ڈاک کے ڈاکو۔ ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکائتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بہتوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا بالکل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۶ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۱۵ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا بس ایک شکائتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (مینیجر)

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — نمبر ۱

تصاویر۔ (۱) رقص بہار (۲) صحرا کے تاجر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشیل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزمِ ادب

مسرت کا مقام ہے کہ اہلِ ذوق نے ادبی دنیا کا سالنامہ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمارے قابل ادبی معاونین کے نتائج افکار اور ہماری ناچیز کوششوں کو قبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ مستقل خریداروں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں سالنامہ رجسٹری کے ذریعہ سے بھیجا جارہا ہے اس لئے اس کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ ان میں سے جن صاحبوں کو سالنامہ ابھی تک نہ ملا ہو وہ رجسٹری و زائد محصول کے لئے ۴ر کے ٹکٹ مینیجر ادبی دنیا کو بھیج کر اپنی کاپی منگا لیں۔ رجسٹری کے بغیر سالنامہ ارسال کرنا گم شدگی کو دانستہ دعوت دینا ہے۔ ہمیں چاروں طرف سے سالنامے کے متعلق قدر دانوں کی گرامی قدر آرا موصول ہو رہی ہیں۔ ہم ان تمام اخبارات رسائل اور ناظرین کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے علم و ادب کے اس ناچیز خادم کی خدمات کو بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ آیندہ نمبر میں ہم ان آرا میں سے چند کا خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے اہل قلم احباب میں سے بعض شاکی ہیں کہ اُن کے گرامی ناموں کے جواب میں دفتر کی طرف سے غیر معمولی تاخیر ہوتی ہمیں ندامت سے اس امر کا احساس ہے کہ واقعی پچھلے دو ماہ میں ہم وقت پر خطوط کا جواب نہیں دے سکے۔ لیکن اس کی واحد اور قطعی وجہ سالنامہ کی ترتیب و تدوین اور اس کی نشر و اشاعت میں ہماری حد درجہ مصروفیت تھی اور بس۔ اب ہم فرداً فرداً ہر صاحب کی خدمت میں جواب روانہ کر رہے ہیں اور اپنے تمام احباب سے اس غیر اختیاری تاخیر کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ بے انتہا احتیاط کے باوجود سالنامہ میں کتابت کی کئی غلطیاں درست ہونے سے رہ گئیں۔ ان میں سے اس وقت تک جو نظر آئی ہیں۔ وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سالنامہ کے مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے مضامین بہ نظرِ احتیاط دیکھ لیں اور اگر مندرجہ ذیل غلطیوں کے علاوہ کوئی اور غلطیاں دیکھیں تو ایڈیٹر کو مطلع فرمائیں۔

نمبر	مضمون	صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۱	برقان	۱۹	۲	۷	نکتہ نگاہ	نقطۂ نگاہ
۲	گارڈز خاندان کے اردو شعرا	۲۸	۱	۱۲	قمرہ	قمر
۳	جوانی کا خواب	۳۵	۱	۲۴	جدّت	جِدّت
۴	”	۳۸	۱	۱۳	نخواستہ	ناخواستہ
۵	داغ	۵۱	۲	۷	منخرے	مسخرے
۶	سوزِ ناتمام	۷۶	۱	۲۵	ہوتا ہے	ہوتا
۷	عزت اور مامتا	۹۴	۲	۷	چِلا دیا	جلا دیا
۸	”	۹۵	۲	۳	متن	تین
۹	ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات	۹۹	۱	۱۲	کولی	کوئی
۱۰	”	۹۹	۲	۱۷	یہن	یہیں
۱۱	”	۱۰۲	۲	۸	دع کدر	دع ما کدر
۱۲	ساقی نامہ	۱۳۳	۱	۱	نام مجھے	نام سے
۱۳	ہندوستان میں عورت	۱۳۵	۲	۳۲	ذکھپا	دیکھا
۱۴	”	۱۳۸	۲	۱۴	رہے	رہی
۱۵	”	”	”	”	رکھتا	رکھنا
۱۶	چین کا ملک الشعرا	۱۴۷	۲	۳۰	بیان بھی	بیان
۱۷	”	۱۵۶	۲	۲۹	ساختہ ساختہ	ساختہ
۱۸	”	۱۵۷	۲	۵	طرف	طرف سے
۱۹	پروفیسر براؤن کے کتب خانہ میں	۱۸۳	۱	۱۴	اسلامی تصرف	اسلامی تصوف
۲۰	چنڈی داس	۱۹۵	۱	۵	مشترق	مستشرق
۲۱	”	۱۹۷	۲	۸	تسکیں	تسکین
۲۲	پاربتی	۲۲۹	۱۲	۱۳	چڑھاتی	چڑاتی

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

چین و جاپان کی موجودہ جنگ

(ذیل کے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ چین و جاپان کے حالات پر علٰحدہ علٰحدہ روشنی ڈالی جائے۔ پہلے حصہ میں جاپان کے نقطۂ نظر سے حالات پر بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں چین کے نقطۂ نظر سے]

جاپان کے نقطۂ نظر سے

جاپان کے [illegible]ے چین کے خلاف موجودہ پالیسی اختیار کرنے کے علاوہ [illegible]ر کوئی صورت نہ تھی پہلے پہل جاپانیوں میں چین سے جنگ کرنے کے متعلق [illegible]ختلاف پایا جاتا تھا [illegible] اب تمام قوم یک جا ہوکر اس پر آمادہ ہے کہ نانکنگ کی [illegible]کوست پر قبضہ جا[illegible]ے۔

جاپان میں [illegible]ت کی بہت کمی ہے اور دوسرے ممالک یقیناً جاپان کی [illegible] معاملے میں کوئی [illegible]نہیں کرسکتے۔

جاپان خیا[illegible]رتا ہے کہ اُس کے خلاف خواہ مخواہ پروپیگنڈا جاری ہے [illegible]ور دوسری طرف چی[illegible] سے ہمدردی کا اظہار کیا جارہا ہے۔

چین جاپا[illegible] کے لئے ایک وسیع بازار ہے اور اس کی تمام تجارت اسی [illegible]لک کے ساتھ وا[illegible] ہے۔ جاپان اسّی فی صدی چیزیں چین کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ جاپان [illegible]ے دس کروڑ افراد کی تجارت چین کے پینتالیس کروڑ افراد کے ساتھ میں [illegible] ہے۔ اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جاپان چین سے خام اجنا[illegible]یدتا ہے اور چین اس کے بدلے میں جاپانی مصنوعات خرید لیتا ہے۔

لیکن [illegible] اس کے چینی جاپانی تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ چین ابھی تک [illegible] دور میں ہے۔ اس کے ارباب حکومت بڑے بڑے جنگی افسر ہیں۔ لڑائی [illegible] طوفان۔ بیماریوں اور دوسری آفات کی موجودگی

میں تجارت کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ ایسے ملک میں جہاں ہر وقت جنگ رہتی ہو، افسر بے انصاف ہوں اور اُن کی زندگی رشوت پر منحصر ہو اور آپس میں نااتفاقیاں ہوں تجارتی تعلقات کا استوار رہنا ناممکن ہے۔

اگر چین اور امریکہ کے ایسے تجارتی تعلقات ہوتے تو یقیناً امریکہ چین کی تجارت کو خیرباد کہہ دیتا لیکن جاپان کے لئے خیرباد کہنا ناممکن ہے کیونکہ جاپان کی تمامتر ترقی اسی پر منحصر ہے۔

جاپان نے بہت قلیل عرصے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے اور صنعتی لحاظ سے اس کا کوئی ملک بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

جاپان جیسے آلاتِ صنعت کسی کے پاس نہیں ہیں۔ انگلستان تک کے لئے بھی یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پرانے آلات چھوڑ کر جاپانی آلات استعمال کرے۔ لیکن ان وجوہات کے ہوتے ہوئے بھی جاپان کو اجازت نہیں کہ وہ کھلے بندوں کسی ملک سے تجارت کرسکے۔ اس کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے لئے اس کے تجارتی مال پر زیادہ سے زیادہ محصولِ درآمد لگایا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے جاپان کی تجارتی ترقی کے لئے چینی بازار بہت ضروری ہے جاپان چاہتا ہے کہ چین کے ساتھ تجارت کرے لیکن چینی حکومت کی آئے دن کی مخالفت اور جاپانی مال کا بائیکاٹ ناخوشگوار فضا پیدا کردیتا ہے

روس نے انتہائی کوشش کی کہ وہ جاپانی تجارت کو شکست دے لیکن جاپان نے جنگِ روس و جاپان میں دس لاکھ انسان صرف اس لئے قربان کئے کہ روسی دریائے آمو کے آگے نہ بڑھ سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ روسی تعلق

کو بالکل قطع کرنے کے لئے اس نے ۱۹۱۰ء میں کوریا پر قبضہ کیا لیکن روسی اثر ابھی تک بعینہٖ قایم ہے۔

جاپان کا دن بدن چین پر قبضہ کرنا صرف اسی رقیبانہ رشک کا نتیجہ ہے۔ روس اور چین کا معاہدہ ہوا لیکن جاپان اسے پرکاہ کے برابر بھی نہیں سمجھتا وہ صرف یہی پکارے جاتا ہے کہ چین ہمارے خلاف شورش بند کر دے۔

جاپان کو چین کے خلاف بہت سی شکایات ہیں اس میں بائیکاٹ معاہدوں کا توڑنا اور جاپان کو خواہ مخواہ ذلیل کرنا بھی شامل ہے۔ جاپان چین کے سیاسی و اقتصادی اضطراب سے خائف ہے اُسے معلوم نہیں کہ چین کا مستقبل کیا ہوگا۔

تاریخی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائی طاقتیں ہمیشہ سے جاپان کو دھمکاتی آئی ہیں۔ مثلاً کوریا نے ۲۰۰ قبل مسیح میں منگولیا نے ۱۲۸۱ء میں چین نے ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں جاپان سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ ۱۹۰۴ء و ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی یہ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے کہ جاپان بھی حفظ ماتقدم کے لئے کچھ تدبیر اختیار کرے۔

جاپان کے پڑوس میں اشتراکیت کا ہوا ہے، اور وہ اس سے خوفزدہ ہے روسی اثر دن بدن ترقی پذیر ہے۔ اشتراکی خیالات کی خاصی اشاعت ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جاپانی سامراج کے مقابلہ میں اشتراکی روس نیم اشتراکی چین کا ساتھی بن چکا ہے۔ منگولیا کا ایک بڑا علاقہ روس کے زیر اثر ہے۔ اشتراکیت کھلم کھلا جاپان کی مخالفت کر رہی ہے چین کی بڑی بڑی فوجیں اشتراکیت کے زیر اثر جاپان کا منہ چڑا رہی ہیں۔

جس طرح بیماری ہمیشہ غلاظت میں پھیلتی ہے بعینہٖ اشتراکیت لڑائی جھگڑوں کے دوران میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے۔

اگر چین میں امن و امان ہوتا تو جاپان سب سے زیادہ فایدہ اٹھا سکتا لیکن شمالی صوبوں میں آئے دن کی جنگیں جاپان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ دخل اندازی کرے۔

اگر امریکہ خود معدنیات کے لحاظ سے اتنا امیر نہ ہوتا اگر اُس کے لوگوں کو چین سے کھلے بندوں تجارت کرنے نہ دی جاتی تو یقیناً اُسے بھی جاپان کی طرح لڑنا پڑتا۔

ذرا خیال کیجئے اگر چین امریکہ کی تجارت اور میکسیکو میں رہنے والوں کو دھمکیاں دے رہا ہو۔ معاہدوں کی پرواہ نہ کرے۔ امریکہ کے خلاف زور و شور سے پروپیگنڈا کرے تو امریکہ اپنے پڑوس میں ایسی بدامنی دیکھ کر خوش رہ سکتا ہے؟

سالہا سال تک منچوریا میں چین اپنی منظم شورش بند نہیں کرے گا۔ لالچی جنگی افسر ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔

جس طرح پریزیڈنٹ ولسن نے ویراکروز پر قبضہ کیا اسی طرح جاپان نے بھی ۱۹۳۱ء میں چینی جنگی افسر شولانگ کے خلاف قدم اٹھائے۔ امریکہ نہایت آسانی سے میکسیکو کا محاصرہ اٹھا سکتا تھا لیکن جاپان کے کئی سالہ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جب تک قوت کے ساتھ ایسا نہ کیا جائے مانچوریا میں امن قایم کرنا محال ہے۔ جس طرح نیکاراگوا نے امریکہ کے زیر سایہ ترقی کی اسی طرح مانچوریا نے بھی جاپان کی مدد سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کافی ترقی کی۔ مانچوریا کے لوگ چین کے جنگی افسروں کے ظلم سے بچ کر بہت خوش تھے۔

چین مانچوریا کی آزادی تسلیم نہیں کرتا اور جاپان کے خلاف پروپیگنڈا اور جاپانی مال کا بائیکاٹ کرتا ہے۔

بائیکاٹ اقتصادی جنگ ہوا کرتی ہے یہ جنگ صنعتی ملک کو اتنا ہی نقصان پہنچاتی ہے جتنا کہ سیاسی جنگ نوع انسانی کو۔

جاپان نہایت امن کے ساتھ چین سے تجارت کر سکتا ہے۔ اُسے چین پر قبضہ جمانے کی خواہش نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ چین کسی طرح اس کا دوست ہو جائے لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ چین پر کسی دوسرے ملک کا اثر قائم ہو۔

پچھلی جولائی اور اگست کی جنگ جاپان نے ہرگز شروع نہیں کی تھی۔ جاپان نے ہر ممکن نرمی دکھائی اور کوشش کی کہ معاملہ زیادہ بڑھنے نہ پائے۔

موجودہ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ چینی افواج شمال کی طرف بڑھنی شروع ہو گئیں۔ جاپان کے مشہور افسر قتل کئے گئے اور کوشش کی گئی کہ جاپان سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ اب اس فضول کوشش کا نتیجہ ظاہر ہے۔

جب چینی جاپانی معاہدے کے خلاف چینی فوجیں شمال کی طرف بڑھیں تو جاپان کا مالی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ پیکنگ میں جاپان کے خلاف بہت زہر اگلا گیا۔ جاپان کے خلاف نفرت بڑھانے میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا گیا۔ نانکنگ نے بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

اس خلاف ورزی میں گیارہ جولائی کا لکھا ہوا معاہدہ بھی شامل ہے۔ اس شور و غوغا کے بعد جاپان کو مجبوراً حفاظتی قدم اٹھانا پڑا۔

اسی دوران میں جاپان کی طاقت کمزور کرنے کے لئے چین کو طاقت ور بنایا گیا۔ ۱۹۳۲ء کے معاہدہ کے خلاف شنگھائی میں لڑائی شروع کر دی گئی اور جاپانی جہازوں پر حملہ کیا گیا۔ چین نے اور بھی بہت حربے استعمال کئے جن سے جاپان مجبور ہو گیا کہ وہ دخل اندازی کرے۔

شنگھائی کی جنگ کی نسبت یہ کہنا کہ جاپان نے شروع کی ہے غلط بات ہے۔ جاپان ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اتنے بڑے صنعتی اور تجارتی مرکز سے چھیڑ چھاڑ کرے لیکن اس کے باوجود جاپان کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اگر چین نے جاپان کے خلاف یہ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ اگر وہاں جاپان کی اقتصادی پوزیشن پر حملے کئے گئے۔ اگر وہاں جاپانیوں پر ظلم کئے گئے تو جاپان کے لئے سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں کہ وہ بھی حفظِ ماتقدم کے لئے اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔

جاپان چاہتا ہے کہ نانکنگ پر غیر ملکی اثرات کا بالکل خاتمہ ہو جائے اور وہ اکیلا ہی اس کا اجارہ دار بنا رہے۔

چین بذاتِ خود اس غیر ملکی اثر کو کم کرنے کے قابل نہیں۔ چین میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ منگولیا اور شمال مغربی حصہ میں روس کا مقابلہ کر سکے۔

چین کا مستقبل بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ چینی جاپانی معاہدے کا چند سال سے زیادہ استوار رہنا ناممکن ہے کیونکہ چین کئی حصوں میں منقسم ہے وہاں جمہوریت قائم نہیں رہ سکتی اور ہمیشہ شہنشاہیت کامیاب رہی ہے آئندہ بھی آمریت کے سوا کوئی طرزِ حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

قومی حکومت جنگی افسروں کے ماتحت ہے مثال کے طور پر ۱۹۳۱ء میں ہشولانگ کو مانچوریا سے نکال دیا گیا تو شیانگ کائی شیک در پردہ بہت خوش تھا اور اس نے جیہال میں کوئی فوج اس کی مدد کو نہ بھیجی۔

یہ درست ہے کہ بہت سی طاقتیں اس وقت جنرل شیانگ کو اکسا رہی ہیں کہ وہ جاپان سے لڑتا چلا جائے۔ لیکن یہ امر چینی مفاد کے خلاف ثابت ہوگا۔

یہ ممالک جاپان کی مخالفت کرنا اپنا سیاسی فرض سمجھتے ہیں۔

چین کے نقطۂ نظر سے

چین کے لئے بھی جاپان کے خلاف موجودہ پالیسی اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ چین اپنے پڑوسیوں کی اقتصادی اور سیاسی جنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ان کی پالیسی ہی یہ ہے کہ چین کو ہڑپ کر لیا جائے۔

چینی اپنے آپ کو صلح پسند خیال کرتے ہیں لیکن جاپان ہر اس ملک کے ساتھ لڑنے کو طیار ہے جو اُسے مشرقی ایشیا میں جنگ کرنے سے روکے جاپان کی پشت پر لالچ، ظلم اور قبضہ کرنے کی خواہش تھی اور وہ اپنی خواہش کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے۔

قدم بہ قدم جاپان نے چین پر قبضہ کر لیا ہے۔ جاپان معمولی سے معمولی واقعات پر لڑنے کے لئے طیار ہو جاتا ہے اور طیارہ رتوں ہی طیار ہو کر میں چین کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ مانچوریا پر قبضہ کرنے کی وجہ نہایت معمولی تھی۔ کسی ریل پر چند بدمعاش چینیوں نے حملہ کر دیا لیکن رات ختم ہونے کے بعد دوسرے روز تمام کے تمام مانچوریا پر جاپان کا قبضہ تھا۔

۱۹۳۱ء میں مانچوریا کے علاوہ اور بھی بہت سے حصوں پر جاپان نے قبضہ کر لیا۔ اب مرکزی حکومت حاصل کرنے کا ارادہ ہے اور چاہتا ہے کہ شمالی چین کا ایک بڑا ٹکڑا اور پرانا دارالخلافہ پیکنگ ہضم کر جائے۔ ۱۹۳۲ء میں چاپی کو برباد کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں جیہال اور شمالی چاہار کی طرف بڑھا۔ پھر ہوف اور چاہار پر ۱۹۳۴ء و ۱۹۳۵ء میں قبضہ کیا۔ سیایون پر ۱۹۳۶ء میں حملہ کیا گیا اور اب ۱۹۳۷ء میں تمام چین کے ساتھ نہایت معمولی وجہ سے لڑائی شروع کر دی۔

اس واقعہ پر ٹائمز آف لندن نے ذیل کے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "یہ نہایت معمولی واقعہ تھا اور بہت آسانی سے حل کیا جا سکتا تھا۔ جاپانیوں نے کسی نہ کسی طرح سے عادتاً اس رائی کو پہاڑ بنا دیا اور ہوف پر فوج کشی کر دی اور ساتھ ہی نانکنگ کی حکومت کو دھمکی بھی دی کہ وہ اس معاملے میں دخل اندازی نہ کرے۔ اب جاپان چین کے ہر علیحدہ علیحدہ حصے پر حملہ کر کے اپنی قوت قائم کر رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بھی اگرچہ شنگھائی کی حکومت نے حملہ کا جواب دیا تھا لیکن جاپانی حملے کی تاب نہ لا سکی۔ ۱۹۳۲ء میں بھی چین انتہائی کوشش کرتا رہا کہ اپنے آپ کو مضبوط بنائے۔

۱۹۳۱-۳۲ء کے چین نے فوجی قوت بڑھانے اور مہذب بننے کی کوشش کی اور اس کے لئے دیگر ممالک سے مدد چاہی۔ نانکنگ گورنمنٹ کے ماتحت چین کی ترقی جاپان کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی۔ جاپانی اخباروں نے دوسرے ممالک کی مدد کو بہت بُری

غارت دیکھا۔ یہ ڈر اس لئے نہیں تھا کہ چین پڑوسی ممالک قبضہ کرلیں گے بلکہ محض اس لئے کہ چین اپنی فوجی سیاسی اور اقتصادی حالت کو مضبوط نہ کرسکے۔

جاپان چینی ترقی کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا ہے اور اس کی روک تھام کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس نے فوجی بربادی شروع کی اور سرکاری و غیر سرکاری عمارات گرادی گئیں۔

کالجوں۔ لائبریریوں اور ہسپتالوں پر دانستہ بم گرائے اور بظاہر یہ پکارتا ہے کہ میں چین کو اُسی کی دشمنی کا سبق دے رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ چین میرا دوست ہو جائے۔

موجودہ لڑائی اچانک نہیں تھی۔ جاپان عرصہ سے اس کی طیاری کر رہا تھا۔ آدھا بجٹ صرف فوجی طاقت پر صرف کیا جاتا ہے۔ شہنشاہیت کو واپس لانے کے بعد جاپانی گورنمنٹ فوج کو مستحکم کرنے کی بہت کوشش کر رہی ہے۔

جب جاپانی یہ دعوے کرتے ہیں کہ چین میں امن و امان قائم نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہاں امن ہو جائے تو کیا وہ اپنی طرف نہیں دیکھتے کیا ابھی کل ہی لوگوں نے شاہی محل کے پیچھے بغاوت نہیں کی تھی اور کچھ عرصے کے لئے متبرک بادشاہ کے خلاف نہیں ہو گئے تھے؟ کیا وہاں ہر روز سیاسی قتل نہیں ہوتے؟ جاپانی سرمایہ دار چینی مزدوروں سے خوف زدہ ہیں لیکن ان کو خود اپنی حفاظت کے لئے فوج کا دستہ رکھنا پڑتا ہے تاکہ انہی کی فوج کا کوئی آدمی انہیں قتل نہ کر دے۔

یہ درست ہے کہ چین میں جاپان کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ چین کا حق ہے کہ وہ استعماری جاپان کے خلاف زہر اگلے۔

جاپان کی فوجی طاقت کے خلاف چین کا اضطراب بالکل فطری ہے۔

اگر چین میں جاپانی افسر قتل کئے گئے ہیں تو اس میں چین کا کوئی قصور نہیں۔ جاپان خود اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ وہ چین پر سختی کر رہا ہے اور چین کے لئے یہ سختی ناقابلِ برداشت ہے۔

چین پر یہ الزام کہ وہ جاپان سے دانستہ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ بالکل لغو ہے۔ نانکنگ گورنمنٹ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ چینی جنرل شیانگ کائی شیک خوب جانتا ہے کہ جاپان کو خواہ مخواہ چھیڑنے کے کیا نقصانات ہیں اور حتی الوسع اس چھیڑ چھاڑ سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

اُس نے شانگ شو لانگ کو سیانفو پر اسی لئے دبایا کہ وہ جاپان کے خلاف زبردست حصہ لے رہا تھا۔ اب شیانگ جاپان کی سختی کا جواب سختی سے دینا چاہتا ہے لیکن چین میں نہ تو اتنی طاقت ہے اور نہ کافی اسلحہ۔

۷ اپریل ۱۹۳۴ء کو ایک جاپانی اخبار نے اعلان کیا تھا اُس ملک کا فطری حق ہے کہ وہ مشرقی ایشیا میں امن قائم رکھے اور ایسا کرنے میں ہمیں یک طرفی و سختی اختیار کرنی پڑے گی۔

اس کے جواب میں چینی گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ کسی ملک کا حق نہیں کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ اگر چین حفظ ماتقدم کے لئے اسلحہ بندی کرتا ہے تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ ملک میں امن قائم رہے۔

لیکن جاپان ایسی باتیں کب ماننے والا ہے وہ برابر اعلان کر رہا ہے کہ ہم امن و امان چاہتے ہیں اور بس۔

دراصل جاپان کی یہ خواہش نہیں کہ چین میں امن قائم ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ وہاں ہمیشہ خانہ جنگی رہے اور اُسے دخل اندازی کا موقع ملتا رہے۔

وہاں جاپانی حکومت کی زیر نگرانی چین کو لوٹا جا رہا ہے۔ جب ۱۹۳۵ء میں امریکہ نے اپنی چاندی کی پالیسی تبدیل کی اور قیمتیں گر گئیں تو جاپان نے بہت مقدار میں چین سے چاندی نکال لی اور یہ سب کچھ جاپانی افسروں کے ماتحت ہوا تھا۔

اسی طرح جاپان خود بخود جھگڑا کھڑا کر لیتا ہے اور الزام غریب چین کے سر تھوپ کر کچھ حصہ اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

اب جاپان یہ چاہتا ہے کہ منگولیا کے سلسلہ میں فتوحات جاری رکھے اور کم از کم دیوارِ چین تک پہنچ جائے۔ اب چین کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ آخری دم تک اپنی حفاظت کے لئے لڑے اور یہی اب چینیوں کا ارادہ ہے۔

چینی حکومتیں آپس میں کبھی نہیں ملیں لیکن اب اُن کا اتفاق ہے اگر یہ قائم رہا اور جاپان نے اس غیر اعلان شدہ جنگ میں چین کو فتح کر لیا تو اس کی یہ فتح اُسے بہت گراں پڑے گی۔

افضل رفیعی

چین (۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۷ء)

تقریباً ۲۵ برس ہوئے کہ چین کی وسیع سلطنت میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا ہوا۔ سن یٹ سین جو چین کی حدود کے باہر ایک انقلابی جماعت کی تشکیل کر رہا تھا۔ آخرکار اپنے پروپیگنڈے میں کامیاب ہوگیا۔ جنوبی چین میں انقلاب کی تُند رو پھیل گئی۔ عوام جوق در جوق شمال کی طرف یلغار کی غرض سے جمع ہونے لگے۔ حتیٰ کہ چین کے آخری بادشاہ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور چین کو ایک جمہوریت قرار دے دیا گیا۔

سن یٹ سین اس جمہوریت کا پہلا رئیس اعلیٰ مقرر ہوا اور رفتارِ واقعات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ چین میں بھی ایک ایسی مستحکم ریپبلک قایم ہو جائے گی۔ جس کی متعدد مثالیں یورپ میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن قضا و قدر کو یوں ہی منظور تھا کہ چین کی تاریخ ایک نئی روش دکھائے۔ سن یٹ سین نے پریزیڈنٹ ہوتے ہی اپنے نصب العین پر عمل درآمد شروع کرنے کی کوشش کی اس کا مقصد اولیں یہ تھا کہ چینی قوم میں آزادی، خودداری اور بیداری کی رُوح پھونک دی جائے اور ملک کے مختلف علاقوں کے باشندوں کو ایک قوم کی لڑی میں منسلک کیا جائے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کی راہ میں اسے ایک ہستی سنگِ گراں نظر آتی تھی یعنی یوآن۔ یوان خود رئیس اعلیٰ ہونے کے عزائم رکھتا تھا۔ سن یٹ سن یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپس کی لڑائی اور خانہ جنگی اغیار کی دراندازی کا باعث ہو گی اپنے عہدہ سے دست بردار ہو گیا اور یُوان اس کی جگہ پریزیڈنٹ مقرر ہو گیا۔

یوان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تو اریخ چین کا وہ پُر مصائب و مذلت دور شروع ہوتا ہے جو اس کے نام پر سب سے بڑا دھبہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا (۱۹۱۵ء) جب جاپان نے اپنے ۲۱ مطالبات چین کے سامنے پیش کئے جن کا مقصد بالفاظِ مختصر چین کو جاپانی سلطنت کا ایک حصہ یا صوبہ بنا دینا تھا۔ یوآن نے اپنے ذاتی مقاصد کو ملکی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے خفیہ خفیہ ان مطالبات کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن باوجود اس پوشیدگی اور پنہانی کے ملک میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی حتےٰ کہ جب دسمبر ۱۹۱۵ء میں یوآن نے اپنے آپ کو بادشاہ قرار دیا تو دیار چین کو ایک اور انقلاب کے زلزلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ بیسویں صدی کی حسِ آزادی ایک بار پھر اسی ملکِ چین میں "خوارئ شہریار" کا باعث ہوئی اور "زاری و قیصری" کو پھر بے نیل و مرام ہونا پڑا۔ اسی گیرو دار و خانہ جنگی کے دوران میں یوآن راہئ ملکِ عدم ہوا لیکن چین کی سلطنت ریزہ ریزہ ہو چکی تھی اور جاپان نے ان حالات سے پوری طرح فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

جن حالات میں جاپان نے اپنی جباری اور اپنے نامصالحانہ رویہ کا ثبوت فتح مانچوریا میں دیا تھا وہ تمام دنیا پر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے اگرچہ ۱۹۳۱ء میں چین میں ایسی ابتری نہیں پھیلی ہوئی تھی جیسی کہ یوآن کی موت کے فوراً بعد لیکن پھر بھی چیانگ کے شک کا اقتدار تمام مملکتِ چین پر حاوی نہ تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنی عسکری قوت تھی کہ وہ جاپان سے نبرد آزما ہو سکے۔ چنانچہ چین نے اس قضیہ کو جمعیتِ اقوام کے سامنے پیش کیا۔ جمعیت نے لارڈ لٹن کی صدارت میں ایک کمشن مقرر کی۔ اس کمشن کی تحقیقات کی رو سے ثابت ہوا کہ جاپان نے جمعیت اقوام کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے اور ایک کمزور ہمسائے سے جابرانہ طور پر جنگ کی ہے۔ جب اس کفن وزدی پر انجمنِ تقسیم قبور نے اس دریدہ دہنی سے جاپان پر الزام لگایا تو جاپان نے اس کا یہ جواب دیا کہ جمعیتِ اقوام کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا۔

جمعیتِ اقوام نے اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے جیہول بھی فتح کر لیا۔ یورپ اپنی الجھنوں میں زیادہ مشغول ہوا تو جاپان نے اپنا دستِ تعدی اور دراز کرنا شروع کر دیا اور یہ ہاتھ بھی ایسا ہے کہ دراز ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرقِ بعید کی فضا جنگ کی گونجوں سے معمور ہو رہی ہے۔ تقریباً دو ماہ ہوئے عسکری صورتِ حالات یہ تھی کہ ہوپی (شمالی چین) میں ۷۰۰۰ جاپانی فوج موجود تھی جس کے پاس ہر طرح کے جدید سامانِ حرب یعنی توپ خانہ، ٹینک، بمبار طیارے وغیرہ موجود تھے بظاہر ان فوجوں کا قیام باکسر معاہدہ کے مطابق تھا یعنی اس لئے کہ یہ افواج پیکنگ اور سمندر کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھ سکیں لیکن

دراصل ان افواج سے خفیہ طور پر یہ کام لیا جا رہا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اس علاقے کو اس قابل بنا سکیں کہ وہاں جاپان کا پرچم کامرانی لہراتا ہوا نظر آنے لگے۔ علاوہ ازیں جاپانی افواج دیگر مقامات (یعنی ٹنسن، ٹنگ چو) وغیرہ میں بھی مقیم تھیں جن میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا تھا اور جن کی عربدہ جوئی و پیکار پسندی کی سرگرمیاں ہر روز بڑھتی جاتی تھیں حتیٰ کہ انہوں نے مارکوپولو کے پل کو نشانۂ توپ خانہ بنا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور گرد و نواح کے کسانوں کی فصلوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ آج کل یہ افواج آس پاس کے مختلف شہروں میں گشت لگاتی ہیں، متعدد چینیوں کو بلاوجہ گرفتار کر لیتی ہیں اور بچوں اور عورتوں پر بھی دست درازی کرنے سے اجتناب نہیں کرتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مانچوریا کی فتح کے بعد جاپان پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جو امیدیں اس کو مانچوریا سے وابستہ تھیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہو سکے گی جتنی رقم مانچوریا کی مادی ترقیوں پر خرچ ہو چکی ہے اس کا عشر عشیر بھی پیداوار کی صورت میں جاپان کو نہیں ملا نہ ہی اس خطہ میں جاپانی آباد ہو سکتے ہیں کیونکہ شدت سرما ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے جاپان نے چاہار اور ہوپی کی طرف نظریں جمانا شروع کر دی ہیں۔ لیکن یہ جاپان کی بدقسمتی ہے کہ اب چین نے بھی خلافِ معمول اپنی عسکری قوت مضبوط کر لی ہے جس کو مغلوب کرنا ناممکن تو نہیں لیکن بہت دشوار و گراں خرچ ضرور ثابت ہوگا۔ ان حالات کو جاپان نے پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا اس لئے اس نے بجائے جنگ کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے شروع کئے اور شمالی چین کو مانچوکو (یعنی مانچوریا) میں ملانے کے لئے اقتصادی دخل (Economic Penetration) کا حربہ اختیار کیا اور ساتھ ہی جنرل سنگ کو شمالی چین [illegible] مقرر کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جنرل چیانگ کے شیک کی افواج کو شمالی چین میں ہرگز داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن جنرل سنگ نے جاپانیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بننے سے انکار کر دیا اور بجائے جاپانی زر سے خریدے جانے کے اس نے مادرِ وطن کے تحفظ کا زیادہ خیال کیا اور جاپانی اقتصادی حملوں کو حتی الوسع روکنے کی مساعی سرانجام دیں۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ اگر جنرل سنگ بندۂ زر ثابت نہ ہوا تو کم از کم اس کی کمزوری و متلون مزاجی کا فائدہ ضرور اٹھا یا جائے گا۔ جاپان کا خیال تھا کہ وسیع و عریض شمالی چین و جاپان کی ملوں کے لئے کپاس کا ایک وسیع کاشت زار ثابت ہوگا۔ وہاں ریلیں بنائی جائیں گی اور اس کے اور جاپان کے درمیان ایک فضائی سلسلہ رسل و رسائل قایم کیا جائے گا لیکن ان میں سے کوئی بات بھی پوری نہ ہو سکی نہ تو زمین چین کا رنگ روئی کے پھنبوں سے سفید ہوا۔ نہ کوئلے کی کانوں نے جاپانیوں کے چہروں کو کالا کیا اور نہ ہی اس علاقے کی فضا طیاروں کی گونج سے آشنا ہو سکی۔ لاچار جاپان کو جنگ کرنا پڑی۔ اب تک جاپان زیادہ تر دھمکیوں سے اپنے مطالبات کو پورا کرانے کی کوشش کرتا رہا ہے دنیا کے سامنے ابھی تک وہ اپنے مطالبات کو صاف صاف الفاظ میں پیش نہیں کر سکا۔ نہ ہی غالباً جاپان کے ارباب بست و کشاد خود ان مطالبات کو اچھی طرح سے خود جانتے ہیں بجز اس کے کہ وہ چین کو اپنے تسلط کے تحت لے آئیں۔ یہ مطالبات ایسے نہیں کہ جاپان ان کو قانونی الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ ایک مطالبہ البتہ ایسا ہے جس کو جاپان علی الاعلان پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ جاپان اور چین متفق ہو کر اشتراکیت کے خلاف ایک محاذ قائم کریں اور دونوں کی متحدہ افواج ہوپی میں اپنا مستقر قائم کریں۔ لیکن ظاہر ہے کہ چین اس مطالبہ کو بھی پورا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو اشتراکیت کے ساتھ جنگ لڑنے کے قابل سمجھتا ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ جو افواج بظاہر جنگِ اشتراکیت کی غرض سے قائم کی جائیں گی۔ وہ آسانی سے چین کے خلاف کام میں لائی جائیں گی۔ لیکن جاپان "تو مان نہ مان میں تیرا مہمان" للکارتے ہوئے گھسا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ مدت تک اعلان جنگ نہیں ہوا لیکن دونوں طرف سے لاکھوں سپاہی میدان کارزار میں کام آ چکے ہیں۔

خادم محی الدین

صحرا کے تاجر

رقص بہار

ترانۂ وطن

ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن!
حاضر ترے لئے ہیں دل وجان اے وطن!

(۱)

ہر صبح آفتاب دھلاتا ہے تیرے پاؤں
ہر شام تجھ پہ ہوتی ہے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں
جنت ہیں تیرے شہر، تو فردوس تیرے گاؤں
اس سے بھی کچھ سوا ہے تری شان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۲)

تیری بلندیوں پہ گھٹائیں ہیں مست مست
دریاؤں، وادیوں کی فضائیں ہیں مست مست
موجیں ہیں مست مست ہوائیں ہیں مست مست
آنند اور سرور کی تو کان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۳)

کلیوں پہ تیری رنگ جواہر کھلا ہوا
باغوں کا روپ نورِ ازل سے دھلا ہوا
تیرے پھلوں کے رس میں ہے امرت گھلا ہوا
یہ رنگ، روپ، رس یہ تری شان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۴)

چاندی اتارتا ہے افق تیری خاک پر
سونا بکھیرتی ہے شفق تیری خاک پر
ملتا ہے زندگی کو وہ حق تیری خاک پر
جس کے لئے جہان ہے پریشان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۵)

ہم کیا ہیں؟ کیا ہیں اپنے یہ اجسام تیری خاک
ہم سب کے ننگ و نام کا ہے نام تیری خاک
آغاز تیری خاک ہے، انجام تیری خاک
تو ہی ہمارے جسم میں ہے جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۶)

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ مردانِ جاں فگن

شرمائے آسمان کو بھی جن کا بانک پن
پہنچے نہ جن کی گرد کو رستم سا صف شکن
ہے نام جن کا زندگی کی جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۷)

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ عرفان حق شناس
سینوں میں جن کے سوز، زبانوں میں ہے مٹھاس
احسان جن کے خلق پہ بے حد، بے قیاس
وہ رہنمائے ملّتِ انسان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۸)

اس خاک سے بنے ہیں وہ روشن ترین دماغ
آندھی کے سامنے جو جلاتے رہے چراغ
پاتے ہیں جن کے نور سے عظمت کا ہم سراغ
ہوتی ہے جن سے راہ کی پہچان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۹)

خاکِ وطن کے عشق کو ایماں بنائیں گے
اغیار کے قدم نہ یہاں جمنے پائیں گے
ہم اس کی آن کے لئے جانیں لڑائیں گے
رکھیں گے جان دے کے تری آن اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۰)

انگلی کوئی اٹھائے تو بازو تڑائے گا
دیکھا بُری نظر سے تو آنکھیں گنوائے گا
دشمن ترا نہ بچ کے کہیں ہم سے جائے گا
ہوگا ہمارے ہاتھ سے بے جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۱)

کیوں ہے اُداس! قلب و جگر ہے ترے لئے
حاضر ہر ایک فرد کا سر ہے ترے لئے
ہر نوجوان سینہ سپر ہے ترے لئے
ستّر کروڑ ہاتھ ہیں بلوان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۲)

جب تک بھی دم میں دم ہے ذرا جان ہے میاں
آنے نہ دیں گے فرق کبھی تیری شان میں
جھنڈا ترا بلند رہے گا جہان میں
رکھیں گے تیری لاج، ترا مان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

وقار انبالوی

موپساں اور اس کی افسانہ نگاری پر ایک نظر

"میں ادبی زندگی میں داخل ہوا تو شہابِ ثاقب کی طرح اور اس سے نکلوں گا تو بجلی کی کڑک کی طرح"۔

موپساں نے ایک ملاقات کے موقع پر یہ الفاظ اپنے ملاقاتی سے کہے تھے اور سچ یہ ہے کہ ان کی صداقت میں شبہ کی گنجائش کم نظر آتی ہے۔ اپنی مختصر حیاتِ ادبی میں، جس کی مدت دس سال ہے شاعری، ناول، رومان، افسانے، ڈرامے، سفر و سیاحت، غرض ادب کے ہر میدان میں اُس کا تخیّل منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ اڑا اور جیسا کہ اس مرکب سوار کا انجام ہوا کرتا ہے جس کا "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" یہ شاہ سوار بھی بہت جلد دیوانگی اور موت کے غار میں غرق ہو گیا۔

اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مشہور فرانسیسی رسالے میں ایک مضمون شائع ہوا جس کے لکھنے والے کا نام اس سے پہلے سنا نہیں گیا تھا صاحبِ مضمون کا نام بتاتے گے۔ دی۔ موپساں"۔ اس مضمون میں رومانی تحریک اور خیالی اور نقلی ادب کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا، اور ایسے ادب کو سچا اور پائدار بتایا گیا تھا جو حقیقی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرتا ہو۔ اس مضمون نے اہلِ قلم میں کھلبلی مچا دی مگر موپساں کے ہم خیال بھی کافی پیدا ہو گئے تھے۔ مصنفین کی فرضی خیال آرائیوں سے پڑھنے والے اکتا گئے تھے۔ انسان بالطبع جدت پسند واقع ہوا ہے۔ اب جو یہ ایک نئی آواز بلند ہوئی تو سب کے کان اس کی طرف لگ گئے۔ اس کے بعد ہی موپساں کا مشہور افسانہ "بُولے دی سوئف" شائع ہوا اور اسے دیکھ کر موپساں کے حریفوں نے بھی اُس کا لوہا مان لیا۔ اخبارات و رسائل نے اس نوخیز ادیب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سوانح نگار اور رپورٹر اُس کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس پر ٹوٹ پڑے۔ مگر موپساں کی زندگی اب تک سیدھی سادی اور بے رنگ گزری تھی، اس لئے سوانح نگاروں نے من گھڑت خاکے تیار کئے اور ان میں اپنے تخیل کے رنگ بھرنے شروع کئے اور اس رنگ آمیزی میں اتنے غلو سے کام لیا کہ اب جو ہم موپساں کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو زمانہ قدیم کے سورماؤں کی طرح اُس کی اوائل عمر اور موت کے واقعات پردۂ راز میں پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ مگر موپساں کے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کی زبانی اور خود موپساں کی زبانِ قلم سے سنے ہوئے واقعات کی امداد سے اس کے سوانح نگار اے ڈوار ڈ مینیل نے موپساں کی زندگی کے دھندلے نقوش کو بڑی حد تک اجاگر کر دیا ہے۔ موپساں کے افسانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے واقعاتِ زندگی سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہو کیونکہ یہ افسانہ نگار اپنے افسانوں سے اس طرح پیوستہ ہے جیسے ناخن گوشت سے۔ اس لئے مختصر سوانح حیات پر پہلے ایک نظر ڈال لیجئے۔

موپساں ۵ اگست ۱۸۵۰ء کو ڈائیپی میں پیدا ہوا۔ فلابیر کی طرح ماں کی طرف سے موپساں کی رگوں میں بھی نارمن قوم کا خون پہنچا تھا۔ بچپن اتریتات میں گزرا۔ بے فکری کا زمانہ کھیتوں اور میدانوں میں دوڑنے غاروں اور پہاڑی چشموں کا سراغ لگانے اور گھنی جھاڑیوں میں کھیلنے میں گزرا۔ مچھیرے جب اپنے جال لے کر سمندر کا رخ کرتے تو اس بچے کا دل چاہتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ نامعلوم دنیا کی سیر کرے۔ اندھیری راتیں اُسے دور دراز ملکوں کی سیاحت کے خواب دکھاتیں۔ ایسی فضا میں اس بچے کی ذہنی صلاحیتوں نے نشوونما پائی اور یہیں سے اس کی روح کی کلی نے کھلنا سیکھا۔

ابتدائی تعلیم ماں کی نگرانی میں ہوئی۔ روئن میں کالج کی تعلیم حاصل کی اور اسی زمانے میں اُس نے توئی بوئل ہے کی ہم جنسی کے فیض سے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ چھٹیوں میں شمالی نارمنڈی واپس جانا پڑا۔ سیر و شکار کے سلسلے میں یہاں کی دلدلیں، کھیت اور جنگل سب روند ڈالے یہیں ان گہری اور نازک جڑوں نے زمین پکڑی جنہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موپساں کو اس سرزمین سے وابستہ کر دیا۔ ساری عمر نارمنڈی اس کے لیے راحت و سکون کا گہوارہ بنی رہی اور یہیں سے سمندر کے اُس شدید عشق کا آغاز ہوا جو آخر عمر تک اس کے مصائب و آلام کو تسکین پہنچانے کا واحد ذریعہ ثابت ہوا تھا۔

۱۸۷۰ء میں وہ پیرس آ گیا۔ خاندان کی مالی حالت بگڑ چکی تھی اس لئے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ نظامتِ بحری میں کئی سال تک منشی کی خدمات خلافِ طبیعت انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد اُسے محکمہ ہدایاتِ عوام میں نسبتاً کچھ بہتر جگہ مل گئی۔

فرصت کے اوقات کو موپساں نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ کشتی رانی کے لئے وقف تھا اور دوسرا ادب کے لئے۔ چھٹی ملی اور اُس نے دریا کا رُخ کیا۔ آس پاس کے سب کشتی راں اُسے جانتے تھے اور اُس کی مزے مزے کی باتیں سُن کر خوش ہوتے تھے۔ کشتی کبھی بہت تیز چلاتا تھا اور کبھی ساحل ساحل آہستہ آہستہ، ملاحوں سے باتیں کرتا کشتی کھیتا چلا جاتا۔ کبھی خودرو پھولوں میں گھنٹوں لیٹا پانی کی سطح پر ننھے ننھے جانوروں اور جل مکڑیوں کا تماشہ دیکھتا رہتا، یا چت لیٹا بید مجنوں کے پتوں میں سفید سفید تیتریوں اور بھونروں کی پرواز پر نظریں جماتا۔ اس انہماک سے جو وقت بچتا وہ لکھنے پڑھنے میں گزرتا۔ خاموشی اور استقلال کے ساتھ وہ اپنے مسودے جمع کرتا رہا اور کبھی ہراساں یا بددل نہیں ہوا۔ ان مسودات میں شاعری، تنقیدیں، ڈرامے، رومان اور ناول سب ہی شامل تھے۔ جو کچھ لکھتا ہر ہفتے فلابیئر کو بھیج دیتا۔ یہ عظیم المرتبت انشا پرداز موپساں کی ماں اور ماموں کا ساتھ کا کھیلا ہوا تھا۔ کہنہ مشق اُستاد نے شاگرد کو وہ گر بتائے جو لکھنے والوں کو غیر فانی بنا دیتے ہیں۔ فلابیئر ہی نے اُسے تحقیق و اکتشاف کا چسکا لگایا تھا اور بتایا تھا کہ سُنی سنائی باتوں اور خیالی روایتوں سے بچ کر خود دیکھنا اور محسوس کرنا سیکھو اور جو کچھ لکھو اس کی بنیاد گہرے مشاہدے پر رکھو۔"

موپساں جو کچھ لکھتا اپنے اُستاد کی خدمت میں پیش کر دیتا اور فلابیئر سختی سے اُس پر تنقید کرتا۔ کبھی یہ سخت گیری اس حد کو پہنچ جاتی کہ اور کوئی ہوتا تو شاید اس کی تاب نہ لاسکتا۔ مگر موپساں ضبط و تحمل سے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ فلابیئر کبھی پدرانہ شفقت سے اس نوجوان کو نشیب و فراز سمجھاتا اور کبھی خلوصِ قلب سے اس کی رہنمائی کرتا۔ سات سال تک فلابیئر نے موپساں کے مسودوں میں بے لاگ کانٹ چھانٹ کی، سارے سارے مضمون کاٹ کر ڈال دیئے اور پورے پورے مسودے بے کار کر دیئے۔ مگر شاگرد کو استاد پر کامل اعتماد تھا اس لئے دل برداشتہ یا شکستہ خاطر نہیں ہوا۔ پھر یکایک ایک دن آمد کے ریلے میں موپساں نے بُولے دی سوئف لکھا۔ اُستاد اسے دیکھ کر چونک پڑا اور شاگرد کی اس کامیابی پر اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ دو مہینے بعد فلابیئر کا انتقال ہو گیا۔

لیکن موپساں جب تک جیتا رہا اُستادِ مرحوم کی روح سے مستفیض ہوتا رہا جیسا کہ بے چین روحیں اکثر مرنے والوں کی روحوں سے سکون حاصل کرتی رہتی ہیں۔ موپساں نے اپنے ایک خط میں بھی اس تعلق کا ذکر کیا ہے۔ اپنے دوست کو لکھتا ہے کہ "مجھے فلابیئر کا خیال ہر وقت آتا رہتا ہے اور میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے کہ کوئی مجھے بھی اسی طرح یاد کرے گا تو میں آج مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

لکھنے کی مشق کرنے کے زمانے ہی میں موپساں ادبی حلقوں میں شریک ہونے لگا تھا۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ کر جب کوئی سبب دریافت کرتا تو وہ کہتا "میں ابھی اپنا کام سیکھ رہا ہوں"۔ لیکن اسی زمانے میں فرضی نام سے وہ چند مضامین رسائل میں شائع کرا چکا تھا اور بعد میں فلابیئر کے مشورے سے چند نظمیں بھی اپنے نام سے چھپوائی تھیں۔ بولے دی سوئف کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کی شہرت کا آغاز ہوا پھر اخبار اور رسالے والوں کے پیہم تقاضوں سے اُس نے تیزی سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اس کی ذاتی صلاحیت وقت کی روش سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی انفرادیت اُسے سب سے نمایاں کرتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اتنا مشہور ہو گیا کہ خود اس کے وہم و گمان میں بھی اتنی شہرت کی امید نہیں تھی۔ پھر اُس کی یہ شہرت صرف فرانس ہی میں محدود نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی ہی میں ساری دنیا میں

پھیل چکی تھی۔ یہ شہابِ ثاقب "مطلعِ شہرت پر چمکتا رہا اور اس کی شعاعوں سے مضمون پر مضمون اور جلدوں پر جلدیں تیار ہوتی رہیں۔

اب وہ دولت مند اور مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی عزت و قعت اور بھی زیادہ ہونے لگی تھی کیونکہ اب وہ امیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس کے قدر دانوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ آزاد نوجوان جس کی محبت کے افسانے سرگوشیوں میں کہے جاتے تھے بیمار تھا، بہت بیمار۔

کامیابی نے اُسے اپنے آغوش میں لیا ہی تھا کہ مرض نے بھی اُسے اپنے چنگل میں لے لیا اور جیتے جی وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکا۔ شدید دردِ سر اور بے خوابی کے ساتھ عصبی دورے پڑنے لگے۔ خواب آور دواؤں اور بے ہوش کرنے والی ادویات سے وہ اپنے مرض کی تسکین کرنے لگا۔ نظر میں پہلے کبھی کبھی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی تھی مگر اب مستقل طور سے بینائی میں فرق آ گیا۔ شہرۂ آفاق جواں سال ادیب تنہائی میں طرح طرح کے اندیشوں سے کانپ اٹھتا تھا۔

موپساں کے افسانوں کو پڑھنے والا اُس کے کمالِ فن پر اُچھل اُچھل پڑتا ہے مگر فطرت اور انسانیت کے بے مثل بیان کے دوران میں اُسے کہیں کہیں فوق الفطرت امور اور اندیشۂ نامعلوم سے بھی یکایک دو چار ہونا پڑتا ہے اور پڑھنے والا سمجھتا ہے یہ موپساں کا غیر معمولی کمال ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے مزاج کی پہنائیوں میں اتنا گہرا اتر جاتا ہے کہ اُن کی کوئی بات اُس سے چھپی نہیں رہتی۔ مگر پڑھنے والے کو اس کا علم نہیں ہے کہ وہ فریبِ نظر اور خوف انگیز کوائفِ ذہنی جن کو اس قدر صحت کے ساتھ موپساں قلم بند کرتا ہے خود اُس کے ذاتی تجربے ہیں۔ اس کی آپ بیتیاں ہیں۔ خطرے کا وجود، نامعلوم کا خوف، موت کا ڈر، یہ سب حالتیں خود اُس پر بیت چکی تھیں۔ اُس کے مرض نے اُسے اِن سب کا تجربہ کرا دیا تھا۔ جسمانی تکلیفوں اور بھیانک کلفتوں سے موپساں اخیر تک لڑتا رہا، محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے وہ اپنے اُس مرض سے لڑتا رہا جو خود اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔

موپساں مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ پستہ قد اور چہرے سے اطمینان و استقلال ٹپکتا تھا۔ اس میں وہ جلا نہیں تھی جو اونچے طبقے کے افراد میں ہوتی ہے اور نہ اُن جیسی وجاہت تھی، لیکن اس کے ہاتھ نازک اور نرم تھے اور آنکھوں کے گرد سائے کے خوبصورت ہالے نظر آتے تھے۔ وہ بہت کم سخن تھا۔ جب کوئی اس سے ملتا تو وہ بہت کم رسمی گفتگو کرتا۔ ملاقاتی اپنی کہتا رہتا اور وہ خاموش بیٹھا مسکرایا کرتا۔ اپنی تعریف سن کر بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے اور قابل سے قابل آدمی سے بھی وہ اسی کم گوئی سے پیش آتا تھا۔ اگر کبھی بہت خوش ہو کر کوئی بات کی بھی تو کسی نہایت معمولی یا عامیانہ موضوع پر۔ سنجیدہ گفتگو میں کبھی اُس نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی باتوں سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہوا کہ وہ خود فن کو کیا سمجھتا ہے اور وہ کیا چیز ہے جسے اُس کی زندگی کا ماحصل سمجھنا چاہیے۔ کبھی کسی معاملے میں اُس نے اپنی رائے نہیں دی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ انسانیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ انسانوں پر اُسے اعتماد و اعتبار نہیں تھا۔ بنی نوع انسان کی نیکی میں اُسے یقین نہیں تھا۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ موپساں متشائم تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں یہ جذبہ بھی موجزن تھا کہ اپنے خیالات کو پست ذہنیتوں اور عوام سے پوشیدہ رکھے۔

موپساں کے افسانوں کے کرداروں کی خصوصیات سے موپساں کی سیرت اخذ کرنا درست نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہیرو کے کردار پر مصنف کا کردار منطبق کر دیں۔ موپساں کہتا ہے:

> "مجھ میں فرسودہ رُوح نہیں ہے۔ میں اپنے اندر نہیں دیکھ سکتا اور نامعلوم روحوں کو سمجھنے کی انتھک کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرے لئے ایک جذبۂ بے اختیار بن گیا ہے۔ میرے ارادے کو اس میں دخل نہیں ہے جو کچھ میرے گرد و پیش ہوتا ہے اُس کو دیکھنے اور سمجھنے کی عجیب صلاحیت مجھ میں از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اثرات جو میرے چاروں طرف ہوتے ہیں مجھ پر چھا جاتے ہیں اور میں اُن میں ڈوب جاتا ہوں۔"

یہ خصوصیت ہر بڑے لکھنے والے کی ہوتی ہے۔ بالزک اور فلابیئر سے زیادہ اور کون اس کا ثبوت دے سکتا ہے۔ اسی طرح موپساں جب اپنے کردار پیش کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کردار کی شخصیت میں جذب کر کے اپنے ہی جذبات و احساسات، اپنی ہی بھلائیاں اور برائیاں، اپنی ہی خامیاں اور کوتاہیاں بیان کرتا ہے۔ اپنی ہستی کو کردار میں اس درجہ مدغم کر دیتا ہے کہ مصنف غائب ہو جاتا ہے اور ہم یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے اُس کے متعلق

مصنف کی رائے کیا ہے۔ غالباً مصنف کی اپنی کوئی رائے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ ہمیں بتاتا نہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موپساں مصائب انسانی پر غور تو کرتا ہے مگر ان پر ترس نہیں کھاتا۔ کمزوروں سے اُسے ہمدردی ہے، سماج کے شکاروں کے لئے اس کا دل دکھتا ہے۔ غریبوں کی مصیبتوں پر وہ غم و افسوس ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے منہ سے خود کچھ نہیں کہتا مگر اس کے دل کی نرمی اور ہمدردی اس کی کہانیوں میں ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہے۔

موپساں نے شروع ہی سے عالمگیر شہرت کیوں حاصل کر لی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس کی صلاحیتیں روایتی پابندیوں سے متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ اُس کی بصارت زمانے کے گرد و غبار سے مکدر نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے خود سیدھے سادے مگر مناسب و مضبوط اوزار بنائے اور رومان کے جنگل میں داخل ہوا اور اس کے دلکش اسرار میں گم ہو جانے کے بجائے وہ بغیر لغزش کئے ہوئے خوش خوش قدم بہ قدم اس میں سے گزر گیا۔

اس کے ہمعصر مسخ شدہ رومانی نظریوں میں بھٹک رہے تھے اور اس کی رواجی نمود سے بھونچکے ہو گئے تھے۔ موپساں نے انہیں انسانوں کی کہانیاں سنائیں، سیدھی سادی اور مطابق عقل کہانیاں، ویسی ہی کہانیاں جنہیں سُن کر ہمارے آباؤ اجداد مسرور ہوتے تھے۔ موپساں نے دیوی دیوتاؤں کے قصے نہیں سنائے بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کے حقیقی افسانے سنائے۔ نقلی افسانے سُنتے سُنتے لوگوں کے دل بھر گئے تھے اور کان کسی اور نغمے کے لئے ترس رہے تھے۔ موپساں نے زندگی کا نیا راگ چھیڑا ہی تھا کہ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، مرجھائے ہوئے دل کلی کی طرح کھل گئے۔ یہ نیا نغمہ روح کی ہم آہنگی میں بلند ہوا تھا اس لئے پیاسی روحیں اس سے سیراب ہونے لگیں اور ہل من مزید کے نعرے گونجنے لگے۔ یہ انسانی روح کا نغمہ تھا اس لئے ساری دنیا کے انسانوں کے دلوں میں اس نے جگہ پائی۔

موپساں کو نہ کبھی غصہ آتا ہے اور نہ اُس کے دل میں کبھی جذبۂ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز پر احتساب نہیں کرتا اور نہ اخلاق کا پرچار کرتا ہے۔ مقاصد اور طریقوں کو نفرت سے نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ اُس کا صرف ایک مقصد ہے، اور وہ یہ کہ اپنے سننے والوں کو خوش کرے۔ زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے وہ ہنستا ہے اور ہنسی اڑاتا ہے۔ مگر اس میں بھی وہ اور مصنفوں سے بالکل جداگانہ خصائص رکھتا ہے۔ مزاح سے وہ ناآشنائے محض ہے۔ کیونکہ زندگی میں اُسے یہ نظر ہی نہیں آتا۔

موپساں کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ اوروں کو ہنسائے۔ وہ تو صرف ایسی حقیقتوں کو بے نقاب کر کے ہنستا ہے جن کو خطرناک صداقتیں یاد کھاوے کی نیکیاں کہنا چاہئے۔ اپنی قنوطیت میں وہ نسل، سماج، تہذیب، تمدن اور دنیا سب کو بغیر کسی رو رعایت کے حقارت سے دیکھتا ہے۔

موپساں نے اگر کسی سے استفادہ کیا ہے تو شوپن ہار اور ہربرٹ اسپنسر سے، گو وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں کی تعلیمات کا کبھی اُس نے غور سے مطالعہ کیا ہوگا۔ موپساں کو کتب بینی کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اُس کا کمال نقشہ نویس کا سا کمال تھا۔ لٹریچر میں شاید ہی کوئی او راس باب میں اُس سے ہمسری کر سکے۔ اس کے جتنے ہیرو ہیں، بڑے آدمی ہوں یا چھوٹے، شہر والے یا دیہاتی، نوکر پیشہ یا تاجر، طوائفیں یا شرابی، وہ اُن سب کو نہایت سُبک رنگ ماحول میں جگہ دیتا ہے مگر اس کی حدود اتنی صحیح متعین کر دیتا ہے کہ یہ لطیف منظر پہلی ہی نظر میں کہانی کے منصوبے کو واضح کر دیتا ہے۔

جب وہ کہیں کچھ بیان کرتا ہے تو ذاتی رائے کو کہیں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جو کچھ اس کے کردار دیکھتے ہیں بس وہی موپساں بھی دیکھتا ہے اُن سے زیادہ خود کچھ نہیں دیکھتا۔ اس کے کردار اپنے خصائص خود کھولتے جاتے ہیں۔ مصنف انہیں کسی صفت سے متصف کرتا ہوا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ انسانی بے چینیوں میں بے جان فطرت کو دخل دینے نہیں دیتا۔ وہ تو ہماری مسرتوں اور غموں پر یکساں ہنستی ہے۔ لیکن اس کے باوجود موپساں فطرت سے محبت کرتا ہے۔ اِسی ایک چیز سے اس کا دل پسیجتا ہے مگر موپساں اپنی طبیعت کو روکے رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر یہ محبت اپنا جوش دکھائے گی تو افسانہ نگار کی حُسن کاری مجروح ہو جائے گی۔

موپساں کی ودیعتِ خاص یہ ہے کہ وہ افسانے میں جس بات کو نمایاں کرنا چاہتا ہے اُس کو شروع ہی سے اپنے افسانے کے

کردار میں اجاگر کر دیتا ہے، اور پھر اس کے گرد ایسے حالات و واقعات تعمیر کرتا ہے کہ وہ خصوصیت اور بھی اُبھر جائے۔ کردار کے پیش کرنے میں اُسے جو قدرت حاصل ہے کسی اور مصنف کو حاصل نہیں ہے۔ بالزک بھی اس خصوص میں اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

موپساں جو کچھ دیکھتا ہے اُسے مصور کی طرح قلم کی تیز جنبشوں سے متعین کر دیتا ہے۔ وہ زیادہ رنگ آمیزی نہیں کرتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ جلدی جلدی خاکے بناتا چلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے حُسن کاروں کی طرح موپساں بھی سادگی پسند ہے۔ وہ دیکھنے والے کے ذہن کو اُلجھنوں میں نہیں ڈالتا۔

نگارش کی اس تیز رفتاری کا فایدہ یہ ہوا کہ موپساں نے افسانوی ادب کا اتنا وسیع سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا۔ اُس کے افسانوں میں ہر شخص کو اپنی سیرت کی تصویر نظر آتی ہے یا یوں سمجھئے کہ اس کے آئینہ خانہ میں ہر شخص اپنی زندگی کے خدوخال دیکھ سکتا ہے۔

موپساں کا اسٹائیل صاف ستھرا، صحیح، آسان اور بہت نمایاں ہے جو منصوبہ یا کینڈا وہ بناتا ہے نہایت مضبوط ہوتا ہے اور اس میں وہ لچک ہوتی ہے جو کسی جاندار وجود میں ہوتی ہے۔

موپساں کہتا ہے کہ "افسانے یا ناول کا منصوبہ گانٹھنے میں مجھے جتنا لطف آتا ہے لکھنے میں نہیں آتا"! اور جب افسانے کا ڈول پڑ جاتا تھا تو اُسے لکھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی تھی۔ صفحے کے صفحے قلم برداشتہ لکھتا تھا۔ جنہوں نے اس کے مسودے دیکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ مسلسل کئی کئی صفحے ایسے دکھائی دیتے ہیں جن میں کہیں ایک لفظ کی بھی ترمیم نظر نہیں آتی۔

موپساں جملوں اور الفاظ کے انتخاب میں زیادہ محتاط نہیں رہتا خیالات کو بار بار دہرانے سے بھی وہ اجتناب نہیں کرتا۔ موپساں کی باصرہ اور شامہ کی قوتیں تکمیل کو پہنچی ہوئی ہیں۔ مگر سامعہ ناقص ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الفاظ کی موسیقیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اپنے استاد فلابیر کی سی سمع نواز ہم آہنگی اُسے میسر نہیں ہے۔ موپساں کے ہاں بے سُرے سازوں کی جھنکار زیادہ سنائی دیتی ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بھی محدود ہے۔ کوئی نادر لفظ یا اچھوتی ترکیب شاید ہی کہیں نظر آئے وہ لوگ جو فلابیر کے نغمے سُن کر جھوم جاتے تھے اور گاتیر کی شیوہ بیانی کے دلدادہ تھے۔ موپساں سے مطمئن نہیں تھے بلکہ بڑی سختی سے اعتراض کرتے تھے کہ صحیح معنوں میں موپساں انشا پرداز کہلانے کا مستحق نہیں ہے لیکن اسی زمانے کے چند مشہور نقاد، موپساں کے مداح نظر آتے ہیں اُن کا یہ کہنا بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ صرف اسٹائیل نہ ہونے کی بنا پر ہم موپساں کو انشا پردازوں کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتے۔ موپساں نمائشی حُسن کاری کا قائل نہیں ہے۔ مولیئر کی طرح وہ ہمیشہ فطرت سے قریب رہتا ہے اور چونکہ فطرت کا ہم جلیس ہے اس لئے فطری زبان ہی میں اظہارِ خیال کرتا ہے۔ صنائع و بدائع کے گورکھ دھندوں میں پڑ کر وہ اپنی فطری سادگی کو غارت کرنا نہیں چاہتا ستائش و شہرت کی تمنا موپساں کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوئی ایک خاتون کو خط لکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

"زندگی میں ہر چیز میرے لئے تقریباً یکساں ہے۔ مرد، عورت، واقعات، سب ایک سے ہیں۔ یہ میرے عقیدے کا سچا اعتراف ہے۔ ہاں میں اتنا اور کہہ دوں جس پر تم شاید یقین نہ کرو کہ میں اپنی طرف سے بھی اتنا ہی بے پرواہ ہوں جتنا کہ اوروں کی طرف سے۔ مجہولیت، مذاق اور درد و عذاب میں سب غرق ہیں۔ میں سب سے بے پرواہ ہوں۔ میرا دو تہائی وقت صحبتِ ناجنس میں ضائع ہوتا ہے۔ ایک تہائی وقت جو بچتا ہے اس میں کچھ لکھتا لکھاتا ہوں اور اسے مہنگے سے مہنگا بیچنے کی کوشش کرتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہ نفرت انگیز تجارت کرتی پڑتی ہے"!

موپساں کو فطرت سے دیوانہ وار محبت تھی۔ سمندر کی ہلکی ٹھنڈی ہوا جب اُسے پنکھا جھلتی تو اس کا جسم لرزنے لگتا۔ صرف سمندر ہی اُسے اپنے آغوش میں لے کر جھلانا اور سکون پہنچانا جانتا تھا۔ سمندر کے نظارے سے موپساں کی طبیعت کبھی نہیں بھری۔ وہ ہمیشہ لمبے لمبے سفر کرتا رہتا تھا۔

موپساں کا فلسفہ بھی بس اتنا ہی اُلجھا ہوا ہے جتنا کہ اُس کا نظریۂ حیات۔ سادگی اور گہرائی میں اُس کی قنوطیت اور سب حقیقت نگاروں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اُس کی قنوطیت کا انجام جب ترس کھانے اور رحم آنے پر ہوتا ہے تو شوپنہار کی طرح اسے بھی منطقی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ موپساں کے اکثر قدردان اس رائے سے اختلاف کریں گے اور کہیں گے کہ رحم کا شائبہ تک اس کی کسی کہانی میں نہیں ملتا اور یہ تو بالکل کھلی

ہوئی بات ہے کہ وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا، لیکن اگر ذرا معان نظر سے دیکھا جائے تو یہ جذبہ ہر صفحے میں کار فرما نظر آئے گا۔ فطری طور پر ہر موضوع کی تہ میں ترحم و ہمدردی کی جھلک نظر آئے گی۔ گو مصنف کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ وہ پڑھنے والے کے جذبۂ ترحم کو اکسائے یا اُسے مصائب زدہ پر ترس کھانا سکھائے۔

ایک نقاد کہتا ہے کہ "موپساں اتنا بڑا ہے جتنا کہ درخت۔ اُس نے ناول اس طرح پیش کئے جس طرح سیب کا درخت سیب پیش کرتا ہے۔" اور یہ ایک ناقابلِ تردید رائے ہے۔

"شہابِ ثاقب" اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ چاروں طرف سے اس کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ الکزینڈر ڈوما نے تین دفعہ موپساں کو لکھا کہ "صرف تم ہی ایک ایسے مصنف ہو جس کی کتابوں کا انتظار میں بے چینی سے کرتا ہوں۔"

لیکن ایک دن آیا کہ موپساں کی بے پروائی زائل ہونے لگی اور اس کی کہانیوں میں نرم دلی جھلکنے لگی۔ اپنی جسمانی تکلیفوں اور اپنے دل و دماغ کے خطرات کو لپیٹ لپیٹ کر بیان کرنے لگا۔ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟ اس کا جواب اس کی کہانیوں میں ملتا ہے۔

شہرت نے اس کے قدم چومے اور بڑے بڑے گھرانوں میں اُسے مدعو کیا گیا۔ یہاں تک کہ خواتین کے ایوانوں میں بھی باریاب ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں جن سے اُسے اتنی جلدی شہرت حاصل ہوئی تھی اب اُس نے لکھنی چھوڑ دیں اور ان کی بجائے محبت اور موت کے حسین رومان قلمبند کرنے لگا۔ داستاں گو نے دیہاتیوں اور کسانوں کا ساتھ چھوڑ کر اونچے طبقے میں امیر امرا کی صحبت اختیار کی۔ اس سے ملنے کے سب خواہشمند تھے اور سب اُسے عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس طوفانِ نشاط میں موپساں کے پاؤں نہیں اکھڑے۔ وہ اپنے دل میں اس عیش و عشرت سے متنفر تھا اور کہتا کہ "میں ان کی ذہنیتو ان کے اطوار، ان کے دلوں اور اُن کی روحوں کا خوب مطالعہ کرتا ہوں۔ مصنف کے لئے کیسا نفیس شغل ہے۔ یہ انسانیت جس قدر نفرت مجھ میں پیدا کرتی ہے اسی قدر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں وہ کیوں نہ بن سکا جو میں بننا چاہتا ہوں — ارسطو فینیز یا ربیلے۔"

اس نئی زندگی کی شرائط کے آگے موپساں کو جھکنا پڑا۔ تربیت چونکہ اچھی ہوئی تھی اس لئے اس زندگی کی روایات اور نقلی تہذیب کا احترام موپساں کم از کم بظاہر ضرور کرتا تھا۔

ناول نگار۔ اس جادو بھری فضا میں تھوڑے عرصے تک رہا تھا کہ اُس کے مرض نے ایک دم سے عود کیا۔ درد شقیقہ اور نئی پرابلم نیسوں نے اس کی جان ضیق میں کر دی۔ اس کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی چیخوں کو روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ناشاد دل موم ہو گیا اور وہ نہایت جذباتی طبیعت کا آدمی بن گیا۔ اس کی ابتدائی صلاحیتیں از سر نو بروئے کار آگئیں اور زیادہ قوت و لطافت کے ساتھ۔ عصبی تکلیفوں نے اس کی بصیرت کو وسیع کر دیا اور ہر چیز کو وہ نئی نظر سے دیکھنے لگا۔ یہی تکلیفیں موپساں کی عظیم الشان شخصیت اور کشادہ دلی کا سبب بنیں۔

اب اس میں غم و افسوس اور مستقبل کے اندیشے پیدا ہو گئے خواہش پیدا ہوئی کہ نامعلوم کو معلوم کرے اور ناقابلِ فہم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے اندر محسوس کرنے لگا کہ کوئی چیز برباد ہو رہی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا مرض تاک لگا رہا ہے اور اب اس پر جھپٹنا ہی چاہتا ہے۔ موپساں اُس سے بچنا چاہتا ہے لیکن پہاڑوں اور سمندر پر وہی فطرت جو اُسے سکون پہنچایا کرتی تھی اب اُسے ڈرانے لگی۔

اُس کا دل کشادہ ہو گیا۔ ان تمام خیالات کو جن کی وہ پہلے برائی کرتا تھا اب خود اپنے اوپر طاری کر کے ان کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی کتابوں میں جذبۂ محبت، جذبۂ ایثار اور احساسِ درد کو نمایاں کرنے لگا۔ کبھی کبھی موپساں اپنی اس نئی شخصیت کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ پہلے کی طرح سوچنے کی اب اس میں صلاحیت نہیں رہی یعنی یہ کہ دنیا کی کسی چیز سے اُسے تعلق ہی نہیں ہے۔

موپساں کا جذبۂ ترحم اب ایک نیا پلٹا کھاتا ہے۔ اُن بدنصیبوں کو اب وہ حقارت سے نہیں دیکھتا جو خود اس کی طرح لاعلاج تکلیفوں میں مبتلا ہیں بلکہ ان کی طرف دستِ اعانت بڑھاتا ہے۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ افسردہ ہو جاتا ہے اور زخموں کو دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ کسی بدنصیبی کی نوعیت یا ابتدا کی وہ تحقیق نہیں کرتا۔ جتنی تکلیفیں ہیں سب سے ہمدردی کرتا ہے۔ جسمانی تکلیفیں، اخلاقی تکلیفیں، وہ تکلیفیں جو دھوکے اور فریب سے پیدا ہوتی ہیں، مسکتی اور نامراد زندگیوں کے پچھلے پہر سے، غرض سب سے اُسے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے اُس کا ذہن بھی تیز ہو گیا۔ سائنس میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس کا

احساس اس سے پہلے کبھی اتنا واضح نہیں ہوا تھا۔ دماغ ہمیشہ مصروفِ کار رہنے لگا۔ وہ خود کہتا ہے "تعجب کی بات ہے کہ ذہنی اعتبار سے میں اب پہلے سے کس قدر مختلف آدمی بنتا جاتا ہوں میں اس فرق کو خوب دیکھتا ہوں اُس وقت جب میں کچھ سوچتا ہوں، کوئی انکشاف کرتا ہوں، کہانیوں کے منصوبے بناتا ہوں، اُن خیالی ہستیوں کا تجزیہ کرتا ہوں جو میرے تخیل میں تیرتی پھرتی ہیں اب مجھے بعض خوابوں میں بھی ویسی ہی خاص ذہنی فرحت حاصل ہوتی ہے جیسی دھوپ میں دیوانہ وار کشتی چلانے سے حاصل ہوتی تھی"۔

اب اُسے اس یقین میں پہلی دفعہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحبِ کمال انشا پرداز ہے۔ اس کے بعد کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ موپساں کوشش کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو بدل لے۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ تاریک اور بیش قیمت دلوں کے بھید اُسے معلوم ہو جائیں، نامعلوم قوموں کے کوائف بیان کرے۔ اُس کا لائقِ رشک سکونِ خاطر جاتا رہا ہے۔

~~~~~~

اُس کے مرض نے ایک خاص صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ اس زمانے میں موپساں نے جنوبی فرانس کا رُخ کیا۔ جہاں اس کی محبوب کشتی سطحِ آب پر اس کی منتظر رہتی تھی۔ اس کشتی میں وہ سیاحت کرتا رہا۔

عرصہ دراز تک موپساں دیکھتا رہا کہ اس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ مرض کا ہر حملہ اس کے قوائے ذہنی کو کم سے کمتر کرتا جاتا ہے اور اس کے تخیل پہ بادل سا چھائے جاتا ہے۔ فالج کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ موپساں اتنا بدل چکا تھا کہ اُس کے دوست احباب بھی اب اُسے مشکل سے پہچان سکتے تھے۔ ایک ملاقاتی کا بیان ہے کہ "وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور کانپ رہا تھا۔ وہ بالکل گھل گیا تھا۔ تکلیف سے چہرہ دُبلا پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں شکوۂ مصائب تھا اور ان میں سے بے رحم قسمت کے خلاف سسکتی شعاعیں نکل رہی تھیں"۔

اب بھی وہ لکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر بے سود۔ مایوسی کی حالت میں خودکشی کا خیال اس کے دل میں راسخ ہوتا جاتا تھا۔ علاج جاری تھا مگر حالت روبہ زوال تھی۔ ایک دن طبیعت کچھ حاضر تھی تو شاعر دورچین کو اس نے اپنے ناول "انجیلس" کا ابتدائی حصہ سنایا اور یہ کہہ کر سنایا کہ "یہ میرا شاہکار ہو گا"۔ لیکن جب سنا چکا تو رو دیا۔ دورچین کہتا ہے کہ "وہ رو دیا یہ دیکھ کر کہ اب اس کا ہنر ترقی کی کس نوبت کو پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر رو دیا کہ اُس کی روح کا سوز و گداز اب اس لائق کبھی نہ ہو سکے گا کہ اپنے اظہارِ خیال سے اوروں کے دلوں کو متاثر کر سکے۔ اُس کی گفتگو اور اُس کے آنسوؤں میں کچھ وہ تقدیس تھی جو مذہبیت کا جزو ہوتی ہے اور یہ تقدیس زندگی کے خوف اور اس زوال کے بھیانک اثر پر چھائی ہوئی تھی"۔

اسی طرح کئی خوفناک ہفتے بیت گئے اور موپساں اپنی عقلِ حیوانی کی مدد سے اپنے مرض کا مقابلہ کرتا رہا۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء کو اس نے بشاشت عقل و ہوش محسوس کیا کہ اب صحت کی کوئی امید نہیں ہے۔ مایوس ہو کر اس نے خودکشی کا اقدام کیا مگر بدنصیبی اس میں بھی شریکِ حال رہی کہ موت نہ آئی۔ لیکن اس کے بعد سے خوشی و ناخوشی کا احساس ہی فنا ہو گیا اور اس کے ذہن پر ابدی تاریکی مسلط ہو گئی۔

موپساں پیرس واپس لایا گیا اور ڈاکٹر بیر تو کے سینی ٹوریم میں رکھا گیا جہاں اٹھارہ مہینے کی مشین جیسی زندگی کے بعد یہ "شہابِ ثاقب" بے نور ہو گیا۔

شاہد احمد
~~~~~~

سکوتِ شام

سوادِ شام میں تنہا رواں ہوں — نہیں معلوم مجھ کو میں کہاں ہوں

ادھر خاموش، ندّی کا کنارا، — اُدھر سنسان جنگل کا نظارا،

فضا پر خامُشی چھائی ہوئی ہے — ہوا کو نیند سی آئی ہوئی ہے،

ترنّم، زمزمے، نغمے، نوائیں — سکوں کی گود میں ہیں سب صدائیں

پرندے چھُپ گئے ہیں گھونسلوں میں — مذاقِ سیر کو لے کر پروں میں

تڑپ کو کھو چکی ہے موج بے تاب — کنارِ جُو میں ہے مدہوشئ خواب

مناظر پر فسوں سا ہو رہا ہے — درختوں میں اندھیرا سو رہا ہے

مثالِ مرگ ساکت ہے ہر اک شَے — کہیں بھی زیست کی جنبش نہیں ہے

حجر خاموش ہیں اشجار خاموش — فلک پر انجمِ ضو بار خاموش

بہت ہیبت فزا یہ خامُشی ہے
بدن میں کپکپی سی آ گئی ہے

سعید احمد اعجاز

سے کہ آپ اس عرصہ میں آزمنت اکتا نہ جائیں۔ کھانا شروع کر دینا چاہیئے! کیونکہ ـــــ ہمارے معزز مہمان جن کے اعزاز میں یہ ڈنر دیا گیا ہے! جانے کس وجہ سے ابھی تک نہیں پہنچ سکے اس سے پہلے کہ میں ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں آپ کو کسی شغل میں مصروف رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایسے مواقع پر کھانے پینے سے زیادہ دلچسپ شغل کیا میسر آ سکتا ہے۔ سو آپ کھانا شروع کر دیجئے میں نیز ان پر جا کر معلوم کرتا ہوں۔

[سیکنڈ ہی جاتا ہے لوگ کھانے اور باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں اتنے میں ایک نوجوان خوشنما کپڑے پہنے ہوئے سجے ہوئے ہال میں داخل ہوتا ہے اس کی موجودہ حالت سے معلوم ہوتا ہے گویا کہیں سے خاک اڑاتا آیا ہے وہ کمرے کی پرتکلف کیفیت دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے لوگوں میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں]

منشی۔ (جو نیلے رنگ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ چشمے کے اوپر سے ناک اور بھوں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے) میر صاحب دیکھئے تو یہ لونڈا اسا کون ہے!

میر صاحب۔ (غور سے دیکھتے ہوئے) ہوٹل کا نوکر بھی تو نہیں معلوم ہوتا۔

منشی جی۔ پھر ہے کون کم بخت!

الفربہ (لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے) کہیں سے ضیافت کا سن پایا ہوگا۔ سوچا ہوگا چلو کچھ ہاتھ لگ ہی جائے گا۔ چلا آیا۔

خاں صاحب! مرزا جی پہچانو۔ تو ذرا۔ کہیں وہی تو نہیں جس کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

مرزا صاحب۔ جاویدی سے مراد ہے آپ کی! اجی۔ آپ بھی کیسا غضب کرتے ہیں۔ اس بے چارے کو یوں ذلیل کرنا اچھا نہیں سن رہے ہیں منشی جی!

منشی جی۔ جی ہاں۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ ایسی ردی حالت میں رہنا کیا پسند کرے گا۔ یہ تو کوئی بھڑ بھونجا معلوم ہوتا ہے۔!

میر صاحب! منہ تو دیکھئے نا! جیسے ابھی کسی ورکشاپ سے نکل کر آیا ہے!

منشی جی۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے! ظالم ضیافت میں بھی چلا آیا جیسے ہے کہیں کا نواب زادہ!

خانصاحب! اب جانے بھی دیجئے۔ کیں کھڑاگ لے بیٹھے۔ نہیں کیا خود ہی جھک مار کر چلا جائے گا۔

(جاویدی اپنے خیالات میں محو تھا کر لوگوں کی سرگوشیوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے)

منشی جی۔ ذرا پوچھئے تو۔ آخر ہے کون!

مرزا صاحب۔ اچھا یہ بھی ایک شغل سہی (کرسی چھوڑ کر جاویدی کے پاس جا کر) کیوں صاحب خاکسار آپ سے کچھ دریافت کرنے کی گستاخی کر سکتا ہے!

جاویدی۔ فرمائیے ـــــ اتنی دیر سے کھڑا ہوں کسی نے پوچھا تک نہیں میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہاں انسانیت شناس آدمی ہی کوئی نہیں!

مرزا صاحب۔ (ناک بھوں چڑھا کر) او ہو۔ کیا کہنے اس شانِ تکلم کے! کیا ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ آپ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر سکے!

جاویدی۔ میں نے یہ کب کہا ہے!

منشی جی۔ (اپنی جگہ سے بآواز بلند) کیا فرماتے ہیں آنجناب!

مرزا صاحب۔ اجی فرمانا کیسا! یہ تو ہمیں کسی قابل ہی نہیں سمجھتے!

جاویدی۔ (پریشان ہو کر) عجیب آدمیوں سے پالا پڑا ہے! کیوں صاحب آپ کے ہاں بلائے ہوئے مہمانوں کی یوں ہی خاطر تواضع کی جاتی ہے ـــــ

میر صاحب۔ (نزدیک آ کر) مگر یہ تو کہئے آپ کو بلایا ہی کس نے ہے۔

جاویدی۔ دیکھئے صاحب آپ حد سے باہر نکل رہے ہیں۔ آپ کے یہ الفاظ ایک شریف آدمی کی توہین کا باعث ہو رہے ہیں۔ آپ کو جاننا چاہیئے ـــــ مجھے یہاں خاص طور پر بلایا گیا ہے!

میر صاحب! شرافت تو آپ کے چہرے سے چھاجوں برس رہی ہے اور ـــــ خاص طور پر بلائے جانے کا حال میزبان کو معلوم ہوگا ـــــ

منشی جی۔ تو گویا ان کے نزدیک ہم سب لوگ عام طور پر بلائے گئے ہیں۔

جاویدی۔ حضرات ـــــ میں آپ سے ایسی بدسلوکی کا ہرگز متوقع نہ تھا۔

الفربہ۔ (کباب کا ایک بڑا سا ٹکڑا جلدی سے منہ میں بھرتے ہوئے) ارے میاں ـــــ کیوں فضول جھگڑا کرتے ہو اکمرے کے باہر

بیٹھ رہو۔ ہمارے کھا چکنے کے بعد اگر کچھ بچ رہا تو تمہیں بھی مل جائے گا

جاویدی۔ (ہاتھ ملتے ہوئے) الٰہی کیا کروں ——— عجیب جاہلوں کے نرغے میں آپھنسا ہوں۔

[جاویدی پریشان ہو کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ لوگ خوب قہقہے لگا رہے ہیں سیکرٹری اُسے نہایت احترام سے اُسے اپنے ساتھ لئے داخل ہوتا ہے ——— اور اُسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے ایک ہار اس کے گلے میں ڈالتا ہے۔ سب لوگ حیران و شرمسار ہیں]

سیکرٹری۔ حضرات اجازت دیجئے کہ تخئیل کے بادشاہ۔ شاعری کے استاد۔ جادو نگار معجز رقم۔ حضرت جاویدی سے آپ کو متعارف کروں۔

میر صاحب! (قدرے شرمساری سے) ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں آج اس یگانہ روزگار شاعر کے دیدار کا موقع ملا ——— جس کے علم وفضل کا شہرہ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا ہوا ہے!

مرزا۔ (نظریں نیچی کئے ہوئے) ہم جناب سیکرٹری کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ ہم کو حضرتِ جاویدی سے ملاقات کا اعزاز نصیب ہوا۔

الفربہ۔ ہِپ ہِپ ہُرے تھری چیرز فار مسٹر جاویدی۔

منشی جی۔ میں حیران ہوں کہ سیکرٹری صاحب کا شکریہ ادا کروں یا اپنی قسمت کا کہ جن بزرگوار کے دیدار کی برسوں سے حسرت تھی وہ آج نصیب ہوئی

خاں صاحب! آپ نہ صرف ہمارے صوبہ بلکہ کل وطن کے لئے مایۂ ناز ہیں ———

میر صاحب۔! کیوں نہیں۔ بلکہ دنیا کے چار کھونٹ میں آپ کی جادو نگاری اور استادی کا ڈنکہ بج رہا ہے!

خاں صاحب! میں تجویز کرتا ہوں ——— کہ سیکرٹری ایک بڑی پبلک تقریب کا انتظام فرمائیں۔ کیونکہ سارا شہر حضرتِ جاویدی سے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

کے دیدار کا مشتاق ہے ———

الفربہ۔ یہ گارڈن پارٹی شالامار میں ہو تو بہتر۔

خانصاحب! بہت درست۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو یہ بھی عرض کروں کہ سب نہایت اضطراب سے مشتاق ہیں۔ کہ ہمارے مخدوم اور معزز مہمان۔ اپنے کلام بلاغت نظام سے ہمیں غذائے روح عطا فرمائیں گے۔

جاویدی۔ میں آپ حضرات کے سلوک کو جو میرے اس کمرے کے دروازے پر قدم رکھنے کے وقت سے اس وقت تک ہوا ہے۔ بہت قیمتی سمجھتا ہوں۔ رہا کلام وہ شالامار کی صحبت کے لئے ملتوی رکھا جاتا ہے۔ اب میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

اچھا ——— آداب!

[جاویدی چلا جاتا ہے اور سب گردنیں جھکائے خاموشی کے ساتھ اٹھ کر باہر جاتے ہیں]

تاجور سامری

رباعیات

(۱)

اک ساغرِ جاں فزا پلا دے ساقی
سوئی ہوئی روح کو جگا دے ساقی
مستیٔ ازل ہو مری آنکھوں میں ساری
مستی آنکھوں کی بھی پلا دے ساقی

(۲)

دوشیزۂ صبح کا تبسم یارب
اور یہ لبِ شام کا تبسم یارب
سرشار ہے صبح و شام میرے دل میں
اک زمزمہ و نور کا تلاطم یارب

(۳)

آ بادۂ جاں فزا سے پُر جام کریں
آ بیعتِ ساقیٔ گل اندام کریں
دنیا نہیں کچھ بھی وقت ہیں اتنے
بے فکر رہیں کہ فکرِ انجام کریں

(۴)

اے صبح کو جبۂ نور دینے والے
اے شب کو پیام سرور دینے والے
دے میرے خیال کو بھی انوار و سرور
اے طور کو برقِ طور دینے والے

اثر صہبائی

ایک فرانسیسی اُردو شاعر

اردو کی داغ بیل کچھ ایسی شبھ گھڑی ڈالی گئی تھی اور اس کا سنگِ بنیاد ایسے مقدس ہاتھوں رکھا گیا تھا کہ یہ نوزائیدہ ابتدا ہی سے ایسی شوخ، چنچل، رسیلی، چھبیلی نکلی کہ بڑے بڑے کٹر بھی اس پر جان دینے لگے، آقایانِ ایران نے اپنی فارسی کو چھوڑ کر اسے پسند کیا، زبان آورانِ عرب نے عربی سے منہ موڑ کر اس سے ناتا جوڑا اور تو اور فاتحینِ فرنگ بھی باوجود فرزانگی اپنے تئیں اس سے بچا نہ سکے۔ آخر انہیں بھی نیم بسمل ہونا پڑا، چنانچہ سینکڑوں فرانسیسی پرتگیزی اور یورپین اردو کے دامِ زلف میں پھنس کر بقول شخصے "فاتح مفتوح" ہو رہے،

"یورپین شعرا اردو" پر بہت سا مواد جمع ہو چکا ہے۔ اسی نام سے ایک مختصر تذکرہ بھی شائع ہو چکا ہے مسٹر محفوظ الحق (پٹنہ) اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانی اور یورپین حضرات کے کئی ایک مقالے طبع ہو چکے ہیں، حال ہی میں "کلیم" دہلی میں اسی قبیل کا ایک تحقیقی مضمون طبع ہو چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ادبی دنیا میں میرے پیارے دوست شاکر میرٹھی نے جارج برنس پیش شور میرٹھی پر ایک بسیط مقالہ سپردِ قلم کیا ہے،

آج ہم ایک صاحبِ دیوان فرانسیسی نژاد نو مسلم اردو شاعر کو پیش کرتے ہیں، ان کا نام الکزینڈر ہیڈرلی (ALEXENDER HEDERLEY) تھا، آزاد تخلص کرتے تھے۔ رسالہ مخزن لاہور میں مارچ ۱۹۱۰ء کی اشاعت میں "الکزینڈر ہیڈرلی" کے عنوان سے سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کا ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے اس کے بعد رسالہ معارف اعظم گڈھ میں جنوری ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں "مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی" کے عنوان سے عبدالماجد صاحب بی اے رحال مدیر صدق، کا ایک مقالہ طبع ہوا ہے۔

فاروق صاحب نے اپنا مضمون صرف دیوانِ آزاد کو سامنے رکھ کر اس کے دیباچوں کی روشنی میں لکھا ہے اور عبدالماجد صاحب نے اس دیوان کے علاوہ لالہ سری رام کے تذکرہ خمخانۂ جاوید کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے مگر فاروق صاحب کا مضمون ماجد صاحب کے پیشِ نظر نہیں رہا یا اگر رہا بھی ہو تو کم از کم ماجد صاحب نے اس مضمون کا حوالہ اپنے مضمون میں نہیں دیا،

یوں تو کئی ایک تذکرہ نویسوں نے آزاد کا ذکر کیا ہے مگر تفصیل اور زیادہ حالات لالہ سری رام ہی نے خمخانۂ جاوید میں لکھے ہیں، اور لالہ جی کے پیشِ نظر دیوان آزاد بھی رہا ہے۔

۱۹۲۵ء میں سردار علی صاحب نے حیدر آباد سے ایک تذکرہ "یورپین شعرائے اردو" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں (۲۰) شعرا کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے ہیں انہوں نے اپنے تذکرے کی ابتدا آزاد ہی سے کی ہے اور خمخانۂ جاوید اور ماجد صاحب کے مضمون کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ماخذات کی فہرست میں "رسالہ معارف جلد دہم عدد دوم بابت ۱۹۲۲ء" ضرور لکھ دیا ہے مگر آزاد کے حالات کے ساتھ کوئی حوالہ نہیں ہے اور آزاد کے دیوان کا تذکرہ اس مزے سے کیا ہے گویا وہ ان کے پیشِ نظر ہی تھا حالانکہ اس وقت تک آزاد کا دیوان ان کی نظروں سے گزرا نہ تھا، افسوس ہے کہ بعض لوگ اس طرح کر کے اپنے تئیں مصنف اور مولف باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خمخانۂ جاوید کی تفصیل مولوی فاروق اور مسٹر ماجد کے مضمون کے بعد آزاد پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی مگر صرف اس بنا پر مجھے خامہ فرسائی کی جرأت ہوئی کہ سال گزشتہ نواب ذوالقدر جنگ بہادر نے اپنے والد نواب سرور الملک بہادر مرحوم کی خود نوشتہ سوانح عمری کارنامہ سروری شائع کی تو اس میں من جملہ اور بہت سی باتوں کے ایک بات

یہ بھی تھی کہ غدر کے بعد ایک متقدر انگریز نے اسلام قبول کیا تھا جو شاعر بھی تھا اور آزاد تخلص کرتا تھا:

کارنامۂ سروری کی عبارت یہ ہے (ایام غدر کے بعد کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے)

"اسی زمانے میں ایک متقدر انگریز مسلمان ہوگیا تھا اور نام اپنا جان محمد رکھا تھا ذکی اور خوش کلام شاعر تھا اس کا تخلص آزاد تھا چنانچہ کہتا ہے:

خدا کی قدرت ہے ورنہ آزاد میرا اور ان بتوں کا جھگڑا
نہ ہوگا فیصل تمام دن میں مگر بروز حساب آدھا"

مطلع بھی اچھا کہا ہے۔

نوید اے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اس کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے بارے رخ پر سے اس نے الٹا نقاب آدھا"

(دیکھو کارنامہ سروری صہ۴۹ حاشیہ)

کارنامۂ سروری کی منقولۂ بالا عبارت کے مطالعہ کے بعد اس تشویش کا پیدا ہونا لازمی تھا کہ آزاد جس نے اسلام قبول کیا کون تھا؛ چونکہ انگریز شعراء میں آزاد تخلص کرنے والا ایک ہی شاعر الکزینڈر ہیڈرلی نظر سے گذرا تھا اس لئے قیاس تھا کہ یہی آزاد جان محمد بنا ہوگا مگر کوئی ثبوت اس کو باور کرنے کے لئے نہ تھا، کارنامۂ سروری میں جو دو شعر آزاد کے نام سے ملے وہ تذکرۂ یورپین شعراء اردو کے منقولہ اشعار میں نہ تھے، اسی غرض سے فاروق صاحب کے مضمون کا مطالعہ کیا تو اسی بحر اور قافیہ اور اسی زمین کے دو شعر ملے مگر مطلع و مقطع فاروق صاحب نے بھی نقل نہیں کیا تھا،

شراب ہو وے جو تند ساقی نہ بے مزہ کر پلا کے پانی"
پلا وہ ساغر کہ جس میں ہووے شراب آدھی گلاب آدھا"
لبوئے بادہ لگا دے منہ سے یہ کیسی کرتا ہے چہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جام شراب آدھا"

اسی غرض سے کہ شاید یہ شعر عبدالماجد صاحب نے نقل کئے ہوں معارف والا مضمون بھی دیکھا مگر افسوس ہے کہ اس غزل کا ایک شعر بھی ماجد صاحب نے نقل نہیں کیا تھا۔

میں اسی تلاش میں تھا کہ جان محمد الکزینڈر ہیڈرلی ہی تھے یا کوئی دوسرا، کہ مجھی مولوی تراب علی خاں صاحب باز نے دیوان آزاد عنایت کیا اس دیوان میں حساب آدھا، نقاب آدھا والی غزل صہ۵۹ اور صہ۶۰ پر موجود ہے البتہ دیوان میں مطلع کا مصرع ثانی یوں لکھا ہوا ہے ؎

ہزار مشکل سے بارے الٹا انہوں نے رخ سے نقاب آدھا

اور مقطع کا مصرع ثانی یوں ہے، ؎

نہ ہوگا فیصل تمام دن میں بروز یوم الحساب آدھا

مگر یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے صحیح مصرع وہی ہے جو نواب سرور الملک نے نقل کیا ہے ورنہ "بروز یوم الحساب" اور "شب لیلۃ القدر کی رات" جیسی غلطی کا امکان آزاد سے نہیں ہوسکتا،

سرور الملک بہادر نے غدر کے بعد کے واقعات میں یہ ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ واقعہ ہوا ہے کیونکہ جولائی ۱۸۶۱ء میں آزاد نے انتقال کیا ہے اس سے یہ متیقن ہوتا ہے کہ آزاد نے انتقال سے ڈیڑھ دو سال پہلے اسلام قبول کیا مگر حیرت ہے کہ دیوان آزاد کے دیباچوں میں اس کا ذکر مطلق نہیں، آزاد کے بھائی طامس ہیڈرلی نے شاید اپنے خاندان کے لئے ننگ اسلام کو پسند نہیں کیا اس لئے اس واقعہ کو قلمزد کر دیا مگر ایک دیباچہ شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور ضلع فتح پور نے بھی لکھا ہے جس میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں چونکہ مسٹر طامس ہیڈرلی نے اس دیوان کو چھپوایا اور شوکت علی صاحب سے دیباچہ لکھوایا ہے اس لئے ممکن ہے کہ طامس صاحب کی خاطر شوکت صاحب نے حرف مطلب کو قلمزد کر دیا ہو۔

بہر حال مسٹر الکزینڈر ہیڈرلی آزاد نے غدر کے بعد اسلام قبول کیا اور جان محمد نام اختیار کیا۔

لالہ سری رام، ایم، اے نے خمخانہ جاوید میں (صفحہ ۲۷ جلد اول) لکھا ہے۔

"کپتان الکزینڈر ہیڈرلی مسٹر جیمس ہیڈرلی فرانسیسی کے چھوٹے بیٹے، ایک مسلمان شریف زادی کے بطن سے تھے ان کے والد ان چند یورپین سے تھے جنہیں ہندوستان جنت نشان کی آب و ہوا خصوصاً دار السلطنت شاہجہان آباد کی دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی عورتوں سے شادی کر لینے کے باعث انہیں کی طرز معاشرت بھی اختیار کر لی تھی الکزینڈر ہیڈرلی کی تربیت و پرورش دہلی

کے شرفائے اہلِ اسلام کی مانند ہوئی اور یہیں کی صحبتوں نے
ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا کر دیا، اٹھارہ برس کی عمر میں شعر
کہنے لگے . . . . آغازِ شباب میں آگرہ چلے گئے تھے ۔
مشورہ سخن نواب زین العابدین خاں عارف سے لیتے تھے" الخ

لالہ سری رام کے علاوہ کسی اور نے آزاد کے فرانسیسی الاصل اور مادر ہندوستانی شریف زادی کے بطن سے ہونے کا تذکرہ نہیں کیا ہے اس کی تصدیق آزاد کے دیوان سے بھی ہوتی ہے، دیوان کے شروع میں قصائد ہیں جن میں ایک قصیدہ اپنے ماموں خان صاحب حیات محمد خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

زہے نصیب ازل سے ہوں بے تردد وبیم ؛ نہ آرزوئے بہشت بریں نہ خوف جحیم

اس کے ساتھ ایک قصیدہ اپنے بھائی نظام الدین خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے،

ہو کے خاکِ عالم میں تیرے کشتگاں پھرنے لگے ؛ مصر میں جیسے غبارِ کارواں پھرنے لگے

ظاہر ہے کہ مسلمان ماں کے بطن سے پیدا ہونے اور اہلِ اسلام کی طرح تربیت اور پرورش پانے کی وجہ سے آزاد کو اسلام سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہوگا اور آخر عمر میں انہوں نے اسلام کا اعلان کر دیا۔

دیوانِ آزاد رائل سائز کے (۱۷۵) صفحات پر مطبع احمدی آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا ہے۔ کاغذ گندہ، سطر ۱۷ سطری اور کتابت معمولی ہے ابتدا ۶ ۱/۲ صفحے کا ایک دیباچہ شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور ضلع فتحپور مضافات الہ آباد نے لکھا ہے جو فارسی ہے اس دیباچہ کا لب لباب یہ ہے کہ آزاد نے اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، اساتذہ کے دواوین اور تصانیف کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنا کلام غالب اور زین العابدین خاں عارف کے پاس بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے، فنِ طب میں بھی بہرۂ کامل تھا اور بڑے اچھے معالج تھے مریضوں کی امداد بھی کرتے تھے اسی داد و دہش نے افلاس تک نوبت پہنچا دی تھی، راقم دیباچہ سے بہت خلوص تھا اگر ایک روز بھی یہ ان کے گھر نہ جاتے تو وہ ان کے گھر آتے تھے۔ مدت تک یہی حال رہا، آخر راقم دیباچہ مشرق کی طرف سفر پہ گئے اور آزاد نے ریاست الور میں نوکری کر لی توپ خانے کے کپتان مقرر ہوئے، الور گئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ راقم دیباچہ کو آزاد کے بھائی کے خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ جولائی ۱۸۶۱ء میں آزاد قیدِ ہستی سے بھی آزاد ہو گئے۔ انتقال کے وقت آزاد کی عمر تئیس سال تھی۔ ان کے انتقال کے تیسرے مہینے اُن کے بھائی طامس ہیدرلی ڈپٹی کلکٹر ہو کر بھرت پور پہنچے اور انہوں نے راقم دیباچہ کو بلا کر آزاد کے منتشر کلام کو مرتب اور مدوّن کر کے شائع کرنے کی خواہش کی۔ ان واقعات کے اظہار کے بعد آزاد کی شاعری کی شاعرانہ تعریف کی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں۔

دوسرا دیباچہ طامس ہیدرلی نے لکھا ہے۔ جو اس حیثیت سے دلچسپ ہے کہ آج سے پچھتر سال پہلے کے ایک انگریز کی نثر کا نمونہ ہے چنانچہ اسی غرض سے یہ دیباچہ نقل کیا جاتا ہے۔

"نیاز مند درگاہ لم یزلی طامس ہیدرلی ابن مسٹر جیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا رازِ دل صاحب دلوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الکزاندر ہیدرلی جوانِ سعادتمند شیریں زبان دانش پیوند ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل ہوا اور چند روز میں جیسا چاہیئے مایۂ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا۔ کیونکر نہ ہو طبیعت درّاک تھی فکر چالاک تھی جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا اس نے گلہائے معنی کا ایک تختۂ خوشرنگ دکھایا رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنون کو رشک ہوا اور دانش مندوں کو حیرت ہوئی نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیر زادے عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسداللہ خاں غالب کے شاگرد تھے وہ اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے، ہنوز برادر موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا بلکہ جو کچھ اس کے دل میں تھا زبان تک نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آ پہنچا اور اس سعادت مندِ ازل کو پیغامِ اجل کا آ پہنچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدہ کپتانی پر مامور تھا دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دور تھا۔ ایسا لائق ہونہار بھائی جس نے کل دو اوپر تیس برس کی عمر پائی ساتویں جولائی ۱۸۶۱ء کو کام تمام ہوا اس غم کا جس قدر بیان کیجئے اس سے سوا ہے جو حال اپنا بنا ہے اور جس قدر غم کیا ہے بجا ہے۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد، افسوس نہ فریاد میں فایدہ دیکھا نہ رونے میں تاثیر پائی بہت روئے پیٹے آخر صبر کرتے بن آئی اشعار اس مرحوم کے جو جابجا پریشان پڑے پائے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا

رہنے نہ دیجئے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کر کے
دیوان مرتب کیجئے تاکہ جو دیکھے وہ کہے اس شخص کی تھوڑی سی
زندگانی تھی مگر وہ اس مدت قلیل میں کیا گہرفشانی تھی نہیں نہیں یہ
بات نہیں ہے مجھ کو یقین ہے کہ یہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے
گئے ہیں، سو اس کے اشعار اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے
ہیں۔ الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور ہو اور اس کے زندہ دیدیلی
کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو۔
زیر مطالعہ دیوان میں صفحہ ۱۲ سے قصائد شروع ہیں جو صفحہ ۴۵ تک
ہیں ایک حمدیہ قصیدہ ایک مسدس نعت مسیح، اور (۹) متفرق مدحیہ قصاید
ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش کو فراہم کر دیا ٭ دم میں پیدا صانع قدرت نے آدم کر دیا

درمیانی ایک شعر ہے۔

سوزشِ داغِ جگر کا چوں ضیائے ماہتاب ٭ گاہ برتر کر دیا رتبہ کبھی کم کر دیا

مقطع ہے۔

بے نوا ہوں بندِ کفر و دین سے آزاد ہوں ٭ مجھ کو یکساں آب گنگ و آب زمزم کر دیا

نعت مسیح کی مسدس کے (۱۱) بند ہیں ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

تیری رحمت حامیٔ رزقِ گدایاں یا مسیح ٭ تیری بخشش تاج بخش تاجداراں یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی خواہاں یا مسیح ٭ ہے تجھی سے نیک و بد کی شکل آساں یا مسیح
ساقیٔ کونین و شاہِ دو جہاں تو ہی تو ہے
یا مسیحا! چارہ سازِ عاصیاں تو ہی تو ہے

اس مسدس میں بالکل وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو ہمارے شعرا رسول مقبول امی وابی فداک کی نعت پاک میں اختیار کرتے ہیں۔
افسوس ہے کہ آزاد کا نہ تو کوئی نعتیہ قصیدہ دیوان میں ہے اور نہ نعتیہ غزل؛ میرا ذاتی خیال ہے کہ طامس صاحب نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ دیوان سے آزاد کے قبول اسلام کا پتہ نہ چلنے پائے ورنہ مجھے یقین ہے کہ آزاد نے نعت کہی ہوگی اور یقیناً کہی ہوگی ممکن ہے کہ کبھی منظر عام پر بھی آ جائے۔
مدحیہ قصاید میں پہلا قصیدہ اپنے ماموں خاں صاحب حیات محمد خاں کی مدح میں ہے جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

زہے نصیب ازل سے ہوں بے تردد و بیم ٭ نہ آرزوئے بہشت بریں نہ خوف جحیم
بری ہوں مدح و مذمت سے میرے مذہب میں ٭ نہ بتکدے کی حقارت نہ کعبہ کی تعظیم
ہزار واعظ و ناصح کیا کریں بک بک ٭ سنوں نہ ایک کسی کی نصیحت و تفہیم
نہ مدح گو کا ادا ہو مری زبان سے شکر ٭ نہ طعنہ ساز سے مجھ کو شکایتِ ملویم
وصال زیست ہے میری یہ تو نہ مرتا ہوں ٭ خدا بھی دے تو نہ لوں حور بانِ باغ نعیم

ایک قصیدہ اپنے کسی بھائی نظام الدین خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ہو کے خاکِ علم میں تیرے کشتگاں کچھ رنے لگے ٭ مصر میں جیسے غبار کارواں پھرنے لگے

علی محمد خاں فرزند خاص نواب فیض محمد خاں بہادر بھجریچ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

عروج پر ہے میری آہ کی شررکاری ٭ کرے ہے خرمن گردوں پہ صاعقہ باری

اپنے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے؛ مطلع ہے۔

پھر سینہ تپ غم میں ہے مجمر نے بادہ ٭ جو تخت ہے دل کا سو ہے اخگر سے زیادہ

مہاراجہ جیاجی راؤ سندیہ بہادر والیٔ گوالیار کے مدحیہ قصیدہ کا مطلع ہے

کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظارِ فصلِ گل ٭ ہے مہاراجہ کی محفل میں بہارِ فصل گل

مہاراجہ شیو دان سنگھ بہادر والیٔ الور کے مدحیہ قصیدے کا مطلع ہے،

جاؤں اب دشت سے وحشت میں پہاڑوں کو نکل
سر شوریدہ ہے مخصوص پئے تیغ جبل

عبدالرحمٰن خاں بہادر والیٔ جھجر کی مدح میں مطلع کہا ہے۔

ایسی ان روزوں میں ہے فیض ہوا کی تاثیر
کہ لگے کھلنے ہر ایک غنچۂ باغِ تصویر

اپنے بھتیجے ولیم کی ولادت پر ایک قصیدہ کہا ہے، مطلع ہے،

ہزار شکر بدرگاہ ایزد متعال ٭ کہ گنج خانۂ دل ہے خوشی سے مالامال

ایک دوست منّالال کی مدح بھی کہی ہے جس کا مطلع ہے۔

آسمانِ جہانِ فضل و کمال ٭ صاحبِ ہوش و رائے منّالال

قصاید میں کوئی خاص بات نہیں معمولی ہیں البتہ بعض قصاید طویل اور پچاس پچاس شعر کے بھی ہیں۔ صفحہ ۴۶ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں جو ۱۵۷ تک ہیں۔
غالب، مومن، وغیرہ اساتذہ کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں بعض ان پامال ردیفوں میں بھی غزلیں موجود ہیں جو دلی اور لکھنو کے اساتذہ کی روندی ہوئی ہیں، چونکہ طبیعت اچھی پائی تھی اس لئے بعض ناصاف اور

ادق زمینوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں، نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں،

کچھ سمجھ کر دل میں اپنے پھر گیا شاید رقیب ۔۔۔ شب جو دروازہ ترا کھڑ کا کھڑک کر رہ گیا

صبح تک سب جاگتے رہتے ہیں سو سکتا ہے کون ۔۔۔ نالۂ پرشور سے ہے میرے گھر میں رت جگا

آسماں کشتیٔ طوفاں زدہ ہو جائے اگر ۔۔۔ چشمۂ دیدۂ تر جائے اُبل تھوڑا سا

غمزہ و ناز و ادا کی وہی صورت تاکے ۔۔۔ اب تو جوبن بھی گیا آپ کا ڈھل تھوڑا سا

تو جانے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے ان کا حجاب آدھا ۔۔۔ ہزار مشکل سے بارے اُنہوں نے رخ سے نقاب آدھا

شراب ہو کے جو تند ساقی تو بسے شرہ کر ملا کے پانی ۔۔۔ پلا وہ ساغر کہ جس میں ہو کے شراب آدھی گلاب آدھا

گرمیٔ رفتار سے وحشت میں جوں فانوس شمع ۔۔۔ آبلوں میں خار ہیں آندورشن زیر پا

کس کا گرم جستجو ہے مجھ کو کیا کیا وہم ہیں ۔۔۔ کچھ تو ہے جو یوں ہمیشہ ہے سفر میں آفتاب

چھوڑے وہ خورشید طلعت کیونکہ ہر جائی پنا ۔۔۔ کب شرف پاتا ہے آزاد اپنے گھر میں آفتاب

میری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کی پھنستا ۔۔۔ آ پڑی ہیں یہ بلائیں میرے سر آپ سے آپ

یہ بزم بزم مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ ۔۔۔ جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ

رخنہ پردازیٔ اغیار کو پوچھو ہم سے ۔۔۔ سینکڑوں دل میں ہزاروں ہیں جگر میں سوراخ

جبینِ یار پہ قشقے کو دیکھ اے آزاد ۔۔۔ نہ دیکھا ہو جو کبھی تو نے آفتاب میں چاند

پیکان کوئی ٹوٹ کے رہ جائے نہ دل میں ۔۔۔ سینے سے نکالو نہ مرے تیر ہلا کر

کون اس کے مقابل ہو یہ ہے کس کی قدرت ۔۔۔ خم ٹھوکے ہے مگدر بت بے پیر ہلا کر

یہ درد لا دوا ہے نہ مجھ کو دوا پہ چھوڑ ۔۔۔ ہمدم مریض عشق ہوں مجھ کو خدا پہ چھوڑ

لکھوں جو احوالِ سوزِ دل کا تو خط وہ بھیجوں تو کیونکر بھیجوں

کہ جل کے کاغذ عجب نہیں ہے لگے کبوتر کے پر میں آتش

جان دوں تجھ پہ یہی ہے مرا ارمان فقط ۔۔۔ میں اسی موت پہ مرتا ہوں مری جان فقط

وہ ہے واقع میں اڑی تک گرے ہیں پیچ و خم اتنے ۔۔۔ کہ رہتی ہے سمٹ کر گیسوئے خمدار گردن تک

بتاؤں تم کو کیا اس گھر میں جس گھر کا یہ عالم ہو ۔۔۔ کہ جو اونچی سے اونچی ہے وہ ہے دیوار گردن تک

اس لاغری پہ لاکھ کرے بل نکل گئے ۔۔۔ تنکے کی طرح عاشقِ خستہ جگر کے بل

یہاں ملے عرقِ رخ تو گلاب کے مول ۔۔۔ شمیم زلف نہ ہاتھ آئے مشک ناب کے مول

چشمِ جاناں کے تصور میں جو رو دیا تو مجھے ۔۔۔ تیرتی پھرتی نظر آئی ہرن دریا میں

ہو دیں گے ہم ممنون سی کے برق پہ کچھ توقف نہیں ۔۔۔ آگ ہمارے دل میں لگا دے شمع و شرر ہو کوئی ہو

اس پہ خفا ہو آپ کہ خوش ہوں بندہ تو ہے اس پہ فدا ۔۔۔ ایسی بھبھن ہو ایسا دہن ہو ایسی کمر ہو کوئی ہو

دیکھ کر تجھ کو یہ شادی سے بڑھے نخلِ چمن ۔۔۔ پتلی پتلی تھیں جو شاخیں وہ بھی ڈالے بن گئے

ان مشکل زمینوں میں اپنے شعر تر نکالنا ایک منجھی ہوئی طبیعت اور مشق والے ہی کا کام ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد خاصے مشاق اور حاضر طبیعت والے شاعر تھے۔

یوں تو آزاد نے مومن، غالب، ذوق، سبھی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں مگر غالب کو انہوں نے زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے، چند ایسی غزلوں کے شعر بھی نقل کئے جاتے ہیں،

جس قدر روتے گئے دونا ہوا سوزِ جگر ۔۔۔ آبِ اشکِ چشمِ گریاں اس پہ روغن ہو گیا

ذوقِ پامالی سے گھر ہے لامکاں اپنا ۔۔۔ مثلِ نقشِ پا یعنی مٹ گیا نشاں اپنا

تو نے کب نمک چھڑکا زخمِ دل پہ اے ہمدم ۔۔۔ تجھ سے تو سوا دشمن ہے مزاج داں اپنا

دل کے خون ہونے کی اور کیا علامت ہے ۔۔۔ چشمِ خوں فشاں اپنی نالہ خوں چکاں اپنا

تیغ ہوں معرکہ آرائیٔ وحشت کے لئے ۔۔۔ ہوتے جوہر مرے ظاہر جو میں عریاں ہوتا

ہے جو ہم رنگ مئے تو بن تیرے ۔۔۔ خون دل بھی پیا نہیں جاتا

مومن کی غزل پر مومن ہی کے رنگ میں ایک غزل کہی ہے۔

محفل سے تری اٹھائیں گے ہم   یوں غیر کا دل بٹھائیں گے ہم
جنگل میں رلا نہ جوشِ وحشت   پھر خاک کہاں اڑائیں گے ہم
کھانے کی قسم تو کیونکر کھاویں   کیا غم بھی نہ تیرا کھائیں گے ہم
کوچے سے تمہارے لیں گے رستہ   جب راہ نہ کوئی پائیں گے ہم
ہے اس کو اگر یہی تماشا   گھر اپنا بھی لٹائیں گے ہم
گر اس کے بچے تو پھر کسی سے   زنہار نہ دل لگائیں گے ہم
ہیں دردِ طلب تو زخمِ دل پر   مرہم نہ کبھی لگائیں گے ہم
سامان ہوا ہے کچھ اکٹھا   اب گھر تجھے پھر بلائیں گے ہم
پابندِ غمِ بتاں ہیں آزاد   کیا قید سے جی چرائیں گے ہم

اب ذرا غالب کے رنگ میں آزاد کو دیکھئے۔

فتنہ اٹھے ہے کس نمط اللہ کے ذرا دکھا کہ یوں   حشر بپا ہو کس طرح چل کے ذرا بتا کہ یوں
میں نے کہا کہ عشق میں جلئے تو جلئے کس طرح   خس کو اٹھا کے اس نے جھٹ آگ پہ رکھ دیا کہ یوں

یوسف کا منہ نہ دیکھے زلیخا تمام عمر   دیکھے جو ایک بار مرے سیم تن کے پاؤں
عارض کو اس کے گل کہیں پھر کیا سمجھ کے ہم   بہتر ہوں گل سے جب بتِ گل پیرہن کے پاؤں
اس بت کی راہ میں جو مجھے ساتھ لے چلے   دھو دھو کے بار بار پیوں برہمن کے پاؤں
رنگِ حنا کے بوجھ سے اٹھنا محال ہے   نازک ہیں کس قدر مرے نازک بدن کے پاؤں
اے غیرتِ بہار ترے انتظار میں   سن ہو گئے کھڑے کھڑے سروِ چمن کے پاؤں
آزاد وقتِ رقص پڑے شب کو بزم میں   کس کس ادا سے اس بتِ ناہید فن کے پاؤں

عشق میں ترے مرنا عمرِ جاودانی ہے   یہ جو زندگانی ہے خاک زندگانی ہے
ان کے سننے کے قابل کب مری کہانی ہے   وہ کبھی جو سنتے ہیں اپنی خوش بیانی ہے
آہ کی شرر ریزی آج آزمانی ہے   آگ گھر میں دشمن کے شب مجھے لگانی ہے
جو کریں وہ بدوضعی ان کی وضعداری ہے   گر کریں وہ بے مہری عین مہربانی ہے
مجھ پہ گو مصیبت ہے یاد تو ہوں میں ان کو   وہ ستم جو کرتے ہیں ان کی مہربانی ہے
اک امید رہتی ہے ہم کو ناامیدی میں   موت کی توقع پر اپنی زندگانی ہے

نہ دے جو بوسہ ابرو نہ دے جواب تو دے   بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے

افسوس خاک تک نہ ہمیں بہرِ سر ملے   وہ بھی ہیں لوگ جن کے اڑانے کو زر ملے

آزاد اپنے شیوۂ تسلیم کی قسم   کہتا ہوں صاف زور کی عادت نہیں مجھے

ہم نے جس راہ میں دیکھا اسے دیکھا آزاد   اور کیا راہ بتا دیں گے طریقت والے

طبیعت کا چہچلا اور چلبلا پن ہر ایک شعر سے ظاہر ہے ایک غزل سنئے۔

بارِ تن سر ہے اسے جلد اڑا چک قاتل   میری گردن کی قسم خنجرِ براں کی قسم
اور بھی عقدے مرے رشتۂ مقصد میں نہ ڈال   بات الجھا نہ تجھے کاکلِ پیچاں کی قسم
غم میں جمعیتِ خاطر کسے ہوتی ہے نصیب   ہوں پریشاں تری زلفِ پریشاں کی قسم
دل سے کھٹکا ترے غم کا نہیں جاتا ہمدم   نشترِ غم کی قسم ناوکِ مژگاں کی قسم
تار رکھیں گے نہ اک ضد سے تری اے ناصح   دشتِ وحشت کی قسم چاکِ گریباں کی قسم
سر سے پا تک شبِ ہجراں میں جلا کرتا ہوں   آہِ سوزاں کی قسم شمعِ فروزاں کی قسم

مشہور ہو سرِ حلقۂ اربابِ جفا تم   معروف ہیں من جملۂ اربابِ وفا ہم
از بسکہ صداقت منشی پیشہ ہے اپنا   بے جا بھی جو کچھ کہئے تو کہتے ہیں بجا ہم
ہنگامِ سحر بادہ گساری کا مزہ ہے   اوقات کریں اپنی تلف بہرِ دعا ہم

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں   کیوں آپ سے آؤں مجھے لے جاؤ تو آؤں
تم دل کو بٹھاتے ہو مرے مجھ کو بلا کر   دل کو نہ بٹھاؤ مجھے بٹھلاؤ تو آؤں
کیا گھر میں تمہارے در و دیوار کو دیکھوں   تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں
غیرت کو رکھا طاق میں جب کی ہے محبت   دشمن کے بھی گھر میں مجھے بلواؤ تو آؤں
گر کوئی بلاتا ہے تو کہتے ہیں یہ ضد سے   آزاد کو محفل میں نہ بلواؤ تو آؤں

چلبلے پن اور چونچلے کے علاوہ طبیعت میں سنجیدگی، اور خیالات میں بلندی بھی تھی بعض دفعہ بڑی دور کی سوجھتے تھے،

آپ اپنے راز کو لاکھ چھپاتے ہیں مگر محبوب آپ کی صورت دیکھتے ہی سب کچھ بھانپ لیتا اور بدظن ہو جاتا ہے

میری صورت سب کہے دیتی ہے مرا حالِ دل   میرے تیور دیکھ کر وہ مجھ سے بدظن ہو گیا

لوگ آتشِ ہجر میں جل کر سیاہ ہو جاتے ہیں مگر آزاد تپ کر سونے کی طرح دمکنے لگتے ہیں۔

ان شعلہ رخوں نے مجھے از بسکہ تپایا   تو رنگ مرا مثلِ طلا اور بھی چمکا

یہ غلط فہمی بھی کیسی مزیدار ہے کہ

وہاں وہ آہ سے میری سدا خطر میں رہا   یہاں میں خفتِ معدومیِ اثر میں رہا

غالب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ان کا مطلوب عشق و ہوس میں تمیز نہیں کرتا، آزاد کو بھی یہی گلہ ہے

ہوس و عشق میں شاید نہیں کچھ ان کو تمیز — مجھ سے وہ باندھتے ہیں عہدِ وفا کیا باعث

جنت جیسی مقدس اور پاک جگہ شراب کی نہر، کتنی بے جوڑ بات ہے آزاد اسے باور نہیں کرتے

خاک سچ کہتا ہے تو خلد میں اور جوئے شراب — آگ پھلنکے نہ جلے تیری زباں اے واعظ

جنت جیسے مقدس مقام پر حورانِ بہشت بھی ویسی ہی عارفہ اور کاملہ قسم کی تہجد گزار ہوں گی۔ بھلا اُن مریم صفت حوروں میں راز و انداز کہاں وہ تو بس رات دن تسبیح پڑھا کرتی ہوں گی۔

خیر صورت میں تو خاصی ہیں مگر حوروں میں — شر کہاں؟ غمزہ کہاں؟ ناز کہاں؟ اے واعظ

معشوق جب آنے لگتا ہے تو غالب کے گھر میں بوریا تک نہیں ہوتا مگر آزاد کے پاس سبھی کچھ رہتا ہے۔ صرف یہ خرابی ہوتی ہے کہ بنگلہ کے کمپونڈ کی دیوار بالکل اپ ٹو ڈیٹ ہوتی ہے یعنی فقط گردن تک اونچی! پس آنگن میں بیٹھ کر نہ تو جلسۂ منعقد کیا جا سکتا ہے اور نہ وصل،

بلاؤں تم کو کیا اس گھر میں جس گھر کا یہ عالم ہو — کہ جو اونچی سے اونچی ہے وہ ہی دیوار گردن تک

یہ بنگلہ بھی جس کی دیواریں تا گلو تھیں کرایہ ہی کا تھا آزاد نے محض اس خوف سے کہ کہیں خراب نہ ہو مکان ہی نہیں خریدا۔

خراب ہووے گا آخر جو مرا گھر ہوگا — مکاں لیا نہ کوئی مارے اس عذاب کے مول

شاید اکبر الہ آبادی نے کہا ہے۔

پہلے تو رہنِ مے ہوا پتلون رند کا — اب کوٹ بھی غریب کا نیلام ہو گیا

اس حالت میں کوٹ پتلون سے "سبک جسم" ہو کر آزاد نکلتے ہیں تو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے،

ننگا ہوں میکشی کی بدولت جنوں نہیں — کپڑے سلگ کے بک گئے فصلِ بہار میں

شبِ فرقت یوں تو گزر جاتی ہے مگر جب صبح کو یار کے گھر جانے کا خیال آتا ہے تو ایک دم یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کیا منہ لے کے جائیں۔ ایک رات یار سے الگ رہ کر زندہ رہنا کونسی عاشقی ہے۔

دکھاؤں صبحِ شبِ ہجر کیا انہیں صورت — کہ ان بغیر با زندہ شرمسار ہوں میں

دیکھیے کتنی اچھوتی تشبیہ ہے۔

کس صف کے میں اور خطوطِ شعاعِ مہر — موزوں ہیں ڈوریاں تری چلمن کے واسطے

اس خیال کی نزاکت کو بھی دیکھئے،

ہو گیا میرا قدِ خم گشتہ چوڑی کی مثال — ہاتھ کنگن کو نہیں درکار ہرگز آرسی

بھیجنے کو تو نامہ بھیج دیا مگر اب پریشان ہیں کہ کہیں قاصد ہی سے اس کی آنکھ نہ لڑ جائے،

اب کیا علاج نامہ پشیماں ہوں بھیج کر — وہ شوخ رخنہ دریں ہے، قاصد جوان ہے

مذکورہ بالا شعر میں خاصا ابتذال پیدا ہو گیا ہے مگر ایک اور شعر سنئے جس میں اپنے رشک کو نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔

وہ رشک کا عالم ہے کہ غیروں کا تو کیا ذکر، ہم وصل کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

دیکھئے کتنا اچھوتا خیال ہے،

بارے خدا کے ہاں بھی تکلف قبول ہے — پیرِ فلک پہ ڈالی ستاروں کی جھول ہے

غالب محض اس وجہ سے جنت کو ناپسند کرتے ہیں کہ اس میں لاکھوں برس کی حوریں ہیں مگر آزاد محض اس وجہ سے جنت کے بدلے دوزخ قبول کر لیتے ہیں کہ حوریں غیر جنس کی ہوں گی دوزخ میں اپنی ہم جنس مخلوق کے ساتھ رہنا ہی بہتر ہے۔

حورانِ غیر جنس کی صحبت سے فائدہ — دوزخ ہی ایسے خلد کے بدلے قبول ہے

آزاد چونکہ غالب کے سلسلہ سے تھے اس لئے امرد پرستی پسند فرماتے تھے کس اطمینان سے کہتے ہیں،

ہند میں کم ہیں عشوہ گر اطفال — رہیے آزاد چل کے کابل میں

آزاد کے تغزل کا نمونہ آپ نے دیکھا، افسوس ہے کہ غریب کو مہلت نہ ملی ورنہ آزاد اگر مشق سخن جاری رکھتے اور عمر وفا کرتی تو اساتذہ کی صف میں داخل ہو جاتے،

صفحہ ۱۵۶ پر غزلیات ختم ہوتی ہیں اور وہیں سے متفرقات شروع ہیں۔

متفرقات میں ایک دوبیتی ہے اور ایک (۳۰) شعر کا قطعہ "دررسیدن کلاہِ زریں" اور ایک تاریخ کسی کی تصویر کی ہے، جس کا تاریخی شعر ہے،

دور کر کر سر بد میں کو رقم کر آزاد — سالِ تاریخ کہ کیا ہوش ربا ہے تصویر

ایک اکتیس شعر کا قطعہ "دررسیدن انبہ" کہا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں،

انبہ جو مرحمت ہوئے مجھ کو — از رہِ لطف اے کرم گستر
مدت العمر ایسے انبہ کبھو — مجھے آئے نہیں جہاں میں نظر

ان کی تعریف کیجئے کیا کیا ۔۔۔ ن کو کس کا بتاسئے ہمسر
رشک ہے جانہیں حسینوں کو ۔۔۔ ان کے سیب ذقن سے ہیں خوشتر
پوست میرے خیال سے نازک ۔۔۔ مغز میرے سخن سے شیریں تر

ایک قطعہ تاریخ کتاب غیرت ارم کا بھی ہے۔ غیرت ارم میں د کا تدخلہ کرکے ۱۲۴۷ھ تاریخ نکالی ہے، اس کے علاوہ چند متفرق تاریخیں ہیں اور مبارک بادیں بھی جن میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۸۵۵ء میں مسٹر ویلن ایجنٹ کے ہاں اور ۱۸۵۶ء میں اپنے بھائی کے ہاں لڑکا ہوا ہے اور ان دونوں کی ولادت کی تاریخیں کہی ہیں،

ایک منظوم خط اپنے بھائی طامس بیدلی کے نام (۴۰ شعر) کا لکھا ہے جس میں اپنی فلاکت کا حال ظاہر کرکے امداد کی خواہش کی ہے۔

احمد خاں نامی کسی صاحب کے غسل صحت پر تاریخ کہی ہے جس سے ۱۸۱۷ء نکلتے ہیں، اس تاریخی قطعہ کے کہنے کے بعد طبیعت نے چند غزل کے شعر بھی موزوں کردئے ہیں جنہیں قطعہ کے بعد ہی لکھ دیا ہے۔

زندگی کیا خاک رہتی برقرار ۔۔۔ گر زمانے میں نہ ہوتا انقلاب
کل تو وہ آفت تھی اور آزاد آج ۔۔۔ یار ہے پہلو میں ساغر میں شراب
رکھ جہاں تک رکھ سکے ساقی کو پاس ۔۔۔ پی جہاں تک پی سکے صہبائے ناب

〰〰〰

عارف کی موت پر ایک قطعہ (۴۰ شعر) کا کہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عارف کی موت کا صدمہ آزاد کو بہت ہوا، زین العابدین خاں عارف، نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے نواب مرزا غلام حسین مسرور کے بیٹے اور غالب کی بیوی کے بھانجے تھے، غالب عارف کو بہت چاہتے تھے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ

غدر سے چند سال پہلے جبکہ ان کی (یعنی غالب کی) بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوگیا اور ان کے دونوں بچے ایک باقر علی خاں اور دوسرے حسین علی خاں صغیر سن رہ گئے تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم سن تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

(یادگار غالب صفحہ ۳۹)

افسوس ہے کہ عارف نے شاعر کی حیثیت سے کچھ بھی شہرت حاصل نہیں کی حالانکہ اچھے شاعر تھے صرف غالب کے اس نوحہ نے ہے ہے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ۔۔۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کا نام بھی زبانِ زدِ عام غالب کر دیا، آزاد نے بھی بڑے خلوص سے عارف کا ماتم کیا ہے کہتے ہیں۔

اے اہل دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج
یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار ۔۔۔ لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
مردے عجب ہے گر نہ اٹھیں اب جی کے قبر سے ۔۔۔ ہم بانگ صور نالۂ اہل عزا ہے آج
ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ ۔۔۔ تشہیر بے ثباتی ارض و سما ہے آج
اے بے کسی کٹے گی میری عمر کس طرح ۔۔۔ جو میرا جاں نواز تھا سو مر گیا ہے آج
ہم جس کے پاس بیٹھ کے کرتے تھے غم غلط ۔۔۔ اس کا ہی یا نصیب جنازہ اٹھا ہے آج
جو عندلیب باغ سخن تھا سو ہم صفیر ۔۔۔ قسمت سے صید پنجۂ باز قضا ہے آج
جو شاعران ہند میں جادو مقال تھا ۔۔۔ وہ اژدہائے موت کا لقمہ بنا ہے آج
جس جسم پر کہ جامۂ گل دوز بار تھا ۔۔۔ وہ جسم کو ہ گرد کے نیچے چھپا ہے آج
بیکس ہوں کس سے اپنی حقیقت بیاں کروں ۔۔۔ جز رنج و یاس کون مرا آشنا ہے آج
اک لمحہ جس کے بے ملے آتا نہ تھا قرار ۔۔۔ اے روزگار حیف وہ مجھ سے جدا ہے آج
کل تک تو تیرا وصل میسر رہا دریغ ۔۔۔ عارف ترے فراق کا مجھ کو گلہ ہے آج
سال وفات لکھ یہ سر یاس دور کر ۔۔۔ عارف پسند رحمت حق ہو چکا ہے آج

دیوان میں مصرع تاریخ کے نیچے ۱۲۶۷ھ لکھا ہوا ہے مگر الفاظ جوڑنے سے ۱۲۷۷ھ ہوتے ہیں اس میں سے مصرع اولیٰ کے بموجب سر یاس یعنی ی کے دس عدد نکال دئے جائیں تو ۱۲۶۷ھ رہ جاتے ہیں مگر یہ دونوں بھی غلط ہیں مولانا حالی کا بیان ہے کہ غدر سے چند سال پہلے عارف نے انتقال کیا،

مسٹر اکرم نے غالب نامے میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں مومن اور ان کے بعد عارف نے انتقال کیا، ۱۸۵۲ء، ۱۸۶۸ھ اور ۱۲۶۹ھ کے مطابق ہوتا ہے اگر ۱۸۶۸ء بھی مان لیا جائے تو مادۂ تاریخ میں ایک عدد کی کمی رہ جاتی ہے، ہماری دانست میں آزاد نے صحیح تاریخ نکالی ہے عارف کا انتقال ۱۲۶۷ھ ہی میں ہوا ہوگا، مسٹر اکرم اور دوسروں کو غالب کا سنہ وفات غلط ملا ہے،

عارف کی تاریخ وفات کے بعد ایک مثنوی (۴۷ شعر کی) در بیان شکایت مخفی بطریق معما" کہی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں، ناسخ کی غزل پر مخمسہ بھی کہا ہے۔

اٹھا پھر ولولہ غم میں تنورِ دل سے طوفاں کا ۔۔۔ نظیر بحر قلزم ہے ہر آنسو چشم گریاں کا
قیامت ہوگیا آنا خیال روئے تاباں کا ۔۔۔ مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایک خمسہ غالب کی غزل پر بھی ہے۔

بلا سے میں نہ ہی خاک بھی عدو کیا ہے تمہیں اسی کی قسم اس کی آبرو کیا ہے
زبانِ شوخ بیاں کا یہ حسن خو کیا ہے ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

آخر میں اپنے بھتیجے چارلس ہیڈرلی کی تاریخ وفات ۱۸۵۲ء نکالی ہے۔

آزاد کے قصاید، قطعات وغیرہ میں کوئی بات نہیں۔ تاریخ نکالنے میں بھی کچھ مہارت نہ تھی کوئی تاریخ اچھی نہیں نکالی ہے تقریباً سب میں تخرجہ او رتدخلہ ہے، خمسے بھی کچھ اچھے نہیں ہیں آزاد کا کارنامہ غزل اور صرف غزل ہے، واقعہ یہ ہے کہ بڑی اچھی غزل کہتا تھا

آزاد کی غزلیات ہر طرح اس قابل ہیں کہ انہیں دوبارہ شائع کیا جائے، پیشِ نظر دیوان نایاب ہے اور عام بھی نہ ہو سکا، بہت کم لوگ آزاد اور اس کے کلام سے واقف ہیں۔

برادرانِ دہلی ممکن ہے کہ آزاد کے قبول اسلام سے متعلق کچھ اور معلومات فراہم کرسکیں، مسٹر ظفر قریشی اور مسٹر شاہد احمد اس خصوص میں توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

تمکین کاظمی

رباعی

کس کس قدر ہیں مصورا
انوار سے کس شے پہ جبیں ہیں مصورا
کس جلوۂ پاک سے جبیں پہ طاری
معصور فلک سے جبر و ہیں معصور

اختر صہبائی

غزل

بیٹھا ہوں تشنگی کو چھپائے نگاہ میں
ساقی کے آستانہ عالم پناہ میں

پھر عرش و فرش میں ہے قیامت مچی ہوئی
پھر جنبشیں ہیں یار کی نیچی نگاہ میں

پروردگار میری "صبوحی" کو دیکھ کر
کیوں آگ لگ گئی ہے تیرے مہر و ماہ میں

ہر ذرے پر ہے میری جبیں اب جھکی ہوئی
دیکھا تھا نقشِ پائے صنم خاکِ راہ میں

یہ صاحبِ خلوص تو وہ بندۂ ہوا
یہ فرق ہے فقیر میں اور بادشاہ میں

خاکِ درِ حبیب پہ جب مجھ کو ناز ہے
پھر کیا دھرا ہے طرّۂ و تاج و کلاہ میں

اس ماہِ نیم ماہ کو دیکھا جو اے ندیم
تارے چمک اٹھے مری لوحِ سیاہ میں

احمد [illegible]

ماہی گیر کی بیوی

بیٹھی ہوں اکیلی کٹیا میں اور اُن کی یاد ستاتی ہے
مدہوش گھٹا کے پردے میں پنہاں ہیں ستاروں کی شمعیں
دل کانپ رہا ہے سُن سُن کر موّاج سمندر کی چیخیں
بے رحم اور بھیانک آندھی بھی رہ رہ کر شور مچاتی ہے

پانی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے کمزور سی کشتی شوہر کی!
ایسا نہ کہیں ہو، طوفانی گرداب میں گُم ہو جائیں وہ!
ایسا نہ کہیں ہو، لہروں کی آغوش ہی میں سو جائیں وہ!
ڈر ہے نہ ڈبو دیں اُن کو کہیں امواجِ مہیب سمندر کی!

ظلمت کی خلیجِ بے پایاں طوفانِ بلا ہے سرتاسر
ممکن ہے بھنور کے چکّر میں بھولے سے پیر پھسل جائے!
ممکن ہے کوئی گھڑیال انہیں سرعت کے ساتھ نگل جائے!
ممکن ہے گرا بیٹھیں چپّو ہاتھوں سے اپنے گھبرا کر

میں قید ہوں غم کے زنداں میں کر لطف و کرم مجھ پر یا رب
محفوظ و سلامت لوٹ آئیں اس رات وہ اپنے گھر یا رب

تخت سنگھ

کوکنار کی جنم بھُوم

اور سورج سے چمکتے ہوئے گرم بادلوں کو لئے ہوئے، آسمان فضا پر دامن پھیلائے کھڑا تھا اور نیچے دھرتی پر ایک کھیت لیٹا ہوا تھا۔۔۔۔ یوں ۔۔۔۔ جیسے کسی سندری کی پیلی اوڑھنی ہو، جس پر لال لال دھبے نظروں کو اپنی جانب کھینچتے ہوں۔ ۔۔۔۔ یہ پیلی اوڑھنی، کھیت تھا، کوکناروں کا!! اور یہ لال لال دھبے خود کوکناریں تھیں۔

بات تو سنو۔ ۔۔۔۔ کھیت میں صرف کوکناریں ہی نہ تھیں۔ کچھ اور بھی تھا ۔۔۔۔ ایک تو تھی سندری ۔۔۔۔ پیلی اوڑھنی، لال کرتی، اور ہرا پاجامہ پہنے ہوئے اور اس کے ساتھ ایک بانکا جوان تھا، ۔۔۔۔ ایسا سنگار کئے ہوئے، کہ اگر اُسے کوئی پری دیکھ لیتی، تو اندر نگر کو چھوڑ آتی ۔۔۔۔

. دونوں ۔۔۔۔ یہ دونوں مست، متوالے، اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے، ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے، ۔۔۔۔ پریم کی باتیں۔ ۔۔۔۔ انہیں اپنی باتوں کے سوا کسی بات کا دھیان ہی نہ تھا اور اس لئے ۔۔۔۔ . . . کوکناریں انہیں دیکھ دیکھ کر، آپس میں اشارے کر رہی تھیں۔ کوکناریں گیانی تھیں نہ؟! آپس میں اشارے کر رہی تھیں، انہیں دیکھ دیکھ کر۔

ایک کہہ رہی تھی "اری! کیا تو یہ جانتی ہے! ۔۔۔۔

کہ اس چھیلے کو اس سندری سے پریم ہے!؟"

اور دوسری بول رہی تھی: "یہ چھیلا؟! ۔۔۔۔ نہیں نہیں! مردوں کو بھی کبھی کسی سے پریم ہوا ہے؟! بات تو یوں ہے کہ اس سندری کو پریم ہے، اس بانکے جوان سے!"

اس پر ایک تیسری، جو اونگھ رہی تھی، ذرا ہوش میں آئی۔ بولی: "تو ہوا کیا! بات تو ایک ہی ہے!"

ایک مدھ مکھی، پھولوں کا رس لئے پاس سے جا رہی تھی، اس کے پروں سے جو آواز نکلی، ایسا معلوم ہوا، کہ کہتی ہے: "ہاں، بات تو ایک ہی ہے، ۔۔۔۔ پر تھوڑا سا فرق ہے"!! اور ہوا، جو اِدھر اُدھر پھر رہی تھی پریوں کے کپڑوں سے چھو کر، اپنی بولی میں، یوں بولی: "شش ۔۔۔۔ شش!"

. . . .

وہ دونوں یوں ہی پھرتے رہے۔

جب دھوپ ذرا تیز ہوگئی تو کھیت کے کنارے پیڑوں کے سائے میں جا بیٹھے۔ پھر دھیرے دھیرے شام آگئی اور کچھ دیر بعد آکاس کی دیوی نے اپنی جھولی میں سے مٹھی بھر تارے لئے، اور نیلے آسمان پہ بکھیر دیئے۔ کھیت پر، مدھم اندھیرا اور مدھم اجالا۔ یہ دونوں مل کر راج کرنے لگے اور کوکناروں کی نظروں سے سب کچھ چھپ جانے لگا۔ اُن کی نظر کمزور تھی شاید۔ ۔۔۔۔ پر

کھیت کے کنارے پیڑ کے نیچے۔ دو پریمی بیٹھے تھے۔ پہلو بہ پہلو اور ۔۔۔۔ آنکھوں آنکھوں میں سوال کر رہے تھے اور جواب دے رہے تھے۔ ہاں ۔۔۔۔ یہی وقت ہوتا ہے، پریم کا۔ اسی وقت چاہ بڑھا کرتی ہے۔ اسی وقت چاہ بڑھانی چاہیئے۔ وقت جو چاہ کا یہی ہوا۔ ۔۔۔۔ ہاں ہاں، ۔۔۔۔ . . .

. . . . . .

اور جیسے، ہر کھیت، جب گرمیوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے تو کاٹ کر برباد کر دیا جاتا ہے۔ ویسے ہی، جب پریم کے شروع شروع کے جوش کی گرمی، اپنی عمر تمام کر لیتی ہے تو پیار ختم ہو جاتا ہے اور من کی بستی اجڑ جاتی ہے۔

. . . .

سنہرے مہینے گرمیوں کے، چلے گئے۔ بھورے مہینے خزاں کے گزر گئے اور سفید مہینے سردی کے ختم ہو گئے اور پھر اس کے بعد اپنی بہار کے گلابی مہینوں اور گرمی کے سنہری مہینوں کی باری آگئی تب . . .

. . . .

ایک دن، جب دن ڈھل چکا تھا۔ پر سورج، ابھی پورا پورا چمک رہا تھا۔ اُسی بیتے سمے کی طرح ایک کھیت، دھوپ میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ کوکناروں کا کھیت اور کوکناریں خود بات چیت کر رہی تھیں، آپس میں۔

مگر وہ ایکا ایکی چپ کیوں ہو گئیں! ـــــ ہاں، ـــــ ایک سایہ سا آیا تھا کھیت میں۔ کھیت کی زمین پر جہاں کہ کوکناروں کے گرے ہوئے لال لال پتوں نے ایک غالیچہ سا بنا رکھا تھا مگر ـــــ . . . ٹھہرو تو سہی! ـــــ سنو۔ کوکناروں نے کیا سنا؟! اس سائے کو، اس عورت کو کیا کہتے سنا۔ ـــــ انہوں نے سنا ـــــ

آہ! ـــــ یہی جگہ تھی، جہاں میرے من کے کھیت میں، پہلی بار، پریم کا بیج بویا گیا تھا! اور اب اُس بیج کے پھل ـــــ اسی دھرتی کو میں نے تجھے سونپ جاتی ہوں ـــــ!!" اور یہ کہہ کر اُس نے، کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دھرتی پر رکھ دی۔ اور ـــــ چپ چاپ، ایک سائے کی طرح جدھر سے آئی تھی اُدھر واپس چلی گئی۔

اور سنو! ـــــ کوکناریں، پھر کچھ کہنے لگیں۔

ایک بولی: ـــــ

"پر وہ اکیلی کیوں تھی؟" ـــــ

دوسری نے پوچھا: ـ "ہاں ہاں" وہ بانکا جوان ساتھ کیوں نہ تھا؟"

اور تیسری نے جو ذرا بوڑھی تھی، اُن دونوں کو جواب دیا: ـــــ

"سنو تو سہی"، اُس نے کہا: ـ "پریم کی بہار جو جاتی رہی!" ـــــ

ایک نے جو بچی سی تھی۔ نادانی سے پوچھا: ـ پریم کی بہار کس طرح جاتی ہے؟"

پر کوکناروں نے کچھ جواب نہ دیا وہ چپ ہی رہیں، ہاں پاس سے ہی، نجانے کیسے؟ دہی مدھ مکھی گزری اور ایسے معلوم ہوا، جیسے اس کے پروں سے آواز نکلی ہے۔ اسی طرح اسی طرح پریم کی بہار جاتی ہے۔ اسی طرح!!"

اور ہوا، جو اِدھر اُدھر بیکار پھر رہی تھی اپنی بولی میں بولی: ـــ "شش۔ شش!!"

اور ساتھ ہی نجانے کہاں سے، پانی کی دو چار بوندیں گریں، آنسو تو نہ تھے۔ خیر آنسو ہی سمجھو۔

اور ان کوکناروں نے آپس میں فیصلہ کر لیا "یہ ہماری چیز ہے"!

اور ایک نے دلیل بھی دے دی "وہ اسے ہمارے پاس ہی چھوڑ گئی ہے!!" اور اس طرح ایک روح، ایک ننھی جان جو کوکناروں کے پاس سے کچھ عرصے کے لئے چلی گئی تھی، انہیں کے پاس پھر واپس آ گئی۔ اپنی جنم بھوم میں مگر

. . . .

جب آدمیوں نے اُسے دیکھا۔ اس کپڑے میں لپٹی ہوئی چیز کو تو وہ اصل بات نہ جان سکے۔

ایک بولا: ـ "ارے! دیکھو!! ایک بچہ پڑا ہے!!!"

اور دوسرے نے اچھی طرح دیکھ کر کہا: ـ "ہاں اور مرا ہوا بچہ!!!"

ان دونوں کی نادانی پر اُن دونوں انجانوں کی باتوں پر کوکناروں کو ہنسی سی آ گئی پر وہ چپ رہیں۔

کوکناریں، گیانی تھیں نہ؟!!!

"میراجی"

رباعی

دل میں مرے درد کا سمندر بھر دے
مردہ جذبات پھر سے زندہ کر دے
اے فصلِ بہار! تیزی سے آ کر
دے میری اُمنگ کے قلب میں پھر نشتر دے

سعید احمد اعجاز

حُسنِ نظر

محبت میں تیری ہے جینا ہی پینا نہ کچھ فکرِ ساغر نہ کچھ ذکرِ مینا

خزاں ہو گئی ہے بہارِ تمنا عجب گُل کھلائے بہار آفرینا

نگاہیں زمانے کی اِس پر جمی ہیں کسے دیکھ بیٹھی میری چشمِ بینا

کسی سے ہیں وابستہ میری امیدیں یہی میرا مرنا یہی میرا جینا

نگاہِ کرم تو نے یہ بھی نہ چاہا غمِ جاودانِ محبت بھی چھینا

خدا سے کریں شکوہ ناخدا کیا غنیمت ہے یہ بھی کہ ڈوبا سفینہ

نظرؔ یوں بھی کرتا ہے کوئی محبت

نہ کوئی سلیقہ نہ کوئی قرینہ

قیوم نظرؔ

اکبر ایک منتظم کی حیثیت میں

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم الشان بادشاہوں میں ہے۔ فاتح، مدبر اور بانیٔ قوم کی حیثیت سے وہ مشاہیر عالم کی صف اولیں میں جگہ پانے کے قابل ہے اُسے تاریخ ہند میں بہت بڑا رتبہ حاصل ہے۔ وہ ایک روشن خیال اور عالی دماغ بادشاہ تھا جس نے اپنے زمانے میں تعصبات و توہمات کے بُت توڑنے کی جاں توڑ کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی رہا۔ وہ ایک قابل حکمران اور زبردست فاتح تھا۔ لڑائیوں میں اکبر کے اس قدر نیادہ کامیاب ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی طرز حکومت اچھی ہونے کی وجہ سے اس کی سلطنت میں بغاوتیں کم ہوتی تھیں۔ یہ اُن مسلم حکمرانوں میں سے تھا جنھوں نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان میں کوئی سلطنت ہندوؤں کی اعانت کے بغیر زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ وہ جب تک زندہ رہا۔ اس پر کاربند رہا اور جب تک اُس کے جانشینوں نے اس کے طریقے پر عمل کیا اُس وقت تک سلطنت عروج پر رہی۔

اکبر نے بڑے بڑے عہدوں پر لائق اور وفادار اشخاص مامور کئے جنھوں نے اُس کی سلطنت کو وسیع بنانے میں خوب جدوجہد کی۔ رعایا کو خوش حال بنانے کی غرض سے نظامِ حکومت میں مناسب تبدیلیاں کیں اور ایسے قوانین نافذ کئے جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ وہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرتا تھا۔

انہیں وجوہات سے آج تک ہر فرقہ اور طبقہ کے بے تعصب اور انصاف پسند آدمی اس کا نام عزت اور عقیدت سے لیتے ہیں۔ اس کے زمانے میں ہر شخص کو مذہبی آزادی تھی اور اکبر کے مذہبی طریقے نے ہندوؤں کو اس کا ہمدرد، جاں نثار اور حلقہ بگوش بنا دیا اور ہندوؤں نے سلطنت کی ترقی میں اپنی جان تک لڑا دی۔ جس وقت یورپ کے حکمران غیر مذہب والوں پر ظلم و تشدد کر رہے تھے اس وقت اکبر نے صلح و آشتی اور غیر مذاہب سے رواداری کی آواز بلند کی۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ کسی طرح مذہب کے تلخ مناقشات کو جن کی وجہ سے اس کی رعایا میں بڑے بڑے اختلاف تھے ختم کر دے اور سارے ملک میں صلح و آشتی کا ڈنکا بجا دے۔ کیا یہ اس کی غیر معمولی دانشمندی کا اور قابلیت کا کافی ثبوت نہیں ہے؟

اکبر کے طرز حکومت میں شیر شاہ کے دستور العمل کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ ایسے وقت میں تخت نشین ہوا جبکہ دہلی کی مرکزی حکومت بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی یہ چار اہم سوال اس کے درپیش تھے۔ پہلا امیروں اور سرداروں کی سرکوبی کرنا اور انہیں اپنے قبضے میں رکھنا۔ دوسرے ہاتھ سے نکلی ہوئی ریاستوں کو اپنے قبضے میں لانا۔ تیسرے مرکزی حکومت کو مستحکم بنانا اور سلطنت کا ایسا بندوبست کرنا جس سے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے۔ چوتھے سلطنت کی پائداری کے لئے ہندوؤں سے میل کرنا۔ ان مشکل عقدوں کو اکبر نے بڑی دانائی سے حل کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک چھوٹی سی ریاست کو نہایت وسیع اور عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا۔

سلطنت میں بیرم خاں سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ اس کو وکیل سلطنت کہتے تھے۔ اس کے ماتحت ایک دیوان ہوتا تھا جو صیغۂ مال کا ذمہ دار تھا۔ میر بخشی کے سپرد دو کام تھے پہلا دار الخلافہ کے سرکاری دفتروں کا انتظام کرنا اور تنخواہ بانٹنا۔ دوسرے فوجی عہدوں کا انتظام کرنا اور جنگ کرنا اور منصب داروں کی نگرانی اور لڑائیوں میں خود لڑنا خانِ سامان شاہی محل کے اخراجات اور انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ صدر الصدور ان جاگیروں کا انتظام کرتا تھا جو مذہب کے لئے وقف کی جاتی تھیں۔ شہروں میں قاضی مقدمے سنتے تھے مفتی اور میر عدل فیصلے سناتے تھے۔ قاضی القضاۃ تمام سلطنت کے محکمۂ عدالت کا سب سے بڑا افسر تھا شہروں

یں عدالتیں موجودہ زمانے کی سی نہ تھیں۔ ہندوؤں کی جائیداد یا وراثت وغیرہ کے معاملے پنچائت کے ذریعے طے ہوتے تھے مگر جب وہ سرکاری افسروں کے سامنے آتے تھے تو ہندو رسم و رواج کا خیال کیا جاتا تھا دیہات میں آپس کے جھگڑے پنچائت کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ قانون تعزیرات سخت تھا۔ مگر ہندو مسلمان سب کے لئے یکساں تھا۔ پھانسی کی سزا کم دی جاتی تھی۔ مقدموں کی اپیل کبھی کبھی بادشاہ بھی سنتا تھا۔ اور دربار عام میں ان کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ ایک داروغہ ڈاک چوکی کا ہوتا تھا جو محکمۂ ڈاک کا انتظام کرتا تھا۔ محتسب کا کام رعایا کے اخلاق پر نظر رکھنا تھا۔ داروغہ ٹکسال شاہی ٹکسال کا بندوبست کرتا تھا۔ علاوہ اس کے میر آتش کے سپرد توپ خانے تھے۔ ان افسروں کے علاوہ سلطنت میں تقریباً ایک درجن افسر اور تھے۔ ان میں سب سے بڑا داروغہ تھا جس کا کام شہر کی حفاظت کرنا اور عورتوں کو ستی ہونے سے روکنا تھا۔ خانساماں کو چھوڑ کر بقیہ آٹھ افسروں کے پاس جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ صوبوں سے ان کے صیغوں کی خبریں آتی رہتی تھیں اور وہ صوبوں کے افسروں کو حکم بھیجتے رہتے تھے۔

شیر شاہ کی طرح اکبر کی حکومت سیاسی کے دو خاص حصے تھے دارالسلطنت کا انتظام اور صوبوں کا انتظام۔ انتظام کی دیکھ بھال شہنشاہ خود کیا کرتا تھا۔ دارالخلافہ میں شہنشاہ کے نیچے وزیر اعظم تھا جو "وکیل سلطنت" کہلاتا تھا۔ اکبر نے شیر شاہ کی طرح تمام سلطنت کو مندرجہ ذیل پندرہ صوبوں میں منقسم کیا۔ آگرہ، احمد آباد، اجمیر، الہ آباد، بنگال، بہار، دہلی، کابل، لاہور، مالوہ، ملتان، اودھ، احمد نگر، برار اور خاندیش۔ ہر ایک صوبہ میں ایک صوبیدار یا سپہ سالار ہوتا تھا جو اکثر خودسرانہ حکومت کرتا تھا۔ سپہ سالار بادشاہ کا کوئی عزیز یا اعلیٰ رتبے کا امیر ہوتا تھا۔ دو تین سال کے بعد اس کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ ہر ایک صوبہ میں کئی سرکار اور ہر ایک سرکار میں کئی پرگنے ہوتے تھے۔ صوبیدار تمام محکموں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ اُس کو فوجی اور جنگی اختیارات بھی پورے طور پر حاصل تھے۔

صوبے کی گورنمنٹ میں صوبہ دار سب سے بڑا افسر تھا۔ اُس کے اختیارات بادشاہ کی طرح بہت وسیع تھے۔ صوبہ دار کو بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔ دارالسلطنت سے دور ہونے کی وجہ سے وہ فرض کی ادائیگی میں کافی سختی اور خود مختاری سے کام لیتا تھا اور اپنی مدد کے لئے جاسوسوں کا ایک گروہ رکھتا تھا فوجی اور عدالتی محکمے اُس کے سپرد تھے۔ لیکن وہ رعایا کے مذہبی معاملات میں کسی طرح دخل نہیں دے سکتا تھا اور نہ بغیر بادشاہ کی اجازت کے کسی کو موت کی سزا دے سکتا تھا۔ شہنشاہ کی طرح اس کے ماتحت بھی کئی افسر تھے۔ جن کو علیحدہ علیحدہ محکمے سپرد تھے۔ ان میں خاص دیوان تھا۔ صدر خود مختار ہوتا تھا۔ اور وہ مرکزی حکومت سے مقرر تھا۔ عامل ریونیو کلکٹر تھا۔ بتکچی موجودہ وقت کے تحصیلدار کے مانند تھا۔ فوجدار سرکار کا حاکم کہلاتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اس بات کی نگرانی کرے کہ بادشاہ کے قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے یا نہیں خزانچی روپیہ وصول کر کے دیوان صاحب کو بھیجتا تھا۔ پولیس کا انتظام اچھا تھا پولیس کا حاکم کوتوال کہلاتا تھا جو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرتا تھا۔ ملزموں کا چالان کرتا تھا اور چھوٹے چھوٹے جرائم کی سزا وہ خود دے سکتا تھا۔ بازار کی دیکھ بھال اور باٹوں کی جانچ پڑتال بھی پولیس کا فرض تھا۔ قانون گو، اور پٹواری، بتکچی کے ماتحت رہتے تھے۔ حکومت کی طرف سے واقعہ نویس بھی رہتے تھے جو ہر بات کی خبر بادشاہ کے گوش گزار کرتے تھے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ فوجی نظام میر بخشی کے سپرد تھا۔ اکبر کے عہد میں سنہ ۱۵۷۱ء میں منصب داری کا طریقہ شروع ہوا۔ اس کا منصب داری بندوبست یورپ کے جاگیرداری طریقے سے کہیں اچھا تھا۔ مثلاً منصب داروں کی طاقت کم تھی۔ اور بادشاہ کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ملک کا ہر عہدہ دار منصب دار بھی ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح فوجی محکمہ جداگانہ نہ تھا۔ حکومت کے بڑے بڑے افسر چاہے وہ کسی منصب پر کیوں نہ مامور ہوں۔ وقت ضرورت پر فوجی کام بھی انجام دیتے تھے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو شخص جتنے کا منصب دار ہو اتنے ہی سوار رکھے۔ بادشاہ جس کو چاہتا تھا منصب دیتا تھا اور جس کو چاہتا تھا معزول کر دیتا تھا۔ منصب داروں کا تبادلہ بھی عمل میں آتا تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ مقررہ تعداد سے کم ہی سوار نوکر رکھتے تھے۔ سب سے بڑا منصب دس ہزار کا تھا جو بعد میں بارہ ہزار کا ہو گیا۔ سات ہزار سے اوپر کے منصب صرف شاہی خاندان کے افراد کو یا بڑے بڑے امراء کو ملتے تھے۔ مثلاً مان سنگھ، ٹوڈرمل کو بہت سے منصب دار دارالسلطنت میں حاضر رہتے تھے اور اکثر صوبجات میں بھی رہتے تھے۔ فوج چار حصوں میں منقسم تھی (۱) سوار (۲) پیادہ (۳) توپ خانہ اور (۴) ہاتھی۔ سواروں میں سب سے بڑی تعداد منصب داروں اور ان کے ماتحتوں کی تھی۔ سواروں کی دو قسمیں تھیں۔ داخلی اور احدی۔ داخلی سے مراد ان سواروں سے ہے جنہیں حکومت اپنی طرف سے بھرتی کر کے منصب داروں کے پاس بھیج دیا کرتی تھی۔ احدی خاص منصب داری سوار ہوتے تھے جن کو چالیس

روپیہ سے لے کر ۱۰۰۰ روپیہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ فوج میں ہر مذہب کے لوگ تھے۔ فوج میں ہندو بھی۔ دربان، شمشیر باز، کہار، پہلوان اور خدمت گار ہوتے تھے۔ ہاتھیوں کے جھنڈ کو حلقہ کہتے تھے۔ سوار فوج کا اہم ترین حصہ تھے۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بادشاہ کی توپ خانہ پر خاص توجہ تھی اور اس کا افسر داروغہ توپ خانہ تھا۔ اکبر کی فوج کی تعداد صحیح طور پر نہیں بتائی جا سکتی۔ کیونکہ مورخین کے درمیان اس بات پر اختلاف ہے۔

اکبر کا مال گزاری انتظام قابل تعریف تھا۔ علاء الدین خلجی اور شیر شاہ سوری نے بھی کئی ضروری اصلاحیں کی تھیں۔ لیکن اکبر کا انتظام ان دونوں سے بہتر تھا۔ خواجہ عبدالمجید خاں مالگذاری کا سب سے بڑا دیوان تھا۔ اس کے بعد مظفر تربتی ہوا۔ ٹوڈرمل نے جو شیر شاہ کا وزیر رہ چکا تھا۔ دہ سالہ بندوبست کی بنیاد ڈالی۔ یہ بندوبست ۱۵۸۲ء میں شروع ہوا۔ جبکہ ٹوڈرمل دیوان اشرف بنایا گیا۔ پھر ٹوڈرمل نے دس سال کی وصولیابی کا اوسط لے کر ہر حیثیت کی اراضی کے ٹکڑے کئے۔ ہر جنس کی ایک شرح معین تھی جس میں کبھی کمی و بیشی نہ ہوتی تھی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مختلف جنسوں کے لئے الگ الگ... شرحیں مقرر تھیں جو گھٹ بڑھ نہ سکتی تھیں۔ اس کے لئے زمین کے چار حصے کئے گئے تھے۔ پولاج، پردتی، چاچر اور بنجر۔ بنجر وہ اراضی تھی جس میں کبھی کاشت نہ ہوتی تھی اور یوں ہی بیکار پڑی رہتی تھی۔ چاچر میں تین یا چار سال تک کاشت نہ ہوتی تھی۔ پردتی جو کبھی سال بھر کے لئے کاشت نہ ہوتی تھی۔ تخم ریزی کے بعد اس بات کی جانچ کر لی جاتی تھی کہ کس زمین میں کون سی فصل بوئی گئی ہے۔ اس کے حساب سے اس اراضی پر لگان کی تشخیص ہوتی تھی۔ جب کوئی نئی یا بنجر زمین بوئی جاتی تو اس پر لگان کم لیا جاتا تھا۔

اکبر کے عہد میں مالگذاری کا بندوبست تین حصوں میں منقسم تھا۔ (۱) ضبطی (۲) غلہ بخش (۳) نسق۔ محکمۂ مالگذاری میں دیوان سب سے بڑا افسر تھا۔ عامل ریونیو کلکٹر تھا۔ اس کا تقرر مرکزی حکومت سے ہوتا تھا۔ بدتچی، توپدار، پٹواری، قانون گو اور مقدم اس کے ماتحت افسر تھے۔ مقدم سب سے چھوٹا افسر تھا۔ اس کے علاوہ اکیس اور افسر تھے جن کا بیان بخوف طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔ پیداوار کا ایک تہائی حصہ بطور لگان لیا جاتا تھا۔ لگان دو قسطوں میں لیا جاتا تھا۔ کاشتکاروں کو نقد یا جنس دو میں سے کوئی بھی ایک چیز دینے کا اختیار رہتا۔ حاکم اور ملازمان سرکار رشوت نہیں لیتے تھے لگان وصول کرنے کا کام مقدموں کے سپرد تھا اور انہیں مقرر تنخواہ دی جاتی تھی۔ کسانوں کو لگان کی رسید ملتی تھی۔ حساب سب فارسی میں رکھا جاتا تھا۔ اس لئے ہندو اقوام اس زبان کو حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ قحط کے زمانے میں بادشاہ تقاوی دیتا تھا۔ تمام سلطنت ۱۸۲ پرگنوں میں منقسم تھی۔ ہر ایک کی مال گذاری ایک کروڑ تھی۔ پرگنہ کا افسر کروڑی کہلاتا تھا۔ ٹوڈرمل کا انتظام سلطنت رعایا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔

المختصر اکبر ایک قابل اور کامیاب منتظم تھا جیسا کہ اس کی حکمت عملی اور اصلاحات سے ظاہر ہے۔ اس کی سیاسی، معاشرتی، فوجی اور مالگذاری اصلاحات نے ہندو اور مسلمانوں میں ملک کی محبت کا جذبہ ابھار دیا۔ اس کی پالیسی نہایت دوراندیشانہ تھی۔ اسی لئے مغلیہ سلطنت ایک عرصہ تک قائم رہی لیکن جوں ہی اس کی پالیسی اور نظام کو چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت سے مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے اور ۱۷۰۷ء کے بعد اس کا شیرازہ بکھر گیا۔

بیجناتھ تواری

صلائے عشق

تُو نسیمِ صبح کی چال میں تُو جمالِ سرو و سمن میں آ
مرے غمکدے میں آ کبھی تُو بہار بن کے چمن میں آ

میری صبح رنج نصیب ہے مری شام شامِ غریب ہے
مرے روزگارِ سیاہ میں کبھی رنگِ صبحِ وطن میں آ

مرا مقتضائے وفا ہے تُو مرا مدعائے وفا ہے تُو
مرے لطف سے تجھے ضد سہی کبھی شکلِ دردِ محن میں آ

کبھی نور بن کے نظر میں بس کبھی نطق ہو کے زباں میں آ
کبھی جان بن کے نفس میں بس کبھی روح بن کے بدن میں آ

یہ سکون و ہوش کی زندگی مرے ذوقِ عشق پہ بار ہے
کبھی قید و بند کا خوف بن کبھی بیمِ دار و رسن میں آ

غم و سوز بن تب و تاب بن تُو نشاطِ حسن و شباب بن
تُو مری وفائے خراب بن تُو عدو کے حیلہ و فن میں آ

تُو خرابِ جامِ غنا نہ بن تُو غریقِ بحرِ خودی نہ ہو
من و تو کی راہ پہ مت نکل مری بےخودی کے چلن میں آ

تو جمالِ روئے مذاق ہے تو حدیثِ حسنِ قبول ہے
تُو زبانِ تائبِ خوش نوا پہ لباسِ شعر و سخن میں آ

(ملک، مراتب علی خاں تائب)

مزدور کا انجام

شام کا دھندلکا ہو رہا تھا۔ جب کریم اور رکھا اور دوسرے مزدور اپنے اپنے کام سے واپس ڈیرے لوٹے اور اپنے اپنے کھانے کے انتظام میں لگ گئے۔

نھتو صبح سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ خاص کر کریم کا۔ کیونکہ وہ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے: اور اکٹھے ہی گھر سے روزی کمانے نکلے تھے اور اس نے کراہتے ہوئے کریم کو آواز دی۔

کریم نے لکڑی کے ٹکڑے۔۔۔ چولھے کے آگے پھینک دیئے۔ اور نھتو کے پاس کوٹھڑی میں حال پوچھنے کے لئے گیا۔

کہو۔ اب کیا حال ہے نھتو۔ درد کا کیا حال ہے؟

درد تو ویسے ہی ہے اور بخار۔ بخار تو بلکہ زیادہ ہے۔

دوا کہو تو کل جا کے لا دوں نہیں۔ اب کب تک اس مصیبت میں پھنسے رہو گے۔

نھتو نے زور سے کھانسا اور خون سے سرخ بلغم چارپائی سے پرے ایک کونے میں پھینک کر اپنی آستین سے مُنہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

دوا۔۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔۔ دوا میں کیا رکھا ہے۔ تقدیر میں ہو تو یوں بھی آرام آ جائے گا۔ ڈاکٹر خدا تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

کریم اب نھتو کی چارپائی کے ایک طرف ہو کے بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ نہیں نھتو۔ کرتا جو ہے خدا ہی ہے۔ لیکن حیلہ وسیلہ بھی تو کچھ چاہیئے نا۔ دوائیں بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہیں تا

نھتو پھر کھانسنے لگا۔ اور دیر تک کھانستا رہا۔ آخر بے دم ہو کر بیچارے نے مشکل سے ایک اور بلغم کا خونیں ٹکرا اسی کونے میں تھوکا۔ اور پھر کراہنے لگ گیا۔

کریم نے اس کی نبض ہاتھ میں لے لی۔ اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نھتو بیچارہ کھانسی سے بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ اس پر غشی کی سی حالت طاری تھی۔ کریم سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ چلا اُٹھا۔ الٰہی اس بیچارے کو آرام دے۔ صحت دے۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ غریب اور اس پر بیماری بیچارے کو ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح پڑا ہے۔ نہ گھر نہ گھاٹ۔ نہ مائی نہ باپ۔ تو ہی اس کا مالک ہے۔ الٰہی تیرے ہی سہارے پر یہ یہاں پڑا رہتا ہے۔

اتنی دیر میں رکھا بھی اندر آ گیا۔ اور وہ بھی نھتو کی چارپائی کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر نھتو ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ اُسے بالکل کچھ ہوش نہ تھا۔ اور کمزوری اتنی تھی۔ کہ اس کا سینہ اب بج رہا تھا۔ سانس بڑی مشکل سے آتا جاتا تھا۔ اور چھاتی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ پھیپھڑے اب بالکل خالی ہو چکے ہیں۔

کچھ دیر بعد نھتو نے کروٹ لی۔ اور آنکھیں بھی کھولیں۔ لیکن ساتھ ہی کراہنا بھی شروع کر دیا۔ اب ہو سکتا تو وہ اشاروں سے ہی باتیں کرتا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ آخر اسے بولنا ہی پڑا۔

کریم تمہارا خدا بھلا کرے۔ تم بہت ہی نیک ہو۔ ہمارے ایسے غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ سارا دن کُتے کی طرح پڑا رہتا ہوں۔ اور تم جو ٹھلیا پانی کی بھر کر رکھ جاتے ہو۔ اسی سے پانی اُنڈیل اُنڈیل کے پی لیتا ہوں۔

وہ پھر کھانسنے لگا۔ اور کھانس کر ہانپتے ہوئے کہا۔

آج مجھے بڑی پیاس لگی۔ آج تو پانی میں نے سب ختم کر دیا۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ رکھا بھی میرا بہت دھیان رکھتا ہے۔ خدا اس کا بھی بھلا کرے۔ لیکن کھانسی آج مجھے۔۔۔۔۔۔

وہ بات بھی ختم نہ کر سکا۔ اور کھانسی نے اسے آ لیا۔ اور کھانستے کھانستے وہ پھر بیہوش ہو کر چارپائی کے ایک طرف گر پڑا۔

کریم اور رکھا کچھ دیر نھتو کو اس طرح پڑا دیکھتے رہے۔ لیکن جب کچھ منٹ گذر گئے۔ اور نھتو نے کروٹ نہ لی اور نہ پھر کھانسا ہی تو یہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر کے کہ اب مریض کو نیند آ گئی ہے۔ اور نیند آرام اور صحت کی نشانی ہوتی ہے۔ اُٹھے۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ کریم نے مٹی کا دیا ایک کونے میں جلایا۔ کونے

میں پڑے ہوئے کنستر سے آٹا نکالا اور باہر آگیا۔

رکھا نے پانی کی ٹھلیا بھر لایا۔ اور اسے ننھو کے سرہانے رکھ دیا۔ اوپر مٹی کا پیالہ الٹا کر رکھ دیا۔

اب یہ دونوں باہر آگئے۔

چنے کی دال ہنڈیا میں گلنے کو ڈال دی۔ اور آٹا گوندھ کر رکھا۔ تنور پر روٹیاں لگوانے چلا گیا۔ اندر ننھو کراہ رہا تھا۔

کریم اور رکھا کانپ اٹھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے دونوں سرد آہیں کر کے رہ جاتے۔ بیماری، غربت اور موت اُن کی نظروں میں پھر رہی تھی۔ بھیانک اور کریہہ طریق پر۔ پانچ چھ ماہ اکٹھے مزدوری کرنے نے انہیں ایک دوسرے کے اتنا قریب نہ کیا تھا۔ جتنا ننھو کی اس غریب الوطنی اور بیماری نے۔

لیکن ننھو کی حالت اب ہمدردی کی بھی محتاج نہ تھی۔ مایوسی کریم اور رکھا کے دلوں میں گھر کر چکی تھی پھر بھی امیدوار رہا اس سے پوچھا۔ کہو تو تمہارے بال بچوں کو بلا لیں۔ کہو تو گاؤں میں اطلاع دے دیں۔ لیکن ننھو کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا معمولی سا بخار ہے۔ کل ہی تو آرام آجائے گا۔ لکھا تو بیچارے بھاگے آئیں گے۔ کرایہ خرچ ہوگا۔ یہاں دوا دارو پر خرچ ہوگا۔ یونہی مفت میں پانچ سات روپے اٹھ جائیں گے۔ آرام قسمت میں ہوا۔ تو یوں بھی آ جائے گا۔ وہ کوئی خدا تو ہیں نہیں . . . . .

روٹی پک گئی۔ کریم اور رکھا نے چپ چاپ سہمے ہوئے کھالی۔ پانی کا گھونٹ پیا۔ اور کریم بازار سے ننھو کے لئے ڈبل روٹی دودھ لینے چلا گیا۔

رکھا نے حقہ سلگایا۔ اور ننھو کے پاس چارپائی کی پائنتی کی طرف جا بیٹھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ حقہ کی چلم نے دیئے کی روشنی سے مل کر کچھ اندھیرا کم کیا۔ اور ننھو نے آنکھ کھولی۔

پیشانی پر پسینہ آرہا تھا۔ ننھو نے اسے ایک میلے کچیلے کپڑے سے صاف کیا۔ اور خاموشی سے رکھا کی طرف تکتا رہا۔

رکھا نے کہا کیوں کیا بات ہے۔ پانی پیو گے۔

ننھو نے سر ہلایا اور کہا کہ نہیں۔

دیا اور چلم دو جگنوؤں کی طرح تاریکی کے مجسمہ میں سوراخ کر رہے تھے۔ لیکن ظلمت کا مجسمہ ویسے کا ویسا تھا۔ بلکہ ان کی تیزی میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اور تاریکی کا مجسمہ تاریک تر ہوتا جا رہا تھا۔

خاموشی یا حقہ کی گڑگڑ۔ باہر لوگ آبادی میں کھانا وغیرہ کھا پی کر کہیں شاید خوش گپیوں میں لگے ہوں۔ لیکن ان کی دنیا سو چکی تھی۔ خاموش اور تاریک تھی۔

موت۔ اندھیرا۔ درد۔ بخار اور کھانسی۔ ننھو اور رکھا ایک دوسرے کو خاموش اور بے حس آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں نے یک خواب دیکھا"

"کیا ہے ننھو۔ پانی پیو گے کیا"۔

"نہیں میں نے ایک خواب دیکھا۔ ابھی ابھی ننھو نے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے زور سے کہا۔ "خواب۔ خواب دیکھا۔ اچھا تو نہیں نیند آئی تھی۔ شکر ہے خدا کا"

"ہاں میں نے ایک خواب دیکھا"

"اب خدا کے فضل سے تمہیں صحت ہو جائے گی۔ گھبراؤ نہیں ننھو۔ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے۔ لیکن تکلیفوں سے گھبرانا نہ چاہیئے۔

ہاں کبھی صحت ہو ہی جائے گی اگر قسمت میں لکھا ہے تو۔ آج لیکن۔ ہاں۔ میں نے آج ایک خواب دیکھا ہے۔

تو سناؤ پھر ننھو۔ رکھا سرہانے کے پاس آکر کہنے لگا۔

"تو سنو۔ رکھا سنو۔ میں نے دیکھا کہ ننھا چراغ اپنی ماں کی انگلی پکڑے بازار جا رہا ہے۔ اور اس کی ماں نے اور اس نے صاف اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ جیسے امیر لوگ پہنتے ہیں۔ وہ دونوں خوش خوش ہیں۔ ہاں خوش خوش۔ نہیں بنیئے کا کچھ خوف نہیں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ وہ بنیئے کی دوکان کو ہی جا رہے ہیں۔ تم جانتے ہو نا اسے۔ وہ کرپا شاہ جس کے پاس میں نے زمین دی رکھی تھی۔ جس نے میرا مکان قرق کرا لیا تھا۔ ہاں اس بنئے کی دکان کو وہ جا رہے ہیں۔ اور چراغ کی ماں ہنس رہی ہے۔ سُن رہے ہو نہ رکھا۔ چراغ کی ماں ہنس رہی ہے۔ بھلا پوچھو تو کیوں۔ وہ ہنس رہی ہے کہ اس کے پاس ایک پلندہ نوٹوں کا ہے۔ ایک رومال میں باندھا ہوا۔ رومال بالکل ویسا ہی ہے جیسا اُس دن میں نے میلے میں خریدا تھا۔ اور بنیا بھی چراغ کی ماں سے آج خلافِ معمول اچھی طرح پیش آیا۔ جیسے وہ پانچ چھ سال پہلے جب ہماری جائداد قرق بھی نہ ہوئی تھی پیش آیا کرتا تھا۔ . . . .

مجھے پانی پلاؤ۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ . . پانی پلاؤ۔

رکھا نے جلدی سے مٹی کے پیالے میں پانی ڈالا۔ اور ننھو کے منہ

سے اُگا دیا۔

نھتو غٹاغٹ پیالے کا پیالہ ہی چڑھا گیا۔

رکھا کا حقّہ گڑگڑ کرنے لگا۔ اور نھتو نے پھر خواب کہنا شروع کیا۔

جیسے وہ ڈر رہا تھا کہ کھانسی اسے پھر بیہوش نہ کر دے:

لیکن کھانسی نے پھر بھی اُسے آ ہی لیا۔

اور پھر وہ اتنا کھانسا کہ بیدم ہو کر ایک طرف کو گر پڑا۔ خون آلود نہیں۔ بلکہ خون کا بنا ہوا بلغم تھوکنے کی بجائے چارپائی پر ہی ڈال دیا۔ اور کرتے کی آستین سے منہ صاف کرنے کی بھی اُسے فرصت نہ ملی۔

جب ہوش آیا تو پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

میں نے دیکھا رکھا کہ کرپا شاہ چراغ سے بھی اچھی طرح پیش آیا۔ اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اور پھر کنستر میں سے نکال کر اُسے گڑ کی ایک ڈلیا پکڑا دی۔ اور اپنے پاس گدی پر بٹھا لیا۔ وہ نوٹوں کا بلندہ چراغ کی ماں بھی کھا نہ . . .

کھانسی نے پھر آ لیا۔

کریم۔ ڈبل روٹی دودھ لے آیا۔

رکھا نے چلم کی آگ ہاتھ سے ہلا کر دیکھی۔ حقّہ ابھی سلگ رہا تھا۔

پانی پی کر نھتو نے پھر کہنا شروع کیا۔

اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کھانسی آ گئی۔ اور میں جاگ اٹھا۔ اب اگر میں مر بھی جاؤں تو کیا ہے۔ زمین اور مکان چراغ پڑھے گا۔ لکھے گا۔ بڑا ہو گا۔ اس کا بیاہ رچائیں گے۔ چراغ کی ماں گہنا پہنے گی۔ ہمارے پاس قرضہ وغیرہ ادا کر کے بھی اپنی پونجی جمع ہو گی . . . . .

مگر یہ کھانسی پتہ نہیں کب پیچھا چھوڑے گی۔

ڈبل روٹی دودھ لایا ہوں۔ کچھ کھا لو۔ صبح کے بھوکے ہو۔

اچھا۔ اچھا کریم۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم بہت ہی بھلے آدمی ہو۔ خدا انہیں اس نیکی کا اجر دے۔ سارا دن مزدوری کرتے ہو۔ رات کو میری خدمت کرتے ہو۔ میں تمہارا حق ادا نہیں کر سکتا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔

ڈبل روٹی دودھ کھلانے کے بعد کریم نے کہا:۔

کل ڈاکٹر کو بلا لیں گے۔ دوا پیو۔ شاید تمہیں کچھ افاقہ ہو۔

ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کیا کرے گا۔ مفت میں دو تین روپے اینٹھ لے گا۔

ڈاکٹر روپے کے ہیں۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر کو کیا ہمدردی ہو گی۔ ہم سے تو وہ [illegible] قسمت میں ہو گا تو خود بخود صحت ہو جائے گی۔ اوہ

لیکن۔ میں نے آج ایک خواب دیکھا۔ تم بھی سنو گے۔ ابھی ابھی میں نے ایک خواب دیکھا۔ تم بھی سنو گے کیا۔ ابھی ابھی میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ رکھا نے سنا ہے۔ نہیں بھی سناؤں گا۔

لیکن تم اب تھکے ہو گے۔

تم اب سو جاؤ نھتو۔ خدا انہیں صحت بخشے۔ نیند جتنی کرو گے اچھا ہے۔ نیند صحت کی نشانی ہے۔ اور غریب کی تو دوا ہی نیند ہے۔

میں سو جاؤں گا۔ تم بھی سو جاؤ۔ میرا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ میں پھر خواب دیکھوں گا۔ صبح پھر تمہیں پورا خواب سناؤں گا۔ ابھی آدھا نھتو کو سنایا ہے۔ اب پھر نیند آ رہی ہے۔

خون سے بھرا بلغم نکال کر ایک کونے میں پھینکا۔ آستین سے منہ پونچھا۔ اور رضا پوش چھت کی طرف تکنے لگا۔ رکھا اور کریم باہر آ گئے۔ چولھے کے پاس۔ سردی تو تھی۔ لیکن موٹے کمبل میں گذارہ ہو سکتا تھا۔ اندر نھتو بیچارے کے بے آرام ہونے کا ڈر تھا۔

دیا جلتا رہا۔ لیکن اندھیرے کے مجسمے میں ایک سوراخ کم ہو گیا۔

نھتو اپنا حقّہ باہر لے آیا۔

نھتو کو نیند آ گئی۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔ شاید سینہ بج رہا تھا۔ پھیپھڑے ڈھولک کی طرح بج رہے تھے۔ خون بلغم۔ بلغم خون۔ کوٹھڑی کا کونہ ان سے بالکل بھر گیا تھا۔ کرتے کی آستین خون سے تھڑ گئی تھی۔

صبح اُٹھتے ہی کریم اندر گیا۔ دیا جل رہا تھا۔ نھتو سو رہا تھا لیکن سینہ بجنے کی آواز بند ہو چکی تھی۔ سانس کی آواز بھی نہ آتی تھی۔

نھتو کے ناک سے خون آلود پانی بہہ رہا تھا۔

کریم ڈر گیا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انسان اور موت۔ انسان بیچارا کہاں تک مقابلہ کرتا۔

رکھا بھی نھتو کی چارپائی کے قریب آ بیٹھا۔ اور کریم گھبرایا گھبرایا باہر کو دوڑ گیا۔ آخر نھتو اس کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور نہ بھی ہوتا۔ تو وہ کم از کم انسان تو تھا۔ اُس پر اس کا کچھ حق بھی تو تھا۔

فرید بلدرم

نوائے فراق

یہ شوخیٔ نگاہ کسی پر عیاں نہیں
تاثیرِ دردِ عشق کہاں ہے کہاں نہیں

عشق اس طرح مٹا کہ عدم تک نشاں نہیں
آ، سامنے کہ میں بھی تو اب درمیاں نہیں

مجھ کو بھی اپنے حال کا وہم و گماں نہیں
تم راز داں نہیں تو کوئی راز داں نہیں

صیاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے
اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

اس در گزر سے اور کھُلا عشق کا بھرم
یہ کیا ہوا کہ مجھ سے وہ اب سر گراں نہیں

پس ماندگاں اب اور ہی ڈھونڈیں دلیلِ راہ
اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

محوِ سکوتِ ناز ازل سے ہے بزمِ عشق
قصہ نہیں، فسانہ نہیں، داستاں نہیں

ہیں پرسشِ نہاں کے بھی عنوان سینکڑوں
اتنا ترا سکوتِ نظر بے زباں نہیں

اے دوست اہلِ درد کے رازِ سکوں نہ پوچھ
مدت ہوئی نگاہ تری درمیاں نہیں

کیا حشر دیکھیے ہو اب اس اعتدال کا
سنتے ہیں عشق درپئے آزارِ جاں نہیں

کیا حشر، وعدہ، کیا رگِ جاں، کیا حریمِ راز
یہ جانتا ہوں تو ہے جہاں میں وہاں نہیں

ہمدم دیارِ دل کی جنوں خیزیاں ہیں اور
زنداں نہیں ہے، دشت نہیں، گلستاں نہیں

تھا حاصلِ حیات بس اک عشوۂ نہاں
اب یہ نہ پوچھ عشق کہاں ہے کہاں نہیں

کیا واقعی فریب ہے اے دل حیاتِ عشق
کیوں مژدۂ وصال سے میں شادماں نہیں

ہستی کے انقلاب کو کیا کہیے فراقؔ
مانا کہ ہجر بارِ غمِ جاوداں نہیں

فراقؔ گورکھپوری

فارسی محاورات اور غالب

اُردو علم ادب کو محمد شاہی عہد کے دکنی اور دہلوی شعراء نے جب فارسی علمِ ادب کی تقلید پر ڈال دیا۔ تو اس میں عروض و قواعد زبان فارسی ہی کا تتبع کیا جانے لگا۔ اس لئے محاورات فارسی کا اردو علم ادب و زبان میں مستعار لیا جانا۔ وسعتِ زبان اور شعر و شاعری کی ضرورتوں کے لئے نہایت ضروری قرار دیا گیا۔ کیونکہ فلا زمۂ محاورہ سے نہ صرف زبان بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس میں کئی نازک سے نازک خیالات کا ادا کرنا بھی بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً میر درد ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں تر دامنی کے لفظ سے جو لطف اور بیان میں نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کسی اور طرح بالکل غیر ممکن تھی۔ حضرتِ سودا ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

اس شعر میں عمر کا پیمانہ بھرنا۔ فارسی محاورہ پیمانہ پُر کردن کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن اگر اس جگہ یہ محاورہ مستعمل نہ ہوتا۔ تو شعر بالکل بے لطف ہو جاتا۔ غرض فارسی محاورات کے استعمال سے بعض اشعار میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور آج تک فارسی علمِ ادب کے عام محاورات ہمارے شعراء نے بکثرت استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک زبان کے کسی محاورے کا دوسری زبان میں ترجمہ کر کے استعمال کرنا بعض اوقات بہت الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات غالب کے اُردو اشعار میں خاص طور پر پائی گئی ہے۔ جیسا کہ ابیاتِ ذیل سے واضح ہو گا ؎

کیا کس شوخ نے نازاز سر تمکین شستن کا کہ شاخِ گل کا خم انداز ہے بالیں شکستن کا

اس شعر میں بالیں شکستن کا محاورہ بجنسہٖ مستعمل ہوا ہے۔ اور عام اردو دان یہ بات ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ کہ بالیں شکستن سے مراد تعظیم بجا لانا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کس شوخ نے متانت کے ساتھ بیٹھنے کی ڈالی ہے۔ کہ شاخِ گل (جو بوجھ سے جھکی ہوئی ہے) کے جھکاؤ کا انداز ایسا ہے گویا وہ کسی کی تعظیم بجا لا رہی ہے۔ غالب ؎

وسعتِ جیبِ جنونِ نیشِ دل مت پوچھ محملِ دشت بدوش رمِ نخچیر آیا

زبان فارسی میں جیب کردن سے مراد کسی کیفیت پر غالب آنا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ دل کے مجنونانہ اضطراب کو وسیع پیمانے پر جیب کرنے یعنی اس پر قابو پا جانے کی کیفیت مت پوچھ گویا سارا جنگل ایک محمل کی صورت بن گیا ہے اور وہ محمل ایک شکار کے کندھے کی باگ ڈور پر رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی جبکہ تمام دشت ہی اس طرح ہاتھ میں کر لیا گیا ہے تو پھر اس میں چلنے پھرنے والوں کے جنون نیش کا کیا حال پوچھنا۔ بس سمجھ لے کہ وہ سب کچھ اسی میں شامل ہو گیا ہے۔ گویا ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ غالب

یک گامِ بیخودی سے لوٹیں بہارِ صحرا آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

مطلب شعر:۔ ہم چاہتے ہیں کہ وحشت کا ایک قدم اٹھا کر جنگل کی بہار لوٹیں مراد یہ کہ دیوانہ بن کر دیوانہ گردی کے مزے اڑائیں۔ لہذا آغوشِ نقشِ پا یعنی اپنے پاؤں تلے کے نقش میں جو آغوش یا خلا ہوا کرتا ہے۔ اس میں صحرا کا فشار کر دیں۔ مراد یہ کہ تمام صحرا میں پھر کر اسی کی خاک اسی آغوشِ نقشِ پا میں لا کر جمع کر دیں۔

اردو زبان میں اس قسم کے نازک خیالات فارسی محاورات کی شمولیت کے بغیر ہرگز ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے شاعر کا ایسا کرنا ایک مجبوری امر تھا۔ کچھ اور مثالیں۔ غالب ؎

دادخواہِ تپش و مہرِ خموشی لب پر کاغذِ سرمہ ہے جامہ تیرے بیماروں کا

جامہ کاغذی در بر کردن۔ زبانِ فارسی کا ایک محاورہ ہے بمعنی فریادی ہونا۔ اور سرمہ سے مراد خموشی لی جاتی ہے۔ تو اس قسم کے فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ کرنا اردو میں گویا اشکال کا دانستہ پیدا کرنا ہے۔ لیکن مرزا صاحب اس زمانے میں جبکہ اُن کی شاعری کی ابتدا تھی۔ ایسی باتوں کی مطلق پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں فرماتے ہیں۔ تیرے بیماروں کا لباس

جیب کا عذر سرمہ ہے۔ یعنی وہ ایک تو فریادی ہیں۔ دوسرے خاموش۔ کسی سے تیرے خلاف کچھ گلا نہیں کرتے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ تجھ سے داد خواہ ہیں۔ یعنی اپنے تڑپنے کا انصاف چاہتے ہیں۔ مگر اس پر بھی وہ مُہر خاموشی برلب ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کچھ شور و شر نہیں چاہتے۔ اور صبر کے ساتھ انصاف کے طالب ہیں۔ غالبؔ ؎

جوہر آئینۂ فکر سخن موئے دماغ	عرض حسرت پس زانوئے تامل تا چند

مفہوم شعر:۔ سخن موئے دماغ، فارسی محاورہ ہے بمعنی عیش میں خلل واقع ہونا۔ کہتا ہے۔ جس طرح آئینے میں جوہر یا مواد کا ہونا کسی کی عیش آئینہ بینی میں خلل کا واقع ہونا ہے۔ اسی طرح زانوئے تامل کے بعد یعنی صبر کرکے بیٹھ جانے کے بعد عرض حسرت کرنا۔ کب تک مناسب ہوگا! ۔۔۔ یہ عرض حسرت گویا صبر میں خلل اندازی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں مرزا غالبؔ نے فارسی محاورات کو بزبان اردو ترجمہ کرکے استعمال کیا ہے۔ لہٰذا یہ شارحین کلام غالبؔ کے اکثر سمجھ میں نہیں آئے۔ اور وہ ان اشعار کا کچھ کا کچھ حل سپرد قلم کر گئے ہیں۔ مثلاً ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

اس شعر کو پہلے مرزا نے اس طرح باندھا تھا ؎

آتشیں پا ہوں۔ گداز وحشت زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

مسبوق الثانی شعر کا مفہوم یہ ہے:۔

قید خانے میں جو وحشت مجھے ہو رہی ہے۔ اس کی گداز یا جلن کا حال مجھ سے مت پوچھ۔ گویا میں آتشیں پا ہوں یعنی میرے پاؤں تک جل اٹھے ہیں۔ اور ان سے میرے پاؤں پڑی زنجیر کی ہر کڑی موئے آتش دیدہ یا ایک جلے ہوئے بال کی صورت بن گئی ہے۔

مصنف نے اسی مضمون کی بنا پر پھر وہ شعر باصلاح لکھا ہے۔ جو کہ مروجہ دیوان غالبؔ میں طبع ہوا ہے۔ یعنی ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

تذکرہ آب حیات میں یہ شعر (صفحہ ۴۴) نقل کرکے آتش زیر پا ہونے کے معنی بیقرار ہونا لئے گئے ہیں۔ مگر یہ معنی غلط ہیں۔ کیونکہ مرزا نے اس محاورے کے لفظی معنی "پاؤں کے نیچے آگ کا ہونا" قرار دیے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے ترجمے عام طور پر کسی زبان میں جائز نہیں ہو سکتے۔ تاہم جب متقدمین میں میر تقی میرؔ، سوداؔ اور دردؔ وغیرہ نے یہ تصرف اظہار مطالب کے لئے لازم سمجھا تو پھر غالبؔ پر کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

ایک اسی طرح کا اور بھی شعر ہے۔ جس میں "بسر زلف شدن" کے فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ کرکے غالبؔ نے اپنے تمام شارحین کلام کو سخت حیران کر رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک	کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

مفہوم شعر:۔ ہماری آہ کو موثر ہونے کے لئے ایک عمر یعنی عرصۂ دراز درکار ہے۔ کیونکہ تیرے سر زلف ہونے یعنی جس قدر کہ تو استغنا برتنے والا ہے اس مدت تک صبر کرکے اور آہیں بھر بھر کے کون جیتا رہ سکتا ہے۔ اس شعر میں "بسر زلف شدن" کے اصلی معنی بیدل یا پروائی کرنا جیسے کہ فارسی میں ہیں۔ وہ اردو میں بتوسط ترجمہ لئے گئے ہیں اور اس سے یہ شعر کچھ عام فہم نہیں رہا۔

حاصل کلام فارسی علم لغت سے مرزا غالبؔ نے اکثر ایسے محاورات اردو غزل میں مستعار لئے ہیں۔ جو متقدمین اور متاخرین شعرائے اردو میں سے کسی نے بھی استعمال نہیں کئے۔ مگر اب وسعت زبان کے لئے ان کو نظم کرنا متبعین غالبؔ کی توجہ کے بہت مستحق امر ہے۔ عام طور پر مرزا موصوف کا تتبع یہی تصور کیا جاتا ہے کہ انداز بیان میں اختصار عبارت اور ندرت خیالات کے ذریعہ شعر کا مفہوم ادق سے ادق تر بنایا جائے۔ لیکن مقدمہ دیوان حالی میں مرقوم ہے کہ "ندما جس محاورے کو کسی طرح باندھ گئے ہوں اگر اس کو ان سے کچھ اور اختلاف کرکے نظم کیا جائے تو یہ بھی ایک طرح کی جدت اور خوبی تصنیف میں داخل ہے" تو غالبؔ کے اپنائے ہوئے فارسی محاوروں کو بھی اسی اصول کے مطابق ہمارے شعرا کو پھر اپنے استعمال میں لانا چاہیئے اور اپنا کمال فن ان میں دکھانا چاہیئے۔ کچھ ایسے ہی محاورات کی مثالیں کلام غالبؔ سے درج کی جاتی ہیں۔ مثلاً

دنداں در جگر افشردن یعنی دانتوں میں جگر کو کھونسنا۔ اس سے مراد آمادہ بہ ہلاکت ہونا ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں ہے ؎

دیکھیے مت چشم کم سے سوئے ضبط افسردگاں
جوں صدف پُر در ہیں دنداں در جگر افشردگاں

نمد در آب یعنی پانی میں نمدے کا ہونا۔ مراد مکر و فریب ہے۔ مثال ؎

کجا معزولی آئینہ کو ترک خود آرائی
نمد در آب ہے اے سادہ پرکار اس بہانے سے

مطلب شعر:۔ دوست کہاں معزولی آئینہ کرتا ہے۔ یعنی آئینے کا دیکھنا وہ کب ترک کرتا ہے۔ اور وہ کب خود آرائی کا شغل موقوف کرتا ہے۔ تو اے سادہ دل عاشق وہ دوست اگر ایسا کہتا ہے تو وہ اس بہانے سے پرکار نمد در آب ہے۔

یعنی سخت فریب دیتا ہے۔ یا وہ سادہ پرکار دوست ہمیں ترکِ آئینہ و خود آرائی
کا وعدہ دے کر بہت فریب دے رہا ہے۔

خار خار ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس سے مراد مرغوبِ دل ہونا۔
یا کسی چیز کی خواہش یا دل میں اس کی طرف سے کچھ لگاؤ رکھنا ہے۔ غالب نے
اس کو بہت سے اشعار میں برتا ہے۔ مثلاً

بہ تکلف خار خارِ التماسِ بیقراری ہے
کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزاں کا

مطلب شعر:- چونکہ دھاگہ سوئی پر لپیٹ کر ایک پیراہن سا لگا دیتا ہے
اس لئے کہ زخم کی وجہ سے جو بیقراری پیدا ہوتی ہے۔ اس کی التجا کو
بھی مرغوب ہے۔

دوسری مثال

تھا مجھ کو خار خار جنونِ وفا اسد
سوزن میں تھا نہفتہ گلِ پیرہن ہنوز

یہاں بھی خار خار سے مراد دل میں اٹکنا یا مرغوب ہونا ہے۔

سرخوش

غزل

ہر چند بستہ چشم رہا بستہ لب رہا
میں مدتوں نشانۂ تیرِ غضب رہا

غیروں پہ لطف کا بھی بتایا گیا جواز
مجھ پر ترا ستم بھی مگر بے سبب رہا

تو نے جو کچھ دیا وہ دیا لطفِ خاص سے
پابندِ آستیں مرا دستِ طلب رہا

اس بزم میں نگاہ پہ قابو نہ رکھ سکا
ہاں مجھ کو اعتراف ہے میں بے ادب رہا

سو بار تیرے غم نے دکھائی رہِ فنا
سو بار تیری یاد میں میں جاں بلب رہا

دل کی فسردگی نے یہ مجھ پر ستم کیا
میں وقفِ انتظارِ اجل روز و شب رہا

فطرتؔ رموزِ شوق نہ کہہ گر یہ کوشش رہ
سب کچھ کہا اُسی نے جو یاں بستہ لب رہا

عبدالعزیز فطرتؔ
شاگرد شادؔ عظیم آبادی

رباعی

یہ جوش و خروش یہ روانی تیری!
یہ عشق سے آشنا جوانی تیری!
اے سرجوشِ بادۂ طرب اے دریا!
یہ رقص و سرود زندگانی تیری!

اثر صہبائی

غزل

پاؤ گے اُسی کی نگہہ ہوش رُبا میں
تاثیر ہے اے صدق دوا میں نہ دعا میں

ممتاز وہ کشتے ہیں شہیدانِ وفا میں
سر جن کے کیے سجدۂ نقشِ کفِ پا میں

جذبِ دلِ بلبل کا اثر تم نے بھی دیکھا
دامن کوئی بے چاک نہیں گل کی قبا میں

سرمے نے بڑھا دی نگہہِ ناز کی تاب اور
یہ آب نہ پہلے تھی کبھی تیغِ جفا میں

ملنا تو کجا آنکھ ملاتا نہیں لیکن
ظالم کے یہ انداز بھی داخل ہیں ادا میں

اترا نہ بہت ہستیٔ موہوم پہ غافل
کچھ اس کی حقیقت نہیں چشمِ حکما میں

ترکیبِ عناصر میں خلل آگیا جس دن
جز خاک ہے کچھ آگ نہ پانی نہ ہوا میں

ناقدریٔ اربابِ کدورت کا گلہ کیا
اے صدق مرا گھر ہے دلِ اہلِ صفا میں

صدق جائسی

ہیر وارث شاہ

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا (انشا)

وارث شاہ پنجابی کا ہومر اور فردوسی ہو گزرا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر اور فصیح و بلیغ سخنور ہونے کے علاوہ علم النفس انسانی (ہیومن سائیکالوجی) کا ایک بہت بڑا ماہر تھا۔ کیونکہ اس کی عظیم الشان تصنیف میں عورت اور مرد کے تمام جذبات کا نقشہ ایسے طریق پر کھینچا گیا ہے جس کی قدر آج کل کے بڑے بڑے ماہرین علم النفس ہی کر سکتے ہیں۔ اس کی شاعری اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے اور نظم میں غضب کی آمد ہے۔ وارث شاہ نہ صرف ایک زبان دان تھا بلکہ زبان آفرین بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقلیم سخن میں زبان اس کی دست بستہ کنیز تھی۔ "ہیر" پر منظوم تقریظ کرنے والے مولوی پارس علی۔ پیراں دتہ ترگڑ۔ نبی بخش ٹھیکیدار۔ محمد دین۔ سراج الدین۔ حکیم محمد دین۔ ہاشم علی وغیرہ ہیں۔ اس بزرگ کی شاعری پر مفصل تبصرہ اصل مضمون میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک اہم مشکل کی وضاحت مقصود ہے جو مقالہ نگار کو ہیر کے اہم مقامات سے اقتباسات حاصل کرنے کے دوران میں پیش آئی ہیں۔ نے کتاب کے کم و بیش ڈیڑھ درجن مختلف ایڈیشن فراہم کئے اور جب ان کا آپس میں مقابلہ کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ وہ تمام کی تمام کتابیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ بہت سے اشعار ایسے تھے جو ایک کتاب میں موجود تھے اور دوسری میں ندارد۔ کسی نسخے میں کم اشعار کسی میں زیادہ۔ کسی میں بہت سی سرخیاں غائب کسی میں کئی عنوانات کا اضافہ اور ر کہنے کو تمام سید وارث شاہ کی مصنفہ تھیں۔ جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تو چونکہ یہ تمام کتاب سوال و جواب کی صورت میں تھی اس لئے گا کر سوال و جواب کرنے والے میراسیوں اور پیشہ ور گانے والوں نے اس کے بہت سے حصوں کو رٹ لیا اور نتیجۃً اکثر اشعار اصل الفاظ پر مشتمل نہ رہے۔ بعض فراموش ہی کر دئیے گئے اور بعض خود گھڑ لئے گئے گانے والوں کی زبان سے ہمیں ایسے اشعار سنے گئے ہیں جو مطبوعہ کتب میں کہیں نہیں ملتے۔ یہ طرز اشعار کے مقدم و موخر ہونے کا سبب بھی یہی ہے۔ اشعار کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ اسی وزن اور بحر میں ایک ہی مضمون پر اشعار کہے گئے اور وہی اشعار رفتہ رفتہ بعض مطبوعات میں

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کہتے ہوئے اصل اشعار میں شامل ہو گئے۔ جتنا ظلم وارث کی کتاب پر بن بلائے اضافہ اور ادغام کی صورت میں ہوا ہے اتنا شاید ہی کسی اور کی کتاب پر ہوا ہو۔ اس کے بعد کتاب کے لاتعداد مرتب کرنے والوں کی نوازشوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کتاب مرتب کرتے وقت ایسے اوقات اکثر آئے جب مرتب حضرات کی اپنی طبع بھی شعر کہنے پر مائل ہوئی اور وہ اصل اشعار بالائے طاق رکھ کر نہایت بے تکلفی سے کتاب کا حجم بڑھاتے گئے۔ محض چند اشعار پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ درجنوں نئے عنوان وضع کئے گئے اور ان کے تحت بھی اپنی طبع کی جولانی دکھائی گئی۔ ان کی فیاضی کی حد یہ تھی کہ مقطع میں نام وارث شاہ کا ہی لکھا گیا۔ اول اول تو ان اشعار کو نمبر کے ذریعے علیحدہ رکھا گیا مگر بعد میں کئی نسخوں میں یہ نو ترمیم اشعار اصل اشعار میں مدغم کر دئیے گئے اور اس طرح اصل و نقل میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ محمد الدین سوختہ امرت سری۔ ہاشم علی ظفر والی۔ کرم الٰہی سلطانوی وغیرہ ہم ترمیم کرنے والوں میں سے ہیں۔ مقدم الذکر

نے سینکڑوں اشعار اپنی طرف سے لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے صحیح نسخۂ ہیر مرتبہ محمد الدین ڈہڑیالوی کا ہے جو پیر اندتا ژگڑ کے وسیلے سے کسی قدیم قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے اور کتاب پر مرتب کا دعوے ہے بھی ہے کہ "جھڑی ابوسعید چھپاندا و ڈی ہیر اصلی ہو اس دے باہجوں ہور جو چھاپے جانوں اہنوں نقلی د جو کتاب ابوسعید محمد الدین ڈہڑیالوی کی مطبوعہ ہے وہی اصلی اور بڑی ہے۔ ماسوا اس کے دیگر مطبوعات نقل تصور کرو) اسی قسم کے دعوے بہت سی کتب پر موجود ہیں۔ بہر حال میں نے اس مقالے کے اقتباسات ہیر کے ایک بہت قدیم نسخے سے لے کر درج کئے ہیں جس کا مرتب عنایت اللہ نامی کوئی شخص ہے مگر ان اقتباسات میں بھی بعض اشعار وارث شاہ کے معلوم نہیں ہوتے کیونکہ وارث تو قافیہ کا بادشاہ ہو گزرا ہے اور بعض اشعار کے قوافی کمزور اور ناقص ہیں۔ امید ہے کہ مقالہ نگار کو اس بات پر مورد الزام نہیں ٹھیرایا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر بہت زیادہ کاوش اور جستجو سے کام لیا جاتا تو وارث کے اصل اشعار کے علاوہ کوئی دوسرا شعر شامل نہ ہوتا۔ اب بھی اگر ممکن ہوا تو بہت جلد کسی دوسری اشاعت میں وارث شاہ سے منسوب اشعار متعلقہ مقالہ ہذا کی تصحیح کر دی جائے گی۔

محمد صادق قریشی

ہیر وارث شاہ ایک غیر فانی ادبی شاہکار ہے۔ بلا شبہ یہ کتاب پنجابی ادب کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔ ہم لوگ رومیو جیولیٹ۔ دانتے۔ بیٹرس یوسف زلیخا وغیرہ کی بابت بہت کچھ پڑھتے ہیں اور اپنی سرزمین کے اس زندہ جاوید رومان کی طرف بھول کر بھی اپنی توجہ مبذول نہیں کرتے۔ یہ کتاب اس زبان میں سب سے پہلی اور آخری تصنیف ہے جس کے اثرات براہِ راست دل و دماغ سے لے کر نفس اور روح تک کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وارث شاہ کی شاعری عام مشرقی شاعری کی نسبت بہت زیادہ سادہ اور نیچرل ہے۔ بالکل عام فہم اور سادہ الفاظ میں ان فطری کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے جن کی موجودگی میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ نفسیاتی اور قلبی کیفیات کی ان تصاویر کا البم ہے جن کے اصل نقوش و خطوط کو کسی قسم کے غیر ضروری رنگ، تصنع یا حاشیہ آرائی سے بدلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میرے نزدیک کتاب کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جذبات نگاری میں وارث شاہ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کتاب کے مطالب و معانی پر تفصیل سے تبصرہ کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹریجیڈی یعنی المناک داستان کے پلاٹ یعنی قصے کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ قصہ کے تمام غیر ضروری عناصر کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ امر غیر ضروری طوالت کا باعث نہ ہو۔

~~~~~~~~

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ہیر رانجھا کی داستان کئی ایک دردناک اور روح فرسا واقعات پر مشتمل ہے ہیر اور رانجھا اپنی تمام حسرتوں اور امیدوں کو ناکام بناتے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ افسانہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

پنجاب کے ایک گاؤں میں موجو نامی ایک فارغ البال زمیندار رہا کرتا تھا۔ وحیدو عرف رانجھا اسی کا بیٹا تھا۔ یہ لڑکا بہت ناز و نعم میں پل کر جب جوان ہوا تو موجو انتقال کر گیا۔ رانجھا کو کاشتکاری کا کام پسند نہ آیا جس پر اس کی بھاوجوں نے بہت کچھ طعن و تشنیع سے کام لیا اور بے چارہ رانجھا کبیدہ خاطر ہو کر تخت ہزارہ کو چھوڑ کر جھنگ سیال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں دریائے چناب آتا تھا، جس کو عبور کرنے کے لئے اس نے لڈن نامی ایک ملاح کی منت و سماجت کی لیکن اس نے بلا اجرت پار لگنے سے انکار کر دیا۔ اس پر دونوں میں تکرار ہو پڑی اور رانجھا نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس جگہ اس نے ونجلی یعنی بانسری بجا بجا کر ارد گرد کی بسنے والی آبادی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہاں تک کہ لڈن ملاح اپنی دونوں بیویوں کے اصرار کی وجہ سے رانجھا پر مہربانی ظاہر کرنے لگا اور اسے اس کی خواہش کے مطابق پار پہنچا دیا گیا۔ سو اتفاق سے اسی کشتی میں جھنگ کے چوچک نامی ایک چودھری کی لڑکی ہیر کا پلنگ جا رہا تھا۔ اس پر رانجھا غلطی اور نادانی کی وجہ سے لیٹ گیا تھا۔ یہی ہیر ہماری اس داستان کی ہیروئن ہے۔ وہ اس وقت مع اپنی سہیلیوں کے دریا کی سیر کو آئی تھی۔ ایک اجنبی کو اپنے پلنگ پر دراز دیکھ کر اس نے اپنی سہیلیوں کو حکم دیا کہ اُسے ذرا سرزنش کریں۔ ناگاہ اس کی نظر رانجھے کے چہرے پر پڑی اس کے مردانہ اطوار اور وجیہہ شکل و صورت دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو گئی۔ ادھر رانجھے میاں کا یہ حال تھا کہ ع۔ ہم نے بھی دین و ایمان قربان کر دیا ہے۔

ان دونوں میں کچھ عرصے تک گفتگو ہوتی رہی اور ہیر نے وفاداری اور خدمت گزاری کا وعدہ دیا۔ اس طرح رہِ عشق و وفا کا یہ اولین مرحلہ طے ہوا۔ اس کے بعد ہیر ہی کے ایما پر رانجھا اس کے باپ کی بھینسیں چرانے کا کام کرنے لگا۔ وہ اکثر اوقات باہر دریا کے کنارے اسے

سلہ "رانجھا جاٹ" ان کی قوم کا نام تھا
~~~~~~~~

ملتی رہتی اور اس کی ہر طرح سے خدمت کرتی رہتی۔ کامل بارہ برس تک رانجھے نے بھینسیں چرائیں۔

شومئی بخت سے ایک دن کیدو، ہیر کے چچا نے ان دونوں کو یک جا دیکھ لیا۔ اس کے بعد حسن و عشق کا وہ ہنگامہ جس کے رازدار صرف دو دل تھے اور جو دریائے چناب کے پانی کی روانی، چراگاہ کی سبزی اور درختوں کی بے زبانیوں میں محفوظ تھا، دنیائے الفت کی وہ امانت جس کی امین صرف دو بے قرار روحیں تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رنج و محن کا واحد ماجرائے سکون، دو سینوں میں بھڑکتی ہوئی آگ، عشق، ہاں وہ ماجرائے عشق اب لفظ رسوائی بن کر جھنگ سیال کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں رانجھا کو بیک بینی و دوگوش گھر سے باہر نکال دیا گیا ؎

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اور رنگ پور کھیڑیاں کے ایک شخص سیدا نامی سے ہیر کی نسبت ٹھہرا دی گئی اور بہت جلد شادی کے انتظامات مکمل کر دئے گئے۔ جب برات آئی اور قاضی نے خطبۂ نکاح شروع کیا تو ہیر نے سیدا کو بطور شوہر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر قاضی اور ہیر کے درمیان دیر تک بحث ہوتی رہی اور بہت طوالت کے ساتھ رموزِ عشق سے قاضی کو آگاہ کیا مگر بے چاری اکیلی ہیر کیا کر سکتی تھی۔ آخر کار وہ بغیر رضامندی کے جبراً سسرال پہنچا دی گئی۔ رانجھا اپنے متاعِ حیات یعنی ہیر کی روانگی کے وقت وہاں موجود تھا اور اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے ایک دوسرے سے درد بھری باتیں کرنے سے کوتاہی نہ کی۔

ہیر سسرال میں اپنے خاوند سے قطعی طور پر علیحدہ رہی۔ وہ رانجھا کے فراق میں ماہیٔ بے آب تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے رانجھے کی طرف ایک درد بھرا پیغام بھیجا کہ خدارا میری خبر لیجو۔ رانجھے نے یہ ترکیب نکالی کہ بالناتھ نامی ایک جوگی کی خدمت میں حاضر ہو کر جوگی بن گیا اور اسی فقیرانہ صورت میں رنگ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے باہر سے ایک چرواہا ملا جس کی وساطت سے وہ ہیر کے گھر تک پہنچ گیا اور جب دروازے پر صدا دی تو سیدا کی نوعمر بہن اس کے سامنے آئی۔ اس کا نام سہتی تھا جب سہتی جوگی کو خیرات میں کچھ اناج وغیرہ دینے لگی تو جوگی نے عمداً اپنا پیالہ گرا دیا اور سہتی سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ مجھے یہی پیالہ دیا جائے کیونکہ یہ میرے نزدیک اپنے پیر کی نشانی ہونے کی وجہ سے متبرک تھا

اس پر بہت دیر تک بحث و تکرار ہوتی رہی۔ جوگی یعنی رانجھا کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ نیاز مندی بارگاہِ ناز میں سجدہ ریز ہو یعنی ہیر کسی طرح باہر آئے اور اس ناکام اور نامراد عاشقِ زار کے سامنے اپنے وفاداری کے تمام پیمان یاد کر کے آیندہ ان کی تکمیل کے لئے کوئی سبیل نکالے۔ ناگاہ اس کی مراد بر آئی۔ پنجابی نسوانیت کا وہ بہترین پیکر، جوگی کی تمام تر تمناؤں کا مرکز، ہیر اس کے سامنے تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے نہ معلوم کیا کچھ کہہ سن لیا کہ رانجھا گاؤں کے باہر کالے باغ میں دھونی رما بیٹھا۔ کتاب کا یہ حصہ جس میں رانجھا اور سہتی کا مکالمہ درج ہے حقایق و معارف انسانی خواہشات۔ جذبات۔ احساساتِ عشق اور ستم ہائے فراق کے متعلق بہترین خیالات کا اظہار ہے۔

کچھ عرصہ بعد سہتی اور ہیر جو کہ ایک دوسرے کی رازدار بن چکی تھیں کسی بہانے باہر نکلیں۔ سہتی بھی مراد نامی ایک بلوچ کے دامِ الفت میں گرفتار تھی اور جوگی نے اسے ملانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ گھر واپس آ کر اہل خانہ کو سہتی نے یہ بتا کر تشویش میں ڈال دیا کہ ہیر کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ گھر والے فوراً کسی مانددی کی تلاش میں نکلے اور کالے باغ سے ایک ایسے مانددی کو لے آئے جو فراق اور ہجر کے سانپ کے کاٹے کا بہترین معالج ہو سکتا تھا۔ رانجھے بے چارے کو بھی مدت سے اسی سانپ نے کاٹ رکھا تھا۔ اس کی مراد بر آئی۔ اس کی فرمائش تھی کہ علاج کے لئے علیحدہ کمرہ ہونا چاہئے لہذا اسے ہیر اور سہتی کے ساتھ علیحدہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تمام رات راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور ابھی کچھ رات باقی تھی کہ میاں جوگی اپنے مریض ہجراں یعنی ہیر کو لے کر گاؤں سے بھاگ نکلے۔ جوگی کی دعا کا اثر سمجھو یا حسنِ اتفاق کہ مراد بلوچ بھی سہتی کو آ ملا اور وہ اس کے ساتھ فرار ہو گئی۔

ہیر اور جوگی میاں گاؤں سے دور باہر جنگل میں ایک غار کے اندر پناہ گزیں ہوئے۔ بدقسمتی سے یہ ایک شیر کی کچھا تھی۔ مگر رانجھے کی مردانگی اور بہادری نے اپنے جوہر دکھائے۔ اس نے خنجر سے شیر کو مار گرایا اور دونوں بے خوف ہو کر نیند کی سحر پاش آغوش میں چلے گئے۔ کھیڑے تعاقب میں آ رہے تھے۔ یہاں سے دونوں پکڑے گئے اور معاملہ قاضی کے روبرو پہنچا قاضی نے فریقین کے بیان لے کر جوگی کو جھوٹا قرار دیا اور ہیر کو کھیڑوں کے حوالے کر دیا۔ اس پر جوگی اور اس کی متوالی جوگن کے دلوں سے آہیں نالوں کا ایک طوفان اٹھا جس کے سوز اور حدت سے گاؤں کا گاؤں

جل اٹھا۔ حاکم وقت (راجہ صاحب) کو اس معاملہ کی خبر ہوئی۔ اس نے کچھ تحقیق کے بعد جوگی کی بد دعا سے خوف کھاتے ہوئے ہیر کو اس کے حوالے کر دیا۔ دونوں جھنگ سیال پہنچے۔ جہاں جوگی نے درویشانہ صورت کو خیرباد کہا اور اپنے تمام مردانہ وقار کے ساتھ ہیر کے والدین کے سامنے پہنچا اور ہیر کو حاصل کرنے کی درخواست کی۔

ہیر کے باپ نے رانجھے سے کہا کہ وہ باقاعدہ برات لے کر آئے تاکہ ہیر سے اس کی شادی کر دی جائے۔ رانجھا تخت ہزارے پہنچا اور ایک شاندار برات لے کر چلا۔ گھر والوں نے کچھ بدنامی کے خوف سے اور کچھ کھیڑوں کے جذبۂ انتقام سے ڈر کر ہیر کی کشتیٔ حیات کو غرق کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ رانجھے کی عدم موجودگی میں ہیر کے چچا کیدو نے ہیر کو زہر کھلا دیا۔ رانجھا برات لے کر آ رہا تھا۔ اس کی زندگی کے سنہری خواب آگے آگے رقصاں تھے۔ امیدوں اور مسرتوں کی دلفریب شعاعیں اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں اس کا دل غیر ارضی انبساط کا مرجع بنا ہوا تھا۔ مگر آہ یہ فلک کج رفتار راحت اور طمانیت کے بے پناہ جذبات کو اپنی آنکھوں میں پناہ دینے سے عاجز ہے۔ وہ ہمیشہ ان احساسات کو حرفِ غلط کی طرح بساطِ دل سے نابید کر دیا کرتا ہے۔ وہ انسان کی خوش ترین توقعات کو باطل قرار دیا کرتا ہے۔ ہاں تو رانجھا برات لے کر آ رہا تھا کہ بدنصیب کو اپنے دل کی کائنات کے برباد ہو جانے کا علم ہوا۔ ہیر مر چکی تھی۔ اس روح فرسا خبر کو سنتے ہی رانجھے کے دل سے ایک دردناک چیخ اٹھی اور وہ بے چارہ بھی وہیں گر کر مر گیا۔ انتہائی مسرت اور انتہائی غم کا یہ منظر بہت دل سوز اور جگر پاش ہے۔

شیکسپیئر کے ایک ڈراما MUCH ADO ABOUT NOTHING کے کردار ہمارے اس حزنیہ سے ملتے جلتے ہیں۔ رانجھا کلاڈیو اور ہیر ہیرو ہے بہتی بیٹرس اور کیدو ڈان جان اور اسی طرح دوسرے کردار ڈان پیڈرو جوجک وغیرہ ہیں۔ مگر کلاڈیو اور ہیرو تو ہزاروں ارمان اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے زندہ رہے اور یہ ہر طرح سے ناکام اور نامراد رخصت ہوئے۔ ہیرو تو موت کے بعد بھی زندہ ہو گئی اور اپنے محبوب کی آغوش میں پہنچ گئی مگر ہماری ہیر کے زہر کے لئے کوئی تریاق مہیا نہ ہو سکا جو غمزدہ رانجھے کو ایک بار پھر ہیر کی روشن اور چمکتی ہوئی آنکھیں دکھا سکتا۔

یہ افسانہ اپنے اثر اور جذبات کے باعث اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ پنجاب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں اس کے قدردان موجود نہ ہوں

بعض حلقوں میں تو اسے تصوف اور الٰہیات کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض انتہا پسند تو اسے قرآن مجید کی تفسیر سمجھتے ہیں۔ ہیر رانجھا کو خدا اور رسول مانتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو وارث شاہ کو ایک بہت بڑا ولی اللہ اور اس کے کلام کو اسرار تصوف کا خزانہ تصور کرتے ہیں۔ صوفیوں کا جانی شاہی نامی گروہ تو ہیر کی کتاب کو خوبصورت ریشمیں غلافوں میں لپیٹ کر ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ لوگ عام الفاظ کے پردے میں عرفانیات الٰہیات اور تصوف کے غیر فانی حقایق کے دریا بہتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہیر سے مراد روح ہے رانجھا جسم ہے۔ بالناتھ پیر طریقت ہے کیدو شیطان ملکی اور چوچک فقہ اور اصول ہیں۔ سہتی موت ہے۔ کشتی پل صراط اور رشتہ نفس امارہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعض کے نزدیک ہیر مثنوی مولانا روم کی مکمل شرح ہے کئی ایک صاحب علم وارث شاہ کی تصنیف کو کلام صوفیائے عظام ثابت کرتے ہیں۔

بہر حال اگر صرف شاعرانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس امر کے تسلیم کرنے سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں گلستاں کی طرح فطرت انسانی کے تمام پہلو واضح کئے گئے ہیں۔ حافظ کے وجد انگیز ترانے امرؤالقیس کی شاعرانہ نازک خیالیاں۔ میر تقی کا سوز و اثر شیلے کے روح پرور نغمات اور شیکسپیئر کے انسانی عزائم کے خاکے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

وارث شاہ کے متعلق بھی ضروری ہے کہ کچھ بتا دیا جائے۔ وہ ۱۱۴۷ھ میں موضع جنڈیالہ شیر خاں[1] ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۸۰ھ میں انتقال کر گئے۔ پہلے پہل گھر پر ہی مذہبی کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد قصور میں حافظ غلام مرتضےٰ صاحب کے پاس تحصیل علم کے لئے پہنچے۔ علم حاصل کرنے کے بعد جب وہ واپس آ رہے تھے تو پاک پتن کے ٹھٹھہ نامی ایک گاؤں میں ٹھہرے اور وہاں کی ایک عورت مسماۃ بھاگ بھری پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔ وہیں ایک مسجد میں ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگوں نے مولوی اور سید سمجھ کر خدمت کرنی شروع کر دی۔ یہیں انہوں نے عشق سے سرشار ہو کر ہیر رانجھا کا قصہ لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ شاید اپنے وطن کو چلے گئے اور اس زندہ جاوید تصنیف کے اشعار لوگوں کو سنانے لگے۔ اس کے استاد کو جب علم ہوا کہ اس کے شاگرد نے حسن و عشق کا ایک عریاں سا طویل قصہ نظم کیا ہے تو وہ بہت خفا ہوئے اور اسے بلا بھیجا۔ وارث شاہ کے حاضر ہونے پر اسے حافظ صاحب دیر تک

[1] یہ مقام حال ہی میں فسادات کی وجہ سے اخبارات میں بہت مشہور ہو چکا ہے۔ صادق

طعن و تشنیع کرتے رہے اور پھر ازرہ مذاق کہا کہ جو کچھ لکھا ہے کچھ اس سے سناؤ تو۔

وارث شاہ نے بغل سے مسودہ نکالا اور چیدہ چیدہ مقامات سے شعر سنائے۔ آخر میں اس نے یہ اشعار پڑھنے شروع کر دیئے ؎

ہیر روح تے چاک قلبوت جانو بالناتھ ایہہ پیر بنایا نی
پنجے پیر نی پنجے حواس تیرے جنہاں تھاپنا تدھ نوں لایا نی
کیدو لنگا شیطان ملعون جانو جس نے وچ دیوان بھڑایا نی
کوٹھا گور تے عزرائیل کھیڑا جیہڑا لیندا ای روح نوں دھایا نی

۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ الخ

[ہیر کو روح اور رانجھے کو جسم تصور کرو اور بالناتھ پیر طریقت بنایا گیا ہے
پانچوں پیر تمہارے حواس خمسہ ہیں جن کے مجموعہ سے تمہارا جسم بنا ہے۔
کیدو لنگڑا شیطان معلون ہے جس نے عدالت میں ان کو گرفتار کروایا
جبہ پیڑی قبر اور کھیڑا عزرائیل ہے جو روح کو تصرف میں لاتے ہی گریز
پا ہو جاتا ہے وغیرہ ۔ ۔ ۔ الخ]

جب یہ سنا تو استاد صاحب کی حالت بدل گئی۔ عشق الٰہی کی آگ بھڑک اٹھی اور ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا۔ درویش سر پر پانی ڈالتے تھے جب ذرا ہوش میں آتے تو وارث سے پھر پڑھنے کو کہتے اور آپ پھر بے خودی کے عالم میں گم ہو جاتے۔

---

(۲)

اب میں کتاب میں سے چیدہ چیدہ مقامات سے اشعار لیتا ہوں تاکہ اس کی ادبی خوبیاں صفحۂ قرطاس پر واضح ہوں۔

جب رانجھا گھر کی تکالیف سے تنگ آکر روانگی کا قصد کر لیتا ہے تو اس کی بھاوجیں اس کا ارادہ سفر ترک کروانے کے لئے کہتی ہیں ؎

بھرجائیاں آکھیا رانجھا وے اسیں باندیاں چیریاں تیریاں ہاں
ناؤں لینا ایں جدوں توں جاونے دا اسیں ہنجواں رتدی رنیاں ہاں
جان وچ الانبیاں گئی ساڈی تیرے درد فراق نے بھنیاں ہاں
جان مال قربان ہے تدھ اتوں لتے آپ وی جو کچھ ہنیاں ہاں
سانوں صبر نہ آوندا اک ساعت جس ویلڑے تیتھوں وچھنیاں ہاں
وارث شاہ واآکھیا من دیور اسیں سب مرادتے پنیاں ہاں

[بھاوجوں نے کہا اے رانجھا ہم تیری کنیزیں بننا قبول کرتی ہیں۔ جب تو جانے کا نام لیتا ہے تو ہم خون کے آنسو روتی ہیں۔ ہماری جان محبت کی آگ کی نذر ہے اور تیرے درد فراق میں جل رہی ہیں۔ جان و مال کے علاوہ ہم خود تجھ پر قربان ہوتی ہیں۔ جب تجھ سے جدا ہوتی ہیں تو ایک ساعت کے لئے بھی ہمیں صبر نہیں آتا۔ اے دیور! اگر تو وارث شاہ کا کہا مانے تو ہماری تمام مرادیں بر آئیں]

علم النفسیات کے ماہرین نسوانی فطرت کے چھپے ہوئے راز فوراً پالیں گے۔ عورت کے جذبۂ عجز و خوشامد کی مثال وارث کے ان اشعار سے بہتر نہیں دی جاسکتی۔ پنجابی زبان کے ٹھیٹھ الفاظ کا استعمال بھی قابل غور ہے۔

رانجھا اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر چلا آتا ہے۔ وہ رات اس نے ایک مسجد میں بسر کی اور صبح جھنگ سیال کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانگی کے وقت کی تصویر ملاحظہ ہو:۔

چڑی چوہکدی نال جاں ٹرے پاہندے پیاں دُدھ دے وچ مدھانیاں نی
صبح صادق جاں آن کے ہوئی روشن تدوں آن چڑیاں چہلانیاں نی
اکناں اٹھ کے ریڑکا پا دتا اک دھوندیاں پھرن دوہانیاں نی
اک اٹھ کے ہلیں تیار ہوئے اک ڈھونڈدے پھرن پرانیاں نی
وضو ساز کے زاہداں پھڑی تسبیح بانگاں مسجدیں کہیاں ہوانیاں نی
ہوئے قافلے کوچ سراں وچوں کھڑکے ٹل بھر بات چلانیاں نی
کار دکار وچ ہویا جہان سارا چرخے ڈاہندیاں اٹھ سوانیاں نی
اٹھ غسل دے واسطے جان دوڑے سیجاں جنہاں نے رات نوں مانیاں نی
رانجھے کوچ کیتا آیا ندی اتے ساتھ لدیا پور رہسانیاں نی
وارث شاہ میاں لدّن بہت موٹا کپا شہد دا لدیا بانیاں نی

[چڑیا بولنے کے وقت جب برہمن گھر سے نکلے تو دودھ میں مدھنیاں ڈالی گئیں۔ جب صبح صادق روشن ہوئی تو چڑیوں نے چہچہانا شروع کیا بعض عورتوں نے اٹھ کر چھاچھ بنانی شروع کی اور بعض دودھ والے برتن دھو رہی تھیں۔ کوئی اٹھ کر ہل جوتنے چلا اور کوئی چابکیں وغیرہ ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ زاہدوں نے وضو کر کے تسبیح ہاتھ میں لی اور ملاؤں نے اذانیں کہیں۔ قافلے سراؤں میں سے چلنے لگے اور صبح کی گھنٹیاں وغیرہ بجنے لگیں۔ تمام جہان کاروبار میں مشغول ہوا۔ عورتوں نے چرخے رکھے اور رات بھر جو بستر عیش پر دراز رہے وہ غسل کے واسطے بھاگے۔ رانجھے نے کوچ

کیا اور ندی پر آیا دریا پار کرنے والے مسافروں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا اے وارث شاہ لڈن بہت بھاری بھرکم آدمی تھا جیسے بنیوں نے شہد کا کپا لا در رکھا ہو]

ان اشعار میں منظر نگاری قابلِ تعریف ہے۔ مشرقی شاعری پر عام الزام ہے کہ اس میں مناظر کشی بہت کم پائی جاتی ہے۔ وارث شاہ کے یہ اشعار اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کے یہ اشعار صبح کا ایک دلفریب منظر ہمارے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔ اس منظر کی سادگی پر کسی قسم کی شاعرانہ رنگینی کارفرما نہیں ہے۔ چڑیوں کا چوں چوں کرنا۔ دودھ کی مدھنیاں۔ چھاچھ کا بننا۔ ہل۔ مؤذن۔ مسجد۔ قافلے۔ چرخے۔ دریا۔ کشتی۔ ملاح وغیرہ تمام مناظر ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سے بہتر منظر کشی اور کونسی ہو سکتی ہے!

وارث کے کلام میں تشبیہیں اور استعارے بھی بہت ہیں۔ ذرا ہیر کی تعریف وارث کی زبانی سنئے۔

دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں
لکھی چین تصویر کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں
سرخی ہوٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا خوجے کھتری قتل بازار وچوں
بایاں ویلنے ویلیاں گھت کڈھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں رواں پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
چھاتی ٹھانہہ دی ابھری پٹ کھینوں سیب بلخ دے چنے انبار وچوں
انویں سرکدی آ ندی لوہڑ لٹی جویں کونج اک نکلے ڈار وچوں
جو کوئی ویکھدا او سدے حسن تائیں کھائے زخم خنجر تلوار وچوں
قزلباش جلاد اسوار خونی نکل دوڑیا اڑد بازار وچوں
وارث شاہ جاں نیناں دا داؤ لگے بچے کوئی نہ جوئے دی ہار وچوں

[دانت چنبے کے پھولوں کی لڑی یا ہنستے ہوئے موتی تھے۔ یہ انار حسن سے نکلے ہوئے دانے تھے۔ یہ جٹی گویا کشمیر کی ہے (کشمیر حسن نسوانیت کا مرکز سمجھا جاتا ہے) یا نقاشان چین کی کوئی تصویر۔ اس کا قد باغ بہشت کے سرو جیسا ہے۔ ہونٹوں کی سرخی اور دنداسے کی خوش نمائی سر بازار خوجے اور کھتری کو قتل کر رہی ہے۔ اس کے بازو کمن ڈال کر بیلنے پر بنائے گئے اور چھاتی موج گنگا کے سنگ مرمر جیسی ہے۔ اس کی گردن سارس کی۔ انگلیاں لوبیا کی پھلیاں اور ہاتھ چنار کے نرم و نازک پتوں کے سے ہیں۔ اس کا سینہ اس شان سے ابھرا ہے گویا ریشم کے گیند ہیں یا انبار میں سے بلخ کے چنے ہوئے سیب ہوں۔ وہ "رہزن تمکین و ہوش" اس طرح چلی آتی ہے جیسے ایک سارس قطار سے باہر چل نکلے جو اس کے حسن کو دیکھتا ہے وہ خنجر اور تلوار کے زخم کھاتا ہے۔ وہ جلاد جیسنہ قزلباش اور خونی سوار ہے جو چھاؤنی سے نکل دوڑا ہو۔ اے وارث! جب آنکھوں کی بازی لگ جائے تو اس قمار بازی کی ہار سے کوئی نہیں بچ سکتا]

غور کیجئے کہ ہیر کے حسن نسوانی کو کن کن چیزوں سے تشبیہیں دی گئی ہیں اور تشبیہیں کیسی موزوں اور برمحل ہیں۔

رانجھا ہیر کے باپ کی بھینسیں چرانے کے کام پر مامور ہے۔ ہیر اسے اکثر اوقات دریا کے کنارے ملا کرتی ہے۔ ایک دن وہ اسے قوانین محبت کی پابند بنانے کی غرض سے اس کے سامنے نسوانی کمزوریوں کو واضح کرتا ہے:۔

شرع وچہ منظور نہ قول رناں رانجھا ہیر نوں آکھ سناوندا اے
مکر رن دے جیڈ نہ مکر کوئی رب وچ قرآن فرماوندا اے
مرشد جن تے رن دا اکھ شیطاں جیہڑا افترا مکر پڑھاوندا اے
رناں سچیاں نوں کرن جا جھوٹھا مرداں وچ نہ کوڑ سماوندا اے
رناں منڈیاں پوستیاں بھنگیاں دا اعتبار زبان نہ آوندا اے
وارث شاہ جے قول تے دیں پہرہ ہٹ جھر دا چاک سدوندا اے

[شریعت میں عورتوں کی بات قابلِ اعتبار نہیں"۔ رانجھا ہیر کو اس طرح مخاطب کرتا ہے" عورت کی فریب کاری کی مانند اور کوئی فریب نہیں۔ خدا خود قرآن میں یہ بات فرماتا ہے۔ عورت اور جن کا مرشد شیطان سمجھو جو افترا و کذب نہیں سکھاتا ہے۔ عورتیں تو صادق کو کاذب بنا سکتی ہیں۔ ایسا کذب مردوں میں سما نہیں سکتا۔ عورتوں، لڑکوں اور بھنگ پوست کے عادیوں کی زبان کا اعتبار نہیں (اے وارث شاہ) اگر تو اپنے قول پر قائم رہے تو یہ بڑے زمیندار کا لڑکا تمہارا خادم کہلاتا ہے۔]

ان اشعار میں شاعر نے نسوانی فطرت کو اچھی طرح روشن کیا ہے۔ "FRAILTY THY NAME IS WOMAN" (اے عورت تو مجسم کمزوری ہے۔ شیکسپیئر کی اس سے بہتر اور کونسی تشریح ہو سکتی ہے۔ اب ہیر جواباً لب کشائی کرتی ہے:۔

ہیر آکھدی رناں نوں نندنائیں رن جیہہ جیہی جند گال دی اے

رن جیڈی نہ سدھ ہے کسے لڑنا رن مال تے ملک نہ بھال دی اے
مجنوں تھیں لیلی پھرے خوابیندی سوہنی آپ نوں گال دی اے
زلیخا چھڈ سرداریاں ہوئی عاجز بھی یار یکے ہتھ سنبھال دی اے
پیکے سامو ریاں سکیاں بن پچھا کی رن نہ دولتاں نال دی لے
سسی ہو شہید وچ تھلاں ہوئی شیریں بھٹ او سدے نال دی اے

[ہیر کہتی ہے رانجھے عورتوں کو مت کوس عورت کی زندگی ... عورت کے برابر کوئی دوست نہیں کر سکتا۔ عورت کو مال و ملک کی پروا نہیں ہوتی۔ لیلی اپنے محبوب مجنوں کے پیچھے خوار ہوئی اور سوہنی نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔ زلیخا نے سرداری چھوڑ کر عاجزی اختیار کی اور اپنی ضد پر قائم ... عورت کا گھر سسرال اور عزیز و اقارب سب اس سے منہ ... محبت کی راہ میں مال و دولت کی چنداں پروا نہیں کرتی سسی شہیدوں کی طرح تھلوں میں مرگئی اور یہی حال شیریں کا ہوا]

ان اشعار میں مصنف نے عورت کے جذبہ محبت کی تشریح کی ہے پہلے ایک دعوے پیش کیا گیا ہے کہ عورت کی محبت غیر فانی اور بے غرض ہے پھر اس کے ثبوت میں لیلیٰ۔ زلیخا۔ سوہنی۔ سسی وغیرہ کی مثالیں دی گئی ہیں۔

ہیر وفاداری اور ثابت قدمی کا پیمان باندھتی ہے۔ دیکھئے میثاق وفا کس قدر مستحکم اور پر اخلاص ہے۔

اللہ سچ کتے نبی برحق میاں سنو ں اپنا سچ اقرار مینوں
تیری بندی ہاں جچر ہے جان میری بھاویں گھنڈ وچ تون ہٹ بازار مینوں
مینوں بھلیاں نے ہور سب گلاں تیرے درس دی لبن ہے کار مینوں
تیرے دامن لگڑی رہاں میاں جو بن جانا ایں پار نا مینوں
تیرے نال ہے قول نباہنا میں بھاویں جت آوے بھاویں ہار مینوں
من جیوندی مکھ نہ موڑ ساں گی وارث شاہ دے نال اقرار مینوں

[خدا کی ذات بکمال سچائی اور نبی کریم برحق ہے۔ مجھے اپنے دل سے سچا اقرار ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تیری کنیز ہوں خواہ تو بازار ہے جاکر فروخت کر دے مجھے اور سب باتیں بھول گئی ہیں اور تیرے دیدار ہی کا کام باقی رہ گیا ہے میں تیرا ہی دامن پکڑے رکھوں گی۔ خدارا مجھے پار لگائیو میں تمہارے ساتھ اس قول کو نباہوں گی خواہ اس کا انجام شکست پر ہو یا فتح پر۔ تو مان ہے کہ میں جب تک کہ دم میں دم ہے منہ نہ موڑوں گی۔ میرا وارث شاہ کے ساتھ یہ اقرار ہے]

اس وقت ہیر رانجھا کو صورت احوال سے اچھی طرح آگاہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ اُسے اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس کروانا چاہتی ہے جبکہ وہ چاروں طرف دشمنوں اور حاسدوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان اغراض کے ماتحت۔

ہیر کرے تسلیاں رانجھنے دیاں میری گل دے وچہ دھیان کرنا
دو تی دشمناں وچہ ہے واس ساڈا صابر ہو کے دکھاں نوں جاجرنا
ایس عشق دے بحر دی لہر مار وا تے لڑھ جانا کے ڈب مرنا
دوجا کید و ہے شکل شیطان دی جی چارہ مندیاں اوس نہ فرق کرنا
صبر شکر کرا تے چپ چاپ رہنا ہر اک زمانے دا دکھ سہنا
سرنے عشق دی آکھلی وچہ فیرغم دھمکاں تیں کی ڈرنا
گھمن گھیر دا نہیں ہے خوف کوئی اساں عشق دے بحر دیوچ ترنا
شاید قدر نوں ایس دی قدر ناہیں میری زندگی عشق دے وچ مرنا
جاہل عاشقاں نوں ایویں دیہن طعنے کتے باورے لگے جین مگر ہرنا
وارث شاہ اک رب دی مہر باجھوں نہیں عاشقاں آسرا ہور پھڑنا

[ہیر رانجھے کی تسلیاں کرتی ہے کہ میری بات کی طرف غور کرو۔ ہمارا ٹھکانا جاسدوں دشمنوں میں ہے مصائب کو صابر بن کر برداشت کرنا چاہئے بحر عشق کی لہر قاتل ہوتی ہے یا تو یہ بہا لے گئی یا ڈبو گئی۔ دوسرے کیدو مجسم شیطان ہے موقع پانے پر وہ کیا کچھ نہ کرے گا۔ ہمیں صبر و شکر سے کام لینا چاہئے اور خاموشی سے رنج والم سہنا ہوگا۔ کیونکہ عشق کی اوکھلی میں سر دے کر غم والم کی دھمکیوں سے ڈرنا مناسب نہیں۔ ہمیں بھنور کا خوف مطلق نہیں اس بحر میں سے ہم تیر نکلیں گے۔ شاید تمہیں اس کی قدر نہ ہو میری تو زندگی ہی عشق میں مرجانا ہے۔ جاہل لوگ عشاق کو اسی طرح لعن وطعن کا نشانہ بناتے ہیں۔ جیسے دیوانے کتے ہرنوں کے تعاقب میں ہوں رائے وارث شاہ ایک خدا کی مہر کے سوا عشاق اور آسرا نہیں ڈھونڈیں گے]

ان اشعار میں ایک عاشق صادق کے دلی جذبات کا اظہار ہے۔ ہیر کو اپنے جذبہ عشق و وفا پر کامل اعتماد ہے۔ اسے لوگوں کے مضحکہ اور تمسخر بازی کی کچھ پروا نہیں۔ آخر کار ہیر کے اٹل عقیدے کے مطابق عاشق اس بحر عشق سے تیر نکلے گا۔ آہ اے محبوب! شاید تو اس گنجینۂ بے بہا اس گوہر آبدار، عشق کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے۔ ارے میں تو اس راہ میں مرجانے کو ہی حقیقی زندگی تصور کرتی ہوں" ہیر کے یہ الفاظ اس کے جذبۂ عشق کے دوام کی تصدیق کرتے ہیں۔

جب ہیر کے والدین اس کی نسبت سیدے کھیڑے سے کر دیتے ہیں تو ملاقات ہونے پر ہیر رانجھے کو اس طرح مخاطب کرتی ہے:۔

تیریاں دولتاں رانجھیا لٹ لیاں ایہناں ظالماں کھیڑیاں گھت گھیرا
روز ازل دا ندھ نال نہوں لگا ضامن رب رسول گواہ میرا
تیری وات اتوں صدقے کراں کھیڑا بجھ گیا کیوں سجناں جی تیرا
سیدے کھیڑے دے سر سواہ پا کے تیرے سر ہیں لا وساں تیرا
کیاں میں کی چلے نہ وس میرا نہیں نال وند لیندی ادھا دکھ تیرا
مر جاؤنا آونا نہیں مڑ کے وارث جگ اُتے اکو ہے پھیرا

[آہ اے رانجھا ان ظالموں نے مل کر تیری دولت لوٹ لی۔ میری محبت تجھ سے روز ازل کی ہے خدا اس کا ضامن اور رسول شاہد ہے۔ تیری راہ سے کھیڑے قربان کروں۔ اے محبوب! تیرا دل کیوں بجھ گیا۔ میں تو سیدے کے سر خاک جھونک کر آخر تیرے ہی سر سہرا باندھوں گی۔ میں کیا کروں میرا اختیار نہیں چلتا ورنہ تیرا آدھا دکھ بٹا لیتی۔ ایک دفعہ مر کر پھر واپس نہیں آنا۔ دنیا پر بقول وارث ایک ہی بار آنا ہے]

واقعی بیچارے رانجھے کی متاع گم تھا۔ اس کی حاصل زندگی۔ اس کی نشاط روح لٹ چکی تھی۔ اس کی تمام امیدوں اور خواہشوں کا جنازہ نکل رہا تھا ؎

کیوں نہ ہو عرش تک بلند فغاں چشم تر سے ہوں کیوں نہ اشک رواں
خرمن سوختہ ہے پیش نظر مثل سیماب کیوں نہ دل ہو تپاں

(صادق)

اندریں حالات اگر رانجھے کا دل بیٹھا جا رہا تھا تو یہ عین فطری امر تھا۔

اب ذرا ہیر کی زبانی عشق کی مزید وضاحت سن لیجئے۔ ہیر کی برات آجاتی ہے۔ قاضی نکاح پڑھنے کے وقت اسے سیدے کے ساتھ نکاح قبول کر لینے کو کہتا ہے۔ وہ انکار کرتی ہے اور ببانگ دہل اعلان کرتی ہے کہ میں اپنے دل کی متاع رانجھے کے سپرد کر چکی ہوں۔ سیدو کے ساتھ میرا نکاح نہیں ہو سکتا۔ قاضی اس کے عشق کو فرضی اور ناجائز اور دعوئے محبت کو باطل قرار دیتا ہے۔ ہیر قاضی کو عشق کی حقیقت سے یوں آگاہ کرتی ہے۔ قاضی صاحب ذرا کان کھول کر سنئے:۔

ہیر آکھیا عشق دے راہ پونا کم نہیں ملوانیاں قاضیاں دا
ایس عشق میدان دیاں کٹھیاں نوں رتبہ کربلا دے ہے غازیاں دا
تربت وچ درگاہ قبول ہووے سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی ایہہ کم نہیں جھوٹھیاں پاجیاں دا
کر کے قول زبان تھیں ہار جانا فعل بے ایماناں دھوکے بازیاں دا
عشق سر ہے ذات خدائیدا دے عاشق شان دیکھن کارسازیاں دا
جدوں کدوں کرے دا ترس عاشقاں نے مالک رب غریب نوازیاں دا
وارث شاہ حقیقی دی لین لذت پہلوں چکھ کے لون مجازیاں دا

[ہیر نے کہا کہ عشق کی راہ پر چلانا ملاؤں اور قاضیوں کا کام نہیں۔ میدان عشق میں مرنے والوں کا مرتبہ کربلا کے غازیوں کے برابر ہے۔ پاک باز مصلوۃ عشاق کا سجدہ درگاہ خداوندی میں جلد قبول ہو جاتا ہے۔ سچائی کے راستے پر جان دے دینا جھوٹے اور ریاکار لوگوں کا کام نہیں۔ زبان سے لفظ نکال کر اس پر قائم نہ رہنا مکار اور دغا بازوں کا فعل ہے۔ عشق تو ذات الٰہی کا ایک بھید ہے۔ عاشق قادر مطلق کی کارسازیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ غریب نواز پروردگار جب کبھی عشاق پر نظر کرم کرتا ہے تو اے وارث وہ مجازیات کا ذائقہ چکھ کر حقیقت کی لذت حاصل کرتے ہیں]

یہاں عشق کی حقیقت نہایت موثر الفاظ میں بیان کی گئی ہے اور وعدہ خلاف کے متعلق بہت جوش کے ساتھ اظہار نفرت کیا گیا ہے۔ ع

کر کے قول زبان تھیں ہار جانا فعل بے ایماناں دھوکے بازیاں دا

اور پھر مجاز اور حقیقت کے معمے کا حل چند الفاظ میں کر کے رکھ دیا ہے۔

عشق کے متعلق کتاب میں جگہ جگہ شاعر نے حکیمانہ افکار کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے ؎

اول حمد خدا دا ورد کیجے عشق کیتا سو جگ دا مول میاں
پہلوں آپ ہی رب نے عشق کیتا تے معشوق ہے نبی رسول میاں
بناں عشق درگاہ تھیں پلن دھکے بناں عشق نہ کجھ مقبول میاں
عشق باجھ بے سود نے کم سارے عشق وچ دا اصل تے مول میاں

[پہلے حمد الٰہی کہیں جس نے عشق کو حاصل دنیا بنایا پہلے خدا نے خود ہی راہ عشق میں قدم رکھا۔ معشوق نبی کریم ہے عشق کے بغیر درگاہ سے نکال دیا جاتا ہے اس کے بغیر کچھ بھی مقبول نہیں۔ تمام کام اس کے بغیر بے سود ہیں۔ عشق ہی زندگی کے بیوپار کا اصل زر اور سود ہے]

قاضی کے زبردستی نکاح پڑھ دینے پر ہیر خشمناک ہو کر اسے مخاطب کرتی ہے۔

ہیر آکھیا قاضیا دغا کیتو کی وٹنا ایں ایس جہان توں جی
بنا پچھیاں پڑھیں نکاح میرا ایہہ فتوے نہیں قرآن توں جی
لے کے رشوتاں کریں خوشامداں توں نہیں سنگدا رب بربان توں جی
جھوٹھی دنیا تے شان گمان جھوٹھا کیوں پھڑنا ایں آپ ایمان توں جی
جیہا کیتوئی ملگ سزا تینوں باویں بدلہ رب رحمان توں جی
وارث شاہ کجھ عمل کما چنگے اد تر جائیں گا ایس جہان توں جی

[ہیر نے کہا اے قاضی! تو نے دغا دیا اس جہان سے کیا حاصل کرنا ہے تو بغیر میری رضامندی کے نکاح پڑھتا ہے یہ مسئلہ قرآن سے نہیں ہے۔ رشوت وغیرہ قبول کر کے تو خوشامد کے طور پر ایسا کرتا ہے اور خدائے قہار سے نہیں ڈرتا ارے نادان! یہ دنیا اور یہ شان وگمان تو باطل ہے تو کیوں ایمان کھو بیٹھا۔ جیسا کیا ہے تمہیں ویسی ہی خدائے رحیم سے سزا ملے گی (اے وارث) بھائی کچھ نیک عمل پیدا کرلے ورنہ اس جہاں سے ناکام ونامراد جائے گا۔]

ارے تجھے کیا خبر کہ قرآن کا فتوے کیا ہے تو تو ایمان فروش ہے۔ آہ اے بندۂ حرص وہوا! اس دار فانی سے اگر کچھ ساتھ جائیں گے تو نیک اعمال ہیں تیرے۔ خیر جیسا کرو گے وہ قادر عدل پرور ویسی ہی سزا تمہارے لئے تجویز کرے گا۔" ہیر کی یہ تقریر قاضی کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہونی چاہیئے تھی۔

جب ہیر کو زبردستی کھیڑوں کے ساتھ بیاہ کر روانہ کر دیا جاتا ہے تو وہ روانگی کے وقت ایک دردناک پیغام چھوڑتی ہے۔ اپنی بے بسی کا خاکہ چند الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

ڈولی چڑھ دیاں ہیر فریاد کیتی لے ہن رانجھیا ہویاں جدائیاں وے
اپنے دلوں تے بڑے زور لائے ایہہ رب تقدیر کرائیاں وے
نزع وقت نہ مشکلاں حل ہوون اکھیں دید دے باجھ پتھرائیاں وے
ہوئی ہیر پردیسن آج تیری پیاں دوستا کٹھن جدائیاں وے
وفاداریاں کیتیاں تدھ نے سن ڈاہڈی تیں دلوں شرمائیاں وے
تیرا باغ امید دا اجڑ گیا کیہاں چلیاں خزاں دیاں وائیاں وے
توں بھی صبر کر اپنے نصیب اتے منیاں رب دیاں ہیں رضائیاں وے
سنجے محل تے ماڑیاں ویکھ کے تے چیکاں ماریں نہ وانگ سودائیاں نوں
اوکھے ویلے نہ کوئی دی کم آوے سب سہیلیاں ہیں ازمائیاں وے
ڑ جا تخت ہزارے نوں سجناں وے کریں بھائیاں نال جفائیاں وے

ایس خیال تھیں سینے وچ چیک پوے طعنے دین گیاں تینوں بھرجائیاں نوں
ایہہ پیچھے وی تیرا نہیں کوئی سجن وارث کرن گے سخت برائیاں نوں

[محافہ میں بیٹھتے وقت ہیر نے فریاد کی کہ اے رانجھے اب وقت فرقت آپہنچا۔ اپنی طرف سے تو کافی جدوجہد کی مگر یہ سب کام تقدیر الٰہی کے ہیں۔ آخری وقت مشکلات حل نہیں ہوسکتیں میری آنکھیں تمہیں نہ دیکھنے سے پتھرا گئی ہیں۔ آہ اے محبوب! تمہاری ہیر آج پردیسن ہوگئی ہے اور سخت فراق نے گھیر لیا ہے۔ تم میرے ساتھ وفاداری کرتے رہے تھے۔ میری طرف سے میں بہت شرمسار ہوں۔ آہ یہ کیسی باد خزاں چلی کہ تیرا گلشن امید اجڑ گیا۔ میں نے تو رضائے الٰہی قبول کرلی تو بھی اپنی قسمت پہ صبر وشکر کر کہیں خالی محلات دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخ ویکار برپا نہ کر دینا۔ میں تمام سکھیوں کو آزما چکی مشکل پڑنے پر کوئی بھی کام نہیں آتا۔ میرے حبیب! اب تو تخت ہزارے کی طرف چلا جا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ محنت ومشقت کر۔ اس خیال سے میرے سینے میں ٹیس اٹھتی ہے کہ تیری بھاوجیں تجھے طعنے دیں گی۔ مگر یہاں بھی تو تیرا کوئی غمخوار نہیں یہ لوگ (اے وارث) تیرے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے]

نہایت دردناک اور موثر الفاظ میں رانجھے کو اپنی تقدیر پر شاکر اور راضی بہ رضائے الٰہی رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا ہے کہ مصیبت کے وقت اچھے سے اچھا ساتھی بھی کام نہیں آتا۔

اوکھے ویلے نہ کوئی دی کم آوے سب سہیلیاں ہیں آزمائیاں نوں

رانجھا فرطِ غم سے مجبور ہو جاتا ہے اور ایک الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ شادی کا ہنگامہ باجوں کی جھنکار اور شور وغل اس کے دل میں ناسور پیدا کرنے کے لئے کیا کم تھے کہ ہیر بھی اب اسے چھوڑ کر جا رہی ہے اور اس کی تسلی اور تشفی کے لئے اسے اپنی تقدیر پر شاکر رہنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ ہیر اس کے غم واندوہ کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔ اس کی یہ طفل تسلیاں ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی بجائے اور بھی ریزہ ریزہ کرنے والی تھیں۔ شدت غم کی وجہ سے اب اسے ہیر پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ ہیر کے مندرجہ بالا پیغام کا جواب وہ یوں دیتا ہے:۔

موہوں مٹھڑے تے دلوں کھوٹڑے نی اینویں جھوٹ دے قصے نہ جوڑ ہیرے
بڑے چانال بیٹھی ایں وچ ڈولی رانجھے نال محبتاں توڑ ہیرے
نال کھیڑیاں دے رشتہ گنڈھیوئی کر کے رانجھے نال انجوڑ ہیرے
خوشی نال سویں توں سیج اتے رڑکن اکھیاں میریاں روڑ ہیرے

تیرے عشق نے ڈیلے وانگ ہیری ساری لئی لے رسا نچوڑ ہیرے
مینوں وچ اوجھاڑ دے سٹ ہوئی چاہئے عشق نبھاوناں توڑ ہیرے
تیرے جیو پر چان دے لکھ جیلے مینوں ہے گی تدھ دی لوڑ ہیرے
تیرے ہجر والا خار دار ورما میرے کالجے نوں ہاسی کھوڑ ہیرے
تیرے کول وفادی بونا ہیں بے وفا ہیں سخت انموڑ ہیرے
وارث عشق دے وید حکیم بھالے دل بیماردوں پئی نہ موڑ ہیرے

[آہ اے ہیر! اے میٹھی زبان اور کھوٹا دل رکھنے والی ہیر! اس طرح افسانہ طرازی سے باز رہ۔ تم تو بڑے چاؤ سے ڈولی میں بیٹھی ہو۔ رانجھے غریب سے پیمان الفت توڑ دو۔ تم نے کھیڑوں کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے اور رانجھے سے قطع تعلق کیا ہے اب مخمور ہو کر بساط پر سوئے گی اور میری آنکھوں میں کنکر محسوس ہوں گے۔ تمہارے عشق نے بیلنے کی طرح میرے جسم سے رس نچوڑ لیا ہے۔ مجھے راہ کے درمیان میں ہی چھوڑ گئی ہو۔ عشق کر تو اس سرے تک قایم رکھنا چاہئے۔ تمہارے دل بہلانے کے لاکھوں بہانے ہیں۔ مگر مجھے تو تمہاری ضرورت ہی رہے گی۔ تمہارے ہجر کا خار دار برما میرے کلیجے میں سوراخ کر دے گا۔ آہ اے ہیر! تو سخت بے وفا اور خود رائے ہے تیرے پاس تو وفا کی بو بھی نہیں۔ اے وارث! میں نے مرض عشق کے کئی اطبا دیکھے مگر دل بیمار کا حال بہتر نہ ہوا]

یہ عاشقانہ غلط فہمی ہے جو شدت غم سے اکثر ایسے لوگوں کو ہو جایا کرتی ہے۔ رانجھا خیال کرتا ہے کہ ہیر اسے عمداً چھوڑ کر کھیڑیوں کے ساتھ جا رہی ہے۔ وہ عشق و محبت سب کچھ بھول چکی ہے اور ہنسی خوشی اب سسرال جا رہی ہے۔

بڑے چاؤ نال بیٹھی ایں ونج ڈولی رانجھے نال محبتاں توڑ ہیرے

اور پھر اپنے مرض عشق کا حال ہے کہ تمام اطبا و وید صاحبان عاجز آ گئے ہیں ؎

مریض عشق پر رحمت خدا کی — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہیر یہ سن کر بولی

میرے رانجھنا کہے خیال ہیوں سیدے نال ناں ہیں رشتہ گنڈھناں ہیں
آپے سُن لیئیں سارے کھیڑیانوں ہیں تاں ٹچہ برادری بھنڈناں ہیں
جیکر ہتھ لائے میرے جسم تائیں مُنہ سیدے دا مار ہیں چھنڈناں ہیں
وارث شاہ دو دستھڑاں مار کے تے رُنّی وانگ مُنہ اوس دا چھنڈناں ہیں

[میرے پیارے رانجھا! تو کس خیال میں ہے۔ میں اور سیدے سے تعلق پیدا کروں! تو خود ہی سن لے گا کہ میں تمام کھیڑیوں کو برادری میں ذلیل کرتی ہوں۔ اگر سیدا مجھے ہاتھ لگائے تو تھپڑ مار کر اس کا منہ سرخ کر دوں اور دونوں ہاتھوں سے روئی کی طرح اس کا منہ سینک دوں گی]

ہیر نے تیرے رانجھنا کہہ کر تمام شبہات کو دور کر دیا ہے جو ایک ناکام و نامراد دل میں پیدا ہو چکے تھے۔

رانجھا جوگی بن کر ہیر کے دروازے پر آتا ہے اور سہتی سے اس کی تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں ہیر گھونگٹ نکالے وہاں آ پہنچتی ہے گھونگٹ کی وجہ سے اس نے رانجھے کی طرف نہ دیکھا اور نہ ہی اسے پہچانا۔ جوگی کا دعوے تھا کہ

اسیں فقر اللہ دے ہاں پورے کجھ منگ لے ساں تھیں گور ہیئے نی
کرئیے مطلب سب جہان پورے تقدیر خدا نہ موڑیئے نی
سوال کسے دا مول نہ رد کریئے دن رات ہی رب نوں سوہیئے نی
یار چھڈ کے یار نوں نس جائے نقش لکھ کے جوڑنا جوڑیئے نی
اساں رُٹھڑے یار ملا دتے دکھ درد دلدراں تے ڑسیئے نی
سر تے آئی بلا نوں ٹال دئیے حکم رب دے نال جا موڑیئے نی

[ہم خدا کے کامل فقیر ہیں۔ اے حسینہ ہم سے کچھ مانگ لے۔ ماسوائے تقدیر الٰہی سب دنیا کے کام پورے کر دیتے ہیں۔ ہم دن رات خدا کی یاد میں رہتے ہیں اور کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ اگر کوئی حبیب اپنے محبوب کو چھوڑ کر چلا گیا ہو تو ہم نقش لکھ کر ان کو ملا دیتے ہیں۔ ہم نے روٹھے ہوئے دوست ملا دیئے اور درد دکھ سہل انگاری دور کر دیتے ہیں اور سر آئی بلا کو حکم ربانی سے ٹال دیتے ہیں]

یہ سن کر ہیر کا جذبۂ عشق ہیجان میں آ جاتا ہے۔ آتش فراق کے شعلے اس کی رگ رگ میں دوڑ جاتے ہیں اور اس کی تپش اسے بے چین کر دیتی ہے۔ مگر وہ شرمیلی دلھن کی طرح ان جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی بلکہ کہتی ہے۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار ملاوندا ای
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای
میرا جیو جامہ جیہڑا آن میلے سر صدقہ اوسدے ناوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک لاوندا ای

[ہیر نے کہا اے جوگی تو جھوٹ بولتا ہے۔ بھلا روٹھے احباب کو کون ملا سکتا ہے۔ میں تو ڈھونڈتی ڈھونڈتی تھک چکی ہوں مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جو رفتگان کو واپس لے آئے۔ وہ جان جاں جو مجھے ملا دے اس کے نام پر اپنا سر قربان کر دوں۔ اے نادان

جگی بھلا رجانے والے اور بچھڑ جانے والے کون ملا سکتا ہے۔ لوگ یوں ہی جھوٹی ترغیب دلوں کو دیتے ہیں]

افسانے کا یہ پارٹ بہت ڈرامیٹک ہے۔ ہیر کو معلوم نہیں تھا کہ س کی آرزوؤں کا مرکز اس کے خوابوں کا سرتاج اس کی توجہات کا نشانہ اور س کے جذبات کا مقصود اس کے سامنے ہی کھڑا ہے جسے مخاطب کر کے لد کہہ رہی ہے کہ

ایسا کوئی نہ ملیا ہیں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑلیاوندائی

کتاب میں ایسے مقام بہت ہیں جہاں قابل مصنف نے عام اخلاقی اور معاشرتی باتیں اچھے خاصے فصیح اشعار میں بھر دی ہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مقامات سے اشعار دئے جاتے ہیں :۔

(کلام جوگی باہتی)

رانجھے جیڈ نہ ہے بدبخت کوئی عشق ہیر ہے سپ سنگچور جیہا
کھیڑیاں جیڈ نہ نیک نصیب کوئی کوئی تھاؤں نہ بیت معمور جیہا
احمد جیڈ نہ کوئی سوہنا حسن اندر یوسف حسن ہے رنگ کافور جیہا
قارون جیڈ نہ ہتھ بخیل کوئی تے غریب نہ سخت مجبور جیہا
زمین جیڈ نہیں صابری کسے دی تے بے شرم نہیں کوئی مغرور جیہا
فاقے کٹنے تے سولی چڑھ جانا رتبہ عشق سخاوت منصور جیہا

[رانجھے جتنا بدبخت کوئی نہیں اور ہیر کا عشق ایک سانپ زہریلے کی مانند ہے کھیڑیوں جتنا نیک نصیب کوئی نہیں اور بیت معمور جیسی اور کوئی جگہ نہیں احمد مرسل جتنا حسین اور کوئی نہیں حسن یوسف کافور جیسا ہے قارون جیسا بخیل کوئی نہیں اور بندہ مجبور جتنا بے کس کوئی نہیں زمین جتنا کوئی صابر نہیں اور مغرور جتنا بے شرم کوئی نہیں۔ کھانے پینے بغیر رہنا اور دار پر لٹک پڑنا یہ رتبہ عشق منصور جیسوں کو نصیب ہوا]

(کلام جوگی باہتی)

عدل بنا سردار ہے رکھ اپھل رن گدھی جو وفادار ناہیں
ناز بناں ہے کنجنی بان جیہی مرد گدھا جو عقل دا یار ناہیں
عمل باہجھ عامل کوئی نہیں ہوندا کتب لدیا خر کسے کار ناہیں
پانی باہجھ دریا بھی نہیں وہندے استغفار باہجوں چھٹکار ناہیں
فقر ہوئے کے صبر نہ کرے جیہڑا جبہ فقر دا اوہ روادار ناہیں
شرم باہجھ مچھاں بنا عمل داہڑی طلب باہجھ فوجاں بھرم بجا ناہیں
ہمت باہجھ جوان بن حسن دلبر لون باہجھ طعام سوار ناہیں

عقل باہجھ وزیر صلوٰۃ مومن تے دیوان حساب شمار ناہیں
بے پرواہیاں بناں معشوق ناہیں سراں دتیاں باہجھ دیدار ناہیں
وارث رن فقیر تلوار گھوڑا چارے تھوک ایہ کسے دے یار ناہیں

[بغیر انصاف کے سردار بے پھل درخت کی مانند ہے بے وفا عورت گویا گدھی ہے۔ ناز و ادا سے عاری کنجنی بان جیسی ہے اور بے عقل مرد گدھا ہے۔ بغیر عمل کے کوئی عامل نہیں ہو سکتا بار کتب بر خرے کسی کام نہیں۔ پانی کے بغیر دریا کیسے بہیں اور توبہ کے بغیر چھٹکارا کیسے حاصل ہو! جو فقیر صابر نہ ہو وہ جبہ فقر کا سزاوار نہیں۔ مونچھوں کی موجودگی بغیر شرم کے اور داڑھی بغیر عمل کے اور فوجیں بغیر کسی طلب کے فضول ہیں۔ ہمت کے بغیر جوانمرد حسن کے بغیر دلبر اور نمک کے بغیر طعام درست نہیں عقل سے خالی وزیر۔ نماز سے خالی مومن اور حساب دانی سے خالی دیوان نہیں ہو سکتا معشوق کے سوا بے پروا اور کون ہوگا جس کا دیدار سر کٹوائے بغیر نہیں میسر آ سکتا۔ اے وارث عورت۔ فقیر۔ تلوار۔ گھوڑا یہ چاروں چیزیں کسی کی دوست نہیں۔

(کلام ایضاً)

جیٹھ مینہہ تے سیال وچ واسندی کتک ماہ وچ منع اندھیریاں نی
رونا ویاہ وچ گاونا وچہ سیاپے سنز مجلساں کرن مندیریاں نی
چغلی خاوندادی بدی نال ملاں کھان لون حرام بدخیریاں نی
حکم ہتھ کمذات دے سونپ دینا نال دوستاں کرنیاں ویریاں نی
مڑن قول زبان تھیں پھڑن پیراں بریاں دناں وچ ایہہ بھی پھیریاں نی
خصماں نال برابری کرن رناں نہیں چنگیاں ایڈ دلیریاں نی
بھلی نال بھلیاں بدی نال بریاں یاد رکھ نصیحتاں میریاں نی
بناں حکم دے مرن نہ اوہ بندے ثابت جنہاں دیاں رزق دیاں ڈھیریاں نی

ماہ جیٹھ میں بارش اور سردیوں میں ہوا بری ہے اسی طرح ماہ کاتک میں آندھیاں غیر ضروری ہیں۔ شادی کی محفل میں گریہ اور مجلس عزا میں نغمہ سرائی۔ پردہ دار گھروں میں مجلسیں نہایت معیوب ہوتی ہیں۔ شوہر کی غیبت اور ملا کے ساتھ بدی اور نمک حرام کرنا برا کام ہے۔ کمینے کو حاکم مقرر کرنا اہل وفا سے دشمنی کرنا ہے جو زبان سے پھر جائے اور مرشد ڈھونڈتی پھرے اس عورت کے گویا برے دن پھر آئے ہیں۔ اسی طرح خاوندوں سے برابری کرنا عورتوں کو زیبا نہیں نیکوں سے نیکی اور بدوں سے بدی کر اور میری یہ نصیحت یاد رکھ۔ حکم الٰہی کے بغیر وہ مرد نہیں مر سکتے جن کا رزق سالم ہے۔

(کلام ہتی باجوگی)

دوست سوئی جو بپت وچہ بھیڑ کٹے یار سوئی جو جان قربان ہووے

شاہ سوئی جو کال وچہ ڈکھ کٹے گل بات دا جو نگہبان ہووے
کواری سو جو کرے حیا بہتا نیویں نظر تے بابجہ زبان ہووے
بناں جنگ تے چور تے ملک وسے پٹ سوئی بن آنڈیوں پان ہووے
علم ہے اوہو جس تے عمل ہویا یاد معنیاں نال قرآن ہووے
نہیں رب نوں اوہ پچھان سکدا جنہوں نفس دی ناں پچھان ہووے
سید سوئی جو شوم نہ ہووے کاذب زانی سیاہ نہ نہ قہروان ہووے
چاکر عورتاں سدا بے عذر ہوون اتے آدمی بے نقصان ہووے

دوست وہی ہے جو مصیبت میں کام آئے اور عاشق وہی ہے جو جان قربان کرے۔ بادشاہ وہی ہے جو قحط میں مصائب کا خاتمہ کرے۔ اور ہر بات کی نگہبانی کرے۔ دوشیزہ وہی ہے جو بہت باحیا ہو اور آنکھیں نیچے رکھے اور بے زبانوں کی طرح ہو۔ خوشحال ملک وہی ہے جو جنگ وجدل اور چوری چکاری سے محفوظ ہو۔ اسی طرح ریشم وہی ہے جس میں انڈے کی پان نہ دی گئی ہو علم وہی جس پر عمل ہوا قرآن تب ہی یاد ہوا جب معانی حفظ ہوں۔ وہ شخص خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا جس کو اپنے نفس کی پہچان نہ ہو۔ سید وہی ہے جو بخیل۔ کاذب۔ سیاہ وزانی یا غضیل نہ ہو۔ غلام عورتیں ہمیشہ بے عذر ہوتی ہیں اور ایسے مرد بے چارے بے خطر ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ کتاب میں ہزارہا اخلاقی پند ونصائح بیان کئے گئے ہیں جو اپنی حقیقت کی وجہ سے بطور ضرب الامثال زبان زد عوام ہو چکی ہیں۔ مشتے از خروارے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ع۔ وارث سپ دا ڈنگیا ہوئے اچھا اچھا ہووے نہ جیبھ دا ڈنگیا وے
اے وارث سانپ کا کاٹا اچھا ہو جائے مگر زبان کا کاٹا درست نہ ہو۔

۲۔ع۔ اک بابجہ عقل بازی جت لیندا اک عقل والا بازی ہار دا نی
ایک عقل کے بغیر بازی جیت لیتا ہے اور ایک عقل کے باوجود شکست کھاتا ہے۔
[کیمیا گر بغصہ مردہ ورنج ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج]

۳۔ع۔ جیہڑا رب دے نام تے بھلا کردا اگے ملن گیاں اوس بھلیائیاں نی
جو خدا کے نام پر نیکی کرتا ہے قیامت کے دن اسے نیکیاں نصیب ہونگی

۴۔ع وارث شاہ وساہ کی زندگی دا بندہ بکرا ہتھ قصائیاں دے
وارث شاہ زندگی کا بھروسہ نہیں آدمی مثل اس بکرے کے ہے جو قصاب کے ہاتھ میں ہو۔ ..

۵۔ع وارث شاہ تد عشق دی نبض وسے جدوں آپنے آپ نوں تجئے نی
وارث نبض عشق تب محسوس ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو بھلا دیا جائے۔

انسان کی ہستی کی بے ثباتی کے متعلق ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

۶۔ چھاں بدلاں دی عمر بندیاں دی عزرائیل نے پاڑ نا سینیاں ایں
بھانویں تخت بہے بھانویں زمیں سویں آخر خاک دیوچہ رلیونا ایں
اج کل جہان دا سیج میلا کسے نت نہ حکم نے تھیونا ئیں
وارث شاہ میاں انت خاک ہونا لکھ آبحیات تے پیونا ئیں

[انسانی عمر بادلوں کے سائے کے مطابق ہے آخر کار عزرائیل جان ہستی پھاڑ دیگا۔ خواہ کوئی تخت پر بیٹھے خواہ زمین پر سوئے۔ انجام کار خاک میں مل جائے گا۔ یہ دنیا چند روز کا تماشہ ہے۔ کسی کو ہمیشہ احکام برداری نہیں کرواگی بقول وارث آخر کو خاک ہونا ہے خواہ لاکھ دفعہ بھی آبحیات کیوں نہ پیا گیا ہو]

جی تو چاہتا ہے کہ ایسے اشعار سناتا ہی جاؤں مگر مجھے خوف ہے کہ یہ مضمون ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہو جائے۔ اس جگہ اس بات کا اظہار نہایت ضروری ہے کہ وارث شاہ نے بعض جگہ نہایت عریاں اور اخلاق کے درجے سے گرے ہوئے اشعار کو قلمبند کیا ہے۔ چنانچہ ہیر جب جوگی سے باغ میں ملاقات کر کے واپس آتی ہے تو رائیاں اور صبر فاں نامی دو سہیلیاں ہیر کو نہایت اخلاق سوز طعنے دیتی ہیں اگر کتاب ان فحش اشعار اور دیگر تمام عریاں خیالات سے پاک ہوتی تو بہتر ہوتا۔ بعض اشعار تو اس قدر عریاں ہیں کہ مجلس میں اُن کا پڑھنا اپنی بے حیائی کی دلیل پیش کرنے کے مرادف ہے۔

وارث کا دماغ پنجابی الفاظ کی ایک زبردست انسائیکلو پیڈیا ہے "ہیر" کے بعض الفاظ زبان کی تدریجی ترقی کی وجہ سے آج کل کچھ غیر مانوس سے ہو گئے ہیں مگر پھر بھی ہمیں وارث شاہ کی بے پناہ شاعرانہ الفاظ جوئی اور الفاظ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے۔

کتاب ڈرامائی طریق پر لکھی گئی ہے اور افسانہ کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے جگہ جگہ "مقولہ شاعر" کے عنوان سے اشعار لکھے گئے ہیں جو افسانہ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے علاوہ حالات مندرجہ پر شاعر کے خیالات کا اظہار رہوتا ہے۔

ہیر کی زبان خالص پنجابی ہے مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے

وارث نے بحیثیت پنجابی کے علاوہ کسی دیگر زبان کا کوئی لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ کتاب میں عربی فارسی کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً قبول۔ قلوب۔ نزول۔ صدق۔ برص۔ جذام منضبط۔ علی الحساب۔ غلطان۔ سرعت۔ تجویز۔ ساعت وغیرہ مگر یہ درست ہے کہ پنجابی الفاظ اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہیں اور زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ وارث نے فطرت انسانی کے تمام ظاہری اور پوشیدہ پہلوؤں کی تصویریں صفحہ صفحہ پر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ ہیر پنجابی ادبیات کا ایک غیر فانی شاہکار اور عدیم المثال مجموعہ ہے۔ عشق و محبت۔ حسرت و ارمان۔ سوز و گداز۔ عیش و مسرت۔ فقر و امارت۔ علم و عقل۔ مذہب و اخلاق۔ صبر و سکون۔ ہجر و اضطراب۔ بے وفائی و عہد شکنی۔ وصل اور شوق اور اس قسم کے تمام دیگر جذبات اور حقائق کے بہترین نقشے اور بہترین توضیحات ہیر میں مل سکتی ہیں۔ انسانوں کی عادات۔ عورتوں کی مکاری۔ حُسن، شہرت، عورت کی اصلیت۔ بے ثباتی عالم۔ ہیجان جذبات وغیرہ پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادبی حیثیت سے ہمیں اشعار میں بعض مقامات پر اسقام دکھائی دیتے ہیں، مگر ہیر گا کر پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی اور گانے میں وہ تمام ادبی اغلاط جو تقطیع اور عروض کے دیگر شعبے پیش کرتے ہیں غائب ہو جاتی ہیں۔ مقصد تو ایک وجد انگیز اثر ہے جو سامعین میں فوراً پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک خاص لے اور ترنم سے ہیر کو پڑھنے والے پنجاب کے گاؤں گاؤں میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مسحور کن طرز بیان اور ترنم ریزی سننے والوں کے دلوں میں اتر تی جاتی ہے۔ پنجاب کی عظیم الشان دیہاتی آبادی ہیر کو متعدد مقامات سے از بر کئے ہوئے ہے اور ہر مرد اپنی موجودہ حالت کے مطابق ہیر میں سے مقام ڈھونڈھ لیتا ہے تاکہ کنج تنہائی میں دل بہلانے کا سامان بہم پہنچے۔ ایک عام دیہاتی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکتا جس کے متعلق ہیر میں اشعار موجود نہ ہوں یہ اشعار ہماری معاشرت کا جزو بن چکے ہیں۔ گورو نانک نے بھی اپنی مقدس زبان میں فرمایا کہ

"مینوں رانجھے دا اٹھیر نگیرا جھٹھ کھیڑیاں دیاں سیجاں"

ہیر ہمارا قومی سرمایہ ہے اس میں ہماری دیہاتی زندگی کے مناظر کھنچے ہوئے ہیں۔ ہمارے گاؤں کی رومان بھری فضا دکھائی گئی ہے اور ہماری مشکلات روزمرہ پر ہیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

جھنگ گھیانہ میں ہیر کا شکستہ سا مقبرہ ابھی تک زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ یہ ایک بہت اونچے ٹیلے پر ریل کی لائن کے متصل جانب شرق واقع ہے۔ سیال نامی قوم کے افراد اب بھی بہت معزز ہیں اور ہیر کا تذکرہ اپنی مجالس میں وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس زبردست مخالفت کے باوجود مقبرہ اور اس کی ملحقہ جاگیر نہایت عاشقانہ احترام کے ساتھ قائم ہے۔ مقبرہ ایک محو انتظار عاشق کی طرح کھڑا ہے۔ ہیر رانجھے کی بارات کے انتظار میں ہی مر گئی تھی۔ مقبرہ کے روزن تخت ہزارہ کی طرف ہیں۔ رنگ پور کھیڑیاں کی طرف کوئی روزن نہیں۔ یہ روزن گویا عاشق خستہ حال کی ٹکٹکی میں لگی ہوئی آنکھیں ہیں جو اب سفید ہو چکی ہیں۔ مقبرہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ؛ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ہیر اور رانجھا دونوں راہ عشق میں ثابت قدم نکلے اور وفا کے پیمان پورے کرتے رہے مگر آہ یہ فلک ناہنجار قلوب انسانی کی انتہائی گہرائیوں سے نکلنے والے جذبات کو ہمیشہ کچل دیا کرتا ہے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے تو وہ بے چارے مر گئے مگر یہ موت ایک دائمی وصال تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے کوئی کھیڑے ہیر کو زبردستی نہیں لے جا سکتے کوئی کید و حسد نہیں کر سکتا۔ کوئی راتباں طعنے نہیں دے سکتی اور کوئی قاضی تکرار نہیں کر سکتا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد صادق قریشی رمداسوی بی اے

رباعی

چہرے سے ردائے شب تاری اٹھی
دوشیزۂ صبح سرمستی اٹھی
انوار جمال سے جگمگاتی اٹھی سعد حیات
مستی ناز و ادا سے ... صہبائی

دنیائے ادب

فصیح الملک

ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان، جہاں استاد، نواب مرزا خاں بہادر داغ دہلی کے لعلِ شب چراغ راقم الدولہ ظہیر دہلوی ان کے استاد بھائی تھے۔ ظہیر کا ناز تو دیکھو! کہتے ہیں۔ ؎

ہم بھی جناب داغ کے ہم درس ہیں ظہیر بلبل ہیں وہ تو طوطیِ ہندوستاں ہیں ہم

شعراء کی یہ سنت ہے کہ اپنے اپنے باکمال استاد کا ذکر خیر کہیں نہ کہیں کر جاتے ہیں جس سے اکتسابِ فیض پر روشنی پڑتی ہے مثلاً بحر کا یہ شعر:-

فیض پہنچا اک جہاں کو ان کی تحقیقات کا
حضرتِ ناسخ کا کیا کہنا جگت استاد ہیں

رند لکھنوی

جا کے اب حضرتِ آتش سے کرو عرض ارند معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

تسلیم لکھنوی

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیمِ دہلوی مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

نسیم بھرت پوری

دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر شاگرد ہے داغ دہلوی کا

خود داغ کہتے ہیں:-

بعد استاد ذوق کے کیا کیا شہرت افزا کلام داغ ہوا

اس موضوع پر سینکڑوں نہیں ہزاروں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں، جنابِ داغ کو دیکھئے کہ ان کی ہم درسی پر ان کے استاد بھائی فخر کرتے ہیں، اپنے آپ کو طوطیِ ہندوستان کہتے بھی ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں اہلِ ہندستان کی ہمدرسی کا شرف حاصل ہے ع

داغِ معجز بیاں ہے کیا کہنا

اب اور آگے بڑھئے امیر کا تعلق لکھنؤ سے داغ کا تعلق دہلی سے ان دونوں اسکولوں میں جو مغائرت تھی وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مغائرت پر معاصرانہ چشمک، سونے پر سہاگہ، باوجود اس کے صوفی باصفا امیر داغ کی غزل پہ غزل کہتے ہیں، مقطع ملاحظہ ہو!

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

امیر صاحب، داغ صاحب سے "دامنِ گلچیں" کے لئے غزل طلب کر رہے ہیں:-

"... موجودہ گلدستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے، اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند نامور شعرائے خوش فکر و خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے، آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقۂ نامور کی افسر ہے اور غایت مشتاقی سے اب غزل کہہ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہٰذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبعِ نازک پر جبر کر کے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے، مگر یہ پہلے سے کہے رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم غریبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیئے جائیں"۔

اچھا اسی سلسلہ میں امیر صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرمایئے:

"میرے پرانے یار پرانے غمگسار حضرت داغ سلامت

خداوند تعالیٰ یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہو گا۔ آپ حاسدانِ کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کریں، اربابِ کمال

؎ منشی صاحب کی جامعیت سے میں بیحد مرعوب ہوں لیکن تغزل کی حد تک کبھی تو داغ اور کبھی وہ داغ کہنا پڑتا ہے ۱۲

خصوصاً وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں۔ محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے، حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔"

تذکرہ "انتخاب یادگار" دیکھئے اس میں حضرت امیر مینائی جناب داغ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:۔

داغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور چوالیس برس کی عمر، صاحبِ دیوان شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگردوں میں فردِ کامل خوش مذاق ہونے میں یکتائی حاصل[1]

امام الفن حضرتِ جلیل۔ حضرت امیر مینائی کے خاص شاگرد اور جانشین ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل ہو کر بھی فرماتے ہیں ؎

داغِ فراقِ داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہلِ زباں کی ہے ہائے ہائے

حقیقت بھی یہی ہے ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ — اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

جلیل کے استاد بھائی مولانا ریاض خیرآبادی جلیل کے دیوان کی تاریخ کہہ رہے ہیں بھلا داغ کے ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ مگر نہیں موقع ہو یا نہ ہو ع

داغ اپنی جگہ جاتا ہے

دیکھئے! حضرت ریاض، داغ کو کس طرح یاد کرتے ہیں ؎

داغوں کے تھے باغ کھلے بعدِ داغ — کس سے کہوں دردِ نہانِ سخن
کس سے کہوں کون بنا بعدِ داغ — چارہ گرِ دردِ نہانِ سخن
داغ مٹے مٹ گئے استاد امیر — ہے سخن اب مرثیہ خوانِ سخن
رہ گئے "ہم" گردِ پسِ کارواں — نقشِ کفِ رہروانِ سخن
نقشِ کفِ پا بھی نہیں نقشِ آب — خاک سرِ آبِ روانِ سخن

غور کیجئے! اس "ہم" میں کون کون ہیں اور اُن کی "ہستی" کیا ہے! دیکھا آپ نے ریاض کا اعتقاد داغ کے ساتھ!

امیر مینائی کے ایک اور باکمال شاگرد ہیں۔ مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب انہوں نے مجموعہ مکاتیب شائع کر کے ہم شیفتگانِ اردو پر بڑا احسان کیا ہے، اس مجموعے کی ابتدا میں امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آخر عمر میں اُستاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے، تاہم صنم خانہ عشق کی جلوہ آرائی گلزارِ داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی"۔

یہ سب کچھ بجا و درست ہے لیکن اسی "موازنہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان اپنے اُستاد حضرت امیر مینائی ہی کی جانب زیادہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

شکوہِ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں قصاید باشوکت و فر کہتے ہیں اور سخنور باسرمایہ صاحب علم و فضل، داغ ان اوصاف سے معرا ہیں"۔

علامہ شبلی نے ثاقب صاحب کے ان دلائل تفضیل کو اسی کتاب کے "ریویو" میں یوں رد کر دیا ہے:۔

داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھلائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدد لی ہے کہ داغ کا سرمایہ علمی کچھ نہ تھا لیکن اہلِ عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔ فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے۔

اور نظامی کہتے ہیں ؎

کہ آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"۔

علامہ شبلی ہی اپنی ایک نظم میں دکن سے خطاب کرتے ہیں اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں اپنے آپ کو اور نواب مرزا خاں داغ کو اس طرح

---

[1] ہمارے بعض . . . ہم وطن بزرگوں نے بعض حاسدوں کے بہکانے کی وجہ سے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ داغ کو "دال منڈی" کے ناٹک نے مشہور کیا ہے۔ داغ جب یہاں آئے ہیں تو ان کی عمر (۶۰) برس سے بھی متجاوز ہو چکی تھی، امیر کا تذکرہ نکلنے کے وقت وہ صرف (۴۴) برس کے تھے مگر دیکھئے امیر صاحب نے ان کی تعریف کن لفظوں میں کی ہے!! دکن آنے سے پیشتر خود حضرتِ داغ اپنی شہرت روز افزوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

ہند سے تا بہ دکن داغ ہے شہرت تیری — اب تو کچھ اور ترا بختِ رسا کہتا ہے

شامل کرتے ہیں ع

شبلی سحر فن و داغ غزل خواں باتست

واہ کمال بھی کیا چیز ہے، وہ علامہ جو آگے چل کر "مجدد دین اسلام" میں شریک ہونے والا ہے اپنے بازو پر اس شان سے ایک غزل گو کو جگہ دے! میرے ایک دوست مجھ سے یہ فقرہ سن کر مجھ پر بہت برہم ہوئے تھے کہ:۔

آپ نے یہ کیا لکھ دیا، شبلی اگر دربارِ فضلا میں سنہری کرسی پر جلوہ فرما ہیں تو داغ بھی مسند آرائے شعر و سخن ہیں۔ خیر مولانا شبلی کے ساتھ مولانا حالی کی بھی رائے سن لیجئے:۔

غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے، آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا . . . ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور ادا کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی بہتات کے طرزِ ادا میں ایک شوخی اور تیکھا پن ہے، جو اسی شخص کا حصہ ہے (اقتباس از مقدمہ شعر و شاعری)

اسی رائے کی تائید میں اسی "مقدمہ" کا اور ایک مقام ہدیۂ ناظرین ہے:۔

ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے، اسی طرح دلی میں ذوق، ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے

واہ رے داغ واہ ؎

داغِ فراقِ داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہل زباں کی ہے ہائے داغ

مولانا حالی نے ہی جامع مکتوباتِ امیر مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب سے فرمایا کہ جناب مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ صاف شعر کو پسند کرتے تھے اور اس لئے اشعار داغ کے مداح تھے۔

جناب مولانا حالی نے خود حضرت امیر مینائی کے استاد حضرت اسیر سے سنا ہے کہ:۔

بھئی! مشاعرہ کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور مشاعرہ ختم ہونے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے[1]

یہی مولانا داغ کو ایک رقعہ لکھتے ہیں اور اس میں یہ شعر خواجۂ شیراز کا سرنامے پہ تحریر فرماتے ہیں ؎

آں سیہ چردہ کہ شیرینیِ عالم با اوست
چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست[2]

صاحبانِ ذوق "شیرینیِ عالم" پر نظر رکھ کے داغ کی کوئی ایک غزل پڑھ لیں، بخدا مزا آجائے گا مزا۔ یہ لطف سخن خداداد ہے۔

مولانا حالی نے ہی بطور پیشین گوئی ایک شعر کہا تھا۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میں تو اس پیشین گوئی کا قائل ہوں اور آپ!
بندہ پرور منصفی کیجے خدا کو دیکھ کر

زمانہ ہوا مولانا حالی کی ایک غزل "مخزن" کے ایک قدیم پرچہ میں ہم نے دیکھی تھی جس کا مقطع اب بھی ہمارے ضبطِ ذہن ہے ؎

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلامِ داغ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بعد کسی اور نقاد کی رائے پیش کرنے سے فائدہ! لیکن قند پارسی بھی تو آخر کوئی چیز ہے! اس سے میں حلاوت پا رہا ہوں تو آپ کیوں محروم رہیں:۔

داغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں بہادر برگزیدہ ترین تلامذہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق و از مشیران خاص فرماں روائے رام پور من داور افغانیانہ اتحادے است، ہر چند ملاقات صوری صورت نہ بستہ دریں نزدیکی گفتارِ دل آویز خویش را فراہم آوردہ گلزارِ داغ نام دیوانے ترتیب دادہ است بعد طبع یکے نزد نامہ گار آورد فرستادہ شوخی کہ در کلام اوست بندہ ندانم کہ امروز دیگرے را دادہ باشند و زبانے کہ او را بخشیدہ اند

---

[1] مقدمہ خطوط منشی امیر احمد [2] خمخانۂ جاوید [3] مقدمہ خطوط منشی امیر احمد۔

فی زمانا کسے رایتسر نیست بیشتر زیں ستائش گفتار دے
چہ تواں گفت۔ خیر الکلام قل و دل۔
معزز ناظرین! یہ رائے بھی کسی معمولی شخص کی نہیں، نواب صدیق حسن خاں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ یہ رائے دہندہ اسی فرد فرید کا فرزند رشید ہے۔ الولد سر لابیہ! داغ سے متعلق ہمارے پاس اگرچہ اور اتنا ہی ذخیرہ ہوگا جتنا کہ آپ کے روبرو پیش کیا گیا ہے لیکن بخوف طوالت اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ع

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے یاد کن ایں شاعر دیرینہ را

علی منظور حیدرآبادی

"ساقی"

گاؤں کی ایک شام

لہلہاتے کھیت اور ان پر شفق کی سرخیاں — آسماں پر منتشر یہ ننھی ننھی بدلیاں
اک کھلا میدان تا حد نظر پھیلا ہوا — غرق شعریت ہوائیں بے خودی پرور فضا
اک طرف ننھے کبڈی کھیلنے والوں کا شور — اور ڈھلانوں میں ادھر بہتے ہوئے پانی کا زور
ڈاٹ پر معصوم و سادہ لڑکیوں کی ٹولیاں — میٹھے میٹھے قہقہے اور پیاری پیاری بولیاں
پانی بھرنے والیوں کے پاؤں کی یہ نرم چاپ — یہ دھندلکا شام کا، یہ دونوں وقتوں کا ملاپ
دھندلی دھندلی ٹیڑھی دیواریں گارے کے مکان — کچھ گھروں میں جل رہی ہیں دھیمی دھیمی بتیاں
روٹی پکنے کی یہ آوازیں، یہ تنوروں کی آگ — گھر کو واپس آتے چرواہوں کے درد انگیز راگ
دور قبرستان سے یہ "ہیر" گانے کی صدا — گھونسلوں میں طائروں کے پھڑپھڑانے کی صدا
شام اور یہ شام کی دلکش ملاحت ریزیاں — موسم باراں کی کافر ولولہ انگیزیاں
یہ ہرے کھیتوں پہ اک رومانیت چھائی ہوئی — پتی پتی اپنی رعنائی پہ اترائی ہوئی

کاش ان لمحات میں وہ انجمن آرا بھی ہو
لطف نظارہ ہے جب وہ جان نظارہ بھی ہو

سید ضمیر جعفری

؎ ایک چشمہ کا نام

"ہمایوں"

نوبل کا اینٹی ملیریا پلورائڈ

نسخہ کونین بائی ہائیڈ روکلورائیڈ
ایسڈ آرسینوس ۱/۱۲ گرین
ایسڈ کاربولک ۱/۸ گرین
اکسٹریکٹ نکس وامیکا ۱/۴ گرین
کیپسین منتھول وغیرہ
خوراک ایک گولی سے دو گولی
دن میں دو یا تین بار۔

جوڑا بخار کے علاوہ باقی سب بخاروں کا علاج ہے اور ملیریا انفلوئنزا اور بڑھی ہوئی تلی کے لئے خاص طور پر مفید ہے خوراک ایک گولی دن میں دو بار پچاس اور سو کی بوتلوں میں قیمت پچاس والی پندرہ روپے فی درجن سو والی ستائیس روپے فی درجن ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے۔ سول ایجنٹ:۔

ایم اے جے نوبل ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

بینائی کی حفاظت اور چہرے کی خوبصورتی

ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت عمدہ و سستا ملتا ہے۔ اصلی پتھر کے چشمے آئی گلاس اور نئے ڈیزائن کے فریم بکفایت ملتے ہیں۔ چشمے ڈاکٹری نسخے کے مطابق بھی نہایت حسن و خوبی سے تیار کئے جاتے ہیں اور آنکھوں کا معائنہ کیا جاتا ہے بیوپاریوں کے لئے خاص رعایت ہے باتصویر فہرست مفت طلب کریں ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیں

دی ایسٹرن آپٹیکل کمپنی رجسٹرڈ

ہول سیل اینڈ ریٹیل ۲۲۳ عبدالرحمٰن سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

برانچ آفس ایسٹرن آپٹیکل کمپنی ۳۰۶/۳۰۷ لوبازار۔ کلکتہ

جو پیسے بچانا چاہے

پڑھے

ہم دوسری فرموں کی طرح بڑے بڑے اور قیمتی اشتہارات نہیں دیتے اور اس طرح جو خرچ بچاتے ہیں اس کا فایدہ اپنے گاہکوں کو سستا مال دے کر تے ہیں۔ ذرا آپ غور سے سوچیں کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے کہاں تک آپ کے فائدہ کی بات ہے۔ ہمارے ہاں ہر قسم کی عینکیں ہر قسم کی ماڈرن اور وضعدار فریمیں اور دیگر سامان موجود ہے آپ ایک دفعہ ضرور آزما کر دیکھیں۔

تاجران جو ہماری ایجنسی کے خواہشمند ہوں ہم سے خط و کتابت کریں۔

حاتم برادرس آپٹیشن عبدالرحمٰن سٹریٹ بمبئی

لاہور کی صنعتی نمائش

میں

صنعت۔ آرٹ۔ انڈسٹری اور تمام دل فریبیوں

سے

ایک چیز نہ پلئیے گا

کارخانہ مقتدا خاں اقتدا خاں تاجر تمباکو و عطر لکھنؤ

اور اس کی

نوایجاد الائچی تمباکو رجسٹرڈ

زندگی کی ضرورت اور اس بہترین خوشبودار اور مفرح الائچی تمباکو

کا

نمونہ مفت حاصل کیجئے

جسمانی توانائی کے لئے۔ آیورویدک دنیا کی لاثانی اکسیر
سکھ سنچارک دراکشاسو
تمام اقسام کی جسمانی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا سکہ رواں ہے۔
چند روزہ استعمال سے پژمردہ اور بے رونق چہرے سرخ ہو جاتے ہیں ہاضمہ میں اضافہ اور جسمانی اعضا کو نشو و نما بخشتا ہے
یہ خالص انگوری دانچ سے تیار شدہ دراکشاسو بیحد خوش ذائقہ اور فرحت بخش ہے
ہر موسم میں مرد و زن سب کے لئے یکساں مفید ہے ہندوستان بھر میں فروخت ہوتا ہے
پنجاب کے ہر شہر و قصبہ میں ایجنٹوں کی جلد ضرورت ہے۔ قواعد ایجنسی و فہرست مفت طلب کریں
بال سدا سندھو بچوں کو صحت مند اور تندرست رکھنے کے لئے اکسیر ہے
ملنے کا پتہ سکھ سنچارک کمپنی متھرا

دن کو بہتر طور پر شروع کریں
گلائیکو تھایمولین
کا روزانہ استعمال ناک اور دانتوں کی صفائی کے لئے اور انہیں گلنے سے بچانے کے لئے بہترین
عمل ہے سائنس کے جدید اصولوں پر بنا ہوا یہ سیال نہایت خوشگوار مزہ رکھتا ہے اور منہ
کو خوشبودار اور صاف کر دیتا ہے اور جراثیم کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔
ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے
تیار کنندہ:۔
کرائس اینڈ داون کمپنی نیویارک۔ امریکہ
ہندوستان کے باضابطہ اور مختار ایجنٹ برائے ہندوستان۔ برما و سیلون
ایم اے بے نوبل لمیٹڈ ۱۰۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

آپ کے سنگار کا نکھار
آٹو دل بہار
کے چند قطروں پر منحصر ہے جو آپ اپنے
رومال یا لباس پر لگائیں گے۔ آٹو دل بہار
ایک غیر معمولی دلفریب خوشبو ہے جو الکحل
سے مبرا ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ چھوٹی شیشی ایک ڈرام ۱۲/ر؛
خوشبودار کارڈ ا رمفت نمونوں کے لئے ۲/ر کے ٹکٹ بھیجیں۔
آٹو مٹی بلوم قبہائے بہار کے پھولوں کی خوشبو قیمت عہ فی اونس۔ مفت نمونہ
کے لئے ۲/ر کے ٹکٹ۔
آٹو مشک بہار رومال کے لئے مشک اذفر کی بہترین خوشبو عہ نمونہ کے لئے ۲/ر
کے ٹکٹ۔
سول ایجنٹ:۔
اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲-۱ اے ڈی،

آپٹریکس
OPTREX
آنکھوں کے لئے لاجواب لوشن
آنکھوں اور پپوٹوں کی سوزش اور جلن کے لئے یہ لوشن بہترین چیز ہے آنکھوں کی
تھکاوٹ کو دور کر کے راحت پہنچاتا ہے اور عینک استعمال کرنے والوں کے لئے نعمت
غیر مترقبہ ہے۔ اس کا عمل ملائم اور راحت رساں ہوتا ہے موٹر چلانے والوں رات کو کام
کرنے والوں اور طالب علموں کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔ ہر معزز دوا فروش سے مل
سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کو رسالہ کا حوالہ دینے سے نمونہ مفت
سول ایجنٹ:۔ نوبل اینڈ کمپنی ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ۔ بمبئی

دوائیں جنکا دنیا میں جواب نہیں
جمیلان
عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب سرپرست ہندوستانی دواخانہ دہلی
کا
وہ نسخہ جس سے دولاکھ مریضان جریان کو اب تک آرام وفائدہ ہوچکا ہے
جریان کا نتیجہ کیا ہے ؟ دل ودماغ وجگر کا کمزور ہوجانا۔ ہاضمہ کا بگاڑ۔ حافظہ کی خرابی
ہمت کی پستی۔ طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی۔ جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی پھر
رفتہ رفتہ مالیخولیا یا جنون یا کوئی سخت بیماری مثلاً دق وسل وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی
شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے۔ آج ہی اس بیش بہا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع
کردیجئے۔ جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہوچکی ہے۔
جس سے اب تک دولاکھ بیماروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ جریان چاہے پرانا ہوچکا ہو یا
نیا ہو ہر حالت میں اس سے فائدہ ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل ودماغ کی کمزوری اور
اعضاء کا اضمحلال دور ہوکر تندرستی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ قبض پیدا نہیں ہوتا۔
بھوک خوب لگتی ہے۔ غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ زرد چہرہ پر سرخی جھلکنے لگتی ہے
جریان کی دواؤں میں جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔
ترکیب استعمال:۔ دو قرص صبح دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔
ترشی تیل۔ گڑ۔ اور ثقیل چیزوں سے پرہیز۔
قیمت شیشی بتیس قرص
چار روپے آٹھ آنے
نوجیون
جل جلان
خارش خشک وتر۔ داد۔ گنج۔ پھوڑے پھنسی گرمی
حب ممسک مشکی
قرص عجیب
طلاء عجیب
طلاء زود اثر
منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس دہلی

انسان کے دو خطرناک دشمن

جو لاکھوں قیمتی جانوں کے ذمہ دار ہیں اور جن کو مٹانے کے لئے
ہر ملک کی گورنمنٹ کروڑوں روپیہ ہر سال ریسرچ پر خرچ کرتی تھیں
آخر جرمن سائنسدان اپنی بیس سالہ کوشش کے بعد ان موذی
بیماریوں کو صفحہ سے مٹانے کے لئے اپنی کیمیاوی ادویات سے
ہزاروں مریضوں پر ہسپتال میں آزمائش کرنے کے بعد میڈیکل کانگرس
اور طبی دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہے اور چاروں اطراف سے اس
سائنسدان کو مبارک باد مل رہی ہے

TUBERCULOSIS.

تپ دق یا سل

خواہ

پھیپھڑوں کا ہو یا انتڑیوں کا، گلے کا یا ہڈیوں
کا یا گردہ کا خواہ کسی درجہ میں ہو اس کے لئے
جرمنی ایجاد **سنٹوبن**

SANTU BEN.

ایک ایسی غذا ولو ہے جس کو دوسرے اور تیسرے درجہ میں بھی
۹۰ فیصدی کامیابی ہو چکی ہے۔
سنٹوبن کا استعمال بالکل سادہ جنگل یا پہاڑ
جہاں کوئی ڈاکٹر یا طبیب نہ ہو بغیر دوسرے کی
مدد کے استعمال کر سکتے ہیں۔ لندن کے تپ دق
کے ہسپتال۔ وائسلکے تپ دق کا ولایت
میں سب سے بڑا آرام گاہ اور سینکڑوں دیگر
علاقہ جات سے مبارک باد مل رہی ہیں۔
چونکہ یہ بیماری خطرناک ہے اس واسطے
اپنا قیمتی وقت اور روپیہ ضائع کرنے سے پہلے
لٹریچر منگا کر بخوشی اپنے ڈاکٹر سے صلاح کر کے
دوائی فوراً شروع کر دیں۔

قیمت فی بکس دس روپے -/۱۰
(جس میں ایک ماہ کی دوائی ہے)
ہر معزز دوا فروش سے مل سکتی ہے

DIABETS.

ذیابیطس

یعنی

شکر کی بیماری کا حکمی علاج

پینکریزل گولیاں

PANCRESALETS.

جس کے صرف تین چار روز کے استعمال
سے پیشاب میں شکر آنا یا پیشاب کا بار بار
آنا بند ہو کر چہرے پر تر و تازگی آجاتی ہے
انسولین انجکشن کے بدلے اس دوائی
کو تمام دنیا کے ڈاکٹر تسلیم کر چکے ہیں۔ بلکہ
ولایت میں نئی طبع شدہ کتاب

Diabetes. The malady of our time

میں بھی اسی دوائی کو ترجیح دیگئی ہے
یہاں تک کہ اس کے استعمال سے کاربنکل پھوڑے
بھی بند ہو جاتے ہیں۔ جب آپ تمام ادویات
لیتے تھک جاویں تو اس کا معجزہ ملاحظہ
کریں۔ قیمت فی شیشی پانچ روپے

ہندوستان کے لئے سول ایجنٹ:۔ ماڈرن ٹریڈنگ کمپنی لاہور

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ

سال ۷

ادبی دنیا

نقشۂ عالم کے منتخبہ ممالک تک ہندوستان کا رسالہ اردو زبان پہنچ گیا ہے

India's Premier Magazine

Feby. 1938

The Adabi Dunya, Lahore.

ادارۂ تحریر: صلاح الدین احمد بی اے — عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی

PRICE
6 ANNAS.

قیمت چھ آنے

" EFFICIENT MANNER OF PREPARATION "

LT.-COL JASPER ROBERT JOLLY TYRRELL

C.I.E., I.M.S. (Rtd) M.B., B.Ch., B.A.O., I.M.

Inspector-General of Hospitals & Member of State Cabinet

In Charge Medical & Sanitation Department
HOLKAR STATE

says

'I was impressed with the cleanly efficiency of the

TAYYEBI DAWAKHANA'

Government of His Highness the Maharaja Holkar.

Medical Department.

No:- 493

Dated 2nd-February 193?

At the request of the Proprietors Mulla Mohammad Hussain and Ghulam Ali. I visited the TAIYABI DAWAKHANA. Indore. This is an old established Institution, where I understand a good deal of work is done. I was shown a large stock of drugs used in UNANI MEDICINES and saw some in the process of manufactures. I was impressed with what I saw of the cleanly efficient manner of preparation of medicines and of the Institution in general.

J. R. J. Tyrrell

Lt.-Col.,
Inspector General of Hospitals
Holkar State, Indore.

Ramunge 3/1/

کمزور بچوں کی طاقت کے لیے

اور ان کے جسم کی خوبصورتی اور بڑھانے کے لئے

ڈونگرے کا بال امرت

دینا چاہیئے

کیونکہ اس میں بچوں کی صحت، تندرستی و جسمانی نشو و نمائی کے لئے بہت قیمتی اور نایاب ادویات شامل ہیں

لاہور ایجنٹ

بھگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

BANISH UGLY Superfluous HAIR

جلد کو خراب۔ سیاہ اور بدنما کر دینے والی۔ ہلکی اور خراب
چیزیں مت خریدیئے اپنے زیادہ بالوں کو دور کرنے کے لئے

بادشاہی سوپ اور پاؤڈر

استعمال کیجیئے جس سے آپ کی جلد قدرتی حالت میں نرم۔ صاف اور ملایم رہے گی

دنیا فروری ۱۹۳۸ء
دوائیں جن کا دنیا میں جواب نہیں
جمیلان
عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب کا پر ہندوستانی دواخانہ دہلی
وہ نسخہ جس سے دو لاکھ مریضان جریان کو اب تک آرام و فایدہ ہو چکا ہے
جریان کا نتیجہ کیا ہے؟ دل و دماغ وجگر کا کمزور ہو جانا۔ ہاضمہ کا بگاڑ۔ حافظہ کی خرابی۔ ہمت کی پستی طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی۔ جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی پھر رفتہ رفتہ مالیخولیا یا جنون یا کوئی سخت بیماری مثلاً دق وسل وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے۔ آج ہی اس بیش بہا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع کر دیجئے جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے۔ جس سے اب تک دو لاکھ بیماروں نے فایدہ اٹھایا ہے۔ جریان چاہے پرانا ہو چکا ہو یا نیا ہو ہر حالت میں اس سے فایدہ ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور اعضا کا اضمحلال دور ہو کر تندرستی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ قبض پیدا نہیں ہوتا۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ زرد چہرہ پر سرخی جھلکنے لگتی ہے۔ جریان کی دواؤں میں جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔
ترکیب استعمال:۔ دو قرص صبح دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔
ترشی تیل گڑ اور ثقیل چیزوں سے پرہیز۔
قیمت:۔ شیشی بتیس ۳۲ قرص (للعہ)
چار روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ
مینیجر ہندوستانی دواخانہ بکس ۲۲ دہلی
جل جلان
قیمت شیشی ۱۲ قرص صرف پندرہ آنے (۱۵ر)
نوجیون
عام جسمانی کمزوری اور طاقت مردانہ کے لئے ...
طلائے عجیب
ان لوگوں کے لئے جو اپنی ...
طلا زود اثر
حب ممسک و مقوی
قرص عجیب
قیمت شیشی ۱۲ قرص بارہ آنے (۱۲ر)

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — تصاویر: زندگی کی صبح و شام — نمبر ۲

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپا اور دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزمِ ادب

آہ امیر افضل علی

گزشتہ ماہ کی یہ افسوسناک خبر ہے کہ سید افضل علی ایم اے سینٹ کمشنر انکم ٹیکس کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ سید صاحب نے آج سے سترہ اٹھارہ سال قبل "مخزن" میں بکمال کر داد انشا پردازی تھی "مخزن" اُن دنوں مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں حیاتِ تازہ حاصل کر چکا تھا اور اُس زمانے میں پنجاب کے قابل، ہونہار اور زریں مستقبل کی امید دلانے والے نوجوان ادیبوں میں سید افضل علی کا نام نہایت نمایاں اور درخشاں تھا۔ ۱۹۲۱ء میں مرحوم کے مختصر افسانوں اور ادبی مضامین کا مجموعہ "تخیلات" کے نام سے شائع ہوا تھا جس کے بعض نسخے شاید اب بھی بازار سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

افضل علی کے اندازِ بیان پر سید سجاد حیدر صاحب "خیالستان" کا بہت اثر پڑا تھا اور مرحوم نے بہت قلیل عرصے کی مشق سے اپنے اسلوب نگارش میں ایک خاص شانِ دلآویزی پیدا کر لی تھی۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے آپ ادبی مشاغل سے دست کش ہو چکے تھے لیکن اب بھی جب کبھی دوستوں کی مجلس میں ادبیات کا ذکر چھڑ جاتا تو ان کی رنگین نوائی ان کے دورِ ماضی کی شگفتہ بیانی کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ سید افضل علی بہت پاکیزہ مذاق اور دوست نواز آدمی تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ مرحوم کی قبل از موت سے پنجاب کی ادبی اور معاشرتی زندگی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

اپنی موت سے دو روز قبل بسترِ علالت پر لیٹے لیٹے انہوں نے "بیمار" کے عنوان سے چند سطور قلم بند کی تھیں جو آج تبرکاً ہم ادبی دنیا میں شائع کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس مرتبہ ادبی دنیا کے سالنامے کے لئے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن بیماری کی شدت نے انہیں اس وعدے کے ایفا کی مہلت نہ دی۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

وحید کیلانی مرحوم

گزشتہ ماہ کا ایک اور افسوسناک واقعہ جناب وحید کیلانی کی جواں مرگی ہے۔ مرحوم ایک صحیح المذاق ادیب تھے اور آپ نے آج سے دس بارہ برس پہلے رسالہ قوس قزح جاری کیا تھا جس نے اردو کی بہت اچھی خدمات انجام دیں تھیں۔ افسوس ہے کہ یہ رسالہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ ہمیں اس حادثۂ جانکاہ میں مرحوم کے عزیز اور اپنے محترم دوست جناب ن۔ م۔ راشد صاحب ایم اے سے دلی ہمدردی ہے۔

جنابِ حفیظ

ہمارے محترم رفیقِ کار حضرت حفیظ ہوشیارپوری آج کم و بیش دو ماہ کی رفاقت کے بعد ہم سے جدا ہوتے ہیں۔ حفیظ صاحب کی ادبی و علمی سرگرمیاں اس قدر گوناگوں اور فراواں ہیں کہ ان کی جانِ ناتواں اُن کے اس بارِ گراں کی بمشکل متحمل ہو سکتی ہے۔ اس پر ادبی دنیا کے حصۂ نظم کی ادارت اُس روانتی تنکے کے ہم معنی تھی جو اونٹ کی کمر توڑ دیتا ہے۔ حفیظ صاحب کے قیمتی مشورے اور ان کی کرمفرمائیاں اب بھی ادبی دنیا کے لئے وقف رہیں گی لیکن اس کی ادارتی ذمہ داریاں اور اس کی پالیسی کی پابندیاں اب اُن کے لئے وجہ پریشانی نہیں ہوں گی۔ ان کی ایک تازہ ترین اور بے حد دلآویز غزل موجودہ نمبر میں شامل ہے۔ پڑھیے اور لطف اندوز ہوجیے۔

سالنامہ کی قدرافزائی

ادبی دنیا کے جن محترم کرمفرماؤں اور ملک کے جن معزز اخبارات و رسائل نے سالنامہ ۱۹۳۸ء کے متعلق ہماری بے بضاعت کوششوں کی داد دی ہے۔ ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔ ذیل میں ان قیمتی آرا میں سے چند کا اقتباس ناظرینِ ادبی دنیا کی دلچسپی اور اظہارِ تشکر کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی

اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

سالنامے اور خاص پرچے تو بہت سے رسالوں کے نکلتے ہیں لیکن محض رسم پوری کرنے کے پیچھے نہ پڑے رہنا اور صحافتی ادب میں واقعی پسندید

اضافہ کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ ادبی دنیا کا سالنامہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ پبلک کو سالنسا تھا کہ عزیز منصور احمد کے بعد ادبی دنیا کا وہ معیار قایم رکھنا جس پر عزیز مرحوم نے اسے پہنچایا تھا آسان کام نہیں۔ لیکن جیسا کہ اتنے مہینوں سے دیکھ رہے ہیں۔ الحمد للہ کہ وہ اندیشہ موہوم ثابت ہوا اور اب سالنامہ نے تو کسی قسم کے شک شبہ کو قطعاً معدوم ہی کردیا۔

یہ ڈھائی سو صفحوں کے قریب ضخامت کی کتاب یعنی ادبی دنیا کا سالنامہ صحافت اردو کا ایک شاہ کار ہے۔ مشفقی صلاح الدین احمد صاحب اور ان کے قابل شرکائے کار کی نظر انتخاب۔ ذوق سلیم اور حسن ترتیب توصیف سے مستغنی ہیں۔ جناب مدیر اور ان کے معاونین کو میں خلوص دل سے ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں۔ کیفی

جناب لطیف الدین احمد صاحب (قطراز ہیں:۔

سالنامہ کی صوری و معنوی خوبیاں "قابل تحسین" ہیں۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہماری صحافت واقعتاً ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس نمبر میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ کوئی مضمون "بھرتی" نہیں ہے۔ علامہ کیفی کا مقالہ نہایت مفید مضمون ہے۔ ہاشمی صاحب نے واقعی دیدہ ریزی کی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خالی الذہن ہو کر داغ کا مطالعہ نہیں کیا۔ صاحب "ترقان" کا رنگ انشا نہایت امید افزا ہے۔ آپ لوگ اردو کی سچی خدمت کر رہے ہیں اور تمام ہی خواہان اردو کو آپ کا ممنون ہونا چاہئے۔

جناب مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی ایم اے لکھتے ہیں:۔

ادبی دنیا کی کامیابی میں سب سے زیادہ حصہ مولانا منصور احمد مرحوم (خدا انہیں جنت نصیب کرے!) کا تھا جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ہی نہیں بلکہ اپنی تمام زندگی "ادبی دنیا" کے ذریعے خدمت ادب اردو کی نذر کردی۔ نوجوان ہونے کے باوصف مرحوم نے ایسی نقادانہ نظر پائی تھی جس کی مثال بہت شاذ ہی ملتی ہے۔ لیکن "ادبی دنیا" کی قسمت میں اس نوجوان ادیب کی سرپرستی زیادہ دیر کے لئے نہیں لکھی تھی۔ چنانچہ اس کی وفات حسرت آیات کے بعد ادبی دنیا کی ذمہ داریوں کو تین بالکل نوجوان اور ہونہار صاحبان علم و فن کے سپرد ہونا پڑا۔ میری مراد مولانا صلاح الدین احمد بی اے۔ جناب حفیظ ہوشیارپوری ایم اے اور حضرت عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی سے ہے مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ ان تینوں باذوق اصحاب کی وجہ سے میرے مرحوم دوست کی یادگار صرف زندہ و پائندہ ہی نہیں بلکہ اُس کے معیار میں بھی کسی قسم کا فرق نہیں آنے پایا۔

یوں تو "ادبی دنیا" کے ہر پرچے میں ایک خاص بات ہوتی ہے لیکن "ادبی دنیا" کا سالنامہ تو بطور خاص ادب اردو میں ایک اضافی اہمیت کا باعث ہوتا ہے۔ سالنامہ شائع کرنے کی رسم مولانا مرحوم کے زمانے سے شروع ہوئی۔ سالنامہ ۱۹۴۳ء جو اس وقت میرے پیش نظر ہے مولانا کی وفات کے بعد پہلا سالنامہ ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ سالنامہ بھی گزشتہ سالناموں کی زنجیر ہی کی ایک کڑی ہے۔

اس مختصر مدت میں ایسی ضخیم اور معیاری چیز کا قدردان ادب کے سامنے پیش کرنا اس قدر آسان نہیں جتنا خیال کیا جا سکتا ہے۔ شروع سے آخر تک میں نے سالنامے کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون نظم و نثر کا اس میں ایسا نہیں جسے غیر معیاری یا غیر دلچسپ کہا جا سکے۔ زمانہ حال میں ادب اردو میں جس قدر نئے رجحانات کا اضافہ ہو رہا ہے وہ سب اس ایک پرچے میں جمع ہیں۔ سالنامہ ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس کی کامیابی پر میں ادارے کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب اپنے ایک مختصر مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

مکرمی۔ رسالہ نامہ ملا۔ ماشاء اللہ خوب ترتیب ہے۔ کامیابی کی مبارک۔

جناب اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ادبی دنیا" کا یہ سالانہ نمبر بہت قابل قدر چیز ہے اور دیر تک محفوظ رکھنے کے لائق۔ حیران ہوں کہ کس افسانہ یا مضمون یا نظم کی تعریف کروں، بہر حال میں نے جناب عاشق بٹالوی کے "جوانی کا خواب" حضرت طاہر کے "ہمزاد" اور "معمولا" اور "چہرہ" کو بہت دلچسپ پایا۔ اختر شیرانی کی نظم "جمال سلمےٰ" اور حضرت احسن مارہروی کی غزل نے وجد کی کیفیت پیدا کردی۔

ادبی مضامین میں گارڈنر خاندان کے اردو شعرا، چین کا ملک الشعرا (لی پو) اور چینڈی داس بیش بہا مضامین ہیں۔

ادبی دنیا کے اس گراں بہا اور عدیم المثال سالانہ نمبر کی اشاعت پر ہدیہ مبارکباد قبول کیجئے۔

جناب صلاح الدین ملک صاحب پٹنہ سے لکھتے ہیں:۔

سالنامہ ۱۹۴۳ء صوری اور معنوی حیثیت سے تمام جرائد میں ایک قابل رشک مقام رکھتا ہے۔ نظم۔ ادبی و اخلاقی مضامین سب اپنی اپنی جگہ نہایت عمدہ اور نتیجہ خیز ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کی بے پایاں کوششوں کی وجہ سے ادبی دنیا اپنی روایتی شان کو نہایت کامیابی کے ساتھ برقرار رکھ سکا۔

معزز معاصر ٹریبیون لکھتا ہے :۔

ادبی دنیا کا سالنامہ حقیقتاً ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ جب ہم محوِ حیرت ہو کر اس کے صفحات الٹتے ہیں تو ہمیں ہر مقام پر ادب و شعر کے بعض بہایت نادر نمونے نظر آتے ہیں۔ افسانے۔ ڈرامے۔ نظمیں اور علمی و ادبی مضامین بہایت خوش اسلوبی و خوش ذوقی سے مرتب کئے گئے ہیں اور ان میں ایک لطیف توازن نظر آتا ہے۔ مشرق و مغرب کے بہترین مصوروں کے متعدد شاہکار۔ سالنامے کی زینت ہیں اور بہت نفاست سے چھاپے گئے ہیں۔ کرشن چندر صاحب کا افسانہ "یرقان" زندگی اور محبت کی ایک سادہ کہانی ہے جسے بہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور افسانہ گو نے جگہ جگہ بہایت چابک دستی سے اپنا آرٹ نمایاں کیا ہے۔ "جوانی کا خواب" جو عاشق صاحب کے کمال فن کا رہین ہے ایک اور دلکش اور جاذب توجہ افسانہ ہے۔ "لندن میں اردو" از آنریبل سر عبدالقادر اور "ہندوستان میں عورت کی حیثیت" از ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری دو بہایت مفید اور پر از معلومات مضامین ہیں۔ علامہ پنڈت برج موہن کیفی کا مضمون ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات نہ صرف خیال انگیز ہے بلکہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک مسرور کن اثر ڈالتا ہے۔ ڈراموں میں سے اندر لال داس قمر کا ڈرامہ "عزت اور ماتما" اور پروفیسر فیاض محمود کا "دس سال" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عزت اور ماتما جدید ہندوستان کی اونچی سوسائٹی کے ایک پہلو کی سچی تصویر ہے۔ آخر میں ہم ساغر نظامی کی نظم آزادی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حقیقی شاعری کا ایک ایسا پاکیزہ نمونہ ہے جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جناب جوش ملیح آبادی اور روشن صدیقی کی منظومات بھی بہایت کیف آور ہیں۔

ہمعصر **نیوٹائمز** رقمطراز ہے :۔ ادبی دنیا جسے ملک کے تین ممتاز ادیب مرتب کرتے ہیں۔ شمالی ہند کا سب سے مقبول مجلہ ہے۔ سالنامہ زیر نظر بہترین علمی و ادبی مضامین۔ افسانوں۔ ڈراموں اور منظومات کا ایک بہایت قابل قدر گلدستہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شاندار اور خوبصورت مصور نمبر نکالنے میں ادبی دنیا کے شعبۂ انتظام کو کس قدر مصارف برداشت کرنے پڑے ہوں گے۔

معاصر **منڈے مارننگ** لکھتا ہے :۔ ادبی دنیا کا سالنامہ ۱۹۳۸ء بجائے خود ایک دنیائے ادب ہے۔ یہ رسالہ ان معدودے چند ہندوستانی مطبوعات میں سے ہے جو یکساں طور پر ظاہری اور معنوی خوبیوں کا ایک بلند معیار قایم رکھتی ہیں۔ موجودہ سالنامہ اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور اپنے ناشرین کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہے۔ ملک کے بہترین انشا پردازوں کے انتخابِ فکر کا ایسا ضخیم مجموعہ اتنی قیمت پر مہیا کرنا یقیناً بہایت موزوں اور مفید امر ہے۔

ہمعصر "**احسان**" کی رائے ہے کہ :۔ اس سال ادبی دنیا کا سالنامہ بہت شاندار شائع ہوا ہے۔ ضخامت قریباً ڈھائی سو صفحات اور کاغذ کتابت۔ طباعت بہت نفیس ہے۔ سرورق پر ایک بہایت خوبصورت رنگین تصویر ہے۔ فہرست مضامین میں چوٹی کے شعرا اور ادبا حضرات کے نام نظر آتے ہیں اور تمام مضامین نظم و نثر معیاری ہیں۔ تصاویر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

معزز معاصر **پرتاپ لکھتا ہے**۔ اردو کے مشہور ماہوار رسالہ ادبی دنیا نے حسب معمول امسال بھی اپنا سالنامہ شائع کیا ہے جس طرح اس رسالہ نے اردو رسالوں کے سامنے ایک معیار قایم کیا تھا۔ اسی طرح اس کا سالنامہ بھی معیاری ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ اعلیٰ۔ مضامین عمدہ۔ افسانے دلآویز۔ نظمیں۔ وجد انگیز تصویریں نشاط آمیز ہیں۔ سرورق بہایت خوبصورت ہے۔ علمی اور تحقیقی مضامین بھی ہیں اور سوا روپیہ میں یہ فردوس نظر گلدستہ بہایت ارزاں ہے۔

ہمعصر **منادی** رقمطراز ہے :۔ ملک کا مشہور و معروف رسالہ ادبی دنیا عرصہ دراز سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے اور ہر سال ایک ضخیم سالنامہ بھی پیش کرتا ہے۔ جو بہت شاندار اور اعلیٰ مضامین کا ذخیرہ ہے۔ تصویریں بھی بہت اچھی ہیں اور ٹائیٹل بھی رنگین اور منقش ہے۔

پروفیسر محمد صادق صاحب اپنے تعلیمی رسالہ دربار میں تحریر فرماتے ہیں :۔

موجودہ سالنامہ گزشتہ سالناموں سے کسی لحاظ سے کم نہیں ہے۔ جہازی سائز کے ۲۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کاغذ سفید ڈمی اور کتابت دیدہ زیب ہے۔ سالنامہ آرٹ اور لٹریچر کے بہترین نمونوں کا حامل ہے۔ مضمون نگار حضرات میں اردو کے بہترین ادبا اور شعرا نظر آتے ہیں افسانوں۔ ڈراموں اور منظومات کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ محققانہ علمی مقالے ہیں۔ داغ۔ چنڈی داس (بنگالی شاعر اعظم) لی۔ پو (چینی ملک الشعرا) اور گارڈنر خاندان کے اردو شعرا کی شاعری پر بہت جامع اور مبسوط تبصرے کئے گئے ہیں۔ چنڈی داس کے "رادھا کے گیت" اپنے

اندر ایک مخصوص جاذبیت رکھتے ہیں اور دل و دماغ سے گزر کر روح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

"چینی شاعر کے دلچسپ سوانح حیات اور اس کی نظموں کے دلکش منظوم تراجم" "میراجی" کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ مضمون کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔

دیگر علمی مقالوں میں "ہندوستان میں عورت کی حیثیت" "ہند و مسلم کے کلچرل تعلقات" "بیگمات اودھ کے خطوط" اور "فرنگی مبلغ دربارِ مغلیہ میں" قابلِ ذکر ہیں۔ "بیگمات اودھ کے خطوط" ان کی مصائب کی زندہ تصاویر یہ غم فراق کی مجسم آہیں ہیں۔ ان خواتین نے نثر مسجع اور بعض دفعہ نظم میں اپنے دلی جذبات کو ظاہر کیا ہے۔

ان خطوط کی ترتیب جناب تسکین عابدی کی مرہونِ منت ہے۔

مضامین میں "لندن میں اردو" اور "جاپانی طالب علم کا لطف زندگی" قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر معلومات آنریبل سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ اور موخر الذکر مضمون ٹوکیو میں مقیم پروفیسر برکاس کا لکھا ہوا ہے۔ افسانوں کے مجموعہ "سوز ناتمام" کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس کے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں نے ایک طویل عالمانہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے مقالہ میں بالغ نظر نقاد نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو ادب پر تمدنی تاثرات اور ادب کے ارتقائی رجحانات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس قیمتی تبصرے کو پڑھ کر ہمیں بے ساختہ پروفیسر صاحب کی فاضلانہ تنقید نگاری کی داد دینی پڑتی ہے۔ "جوانی کا خواب" اور "یرقان" شاہکار افسانے ہیں۔ آصف کے طبعی رجحانات اور رالی کے جذبات کو قلمبند کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اٹھتے ہوئے رالی اور گرتے ہوئے آصف کی لفظی تصاویر ہر لحاظ سے کہنہ مشق مصوروں کے کمال فن کی شاہد ہیں۔ "عزت اور ماں تا" اور "دیوی" قابل قدر ڈرامے ہیں۔ ایک فیشن ایبل سوسائٹی کی منہ بولتی تصویر ہے اور دوسرا ہندوستانی سماج کے خلاف زبردست صدائے احتجاج۔ پروفیسر فیاض محمود کے نفسیاتی افسانے اسلامی گھرانوں کی معاشرت کے بہترین نقشے ہوا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ذاتی تاثرات، نفسیاتی تجزیوں اور بلاواسطہ معلومات (FIRST-HAND KHNOWLEDGE) کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں "دس سال" ان کا اسی قسم کا مکالمہ ہے۔ قدیر کا کامیاب تجربہ نفس مکالمہ نگار کے زورِ قلم کا شاہد ہے۔ "برابر کی چوٹ" مشہور ڈرامہ نویس محمد عمر صاحب کی جولانیٔ قلم کا نتیجہ ہے۔ "تنہا پریم" کافی غور و فکر کے ساتھ لکھا ہوا استعارہ ہے۔ "بھولا ہوا خواب" بہترین واقعاتی افسانہ ہے۔ "بھولا" میں ایک بچے کے لطیف اور معصوم جذبات اور محدود تخیلات کو نہایت خوش اسلوبی سے لفظی جامہ پہنایا گیا ہے۔

ترجموں میں سے "ہمزاد" "مادر مادر" اور "شاعر کی موت" قابل تعریف شاہکار ہیں۔ طاہر قریشی نے مشہور فرانسیسی افسانہ نگار مپاساں کے افسانوں کے تراجم لکھ لکھ کر کافی نام پیدا کیا ہے ان کا موجودہ ترجمہ "ہمزاد" بھی سالنامے کا بہترین مغربی افسانہ ہے۔ "مادر مادر" روسی سحر کار ٹرجنیف کا شاہ کار ہے "شاعر کی موت" ایک دلکش ڈرامائی طنز ہے۔

منظومات میں ہمیں اردو کے تمام ممتاز شعرائے عہدِ حاضر نظر آتے ہیں۔ ادبی دنیا کا سالنامہ کیا ہے۔ عہدِ حاضرہ کی بہترین غزلوں، گیتوں، رباعیات پابند اور آزاد نظموں کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔ کہیں فیض صاحب انتہائی مایوسی کے عالم میں کہہ رہے ہیں "تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے" اور کہیں احسان دانش ملتجی ہیں "مجھے یوں نہ داغ فراق دے مرے غمگسار چلا بھی آ" اختر شیرانی اپنی سلمیٰ کا جمال دکھا رہے ہیں اور اسد ملتانی کسی گہری یاد میں گم ہیں منصور کی آواز سینے میں اترتی جاتی ہے سے اس وقت مجھے چھوڑ دیا تم نے مری جاں جس وقت گھلا دی تھی تم نے مری جاں۔ عرشی کے عرفاں نواز شعر اور جوش کی محبت بھری باتیں کیا دل کو بھاتی ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ رسالہ اسی طرح اردو ادب کی خدمت میں پیش پیش رہے اور اس کی صوری و معنوی صفات میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے۔

منصور گولڈ میڈل: ہمیں یہ اعلان کرنے میں بے حد مسرت ہے کہ منصور گولڈ میڈل جس کا اعلان اکتوبر اور نومبر کے پرچوں میں کیا گیا ہے۔ جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کو ان کے مضمون "نگار ر ڈنر خاندان کے اردو شعرا" پر دیا جانا قرار پایا ہے اور یہ علامہ برج موہن کیفی۔ ملک عطاء اللہ صاحب کلیم اور اڈیٹر ادبی دنیا کا متفقہ فیصلہ ہے۔ ہم منشی صاحب موصوف کی خدمت میں ان کے گراں پایہ مضمون کے انتخاب پر تہ دل سے تہنیت پیش کرتے ہیں میڈل بن رہا ہے اور عنقریب ان کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے گا۔

دیگر انعامات: سالنامہ کے مختلف مضامین کے لئے جن انعامات کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان کا قطعی فیصلہ ابھی نہیں ہو سکا۔ امید کامل ہے کہ مارچ نمبر میں انعامی مضامین کا اعلان کر دیا جائے گا۔

صلاح الدین احمد

پنڈت رتن ناتھ سرشار

حضرتِ سرشار کو دنیا سے اُٹھے ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ ابنائے زمانہ اور حامیان اردو کی ناقدری اور بے اعتنائی کا یہ حال ہے کہ ان کی طفولیت اور تعلیم و تربیت وغیرہ کے صحیح حالات کسی کو معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ان کے سالِ ولادت کی بھی کسی کو خبر نہیں۔ اندازاً اس قدر کہا جاتا ہے کہ جب سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کے عہد کا آخری دور تھا۔ صرف چار برس کی عمر تھی جس وقت آپ کے والد پنڈت بیج ناتھ در تھنا کر گئے۔ ماں کے سایۂ عاطفت میں آپ نے پرورش پائی کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے مزاج میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی ایام طفولیت میں ذہانت و طباعی زبان کی طراری کے پردے میں اپنا رنگ دکھاتی تھی بیگمات لکھنؤ کے پڑوس میں آپ کا مکان تھا۔ حضرتِ سرشار کی رسائی ان کے محلات میں تھی۔ آپ نے لڑکپن میں اردو انہیں شریف خاتونوں سے سیکھی اور انہیں کے فیضانِ صحبت سے آپ کو بیگمات کے طرزِ معاشرت اور روزمرہ کے محاوروں سے کمسنی ہی میں بخوبی واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرتِ سرشار چونکہ فطرتاً ذہین اور طباع تھے بیگمات کی صحبت ان کے حق میں اکسیر ثابت ہوئی جب فسانۂ آزاد لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو لڑکپن کی معلومات کا یہ ذخیرہ دماغ میں محفوظ تھا۔ قدیم دستور کے مطابق آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی سلطنت اودھ کے زوال کے بعد جب انگریزی راج قائم ہوا تو لکھنؤ میں انگریزی تعلیم کے لئے کیننگ کالج قائم کیا گیا۔ پنڈت رتن ناتھ اس میں داخل ہوئے کچھ عرصے تک انگریزی تعلیم سے مستفید ضرور ہوئے مگر کوئی باقاعدہ سند حاصل نہ کی۔

جب سن تمیز کو پہنچے تو فکرِ معاش دامن گیر ہوئی کوشش کرنے سے ضلع کھیری کے اسکول میں مدرسی کی جگہ آپ کو مل گئی۔ اُسی زمانہ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نئے خیالات کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ نظامِ معاشرت کے ہر صیغہ میں اصلاحی مسائل درپیش تھے اردو زبان بھی اس اثر سے بچ نہ سکی نئے رسالے اور اخبار جاری ہو گئے تھے۔ جن میں قدیم ایشیائی تکلفات اور مبالغہ آمیز طرزِ تحریر کو خیرباد کہہ کر واقعات نفس الامری معرضِ بحث میں تھے۔

حضرت سرشار میں انشا پردازی کا مذاق موجود تھا۔ مراسلۂ کشمیر" اور "اودھ پنچ" میں طبع آزمائی شروع کی۔ اس وقت کے مضامین پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سرشار کو خزینۂ فطرت سے کس قدر شوخی روانی اور جدت طرازی ودیعت ہوئی تھی۔ طرزِ تحریر میں عجب تازگی اور شگفتگی تھی۔ اس وقت تک طرزِ تحریر میں فسانۂ عجائب کی نثر کی تقلید نمایاں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں رجب علی سرور (مصنف فسانۂ عجائب) کا سکہ لکھنؤ میں رواں تھا وہ نثر اردو کے پیمبر مانے جاتے تھے۔ ہر مضمون نگار کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی تقلید کرے۔ یہی وجہ ہے کہ سرشار کے ابتدائی زمانے کی نثر میں سرور کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چونکہ فارسی کا رواج اس زمانے میں بہت تھا۔ حضرت سرشار کے پہلے دو مضامین جو مراسلۂ کشمیر میں شائع ہوئے وہ فارسی میں لکھے گئے تھے۔ اسی زمانے میں سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک تعلیمی اخبار نکلتا تھا۔ اس میں علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوا کرتے تھے۔ حضرت سرشار کے سپرد ترجمہ کا کام تھا جس کو آپ نے بڑی قابلیت سے انجام دیا۔ چنانچہ سررشتۂ تعلیم کے مہتمم اعلیٰ نے اپنی سالانہ روئیداد میں اس امر کا اعتراف کیا کہ پنڈت رتن ناتھ صحیح اور بامحاورہ ترجمہ کرتے ہیں۔

اس طرح حضرت سرشار کی مضمون نگاری کا شوق اور حوصلہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اودھ پنچ مراسلۂ کشمیر۔ مراۃ الہند۔ ریاض الاخبار آپ کے رشحاتِ قلم سے سیراب ہوتے رہے۔

پہلی تصنیف

۱۸۷۸ء میں طبعیات کی ایک کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا چونکہ اس کے ہر صفحہ میں تحقیقات علمی سے کام لیا گیا تھا۔ ابر باد اور برف کی ماہیت کا حال درج تھا اس کا نام شمس الضحیٰ رکھا ایسے ادق مضمون کو جس کے لئے اصطلاحات علمی اس وقت تک ایجاد نہیں کی گئی تھیں۔ سرشار نے نہایت عام فہم اور سلیس عبارت میں لکھا ہے۔

اسی سال خوش قسمتی سے منشی نول کشور نے حضرت سرشار کو اپنا علمی مشیر مقرر کیا اور اودھ اخبار کی اڈیٹری کا قلمدان ان کے سپرد کیا اسی زمانے میں اودھ اخبار کو بہت عروج ہوا۔ حضرت سرشار نے وقائع نگاری میں بھی اپنا سکہ جمایا اور ہر قسم کے سیاسی اور معاشرتی مضامین لکھ کر لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا۔

فسانۂ آزاد

فسانہ آزاد کے آغاز و انجام کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ اس کی بنیاد پڑنے کی کیفیت یوں ہے کہ جب حضرت سرشار کچہری سے ترک ملازمت کر کے لکھنؤ واپس آئے تو نیاز شب و روز یاران دقیقہ رس کی صحبت میں وقت گزرتا تھا۔ اس صحبت میں منجملہ اور طرار و حاضر جواب حضرات کے منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہجر صاحب نے بر سبیل تذکرہ کہا کہ DON QUIXOTE (ڈان کوئک زاٹ) کے طرز کا افسانہ اگر اردو میں کوئی لکھ سکے تو خوب ہو۔ حضرت سرشار کے دل میں یہ بات اتر گئی۔ جی میں ٹھان لی کہ اردو میں اس انداز سے مضامین کا سلسلہ شروع کریں جو ظرافت و خوشدلی میں ڈان کوئک زاٹ کے ہم پلہ نہیں تو اس سے کم درجہ بھی نہ ہوں۔ چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے زیر عنوان مضامین شائع ہونے لگے یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم کبھی جہلم کبھی عیش باغ کے میلے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکلنے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ مگر لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا پسند آیا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ اس طرح کے مختلف قسم کے مضامین کی کڑیوں کو ملا کر فسانہ آزاد کا ڈھانچہ تیار کیا ایسے مضامین میں جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت کم تھا سلسلہ اور ربط پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جتنا چاہیئے ویسا ربط اور تسلسل ان مضامین میں پیدا نہ ہو سکا اگر کوئی سلسلہ ہے تو صرف اس قدر کہ اس افسانے کے رسم و داستان میاں آزاد خانہ برباد ہر فن میں طاق اور ہر کمال میں مشاق ہیں ہر قسم کے عقلی و نقلی علوم میں آپ کو دخل ہے۔ سپہ گری کے فن میں یہ طاق ہیں۔ شاعر بھی ہیں حسن میں یوسف ثانی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ صبح ہوئی اور یہ بوئے گل کی طرح گھر سے باہر نکلے اور دنیا بھر کی سیر پر کمر باندھی۔ کبھی لکھنؤ کا محرم دیکھنے جا رہے ہیں کبھی عیش باغ کے میلے کی سیر کرنے نکلے ہیں۔ کبھی کسی نواب کی دربارداری میں مصروف ہیں۔ غرضکہ یہ جہانیاں جہاں گشت آدمی ہیں ان کے لئے کسی خاص مشغلہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی کوچہ گردی میں ایک روز ان کی نگاہ ایک محبوبہ سے لڑ گئی۔ ادھر سے پیغام وصال ہوا۔ بعد ہزار ناز و نیاز اس پری پیکر نے جو کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون تھی اس شرط پر آپ کو رفیق زندگی بنانا منظور کیا کہ یہ روم جائیں اور سلطان کی فوج میں شریک ہو کر روس کے خلاف لڑیں حضرت آزاد بھی اپنے دھن کے پکے تھے۔ سیدھے روم پہنچے اور وہاں سے سرخرو ہو کر اپنی معشوقہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا۔ اصل قصہ فسانہ آزاد کا صرف اس قدر ہے۔ مگر مصنف کے زور قلم کا یہ حال ہے کہ پچیس سو صفحے اس مختصر مطلب کے ادا کرنے میں لکھ ڈالے اور داستان کی دلچسپی میں فرق نہ آنے دیا۔ علاوہ ڈان کوئک زاٹ کے مختلف انگریزی افسانوں کے حالات اس میں درج ہیں لیکن مصنف کے قلم میں یہ قدرت ہے کہ ہر ا قصے اور جزوی قصے کو اپنا لیا ہے۔ اہل نظر سے یہ مخفی نہیں کہ فلاں داستان فسانہ آزاد میں فلاں انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے مگر اس کو ثابت نہیں کر سکتے۔ حضرت سرشار کی یہ کیفیت تھی کہ چار احباب کے درمیان بیٹھے باتیں کرتے رہے ہیں اور وہی باتیں فسانہ میں شامل کرتے جاتے ہیں مگر اس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ جس زمانے میں یہ فسانہ اودھ اخبار میں نکل رہا تھا۔ حضرت سرشار کا ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آپ کے پاس تعریف و توصیف کے خطوط آتے تھے یہ خطوط معمولی لوگوں کے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ایسے حضرات کے جن کی قابلیت مسلمہ تھی۔ مثلاً مولوی عبدالحلیم شرر۔ جن کا خیال ہے کہ رتن ناتھ نے افسانے کی نئی راہ اردو میں نکالی۔

اودھ پنچ کی مخالفت

آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ اخبار جو ایک زمانے میں حضرت سرشار کے زور قلم

سے فیضیاب ہوتا تھا۔ آپ کے خلاف ہوگیا۔ فسانۂ آزاد پر جا و بے جا اعتراضات کی بھرمار کردی مگر ان کے ایسے ایسے دنداں شکن جواب دیئے گئے کہ معترضین کے منہ پھر گئے۔ غرضکہ قدر دانوں کے نعرہ ہائے تحسین اور معترضین کے شور و غل میں یہ فسانہ اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا اور بے حد مقبول عام ہوا۔ لفظوں کی نئی تراش ترکیبوں کی خوبصورتی۔ کلام کی آمد۔ مضامین کی شوخی طرز تحریر کی نزاکت۔ جواب و سوال کی نوک جھونک۔ زبان کی پاکیزگی۔ محاورے کی صفائی۔ روزمرہ کی لطافت ظرافت کی گلکاری نے لوگوں کو حضرت سرشار کا شیدا کر دیا تھا۔ اردو میں ایسے افسانے کی اشاعت بالکل نئی بات تھی۔ اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی لازمی ہے کہ محض قصہ سمجھ کر فسانۂ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر نافہمی ہے۔ فسانے کی دلچسپی کا انحصار تسلسل داستان پر نہیں۔ حضرت سرشار نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ سرشار جو کہ شاعر کا تخیل اور مصور کا قلم اپنے ساتھ لایا تھا۔ فسانۂ آزاد میں اس تہذیب کا مرقع کھینچا ہے مگر اس تہذیب کا صرف خوشنما پہلو ہی نہیں دکھایا ہے بلکہ اس کے عیوب کو بھی ظاہر کیا ہے۔ خصوصاً عورات کے طرز معاشرت اور بول چال کا خوب رنگ دکھایا ہے۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھ کے سامنے بھ جاتی ہے۔ نوخیز اور کمسن لڑکیوں کی شوخی کا عالم دل پر بجلی گراتا ہے ایک ایک بات سے ہزار ہزار رنگینیاں پیدا ہیں اور پھر حیاپروری بھی ایسی کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھیں۔ پرانی جہاندیدہ بوڑھیوں کی بدگمانی اپنے رنگ میں لطف دے جاتی ہے ان کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہیں وہ ادب و سلیقہ سے معمور ہیں۔ ماما مغلانیاں ہیں کہ ہوا سے لڑتی ہیں۔ ضلع جگت میں طاق ہیں۔ رستے چلتے لوگوں پر پھبتیاں کستی ہیں۔ نواب صاحب اپنے رنگ میں مست ہیں اور عجب انداز سے شام کے وقت چوک کی سیر کو نکلتے ہیں۔

موجدِ طرزِ نو اردو میں حضرت سرشار اس طرزِ نو کے موجد ہیں اور ان کا یہ فخر درست و بجا ہے۔ پرانے زمانے کی داستانوں میں (جن میں فسانۂ عجائب کا پایہ بہت بلند ہے) زندگی کے مرحلے روحانی اور غیبی قوتوں کی مدد سے طے کئے جاتے ہیں۔ اُن میں انسانی جذبات اور دانش و بینش کی وہ تصویریں نہیں پائی جاتیں جن سے فسانہ آزاد کی رونق و وقعت ہے۔

پرانے افسانوں میں تقریباً ہر داستان اسی طرز پر ہوتی ہے کہ طوطا بولا اے شاہزادہ والا تبار فلاں ملک میں جو یہاں سے اسی کروڑ کوس کے فاصلہ پر ہے ایک شاہزادی ہے جس کا حسن دیکھا نہ سنا ضیائے رُخ کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں رات ہوتی ہی نہیں۔ یہ سنتے ہی شہزادے صاحب کو اس سے شادی کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے بلا تامل نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کہیں صحرائے طلسم میں اسیر ہوتے ہیں کہیں دیووں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے کہیں رات کو پریاں فرش خواب سے اٹھائے جاتی ہیں۔ کہیں حضرت خضر سے ملاقات ہوتی ہے۔ غرض اس انداز پر کل داستان لچر پوچ یاد رہوا خیالات کا ذخیرہ ہوتی ہے فسانۂ آزاد کے بعد یہ طرز بالکل متروک ہوگیا۔ اس کے انداز تحریر نے ایک نیا راستہ نکالا جس نے پرانی وضع کی فسانہ نگاری کی وقعت کھو دی۔

فسانۂ آزاد کے عیوب فسانۂ آزاد میں باوجود اس قدر خوبیوں کے اکثر عیوب بھی موجود ہیں جو قدر دانوں کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں اور جن کی وجہ سے فسانہ مذکور کی اشاعت کے وقت معترضین کو حرف گیری کا موقع ملا۔ افسانۂ آزاد میں وہ سلسلہ ترتیب یا انتظام نہیں جو عموماً جدید طرز کے ناولوں یا قصوں میں مانا جاتا ہے۔ مثلاً ثریا بیگم کی داستان بجائے خود ایک چھوٹا سا فسانہ ہے جس کا تعلق کل قصہ سے ایسا مربوط نہیں جیسا چاہیئے۔ علاوہ بریں میاں آزاد کا چال چلن متضاد صفات کا مجموعہ ہے شروع میں یہ شخص ایک آوارہ مزاج اور یار باش آدمی تھا لیکن یکایک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تہذیب و شائستگی رگ رگ میں سمائی۔ ایسے وارستہ مزاج شخص کا بلا وجہ اس قدر مہذب ہو جانا خلاف قرینہ ہے۔

حسن آرا کا بھی یہی حال ہے یعنے یو۔پی کے مسلمانوں میں ابھی برسوں تک ایسی آزادی پسند عورت نہیں پیدا ہو سکتی۔ نیز یہ عقدہ بھی نہیں کھلتا کہ حسن آرا کے خیالات و جذبات کیونکر اس قدر بلند ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ خیالات پر صحبت کا اثر پڑتا ہے یا تعلیم و تربیت کا حسن آرا کی صحبت ہمیشہ پرانے خیالات کی بیگمات کے ساتھ رہی اور تعلیم فارسی زبان کے ذریعہ حاصل کی اس صورت میں مغربی خیالات کا رنگ اس

خاتون پر کیونکر چڑھا غرضکہ چال ڈھال کا انداز جیسا کہ اس فسانہ میں دکھایا گیا ہے۔ خلاف فطرتِ انسانی ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ باتیں ایسی نہیں کہ فسانہ آزاد ناول کے لقب کا بالکل مستحق نہ سمجھا جائے۔

خوجی کی چال ڈھال شروع سے آخر تک ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اسی طرح ہمایوں فر، سپہر آرا، بڑی بیگم، اللہ رکھی وغیرہ فطرت انسانی کی سچی تصویریں ہیں۔ اس کے علاوہ فسانہ آزاد میں ناول کے اور عنصر بھی موجود ہیں۔ جذبات دلی۔ کیفیات قلبی۔ شادی و غم۔ عشق و شجاعت جلوہ ہائے قدرت صبح و شام سیر دریا وغیرہ جس کیفیت کو بیان کیا ہے تصویر کھینچ دی ہے۔

فسانہ آزاد میں یہی عیب ہے کہ مصنف سے اکثر مقامات پر تناسب واقعات نہ نبھ سکا۔ مثلاً ایک روز کا ذکر یوں لکھا ہے کہ حسن آرا نے میاں آزاد کے علم و فضل کا امتحان لیا اور فرمائش کی کہ ایک بوڑھے کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی تقریب کی تاریخ لکھو۔ میاں آزاد نے فرمایا۔ پیر نابالغ جس سے ۱۲۹۶ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ روم کی لڑائی ۱۲۹۶ ہجری سے دو تین برس پہلے ہوئی۔ میاں آزاد اس تاریخ کے نکالنے کے بعد روم کی لڑائی میں شریک ہونے کے لئے گئے۔ لہذا تاریخ غلط ہو گئی اور واقعات میں تناسب نہ قایم رہ سکا اسی طرح پر ایک مقام پر حضرت سرشار خدا جانے کس ترنگ میں لکھ گئے کہ بام پر بیش بہا شال کا خیمہ نصب ہوا۔ معترض سوال کر سکتا ہے کہ میخ کہاں ٹھونکی گئی۔ چھت تو اس کام کی نہیں ہوتی۔ ایک جگہ مصر کا اٹاچی خوجی سے کہتا ہے کہ کرسی کے احمق ہو۔ یہ خاص لکھنو کا محاورہ ہے۔ مصر کے اٹاچی کو اس کی کیا خبر ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی لغزشیں فسانہ آزاد میں اکثر جگہ پائی جاتی ہیں چونکہ یہ افسانہ عجلت اور بے پروائی سے لکھا گیا تھا۔ لہذا ایسی لغزشیں قابل معافی ہیں۔

اکثر محاورے بھی فسانہ آزاد میں ایسے ملیں گے جن کو لکھنو کے اہل زبان دار الضرب شاہی کا سکہ نہ کہیں گے۔ اس قسم کی حرف گیری زیادہ تر اودھ پنچ کے معترضین نے کی ہے۔

حضرت سرشار فسانہ آزاد میں لکھتے ہیں۔ طبیعت بے مزہ ہے وری۔ جانے کیا سبب (فسانہ آزاد ضمیمہ اودھ اخبار مطبوعہ ۲ جولائی ۱۸۸۰ء) اعتراض ہے جانے کیا ہوا" لکھنو کی بول چال نہیں ہے مزہ کھانا ہوتا ہے طبیعت بد مزہ ہو جاتی ہے۔ اسی نمبر کے صفحے ۷ پر داہنی طرف لکھا ہے۔ (اصل محاورہ ہے) داہنی طرف۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ کٹی بار پائی پر سر دے مارا (فسانہ آزاد ضمیمہ اودھ اخبار صفحہ ۳۶ مطبوعہ اگست ۱۸۸۱ء) پائی لفظ غلط ہے۔ پٹی درست ہے پھر غم مفارقت میں دل پھٹا جاتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے (صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۱ء) اس جگہ پر یہ محاورہ بالکل غلط ہے دل پھٹ جانا قطع امید ہو جانے یا بیزار ہونے کی جگہ آتا ہے نہ کہ عاشق و معشوق سے دل پھٹ جاتا ہے۔ اس قسم کی لغزشیں کتاب کے اور حصوں میں پائی جاتی ہیں مگر ان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت سرشار زباندان نہ تھے۔ سراسر ناانصافی ہے۔ ایسی فروگزاشتوں کا شمار ایسا ہی ہے جیسے کسی قلزم ذخار میں خس و خاشاک۔ حق تو یہ ہے کہ انگریزی یا اردو کا کونسا مصنف ہے جس کی تصنیفات بالکل عیب سے پاک ہیں۔ فسانہ آزاد میں اکثر بھرتی کے مضامین بھی ہیں۔ مثلاً صوفی کے وعظ یا اخلاقی پند و نصائح کے موضوع پر تقریریں محض خانہ پری کے لئے درج ہیں۔ خلاق عالم نے حضرت سرشار کو کسی سنجیدہ کام کے لئے پیدا نہیں کیا تھا صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے دنیا میں آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں پند و نصائح کا دفتر کھولا ہے۔ فسانہ کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے۔ باوجود ان عیوب کے جن کا ذکر سلسلہ وار ہو چکا ہے فسانہ آزاد بہ حیثیت مجموعی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اس کے جوہر اس کے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔

انشا پردازی کا رنگ جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے۔ اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت سرشار نے طرز قدیم کو فسخ کیا۔ رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب کی زبان نثر اردو کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن سرشار کا انداز بیان زیادہ صاف۔ دلکش اور مؤثر ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ فسانہ آزاد کے شائع ہونے کے بعد فسانہ عجائب قدیم کتابوں کے کتب خانہ میں۔ رکھنے کے قابل ہو گیا جس کا وجود صرف اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ زمانہ قدیم میں نثر اردو کا کیا انداز تھا۔ دونوں مصنفوں کے طرز تحریر کے نمونے دیکھو۔

سرور:- گرہ کشایان۔ سلسلہ سخن نازکنندگان فسانہ کہن یعنی محرران رنگین و مورخان جادو نگار نے اشہب قلم کو میدان وسیع بیان میں باکرشمہ سحر ساز و لطف ہائے حیرت پرداز گرم عنان اور جولاں یوں کیا ہے۔ سرزمین ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبان جہان قابل بود و باش خوباں الخ

سرشار:- سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گریۂ مسکین

کی آہٹ پائی تو گھبرا کر ککڑوں کوں کی بانگ لگائی۔ ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو سرِ شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ یہ آواز خوش آیند سنتے ہی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔ ادھر آنکھ کھلی اور باچھیں کھل گئیں"۔ دونوں کے اندازِ تحریر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور کی نثر تصنع کے بوجھ سے گرانبار ہے سرشار کا طرزِ تحریر شوخی اور بے تکلفی سے معمور ہے۔ قدرتی جوش اور صفائی بیان عجب لطف دکھاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرور کی نثر میں فرضی لطافت اور خیالی رنگینی کا دخل زیادہ ہے۔ سرور مضامین خیالیہ کی ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں۔ سرشار فضا میں حالیہ کی تصویر کھینچتے ہیں۔ رجب علی سرور کے زمانے میں فارسی کا بہت رواج تھا جو کچھ اس نے لکھا اس کے لئے باعثِ فخر ہے۔ سرشار کی روش مطبوعِ خلائق ہوئی۔ اس وقت جتنے ناول اردو زبان میں موجود ہیں۔ سب فسانۂ آزاد کے بعد لکھے گئے۔ سب میں حضرت سرشار کا پرتو نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سرشار نے اپنے لکھے ہوئے مسودے کی نظرِ ثانی نہیں کی جس زمانے میں فسانۂ آزاد اودھ اخبار میں شائع ہو رہا تھا۔ لوگوں کے چشم دید واقعے ہیں کہ اخبار شائع ہونے کو ہے اور کاتب پنڈت جی کو ڈھونڈ رہا ہے کہ فسانے کا مقررہ حصہ لکھ دیں۔ تاکہ اسی روز نکل جائے۔ پنڈت جی آئے اور نہایت بے تکلفی سے قلم برداشتہ چار صفحے لکھ کر حوالے کر دئیے۔ اس عجلت میں کیا لکھا ہوگا۔ مگر نگاہِ غور سے دیکھا تو موتی پرو دئیے ہیں۔

سرشار کے ناول حضرت سرشار نے علاوہ فسانۂ آزاد کے بہت سے ناول لکھے اور اکثر انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کئے۔ ان تصنیفات میں سیر کہسار۔ جامِ سرشار۔ کامنی۔ اور خدائی فوجدار زیادہ تر مشہور ہیں۔ سیر کہسار میں ادنیٰ درجہ کی اسلامی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے۔ عبارت شوخ و رنگین ہے مگر فسانۂ آزاد کے مقابلے میں سست۔ جامِ سرشار بھی فسانۂ آزاد کی کیفیت سے خالی ہے۔ خدائی فوجدار ڈان کوئکزوٹ کا ترجمہ ہے۔ اس کا رنگ بھی بہت پھیکا ہے لکھنؤ سے حیدر آباد جانے کے قبل چھوٹے چھوٹے ناولوں کا ایک سلسلہ خمکدہ سرشار کے نام سے جاری کیا تھا۔ ہشو۔ کڑم دھم۔ بچھڑی ہوئی دلہن۔ طوفانِ بے تمیزی وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہ ناول اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک زبردست مصنف کا کمال کس قدر زوال پذیر ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا اگر حضرت سرشار ان کو لکھنے کے لئے قلم ہی نہ اٹھاتے۔ یہ خمکدہ کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ سرشار کو حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کا حال سرشار نے خود کشمیر پرکاش میں یوں تحریر فرمایا ہے (مارچ ۱۸۹۹ء) چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگرس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا وہاں سے بخت رسا حیدر آباد لایا۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان امرا اور پبلک نے میری بڑی خاطر کی۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے مجھے بلوایا اور دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھا۔ اور شعر و سخن و نثر کی اصلاح لینے لگے اور کسی کلام پر خوش ہوئے تو ایک اشرفی انعام۔ حضور نظام مجھے جانتے تھے۔ یہ شرف بخشا کہ ایک گھنٹہ کامل تک ناول سیر کہسار کی بجنسہٖ دربار میں سیر کی۔ حیدر آباد سے حضرت سرشار نے ایک رسالہ موسوم بہ دبدبۂ آصفی نکالا تھا۔ ابتدا میں اس میں اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے رہے خود بھی اکثر لکھتے تھے۔ مگر طرزِ تحریر میں اگلی سی آب و تاب نہیں رہی تھی۔

شاعری حضرت سرشار شاعری میں منشی مظفر علی صاحب اسیر کے شاگرد تھے۔ حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔ مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی مضمون آفرینی میں کمال حاصل تھا۔

آزادی آزادی اور فطری بے باکی کی وجہ سے کبھی شہرت یا جاہ و ثروت کی آرزو دل میں نہ آنے دی گو کہ زمانے نے کمال کی سند عطا کر دی تھی مگر بے نیاز طبیعت نے کسی رئیس یا امیر کے در کی طرف رُخ نہ کرنے دیا۔ آخر عمر میں حیدر آباد کے ایک رئیس کے دربار میں رسائی ہو گئی مگر وہ بھی اپنی کوشش سے نہیں۔

ذہن خداداد حضرت سرشار عجب ذہن خداداد ساتھ لائے تھے۔ فارسی اور عربی میں فاضلانہ لیاقت نہ تھی مگر طباعی کا یہ حال تھا کہ علما و فضلا کی صحبت میں بیٹھ کر اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ حافظہ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں شعر اردو فارسی کے ازبر تھے۔ یہی اشعار مختلف موقعوں پر اپنے مضامین میں عجب انداز سے چسپاں کرتے تھے۔

بے اعتدالی افسوس ہے اس باکمال نے اپنی قدر آپ نہ کی۔ بے اعتدالیوں نے بے طرح دل میں جگہ کر لی تھی سرشار اسم بامسمیٰ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبردست مصنف کا کمال روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا۔ اور زندگی فارغ البالی کے ساتھ نہ بسر ہو سکی۔ سنتے ہیں کہ آخر زمانے میں مہاراجہ کشن پرشاد نے انہیں بے اعتدالیوں کی وجہ سے اپنا دستِ شفقت کھینچ لیا تھا۔ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صاحبِ

کمال ضعیف ہوتا ہے۔ تو اُس کا کمال جوان ہوتا ہے۔ لیکن سرشار کی عمر کے ساتھ اُن کے کمال میں بھی ضعف آ گیا۔ اس عالی فہم مصنف کو خود اس امر کا احساس تھا۔ یہ ذہنی زوال لازمی تھا نثاری ہو یا شاعری یہ سب صحت دماغی پر منحصر ہے۔ آب آتشیں، جب دماغ میں آگ لگا دے تو کھائے مضامین آتش بازی کے پھول ہو کر رہ جاتے ہیں۔ طبیعت پھیکی ہو جاتی ہے۔ کلام میں گرمی باقی نہیں رہتی۔

ممکن نہیں کہ ایسا ذہین اور ذکی شخص اس بلائے بے درماں کے اثر سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ مختلف فسانوں میں اس کی مذمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ خود ضبط نہ کر سکے۔

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں تپ دروں نے بالکل گھلا دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ جسم سوکھ کر لاغر ہو گیا تھا۔ آخر کار ۲۷ر جنوری ۱۹۰۲ء کو اس دار فانی سے رحلت کی۔ پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔

اس مسئلے پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہو گا کہ اردو میں قصہ نگاری کا قدیم رنگ کیا تھا۔ کیونکہ جو لوگ اردو جاننے والے اور پڑھنے والے ہیں ممکن نہیں کہ انہوں نے طلسم ہوشربا، بوستان خیال یا فسانہ عجائب کی بعید از خیال اور خلاف از عقل و قیاس سرگزشتوں کا مطالعہ نہ کیا ہو یا کم از کم ان کے نام سے آشنا نہ ہوں۔ ان کتابوں کے مصنفین کی جدت اور مضمون آفرینی میں کس کو شک ہو سکتا ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ یہ افسانے اصلیت اور حقایق انسانی سے خالی تھے اور اس وجہ سے اُن سے وہ کام نہ نکل سکا جو یورپ میں آج ناولوں کے ذریعے ہو رہا ہے۔ وہاں ان ناولوں اور قصوں سے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فواید حاصل ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ہمارے یہاں ان پرانے افسانوں سے صرف تفریح طبع مقصود تھی۔ اسی شوق نے جو امرا اور حکمرانوں کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ ہمارے یہاں داستان گویوں کی ایک خاص جماعت پیدا کر دی تھی جس کے باقیات الصالحات آج بھی ہندوستان کی اسلامی دیسی ریاستوں میں اپنے اسلاف کے کمال کا عملی ثبوت دینے کے لئے موجود ہیں لیکن اب ان باتوں میں کوئی لطف باقی نہ رہا اور خیالات اور مذاق کے تغیرات کے ساتھ ضروری تھا کہ اس صنف خاص میں کچھ مسالہ ان لوگوں کی ضیافت طبع کی غرض سے مہیا کیا جاتا جن کا وجدان صحیح دیو، جن، بھوت پریت کے دور از خیال اور غیر سبق آموز قصص میں کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ اس اہم ضرورت کی تکمیل کا احساس سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کو ہوا اور وہی اردو کی جدید طرز کی فسانہ نگاری کے موجد ہیں۔ ہم خود بھی جانتے ہیں کہ اردو زبان کے اولین مصنفوں میں ہمیں جتنے نام سنتے ہیں وہ سب کے سب قدیم تعلیم و تربیت کے نمونے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی پرانے زمانے کی یادگار تھے۔ ان میں اتنی بات ضرور تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور غالباً مطالعہ کے زور سے اس میں مہارت کامل پیدا کر لی تھی۔ یہ امر ابھی تک مابہ النزاع ہے کہ جدید فسانہ نگاری میں اولیت کا سہرا شرر کے سر ہے یا سرشار کے۔ قدردانان اردو کے دو گروہ ہو گئے ہیں ایک شرر کی فضیلت کا مدعی ہے دوسرا سرشار کی۔ ہمارے یہاں اصولی اور علمی بحثوں میں بھی ذاتیات تک نوبت آ جاتی ہے ورنہ اس قسم کے مسائل پر رائے زنی کرنا نہ صرف دلچسپی کا موجب ہوتا ہے بلکہ مفید بھی کیونکہ کسی زبان کی تاریخ ان واقعات کے فیصلہ کن تجزیہ کے بغیر کسی طرح مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ بہر حال یہ بحث ایک عرصے تک جاری رہی اور دونوں گروہ اپنے اپنے عقاید کی تائید عقلی و نقلی دلائل سے کرتے رہے ہم کو اس جگہ سرشار و شرر کے قضیئے از سر نو تازہ کرنا منظور نہیں مگر ہماری ذاتی رائے اس بات میں یہ ہے کہ اگر مولانا حکیم برہم کی منطق کی رعایت سے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ فسانہ آزاد جو سرشار کی شہرت علمی کی بنیاد ہے بعض اسباب سے جدید طرز کے ناولوں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق نہیں تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سرشار اصولاً اردو ناول نویسی کے موجد ضرور ہیں۔ اس سے ہمارا یہ منشا یہ ہے کہ سرشار سب سے پہلے ہندوستانی فسانہ نگار ہیں۔ جنہوں نے اردو قصوں کو مافوق العادت واقعات سے لبریز کرنے کی جگہ ان میں اصلیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

سرشار کی اولین تصنیف جس نے دنیائے ادب میں ان کو مشہور و معروف کر دیا ہے، اور ان کی نام وری و عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ فسانہ آزاد ہے۔ اُس کو اردو قصص اور ناولوں میں باعتبار مضمون کے وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں ڈان کوئگزات کو ہے۔ فسانہ کی شان نزول بھی یہی ہے کہ سرشار کے کسی دوست نے اس طرز کی کتاب تصنیف کرنے کی فرمائش کی تھی۔ سرشار نے مستقل کتاب مرتب کرنے کی جگہہ پہلے جداگانہ مضمون کی حیثیت سے اسے اودھ اخبار میں چھپوانا شروع کیا اور جب انہیں معلوم ہو گیا کہ پبلک کو اس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تو اُسے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ فسانہ آزاد میں جدید و قدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ

کی گئی ہے کہ دونوں مذاق کے لوگ اُسے پسند کرتے ہیں۔ ہم اس جگہ فسانۂ آزاد کی خصوصیات کو نمبروار تعیین کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلی اور مفید ترین خصوصیت فسانہ کی یہ ہے کہ اس میں جس قدر واقعات ہیں وہ سب کے سب بلا استثنا انسانی کرداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے پرانے قصوں میں روحانی تصرفات کا منظر بہت دلکش الفاظ میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن یہی ایک بات ایسی تھی جو قصے کو صرف قصہ کی وقعت دلاتی تھی۔ نہ اس سے اخلاق و آداب پر کوئی اثر پڑتا تھا۔ نہ کوئی تاریخی یا تمدنی منافع مرتب ہوتے تھے اور نہ کوئی معاشرتی یا اخلاقی نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جب پڑھنے والا یہ سمجھے کہ اس کتاب کا ہیرو محض روحانی طاقتوں کی بدولت اپنی مشکلات سے عہدہ برا ہوا اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو اس سے اس کی ہمت وجرأت و استقلال میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ مُہر سلیمانی یا الٰہ دین کے چراغ کا حاصل کرنا انسانی طاقت سے قطعاً خارج ہے۔ لیکن اگر اُس کی کامیابی اور حقداری خود انسانی کوششوں کا نتیجہ ثابت کی جائے تو یقیناً اس کے عزم و ارادے بلند ہوں گے اور وہ یہ خیال کرے گا کہ اس شخص کی طرح میں بھی اپنے دماغ و ذہن سے کام لے کر فائز المرام ہو سکتا ہوں۔

(۲) دوسری خصوصیت فسانہ کی یہ ہے کہ اس میں جس قدر باتیں لکھی ہیں۔ وہ ایسی ہیں کہ اُن کی اصلیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ کوئی منظر کوئی سین کوئی واقعہ ایسا نہیں دکھایا گیا جس کی ہو بہو تصویر نہ کھینچ دی ہو۔ مثال کے لئے فسانہ آزاد کے ابتدائی صفحات دیکھنے چاہئیں جہاں آزاد مکتب وغیرہ کی سیر کرتے اور وہاں کی کیفیت بامعان نظر دیکھتے پھرتے ہیں یہ حالات مطالعہ کیجئے تو ممکن نہیں کہ وہی سماں آنکھوں کے سامنے پھر نہ جائے

(۳) ناول کی کئی قسمیں ہیں کسی میں کوئی تاریخی واقعہ درج ہوتا ہے۔ کسی میں رسم ورواج کی کیفیت دکھائی جاتی ہے کوئی کسی خاص زمانے کی عام معاشرتی وتمدنی حالت کا آئینہ ہوتا ہے۔ فسانۂ آزاد اس وقت کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا دلچسپ ترین مرقع ہے۔ سرشار کی دو ایک اور تصانیف (سیر کہسار وغیرہ) اس خصوصیت کی مشترکہ طور پر حصہ دار ہیں۔ سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے محمد علی شاہ کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ عروج کا تھا لیکن اسلامی سوسائٹی میں جہاں تک اس کا تعلق اودھ سے ہے دلفریب خوبیوں کے ساتھ بعض قابل اصلاح عیوب بھی موجود دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ

ان باریک باریک باتوں کو جن کی طرف انسان کا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ سرشار نے نہایت غور وخوض سے دیکھا اور جانچا۔ انہوں نے کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ کسی قسم کا الزام نہیں لگایا۔ لیکن محاسن کے ساتھ معائب کا ذکر اس انداز سے کر گئے ہیں کہ نکتہ سنج طبائع ان کا منشا فوراً سمجھ جاتی ہیں۔

(۴) اردو نثر میں بیگمات کی زبان خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اس امر خاص میں دہلی اور لکھنؤ والے دونوں ہمنوا ہیں کہ جس محاورے کا ثبوت محلات کی گفتگو سے نہ ملے وہ قابل سند نہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ بیگمات کی زبان کی نقل ہر شخص آسانی سے نہیں اتار سکتا۔ آج تک صرف دو چار ہی آدمی ایسے گزرے ہیں۔ جنہوں نے اس میں کمال حاصل کیا اور ان میں سرشار یقینی طور پر ممتاز ہیں۔ اس کا ثبوت فسانہ آزاد اور سیر کہسار کے صفحے صفحے سے ملتا ہے۔ وہی الفاظ وہی محاورے وہی لب ولہجہ وہی انداز تقریر وہی لوچدار باتیں۔ وہی فصاحت وہی لطافت گویا آپ اپنے کانوں سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سُن رہے ہیں پردہ نشین مستورات کی زندگی مغرب کی نگاہوں اور ان لوگوں کی نظروں میں جو اسلامی طرز معاشرت سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ایک سربستہ راز بنی ہوئی ہے۔ لیکن سرشار کے فسانہ آزاد میں یہ راز بے نقاب کر دیا گیا ہے اور کم از کم لکھنؤ کی بیگمات کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ صحیح اور بالکل صحیح ہے جو کام ایک مسلمان اہل قلم عمدگی کے ساتھ انجام نہ دے سکا وہ سرشار نے پورا کیا۔ یہ وصف اُسی شخص میں ہو سکتا ہے جسے اپنی آنکھوں سے محلات کی زندگی کا طور طریق دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ کہا جاتا ہے سرشار کو ایسے مواقع خوش نصیبی سے ملے تھے۔ پڑوس میں مسلمانوں کے مکانات تھے۔ اس زمانے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ سرشار کو اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں ان گھروں میں جانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا اور یہی تجربہ اور مشاہدہ ہے جو ان کی لفظی تصویروں میں اصلیت کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس مرقع میں بعض نقش ونگار خیالی اور فرضی بھی ہیں۔ مثلاً حسن آرا اور سپہر آرا کی آزادانہ معاشرت اور ان کے ساتھ آزاد کے تعلقات کا اس درجہ بے تکلف ہونا یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں اسی طرح آزاد کو ان کی محبوبہ کی جانب سے جنگ میں شریک ہو کر دادِ مردانگی دینے کی صلاح ایک ایسا فعل ہے کہ تاوقتیکہ عورتوں کی تعلیم وتربیت باقاعدہ طریقے سے اصولاً نہ ہو۔ وہ اس قسم کے جذبات کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتیں۔

(۵) زبان کی خوبیوں کا ایک پہلو اوپر دکھانے کے بعد صرف اس قدر کہنا رہ جاتا ہے کہ بیگمات کی گفتگو سے قطع نظر دوسری صورتوں میں بھی فسانہ آزاد کے مصنف نے اپنے اشخاص افسانہ کے طرز کلام کی نقل اتارنے میں کمال کیا ہے۔ ملا اور واعظ سے لے کر افیونی اور سرائے کی بھٹیاری تک کی بول چال اس صفائی سے دکھائی گئی ہے کہ باید و شاید۔

(۶) یہی مکالموں کا حال ہے ناول نویس کے لئے یہ منزل بہت دشوار گزار ہوتی ہے کیونکہ اُسے اپنا مافی الضمیر دوسروں کی زبان سے اس طرح ادا کرنا پڑتا ہے کہ سننے والوں کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی توسل اور بھی ہے۔ سرشار اس دقت پر بھی بخوش اسلوبی غالب آئے ہیں اور انہوں نے اس راستے کو اس طرح طے کیا ہے کہ کسی موقعہ پر تکان کے آثار نہیں پائے جاتے۔

(۷) سرشار کے فسانہ کے کیرکٹر بولتے ہوئے ہیں اور یہ صفت بھی بہترین ناولوں کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ آزاد اور خوجی پر ان کا طبعی رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ جہاں کہیں اور جس جگہ کبھی نظر آتے ہیں دور سے شناخت ہو جاتے ہیں۔ آزاد اور خوجی کی جو شہرت اب ادبی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس کی مثال الف لیلہ کے خاص خاص کیرکٹروں کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ بھی سرشار کے باکمال ہونے اور ان کی تصنیف کے مقبول عام ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔

(۸) اس میں شک نہیں کہ تاریخی ناول فن فسانہ نگاری کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ عشق و محبت کی سرگزشت کا فرضی پیوند لگایا جاتا ہے جس سے اصل کتاب پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ نقص اُن ناولوں میں نہیں ہوتا جن میں کسی خاص ملک، قوم ملت یا کسی خاص وقت کے مراسم اور رواج یا سوسائٹی کی عام حالت دکھائی جاتی ہے۔ اس قسم کی تصانیف ہر زمانے میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں جن میں اگرچہ واقعات سب فرضی ہوتے ہیں لیکن انہیں گرد و پیش کے جن حالات و واردات کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ ان کے صحیح اور دلپسند ہونے میں کلام نہیں جس طرح ہم ان کتابوں کے مطالعہ سے لکھنو کی قدیم سوسائٹی (جس کی کچھ جھلک اس زمانے میں بھی وہاں پائی جاتی ہے) کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں اس طرح آئندہ زمانے میں بھی اگر کسی کو یہ شوق ہوا تو اس کے لئے معلومات کا بہترین ذریعہ فسانہ آزاد یا اسی قسم کا اور لٹریچر ہوگا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد غالبًا سب کو اعتراف ہوگا کہ فسانہ آزاد کا شمار جائز استحقاق کے ساتھ کم از کم اردو کی ان زندہ جاوید کتابوں میں ہونے کے لائق ہے جو اپنی مستقل دلبستگی اور دائمی مفاد کے سبب خاص و عام سے قبولیت کی سند لے کر مدت ہائے دراز تک رواج پذیر رہتی ہیں۔ اس قسم کی تصانیف مصنف کے لئے عمومًا سرمایہ ناز ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے اگر سرشار کو فسانۂ آزاد پر فخر ہو تو کچھ نازیبا نہیں۔

اکثر معترضین کا خیال ہے کہ بہت سے محاسن کے ساتھ فسانہ آزاد میں چند عیوب بھی ایسے موجود ہیں جو نظر انداز نہیں ہو سکتے۔ مثلاً کتاب کی ضخامت اس قدر ہے کہ طوالت بعض مرتبہ مطالعہ کی دلچسپی کو کم کر دیتی ہے۔ اسی طرح مضامین اور واقعات کا غیر مسلسل ہونا بھی اصول تنقید کے لحاظ سے قابل اعتراض ہے بعض اہل نظر فسانہ آزاد کو جدید ناول نویسی کا نمونہ نہیں سمجھتے یہ باتیں ایک زمانے تک معرض بحث میں رہ چکی ہیں اور یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ فسانہ آزاد کے علاوہ سرشار کی اور تصانیف بھی ہیں لیکن وہ اس اعلیٰ پیمانے کی نہیں جس کا مقابلہ فسانۂ آزاد کے ساتھ کیا جائے۔ تصنیفات مابعد میں سے سیر کہسار، جام سرشار اور کامنی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں لیکن ان میں سے کوئی فسانہ آزاد کے رتبہ کی نہیں۔ سیر کہسار غنیمت ہے لیکن اس کے بعد بضرورتاً انہیں چند کتابیں لکھنی پڑیں۔ پی کہاں۔ ہشو۔ بچھڑی ہوئی دلہن وغیرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں ان سے تفریح کے سوا اور کوئی فایدہ نہیں متصور ہو سکتا۔ ایک امر سرشار کی کتابوں کے متعلق یہ بھی ہے کہ ان کے تمام ناولوں میں فسانہ آزاد سے لے کر ہشو پی کہاں تک ایک ہی قسم کی سوسائٹی کا رنگ دکھایا ہے اور ایک ہی طرح کے کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ جس معاشرت کی تصویر انہوں نے دکھائی ہے۔ صرف اُسی کے خط و خال سے وہ بخوبی واقف تھے۔

ہمارے خیال میں اگر سرشار تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے تو غالبًا اپنی قابلیت سے اس میں بھی مرد میدان ثابت ہوتے لیکن یہ رنگ ان کے

طبعی مذاق کے بالکل مخالف تھا اور ابتداءً انہیں ایسی دشوار گزار گھاٹی کے طے کرنے میں ناقابل بیان مشکلات کا سامنا ہوتا اور ان پر غالب آنے کے بعد بھی یقیناً انہیں ملک میں وہ رسوخ نہ حاصل ہوتا جو فسانۂ آزاد کی وجہ سے ہوا کسی کتاب یا کسی مصنف کی تصانیف کی قدر و منزلت یہ دیکھنے سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ اس کتاب یا ان کتابوں کی وجہ سے اس زبان کے عام علم و ادب پر کیا اثر پڑا۔ سرشار نے ناول نویسی کی جدید شاہراہ نکالی کہ اردو اہل قلم کا ایک معقول گروہ اس پر چلنے کے لئے تیار کر دیا ہے اور اب جس قدر نئے ناول لکھے جاتے ہیں۔ وہ اصولی طور پر سرشار کے نمونے پر ہوتے ہیں۔ اصول سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ اگرچہ سین۔ پلاٹ اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بعض جدید ناول فسانۂ آزاد سے افضل ثابت ہوئے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ فسانۂ آزاد کے اتباع اور تقلید سے اس لئے باہر نہیں کہے جا سکتے کہ سب سے پہلے فسانۂ آزاد ہی نے جدید قصہ نویسی کا نمونہ پیش کر کے دکھایا تھا کہ قدیم و جدید افسانوں میں مابہ الامتیاز فرق کیا ہے اور فطرت انسانی کے کارنامے کس طرح آشکار کرنا چاہیے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرشار کی تصنیفات نے اردو کے فن افسانہ نویسی کو خاص تقویت پہنچائی ہے اور اس کا اعتراف تو ان لوگوں کو بھی ہے جو سرشار کو اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتے جو انہیں ملک نے دے رکھی ہے۔ جدید طرز کے افسانوں کے ماسوا سرشار کی علمی خدمات کی تفصیل کچھ اور بھی ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ اس جگہ قلم بند کریں گے۔

سب سے پہلے ان کے مضامین مراسلۂ کشمیر اور اودھ پنچ وغیرہ میں نکلتے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ ۱۸۷۹ء میں انہوں نے علم طبعیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ انگریزی انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی اور گو انہوں نے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی لیکن ذاتی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ ہر قسم کا کام وہ انگریزی میں بآسانی کر سکتے تھے۔ ایڈووکیٹ اور پاینیر میں ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مراسلات ڈفرن کے نام سے انہوں نے لارڈ ڈفرن کے خطوط کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ خطوط مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق ہیں اور ان کا صاف و صحیح ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سرشار انگریزی خوب جانتے تھے۔ عربی فارسی کی تعلیم اس وقت شرفائے ہنود میں عام طور پر رائج تھی اور سرشار بھی ان دونوں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے چار برس کی عمر میں ان کے باپ پنڈت بیج ناتھ کا انتقال ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باوجود تعلیم ان کی باقاعدہ ہوئی اس کا ثبوت ان کے علمی مضامین سے بھی ملتا ہے۔

۱۸۷۹ء میں منشی نول کشور نے اودھ اخبار کا انہیں ایڈیٹر مقرر کیا۔ ان کے زمانے میں جو شہرت اور ہردلعزیزی اس اخبار کو حاصل ہوئی اس کی نظیر اس کی پچھلی اور مابعد کی زندگی میں نہیں ملتی۔ خصوصاً جس زمانے میں فسانۂ آزاد بہ اقساط اس میں شائع ہوتا تھا اس وقت اودھ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور شاید یہ پہلی کامیابی ہی تھی جو کسی اردو اخبار کے حصہ میں آئی۔ اودھ اخبار سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد وہ اپنا خاص رسالہ خمکدہ سرشار نکالنے لگے۔ جس میں یہ التزام رکھا گیا تھا کہ ہر نمبر میں ایک مکمل ناول نکلتا تھا۔ پی کہاں۔ بچھڑی ہوئی دلہن اور کڑم دھم بھی ہیں نکلتے تھے۔ ہز ایکسیلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اس زمانے میں وزیر افواج نظام تھے۔ حضرت سرشار ان ہی کے ہاں رہتے تھے اور مہاراجہ بہادر ان پر آخر دم تک مہربان رہے۔ سرشار اُن سے جدا نہیں ہوئے حیدرآباد میں ہی حضرت سرشار نے اپنے علمی مشاغل کا سلسلہ از سر نو جاری کر لیا تھا۔ حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار ہیں۔ دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نثر اور نظم کے پرچے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی میں حضرت سرشار کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبدبۂ آصفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا تھا لیکن اکثر مضامین دوسروں کے نام سے چھپتے تھے تاہم طرز تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے مصنف حضرت سرشار ہی ہیں۔

سرشار اسم بامسمیٰ سرشار تھے۔ آب آتشیں سے انہیں اس درجہ اُنس تھا کہ کسی وقت اس کے کیف سے خالی نہ رہتے تھے جہاں کہیں جاتے ملازم کے ساتھ ایک بوتل ضرور ہوتی۔ مے نوشی کا شغل ان کی خلوت و جلوت کا رفیق تھا۔ اس بے اعتدالی نے جہاں ایک طرف اُن کے قوائے جسمانی کو صدمہ پہنچایا۔ وہاں دوسری طرف ان کے آفتاب کمال میں ہی گہن لگا دیا تھا۔ قاعدے کی بات ہے کہ انسان جس قدر معمر اور مسن ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کا ہنر پختگی پاتا جاتا ہے۔ لیکن سرشار کی کیفیت جداگانہ تھی جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے۔ ویسے ویسے ان کے جوہر فن کی جلا ماند پڑتی گئی اور اگر سبب اس کا غائر نظر سے دیکھا جائے تو سب سے قوی یہی ہو گا کہ انہوں نے بنت العنب کو منہ لگا کر خود کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

سرشار کا اصلی نام پنڈت رتن ناتھ در تھا لیکن وہ زیادہ تر اپنے تخلص سے مشہور ہیں۔ اس کے باوجود بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فن شعر گوئی میں بھی انہیں مہارت تھی۔ بیشک وہ شاعر تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کی علمی عظمت کا ثبوت اُن کی دو مختلف تصانیف سے ملتا ہے نہ کہ ان کے چند متفرق اشعار ایک یا دو مختصر مثنویوں اور نظموں سے جن کے مختلف اشعار اکثر لوگوں کو اب تک یاد ہیں۔ تحفۂ سرشار ایک مثنوی ہے لیکن اس سے پختگی کلام اور رنگینیٔ خیالات کا ثبوت کچھ زیادہ نہیں ملتا تاہم قیاس سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر سرشار نے شعر گوئی کی طرف کچھ اور توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوتے۔ شاعری میں حضرت اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کے اشعار گواہ ہیں کہ انہوں نے صنائع و بدائع کی پابندی میں اپنے استاد کی پیروی نہیں کی بلکہ صاف اور شستہ زبان کو ترجیح دی ہے۔

ساقی نامہ سرشار سے اچھا کون لکھ سکتا ہے جن کے گھر کی شراب لونڈی تھی۔ ظرافت کا مادہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اس کا رنگ آپ کی عام تصانیف میں موجود ہے۔ غزلیات کہنے کے سرشار معموناً عادی نہ تھے۔ لیکن آخر ان کے زمانۂ حیات میں انہیں کے اہتمام سے بہ مقام حیدرآباد مہاراجہ شاد بہادر کی ڈیوڑھی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرشار خود تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن مقامی شعرا کو اصرار کے ساتھ شرکت کے لئے مدعو کرتے تھے ان کی خاطر سے اکثر مشاہیر کو وہاں جانا پڑتا تھا اس طرح مشاعروں میں بڑی رونق رہتی تھی تاہم کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ حیدرآباد میں انہیں باوجود علمی مذاق کے لذت سے اپنے ہم خیال مل سکے اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب خانہ خراب نے ان کو زیادہ تر گوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے دم سے وہاں وہ علمی چرچا نہ ہونے پایا جس کی امید سرشار ایسے مشہور نثار کی موجودگی سے بہر صورت ہو سکتی تھی۔ خود محبوب الکلام دبدبۂ آصفی جو ایک معنی میں ان کے ذاتی رسالے تھے۔ ان کی عدم توجہی سے کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہ ہو سکے۔ مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بھی وہ کم رتبہ تھے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون ایسا نکل جاتا تھا جس کی طرز بیان کہہ اٹھتی تھی کہ یہ حضرت سرشار کی جودت طبع کا نمونہ ہے۔ حیدرآباد انہیں موت کھینچ لے گئی تھی اور وہ پھر وہیں کی خاک کے پیوند ہوئے ۲۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد میں رحلت کی جس خاک میں امیر و داغ کی ہڈیوں کا پیوند ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ وہی سرشار ایسے اہل کمال کا بھی مدفن بنی۔

علی حسن خاں ایم اے

رباعیات

ہر شے تاریک ہے ہر اک جا تاریک — ظلمات میں ہے دیدۂ بینا تاریک
کچھ دیکھ سکے گی نہ تری آنکھ اس میں — دل ترے حریف کا ہے ایسا تاریک

گو ختم نہ مجھ سے ہو سکا میرا کام — لیکن مری زندگی نہیں ہے ناکام
میں راہِ طلب میں رہ گیا ہوں تھک کر — مایوس نہیں یاس سے مجھ کو کیا کام

پامال مری روح پرستش کو نہ کر — کر رحم مرے ذوقِ عبودیت پر
پھر جھک نہ سکے گا یہ کسی کے آگے — قدموں سے نہ اپنے اب اٹھا میرا سر

غم آب ہے اس کی دل ترا اک گوہر — غم جانِ مسرت ہے نہ کر اس سے حذر
جس دل نے کبھی مجھ سے محبت کی ہے — آلودہ اسے غیر کی الفت سے نہ کر

مانا کہ پھری ہوئی ہے قسمت مجھ سے — مانا کہ کنارہ کش ہے دولت مجھ سے
مانا کہ کٹی یونہی جوانی بے کار ! — کیا غم ہے جو ہے تجھ کو محبت مجھ سے

منصور احمد مرحوم

خود غرض

(۱)

آخر مویشی جن کی بدولت تین برس پیشتر جیا اور جیون جاٹ اور اُن کے حواریوں میں تصادم ہوا بے سمجھ جانور ہی تھے نا۔ اگر عقل ہوتی تو کیوں کسی کے کھیت میں گھس کر اُگتی ہوئی مکی کی ہری بھری کونپلوں کو منہ مارتے تلوں کے خشک پودوں کو اگر لتاڑ کر زمین پر بکھیر بھی دیا تھا تو جیا اور جیون دونوں کو چاہئے تھا کہ آرام سے بیٹھ کر ایک دوسرے کو تنبیہہ کرتے۔ یا چار بھائیوں کے روبرو اپنا معاملہ نپٹا لیتے اور اگر ممکن ہوتا تو جائز ہرجانہ طلب کرتے۔ نہ یہ کہ لٹھ لے کر ایک دوسرے کا سر پھوڑ دیتے اور پھر عدالتوں میں ناکوں چنے چبا کر سینکڑوں روپیہ وکیلوں اور پولیس والوں کی جیب میں داخل کر کے انجام کار راضی نامہ کر لیتے۔ لوگوں کی ایسی غلطیوں اور سماج کی چند تباہ کن رسوم کا ازالہ کرنے کے لئے رُہل گاؤں کے ایک بزرگ نے پنچایت کی بنا ڈالی۔ لوگوں نے اعزاز کے طور پر اُسی بزرگ کو پنچایت کا صدر چُنا۔

رُہل گاؤں میں ایک لالہ میاداس ہی ایسے فرد تھے جن کی آنکھوں میں پنچایت خار کی مانند کھٹکتی تھی۔ وہ طبیعت کے نہایت خود غرض واقع ہوئے تھے۔ گاؤں میں اُن کی دو دُکانیں تھیں۔ ایک آٹے دال کی اور دوسری کپڑے کی جن سے انہیں باقی دکانداروں کے مقابلے میں زیادہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ پہلے وہ گاؤں کے چودھری تھے اور اپنے پیسے کے زور پر من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ مگر اب پنچایت کی وجہ سے اُن کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ پنچایت کے احکام مانے بغیر گزارا بھی نہ تھا کیونکہ اگر اس کے فیصلے کے خلاف وہ ایک لفظ بھی کہتے تو اُن کا روزگار خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ادھر اگر گاؤں والے اُن سے عدم تعاون کر دیتے تو وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جاتے۔ ہزاروں روپیہ کی جائداد کو چھوڑ کر اُس گاؤں سے چلے جانے کا خیال بھی وہ دل میں کیسے لاتے؟ پنچایت کا ایک ایک رکن اُن کی خود غرضی سے آگاہ تھا۔ یہاں تک کہ اگر بھولے سے وہ کسی کے بھلے کی بات بھی کرتے تو لوگ مشکوک انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور دل میں کہتے کہ اس بات میں کوئی نہ کوئی ایسا راز ضرور ہے جس سے لالہ میاداس کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچے گا۔ جب لالہ میاداس نے سیدھی انگلیوں گھی نکلتے نہ دیکھا تو پنچایت میں سے چند ایک آدمیوں کو روپے سے خریدنے کی کوشش کی مگر یہ سودا انہیں مہنگا پڑا۔ بہت اصرار کے بعد جن چند اشخاص نے اُن کا حواری بننا قبول کیا۔ وہ پیسہ ختم ہوتے ہی لالہ میاداس کے گھر پہنچتے اور روپیہ مانگتے۔ نفی میں جواب ملنے پر لالہ میاداس کو دھمکی دیتے کہ وہ پنچایت میں اس کی ہر ایک بات کی مخالفت کریں گے اور اگر پھر بھی لالہ میاداس نظر التفات نہ کرتے تو ہر اچھی بُری بات میں ان لوگوں کی طرف سے پنچایت میں اُن کی کھلم کھلا مخالفت ہونے لگتی۔

لالہ میاداس کے ایک لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کی عمر کوئی اکیس برس اور لڑکی کی سولہ برس تھی۔ لڑکا پاس ہی کے بڑے شہر میں نہر کے محکمہ میں نوکر تھا۔ پوہ ماگھ کے اُن دنوں جبکہ سورج دھن راس کو کاٹ کر مکر راس میں داخل ہوتا ہے یعنی تل سنکرانت کے دن جبکہ سبھی دیہی عورتیں تل بانٹ رہی تھیں اور آپس میں گاجر، مٹر، امرود، بیر اور گنے کا تبادلہ کر رہی تھیں۔ اور سوئے ہوئے جذبات میں زندگی پھونک دینے والے تبسم سے مسکراتی ہوئی ایک دوسری سے کہہ رہی تھیں "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔" اور اُس دن کے بعد جبکہ دن تل برابر ہر روز بڑھ کر آہستہ آہستہ چولھا سماج کی حاضری میں کمی پیدا کر رہا تھا منورما ـــــ لالہ میاداس کی لڑکی ـــــ سترھویں برس میں قدم رکھ رہی تھی اور یہ غم کہ لڑکی اس قدر جوان ہو رہی ہے اور اس کے لئے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل سکا۔ لالہ میاداس کی بیوی کو کھائے جا رہا تھا۔ سنکرانت کے اُن دنوں میں منورما کی ماں کی ادھوری خوشی کا اُس کی نیم جان آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک دن گھر کی دہلیز پھاندتے ہوئے لالہ میاداس کا ماتھا ٹھنکا۔

"منورما کی ماں"۔ لالہ میاداس نے کہا۔ "آج کیا بات ہے۔ بتی کو دیا سلائی تو دکھا دو۔"

"دیا بتی جلائے بھاڑ میں" منورما کی ماں نے بپھرتے ہوئے کہا۔ "مجھے

مگئے ہیں کا ہوش ہے کیا۔ مجھے تو اس چھوکری کے غم نے کھالیا ہے۔ پنچائت ماننے سے رہی تو گیا نے بٹھا چھوڑیں گے۔"

"دیکھو ــــــ اگر اتنی ہی جلدی تھی تو پھر دنوں سے کیوں نہ نسبت کر نے دی۔ یہ قرار پایا تھا تاکہ منورما کو کسی بڑے گھرانے میں دیا جائے اور پنچائیت میں اس بات کا چرچا کیا جائے کہ بیاہ شادیوں میں جہیز دینا فضول ہے۔ اس سے سینکڑوں گھر برباد ہو چکے ہیں اور اگر کسی کو ضرور کچھ دینا ہی ہو۔ تو تحفے تحائف کے طور پر دیا جائے۔ مگر ایسی حالت میں بھی اُن اشیا کی قیمت دو سو سے زیادہ نہ ہو ــــــ یہی ایک طریقہ ہے جس سے امیرانہ وضع داری کے ساتھ تھوڑے سے خرچ میں گزارا کر سکتے ہیں۔ برات کو روٹی اچھی کھلا دی۔ جہیز میں کچھ نہ دیا اور اپنا روپیہ بچا لیا . . . مگر کرم اور بلاقی شاہ، بشیشر اور گردھاری سب اس کے خلاف ہیں۔ وہ علانیہ طور پر کہتے ہیں کہ منورما کا بیاہ درپیش ہے اور اسی لئے یہ ٹنگ و دھونگ رچا رہی ہے"۔

تو کیا رامے اور بانشی اور ان کے پٹھوؤں نے تمہارا ساتھ نہ دیا . .

انہیں پیسے کا ہے کو دیئے . . "

"انہوں نے بہتیرا شور و غوغا کیا مگر وہ ہیں آٹے میں نمک برابر ــــــ میں نے پردھان سے کہہ دیا ہے کہ میری ہر بات میں بلاوجہ مخالفت کی جا رہی ہے"

"مگر پردھان کس کروٹ ہے ــــــ . . "

"وہ کہتا تھا کہ باہر سے آئی ہوئی برادریں یہ بات گوارا نہ کر سکیں گی۔ تس پر میں نے جواب دیا کہ جب وہ سمجھیں گے کہ یہاں کی پنچایت کا یہی دستور ہے تو پھر وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے اور اگر وہ اس کے خلاف احتجاج کریں تو ہم دوسرے گاؤں کی لڑکیاں لینی چھوڑ دیں گے اور اپنی چند ایک نزدیک کے گاؤں میں جہاں رہل کی پنچائت کا دبدبہ ہے اپنے ناطے کر لیں گے . . . "

"پھر کیا بولا وہ بڑھئو ــــــ ڈھانٹ ــــــ"

"سنو تو ــــــ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے گرام میں کئی پیسے ٹکے سے اچھے ہیں اور کئی قصبوں کے لوگ اپنی لڑکیاں ہمیں منت سے دینے کو طیار ہیں ــــــ بات تو یہ ہے کہ پنچائیت مضبوط ہو اور گرام باسیوں میں ایکا ہوا ہو ــــــ"

"پھر کوئی تانا بانا بنا کہ یونہی . . . "

"رام پہ بھروسہ رکھو نا ــــــ کل شام کے آٹھ بجے اس بات کے متعلق بحث ہے ــــــ میں نے ایک آدھ پٹھوا در تیار کیا ہے۔"

(۲)

پنچایت ماروتی مندر کے بغل میں ایک بڑے کمرے میں بیٹھی۔ منورما کی ماں بھی درشن کے بہانے چند ایک عورتوں کو ساتھی بنا کر اُس کھڑکی میں جو مندر سے پنچائت والے کمرے میں کھلتی تھی آ بیٹھی۔

پردھان جی خاموشی سے سب کی باتوں کو سن رہے تھے۔ لالہ میاداس کا حواری بانشی مل کچھ پڑھا لکھا تھا اور سلجھے الفاظ میں گفتگو کر سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جہیز کی رسم بہت پراچین اور سناتن ہو چکی ہے۔ آج جبکہ بھارت ورش کی حالت بہت ابتر ہے اور اوسط آمدنی فی کس دو پیسے ہے تو پتری دھن کہاں سے تیار کیا جائے۔ پراچین سمے میں جبکہ بھارت ورش سونے کی چڑیا تھا۔ ہر ایک آدمی کو توفیق تھی کہ وہ پتری دھن زیادہ سے زیادہ دے۔ ہم نے کئی ایک گھرانے دیکھے ہیں۔ جہاں پتری دھن کے سوال نے غریب ماتا پتا اور کنبے کو بہت دکھی کیا۔ یہاں تک کہ کئی کنیاؤں نے اپنے ماں باپ کی بُری حالت کو دیکھ کر اور سماج کے اس سخت تکلیف دہ قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک لیا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے جل مریں۔ یا دریا میں کود کر جان دے دی یا چھت پر سے چھلانگ لگا کر پران تیاگ دیئے۔ لوگوں نے ان کی لاش پر آنسو بہا کر سماج کو خوب کوسا۔ مگر سماج کو آلائشوں سے پاک کرنے کی جرات نہ کی۔ بنگال میں جہاں یہ رسم زیادہ عام ہے۔ وہاں لوگوں نے اخباروں میں اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی۔ مگر بڑی توند والے کر سماج مندر کا رقبہ گھیرنے والے سرمایہ دار کب کسی کی سنتے ہیں ــــــ ان کی بلا سے کوئی جل مرے . . . کوئی ساگر میں کود کر پران تیاگ دے . . . "

بانشی مل کے گلے میں رقت (جو اُس نے کمال عیاری سے پیدا کر لی تھی) سے رکاوٹ پیدا ہو گئی اور وہ آگے بولنے سے معذور ہو گئے لالہ میاداس نے اس ہوش ربا تقریر کے بعد ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آہ ــــــ ہندو سماج۔ تیرا ایشور ہی سہائی ہے۔" انہوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ منورما کی ماں کے چہرے پر انہیں خوشی اور شانتی کی لہر دکھائی دی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی۔ کہ میدان آج اس کے خاوند کا ہی ہے۔

راسے نے دیکھا کہ بانشی کا گلا رقت سے رک جانے کی وجہ سے سامعین پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بانشی کی بات کو جاری رکھا ۔۔۔۔

"یہی نہیں بلکہ کئی والدین نے بھی ناک کی خاطر اپنے آپ پر منوں بوجھ ڈالا جس کے نیچے دب کر وہ زندگی بھر ٹھنڈی سانسیں لیتے رہے اور اپنے بیوی بچوں کو ہمیشہ کے لئے ننگ و ناموس سے عاری کر گئے ایک لمحہ کی واہ واہ کے لئے ہمیشہ کے لئے اپنی عزت او رآبرو برباد کر دی ۔۔۔۔ پیسے کی کمی اور جہیز کی زیادتی کے نااہل ہوتے ہوئے لوگوں نے مدت تک اپنی کنیاؤں کو کنوارا بیٹھا چھوڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے اغوا کی وارداتیں ہونے لگیں اور ان پاپ ایتا چار ی ناک کے ٹھیکے داروں کی ناک اپنی کنیاؤں کی وجہ سے ایسی کٹی کہ پھر انہوں نے نکٹا چہرہ کسی کے سامنے نہ کیا اور یا خود کشی کر لی یا جنگل کا رُخ کیا ۔۔۔۔"

"مگر" مخالف پارٹی کے ایک رکن نے اپنی تقریر کو شروع کرتے ہوئے کہا "میں اپنے محترم بھائیوں کی ان باتوں کو صحیح مانتا ہوں کہ اس غریبی کی حالت میں ہم بڑی بیج کا جہیز نہیں دے سکتے۔ مگر اس رسم کا تیاگ سارے دیش میں مجموعی طور پر ہو تو بہتر ہے۔ آپ سوچیں تو کہ اگر ہم کسی کو جہیز نہ دیں تو باہر کے دیہات یا قصبے یا شہر کا کوئی آدمی کس لئے ہماری لڑکیاں لے گا۔ اُسے ہماری پنچایت کی پرواہی کیا ہے۔ پنچایت کی سب سے بڑی سزا حقہ پانی بند کر دینا اور انجام کار پنچایت کے فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والے آدمی سے عدم تعاون کر کے اُسے گاؤں چھوڑ دینے پر مجبور کر دینا ہی ہے نا۔ مگر دوسرے گاؤں کے آدمیوں کو اس بات کی کیا پرواہے۔ کل لالہ میا داس اور بانشی لال نے کہا تھا کہ اگر باہر کے آدمی اس بات کو گوارا نہیں کرتے تو اُن سے رشتے نہ کئے جائیں اور پڑوس کے دو چار گاؤں میں رشتے ناطے دیکھ لئے جائیں۔ کتنی غلط بات کہی ۔۔۔۔ پردھان صاحب کی ہی مثال لو۔ ایشور نے انہیں اچھا دھن وان بنایا ہے۔ کل ہی انہوں نے اپنی اکیلی کا بیاہ کیا تو اُس پڑھی لکھی سوشیل کنیا کے لئے تلاش اور تجسس کا دائرہ نہایت تنگ ہونے کی وجہ سے کوئی مناسب ور مل ہی نہیں سکتا۔ ایسا ور جو کہ برسر کار ہونے کے علاوہ گھر بار سے بھی اچھا ہو ۔۔۔۔ یہ سب کچھ تب ہی ہو سکتا ہے کہ سارے ملک میں مجموعی حالت ایک سی ہو ۔۔۔۔"

"بالکل ٹھیک کہا لالہ گردھاری لعل نے" ایک شخص نے کہا۔ "اور پھر آپ حساب لگا کر دیکھیں گے کہ ہمارے پڑوس کے گاؤں میں جو اس پنچایت کے دبدبے میں ہیں۔ لڑکیاں زیادہ ہیں اور لڑکے بہت تھوڑے اور جو تھوڑے سے ہیں وہ بھی آوارہ اور شہدے۔ ہر ایک ماتا پتا کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے اپنی کنیا کے لئے اچھا ور ملے۔ کوئی جان بوجھ کر اپنے جگر کے ٹکڑے کو آگ میں پھینکنا نہیں چاہتا مگر موجودہ حالات کی وجہ سے اور تلاش کا دائرہ نہایت محدود ہونے کی وجہ سے یہ جب ہی ممکن ہے کہ یہ بات مجموعی طور پر ہر جگہ ہو"۔

حقے کی نال کو پرے کرتے ہوئے اور منہ پر سے اپنی سفید اور بڑی بڑی مونچھوں کو ہٹاتے ہوئے پردھان نے کہا۔ "لالہ گردھاری لعل اور روپ چند نے جو باتیں کہی ہیں۔ وہ زیادہ وزن رکھتی ہیں اس میں شک نہیں کہ جہیز کی رسم مذموم ہے۔ مگر جب تک ملک کا بیشتر حصہ اس رسم کو خیرباد نہیں کہتا۔ ہمارے گاؤں میں اس کا ترک ہونا محال ہے ۔۔۔"

لالہ میا داس نے جواب دیا "مگر جب کبھی یہ رسم چھوڑی جائے گی تو پہلے اس کے ترک کرنے والے چند افراد ہی ہوں گے۔ کیوں نہ نرہل کے باشی مثال قایم کریں"۔

اس کے بعد چند سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ کچھ سوچ کے بعد پردھان نے لالہ میا داس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"لالہ میا داس ۔۔۔۔ امید ہے کہ آپ اس گستاخی کو معاف کریں گے ۔۔۔ یہ جو لوگوں کا خیال ہے کہ آپ سب کچھ فلاح کے لئے نہیں بلکہ خودغرضی کے لئے کر رہے ہیں ۔۔۔۔ آپ اس بارہ میں اپنی پوزیشن کیوں نہیں صاف کر دیتے"؟

لالہ میا داس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس سے پیشتر کسی نے علانیہ طور پر انہیں خودغرض کہنے کی جرات نہیں کی تھی۔ اغلب تھا کہ زیادہ شرمندگی کی وجہ سے وہ کچھ اناپ شناپ پر اتر آتے۔ مگر اُن کے سرکردہ حواری نے صورت حالات کو قابو میں لے لیا اور بات کو ٹالنے کی غرض سے بولا ۔۔۔۔

"پردھان جی۔ مجھے افسوس ہے کہ لالہ میا داس پر اس طرح ذاتی حملہ ہوتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ بات انہیں اس وقت سوجھی جب وہ اپنی کنیا کی شادی کی فکر میں تھے ۔۔۔۔ یہ سب کچھ منورما کے

لئے نہیں ہو رہا۔ یہ سب ہماری تمہاری بیٹیوں کے لئے ہے۔ اُن کو ایشور نے بہت کچھ دھن دیا ہے۔ وہ نہایت آسانی سے لڑکی کے جہیز میں ڈیڑھ دو ہزار روپیہ خرچ کر سکتے ہیں . . . "

لالہ میا داس کو گویا پہلے ہی تول گیا۔ اگرچہ اس بات نے اُن کی پوزیشن کو زیادہ خراب کر دیا کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ وہ روپیہ بچانا چاہتے تھے اور اسی لئے وہ یہ ڈھونگ رچا رہے تھے مگر موقع محل دیکھ کر انہوں نے لالہ بانسی مل کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔

"اس بات میں ذرہ بھی شک نہیں ——— میرے پاس ایشور کا دیا اتنا ہے کہ تین پشتوں تک ختم نہیں ہو سکتا۔ ایک لڑکی کے جہیز میں دو ڈھائی ہزار خرچ کرنے سے میں گھبراتا نہیں"۔

لالہ میا داس کے دوسرے حواری رامے نے کہا۔ "ہاں ——— ہاں توفیق والے نے تو کر دیا ہم کیا کریں گے۔ پنچایت کو ہماری فکر بھی لازم ہے کل میری بھتیجی بیاہی جانے والی ہے"۔

پنچایت کے اس اکھٹ میں ایک اور شخص بھی تھا جو اب تک چپ بیٹھا تھا۔ نام تو اس کا بشیشر دیال تھا۔ مگر لوگ اُسے "منہ پھٹ" کہا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ ہر اچھی بری بات چھوٹے یا بڑے کے سامنے بلا تکلف کہہ دیتا۔ حسب عادت اس نے کہا۔

"اس بات کا مزا تب ہے لالہ میا داس منور ما کا بیاہ کر لیں تو پھر اس گرام میں جہیز نہ دینے کا رواج بنایا جائے اس سے یہ پتہ چلے گا کہ وہ سب کچھ خود غرضی کی وجہ سے نہیں کر رہے"۔

"بے شک . . . مجھے منظور ہے ———" لالہ میا داس کو کہنا پڑا۔ اوپر کھڑکی میں منور ما کی ماں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ایسی حالت میں لالہ میا داس نے منظور تو کر لیا مگر گھر پہنچے تو وہ خجل سے تھے اور بہت تکان زدہ دکھائی دیتے تھے۔ منور ما کی ماں نے اُن کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہائیں ——— آپ روتے کیوں ہیں"۔

"میرا بانسی اور رامے وغیرہ پر پیسہ لگایا ہوا ابھی یوں ہی گیا . . ." میا داس نے پھوٹتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو کہوں گی ——— انہوں نے کوشش بہت کی ——— . . . اس میں کسی کا کیا قصور۔ ہماری قسمت . . ."

منور ما کا جہیز چھت پر سجایا گیا تھا۔ لالہ میا داس پردھان کو جہیز دکھا رہا تھا اور پردھان یہ محسوس کر رہا تھا کہ میا داس ہر چیز کی قیمت اس کی اصلی اور ممکن قیمت سے دو گنی کے لگ بھگ بتاتا ہے۔ مگر تھالی میں نقد ایک ہزار روپیہ دھرا تھا۔ تھالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور لالہ میا داس سے علیحدہ ہو کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اب تو تمہیں میا داس کے متعلق شک نہیں رہا . . ."

"آپ دیکھیں تو سہی" منہ پھٹ نے کہا۔ "میا داس دو ڈھائی ہزار بتاتا تھا۔ مگر یہ سارا جہیز بھینس سمیت پندرہ سو سے زیادہ کا نہیں۔ میا داس نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ دکھلاوے کو کیا ہے۔ تھال میں اس نے ایک ہزار کی رقم رکھ دی ہے تاکہ اُسے کسی کے منہ پر جھوٹا نہ ہونا پڑے چار سوٹ ہوتے کیا ہیں اور دوسرے کپڑے کناری وغیرہ سے مجھے تو پرانے دکھائی دیتے ہیں"۔

پردھان نے کہا "ارے بھائی پندرہ سو اور دو ہزار میں کون سا زمین آسمان کا فرق ہے"۔

"یہ سب کچھ انہیں مجبور کر کے کروایا گیا ہے۔ ورنہ وہ اتنا بھی نہ کرتے ——— اس سے اُن کی قربانی اور بے غرضی عیاں نہیں ہو گی۔ میں لالہ میا داس کو کئی بار پرکھ چکا ہوں۔ وہ نہایت خود غرض آدمی ہے . . . میں ایک بات آپ کو بتاؤں اگر آپ کسی سے ذکر نہ کریں تو ———"

"ہاں کہو ——— میں کسی سے نہیں کہوں گا ———" پردھان نے اپنا کان منہ پھٹ کے پاس لاتے ہوئے کہا۔

"بانسی مل اور رامے دونوں کو اُس رات لالہ میا داس نے پچاس پچاس روپے دیئے تھے کہ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ جہیز کی رسم اڑا دی جائے۔ تاکہ اس کی رقم بچ جائے ——— اور یہی وجہ تھی کہ بانسی اور رامے اس دن بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے تھے ورنہ آپ خود ہی سوچئے کہ بانسی اور رامے دونوں کے گھر لڑکیاں ہیں ہی نہیں بلکہ بانسی کے گھر چار لڑکے اور رامے کے ہاں دو لڑکے ہیں۔ ایک بھتیجی ہے جو کہ جوان ہے۔ لیکن اس کا بھائی زندہ ہے۔ جو بیاہ کرے گا اس لئے قاعدے کے مطابق انہیں اس بات کے خلاف ہونا چاہئے تھا یا حق میں ——— بانسی کا سب سے بڑا چھوکرا بارہ برس کا ہے اور رامے کا آٹھ برس کا . . . انہوں نے سوچا ہوگا کہ چلو اب تو پچاس پچاس کھرے کرو۔ بعد میں دس بارہ برس کے بعد جب لڑکے شادی کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ جہیز کو بند

کرنے والا رواج خود بخود بند ہو جائے گا"۔

"مگر اس بات کا ثبوت ——— ؟"

"ثبوت یہی کہ لالہ میاداس اپنے بیٹے کرشن گوپال کی شادی کے وقت اپنا رویہ بدل ڈالے گا اور آپ دیکھیں گے کہ بانشی مل اور رامے وغیرہ بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ بدلیں گے اور کہہ دیں گے "ہم نے غلطی کی تھی۔

دراصل جہیز کی رسم مجموعی طور پر ترک ہونی چاہیئے"——— یہ بھی کہیں گے کہ انسان کی عقل ہی ہے نا ——— غلطی ہو سکتی ہے ——— اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوگا کہ لالہ میاداس خواہش کریں گے کہ کرشن گوپال جو کہ برسر روزگار ہے کسی بڑے گھر میں بیاہا جائے اور بہت سا جہیز اُس کے ہاں شادی میں آئے ———"

پردھان نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "یہ بات ہے!"

اور رمنہ بھٹ نے برابر کی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "جی ہاں"

"تو میں دیکھوں گا کہ کسی طرح سنگھ پنچائت کو لالہ میا داس ایسے خود غرض آدمی پیسے سے خریدتے ہیں اور کس طرح وہ بانشی اور رامے سے ضمیر فروش آدمی سماج میں آرام سے سانس لیتے ہیں ———"

(۴)

لالہ میاداس کی ہدایت کے مطابق بانشی اور رامے پنچایت کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے مارو تی مندر میں پہنچے ہوئے تھے۔ لالہ میا داس کہہ رہے تھے۔

"پنچایت کے سب آدمی جہیز رکھنے کے حق میں ہیں ہی۔ اب میں اس رسم کے اڑانے پر چنداں زور نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں نے منورما کے بیاہ میں کافی سے زیادہ پیسہ خرچ کیا ہے۔ اس لئے میری بھی خواہش ہے کہ میں بھی جتنا جہیز مل سکے منظور کر لوں ——— میرے لڑکے کرشن گوپال کو رام بھج دت ریٹائرڈ منصف کی چھوٹی لڑکی کا رشتہ ملتا ہے ——— جہیز کافی ملے گا۔ اگر اس بات کا ذکر چھڑے تو تم بھی خاموش رہنا"۔

بانشی نے کہا "مگر یوں ہماری پوزیشن خراب ہوتی ہے۔ وہ کہیں گے کل یہ اس رسم کے خلاف تھے۔ آج حق میں ہو گئے ہیں بلکہ اگر وہ یہ تجویز پیش بھی کریں کہ جہیز کی رسم بند ہونی چاہیئے تو آپ کو فوراً منظور کر لینی چاہیئے کیونکہ اس طرح نہ صرف آپ کی پوزیشن برقرار رہے گی۔ بلکہ اُن کا الزام کہ آپ خود غرض ہیں غلط ثابت ہوگا"۔

"مگر میں کہہ دوں گا کہ میں غلطی پر تھا۔ بیاہ بغیر جہیز شوبھان نہیں ہو سکتا یہ میں نے اپنی لڑکی کے بیاہ پر اندازہ لگایا ہے۔ وہ اس بات کی تہ تک کب پہنچ سکیں گے کہ یہ میں اس لئے کر رہا ہوں کہ کرشن گوپال کی شادی میں کافی سے زیادہ جہیز آئے . . .

میں یہ بھی کہوں گا کہ جہیز نہ دینے سے نہ صرف سسرال میں لڑکی کی عزت کم ہوتی ہے بلکہ ——— . . ."

رامے نے کہا "مگر وہ شخص جنہوں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ جہیز کی رسم اڑانے کی تیاریاں محض منورما کے بیاہ کی خاطر ہو رہی ہیں۔ وہ یہ بھی تاڑ جائیں گے کہ اب سب کچھ کرشن گوپال کے بیاہ کا پیش خیمہ ہے۔ کڑوا کڑوا تھو ——— میٹھا میٹھا ہپ"!

"اُن کے دل میں خواہ خیال تک بھی نہ آئے ——— چور کی داڑھی میں تنکا ——— پہلے تم نے میرے پیسے گنوائے ہیں۔ اُن کا حق تو ادا کرو کہ اگر وہ کہیں کہ جہیز کی رسم اڑ جائے تو تم اس کی مخالفت کرنا"۔

بانشی نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "رام رام ——— وہ کہیں گے۔ یہ کس قماش کے آدمی ہیں"۔

رامے بولا "شاید وہ یہ بھی اندازہ لگا جائیں کہ یہ کسی مخصوص وجہ سے اس بات میں حصہ لے رہے ہیں"۔

بانشی اور رامے نے یک زبان ہو کر کہا "ہم نہیں ماننے کے . . . اب ہم کسی صورت میں جہیز کے حق میں نہیں ہو سکتے"۔

پردھان جی نے پنچایت کے کمرے میں داخل ہوتے ہی، روپے کی خفیف سی کھنکار سنی . . . اُن کا ماتھا ٹھنکا ——— تینوں کو ایسے موقع پر یک جا ہوتے دیکھ کر وہ کچھ سمجھ گئے۔ مگر انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ جانتے ہی نہیں اور ان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

پنچایت لگتے ہی پردھان جی نے جہیز بند کر دینے کا تذکرہ چھیڑا "اب کہ لالہ میاداس نے منورما کے بیاہ سے آپ کے شکوک رفع کر دئے ہیں۔ امید ہے آپ جہیز بند کر دینے کے حق میں ہوں گے"

لالہ میاداس نے بڑے لمبے چوڑے طریقے سے بتایا کہ وہ ان کی غلطی تھی اور وہ منورما کے بیاہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بیاہ میں جہیز نہایت ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر کنیا کی سسرال میں عزت نہیں ہوگی ———" اور اس بات کی بانشی نے تائید کی۔

راما کہنے لگا "لالہ گردھاری لعل نے درست کہا تھا کہ یہ رسم مجموعی طور پر بند ہو تب ہی اچھا ہے . . . میرے خیال میں . . ."

"نہیں نہیں ـــــ ایسا نہیں ہوسکتا" منہ پھٹ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب یہ سب باتیں کرشن گوپال کے بیاہ کی خاطر ہو رہی ہیں۔ ـــــ اور پنچایت کے سب آدمی میا داس کے خلاف بولنے لگے حقے کی نال پرے کرتے ہوئے اور اپنی سفید مونچھوں کو سنوارتے ہوئے پردھان نے پوچھا۔

"کیا کرشن کی شادی کا انتظام ہو گیا ہے"؟

میا داس نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں"۔

"کیوں نہیں ـــــ" منہ پھٹ نے کہا۔ "رام بھج دت کون شخص ہے ـــــ اس دن کشمیری ٹوکری میں شگن نہیں بھیجا تھا"؟

لالہ میا داس کچھ کھسیانے سے ہو گئے ان سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ پردھان جی نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"لالہ میا داس نے لڑکی کی شادی کے وقت جہیز کے خلاف ہو کر اور کرشن کی شادی پر اس کے حق میں ہو کر اپنی خود غرضی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ہمارے پاس اس بات کا بھی کافی ثبوت ہے کہ انہوں نے پنچایت کے چند افراد ـــــ بانشی رامے، نارائن وغیرہ کو پیسے سے خریدنے کی کوشش کی ہے اور پنچایت کی تاریخ میں ایسی بد دیانتی کی مثال نہیں ملتی . . ."

"جھوٹ ـــــ سفید جھوٹ ـــــ" بانشی نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا ثبوت"؟

"اس بات کا ثبوت وہ باتیں ہیں جو ابھی پنچایت لگنے سے چند منٹ پیشتر تم کر رہے تھے اور جو ان کانوں نے خود سنی ہیں۔ اگر اس سے زیادہ ثبوت چاہتے ہو تو مجھے اپنی بہیں ٹٹولنے کی اجازت دو . . ."

بانشی نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "... مگر یہ بیس روپے میں نے میا داس سے ادھار لئے ہیں ـــــ"

"اونہہ ـــــ" پردھان جی نے کہا۔ "رامے نے بھی اتنے ہی روپے میا داس سے قرض لئے ہیں اور تم سود خوار جو جاٹوں کو سینکڑوں روپیہ قرضہ دیتے ہو۔ میا داس سے بیس روپے کی حقیر رقم کیوں لینے گئے تھے ـــــ ٹھیک . . . عذرِ گناہ بدتر از گناہ[1] ـــــ"

لالہ میا داس، بانشی رام، رامے شاہ، نارائن مل اور اُن کے حواریوں نے شرم سے اپنی گردنیں جھکا لیں۔ حاضرین پانچ منٹ کے قریب خاموش رہے۔ اس اثنا میں پردھان جی نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ اُن لوگوں کے سوا سب نے وہ تحریر پڑھی اور اس سے اتفاق کیا۔ تحریر تھا۔ "لالہ میا داس سے مکمل عدم تعاون کیا جائے تا آنکہ اُن کے کرم اور آچار سے اُن کے شدھ ہونے کا پتہ چلے اور لالہ بانشی مل، رامے شاہ، نارائن اور اُن کے ساتھیوں کو دو سال کے عرصے تک رائے دینے کے حق سے محروم رکھا جائے ـــــ جہیز کی رسم فی الحال جاری رہے"۔

. . . .

چند ماہ بعد لوگوں نے دیکھا کہ میا داس اپنے کاروبار کو تباہ و برباد ہوتا دیکھ کر ریل گاؤں چھوڑ رہا تھا۔ اڑتی اڑاتی یہ خبر بھی پردھان کے کانوں میں پہنچی کہ رام بھج دت نے اپنی لڑکی کا رشتہ لالہ میا داس کے لڑکے سے اس بنا پر توڑ لیا ہے کہ ان لوگوں کی برادری میں نہیں بنتی۔

[1] نیک چلن

راجندر سنگھ بیدی

تجلّیات

نظر ساقی کی مجھ پر مہرباں معلوم ہوتی ہے
پیالوں میں شرابِ ارغواں معلوم ہوتی ہے

چُرالی عندلیبوں نے کہاں سے نور کے نغمے
یہ میرے دردِ دل کی داستاں معلوم ہوتی ہے

نہ ہستی پر یقیں مجھ کو، نہ مستی پر یقیں مجھ کو
مری فطرت ازل سے بدگماں معلوم ہوتی ہے

یہ ذرّے ایک دھندلا عکس ہیں روشن ستاروں کا
زمیں آئینہ دارِ آسماں معلوم ہوتی ہے

بھٹکتا ہے ابھی تک کارواں منزل نہیں ملتی
یہ تدبیرِ امیرِ کارواں معلوم ہوتی ہے

جو رہ جاتے ہیں پیچھے کارواں سے اے ضیاؔ تھک کر
انہیں کچھ قدرِ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ضیاؔ فتح آبادی ایم اے

آخری انصاف

جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور روشنی کی ایک دھیمی سی کرن نمودار ہو کر باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں کھو گئی۔ ہوا چھپتے ہوئے درختوں کی شاخوں میں سسکیاں لے رہی تھی۔

ایک انگریز جھونپڑے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور دروازے کو زور سے بند کرتے ہوئے معمر پادری کے بالمقابل (جو فرش پر پالتی مارے بیٹھا تھا) بیٹھ گیا۔

"ماگا" اُس نے پائپ پر جلتی ہوئی دیاسلائی رکھتے ہوئے کہا "سامنے کی دیوار پر تانش کے دو ٹیکے نظر آرہے ہیں۔ مجھے اکثر یہاں ان کو دیکھ کر حیرانی ہوئی ہے۔ یہ کیسے ہیں"۔

بوڑھے پادری کا سر چھاتی پر آ لگا۔ آنکھیں زمین پر گڑ گئیں اور افسردہ آواز میں بولا "یہ دونوں حکم کے تیکے ہیں ماسٹر!"

انگریز نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور چھت کی طرف پائپ کا دھواں چھوڑا۔

"ابھی میرے جہاز کی روانگی میں کچھ دیر ہے" اس نے کہا "اگر ان کے متعلق کوئی کہانی ہے تو میں سننا چاہتا ہوں"۔

پادری اٹھا۔ دروازے کو زنجیر لگا دی۔ واپس آکر انگریز کے سامنے حکم کے دونوں تیکے رکھ کر بیٹھ گیا۔

"ماسٹر یہ ایک غمناک افسانہ ہے"۔

"کل مجھے ٹیکو سے چلا جانا ہے اور آج میری طبیعت افسردہ سی ہے۔ میں یہی کہانی خواہ پرغم ہے یا پُرمسرت سننا چاہتا ہوں"۔

ماگا نے اپنی چھاتی پر صلیب کا نشان بنایا اور دوران گفتگو میں اس کی نگاہیں پتوں پر جمی ہوئی تھیں۔

. . . .

ماسٹر! جب موکی پہلی دفعہ ٹیکو میں آئی تو یہاں کے بوڑھوں نے اپنی عمر رسیدہ بیویوں کو حسرت اور یاس کی نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ وہ جنگل کے آخری حصے پر اُگنے والی گھاس کی طرح خوبصورت اور نازک اندام تھی اور اُسے دیکھ کر ان کو اپنی بیویوں کا کھویا ہوا شباب یاد آگیا، اور جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ یہیں ٹھہرے گی تو نوجوان مسکرائے بوڑھوں نے اور زیادہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بیویوں کو دیکھا اور پہلے سے زیادہ بوڑھاپا محسوس کرنے لگے۔

اب گاؤں کے نوجوان اکثر کمپنی سٹور کی طرف آنے جانے لگے جب وہ خلیج کی طرف جاتے ہوئے اس اجنبی لڑکی کے جھونپڑے کے قریب سے گزرتے تو ان کے قدم ڈھیلے پڑ جاتے۔ رفتار میں کمی واقع ہو جاتی جب وہ جھونپڑے سے آگے نکل جاتے تو بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے یہاں تک کہ جھونپڑا اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور وہ خود جنگل میں چھپ جاتے اسی طرح بوڑھے بھی جب کبھی اس راستے سے گزرتے تو ان کے قدم سست پڑ جاتے اور رفتار میں نوجوانوں سے زیادہ کمی واقع ہو جاتی۔ ان باتوں کو دیکھ کر کیلاجی جو کمپنی سٹور کا مالک تھا بہت خوش ہوتا، کیونکہ اس کی تجارت پر بہت خوشگوار اثر پڑ رہا تھا۔

ان نوجوانوں میں جو ہر روز باقاعدگی سے موکی کے جھونپڑے کے قریب سے گزرتے، اس امید میں کہ شاید اس کی ایک جھلک نظر آجائے اور وہ ہاتھ کے ہلکے سے اشارے اور ہلکے سے تبسم سے ان کا خیر مقدم کرے، ایک نوجوان ذوَل بھی تھا، لیکن اس کا رویہ دوسروں سے بالکل علیحدہ تھا۔ وہ اوروں کی طرح آہستہ آہستہ چلنے اور چوروں کی طرح مڑ مڑ کر دیکھنے کے بجائے سیدھا اس کے دروازے پر جا کر اُسے آواز دیتا، وہ باہر نکل آتی، اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور وہ بہت دیر تک سائے میں کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہتے۔

جب اور نوجوانوں نے ذوَل کو اُس طرف بہت آتے جاتے دیکھا

تو انہوں نے آنا جانا ترک کر دیا کیونکہ زول بہت بڑے قد و قامت کا بے حد طاقت ور جوان تھا۔ جب اس کی قمیض کا گریبان کھلا ہوا ہوتا تو شفاف کھال کے نیچے عضلے اس طرح حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے جیسے شیشے کے نالاب میں مچھلیاں تیر رہی ہوں اور اُس کے ہاتھ مضبوط اور شکاری جانوروں کے پنجوں کی طرح طاقت ور تھے اور خوں ریز بھی۔

لیکن ابھی تک ایک ایسا شخص باقی تھا جو اکثر موکی کے گھر کی طرف آنکلتا۔ بارہا جب وہ زول کو موکی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتا تو غصے سے دانت پیستا اور ہتھیلیوں کو اس زور سے بھینچتا کہ ناخن پوست میں پیوست ہوتے۔ یہ سارے گھر میں ٹریسیل کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن ٹیکو کے لوگ اسے رنٹ کے نام سے یاد کرتے کیونکہ وہ پست قامت اور لوہے کے بت کی طرح مضبوط تھا۔

ہر روز زول اور رنٹ موکی سے ملنے آیا کرتے اور وہ دونوں کا استقبال کرتی۔

ماسٹر ایک دن ایسا ہوا کہ دونوں نے اپنے آنے کے لئے ایک ہی وقت انتخاب کیا اور دونوں ایک ہی وقت سوسوگز کے فاصلے سے نمودار ہوئے۔

زول کو یہ دیکھ کر از حد غصہ آیا اور اُس نے رنٹ کے پاس جا کر کہا۔ یہ بہت دانائی کی بات ہوگی کہ تم واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ موکی تمہیں نہیں دیکھنا چاہتی۔

رنٹ مسکرایا اور کہنے لگا اگر وہ مجھے نہیں دیکھنا چاہتی تو وہ خود بھی تو کہہ سکتی ہے۔ درحقیقت وہ تمہیں نہیں دیکھنا چاہتی۔

رنٹ دوبارہ ہنسا اور اب کے جو اس کا منہ کھلا تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ دہن بھر نیزوں کے منہ آگ پر رکھ دیئے گئے ہیں۔

"مجھے تمہاری بات پر مطلق اعتماد نہیں ہے"

"یہ حقیقت ہے"۔ زول نے کہا۔

"پھر بھی مجھے اعتماد نہیں ہے"!

زول ایک قدم آگے بڑھ گیا اور اپنے لمبے لمبے بازو اوپر اٹھائے ہیئے وہ ایک دیو کوہ پیکر کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو ایک بونے کے ساتھ کھڑا ہوا اُس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ دونوں جو ایک لڑکی کی محبت کے لئے لڑ رہے تھے۔ ایک دلچسپ تضاد پیش کر رہے تھے۔ ایک بلند قامت چٹان کی طرح مضبوط لیکن بدخلق تھا۔

اور دوسرا مختصر سا انسان، بدصورت، مگر گوبگڑ کی طرح طاقت ور اور خنداں تھا۔

اب زول نے پھر بولنا شروع کیا۔ اب کے اُس کے الفاظ سخت اور ناقابل برداشت تھے۔

"میں نے بہت آدمیوں کو اپنے پر اعتماد کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگرچہ شروع میں انہوں نے بھی تمہاری طرح ہٹ دھرمی کی لیکن آخر کار وہ سمجھ گئے۔

"وہ بزدل ہوں گے" رنٹ نے کہا

"اُن میں سے بعض بزدل نہیں تھے۔ مولول کو جانتے ہو"!

رنٹ نے کہا

"ہوں۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک کمزور انسان تھا اور میں کمزور نہیں ہوں۔ اگر وہ میرے برابر طاقت کا مالک ہوتا تو تم پر کبھی اعتماد نہ کرتا"

زول نے کوئی جواب نہ دیا اور موکی کے جھونپڑے کی طرف چل دیا اور دو قدم چل کر کہا۔ "چلو ہم دونوں اس سے فیصلہ کرا لیتے ہیں"!

رنٹ اس کے پیچھے ہو لیا اور وہ اُس کے جھونپڑے تک پہنچ گئے اور وہ دو درندوں کی طرح تھے کہ بالکل ایک ہی وقت میں اپنے شکار کو دیکھیں اور یہ فیصلہ کرنے کے لئے ایک دوسرے پر حملہ کر دیں کہ شکار کس کو ملنا چاہئے۔

جھونپڑی کے پاس پہنچ کر انہوں نے موکی کو آواز دی۔ وہ باہر نکلی اور ان کے درمیان کھڑی ہو گئی کبھی ایک کی طرف دیکھتی اور کبھی دوسرے کی طرف ــــ اس کی آنکھوں میں سوالات جھلک رہے تھے۔

"تم آپس میں دوست ہو"! آخر اس نے کہا۔

زول غرایا جس طرح کوئی درندہ شکار مارنے سے پہلے غراتا ہے ــــ رنٹ ہنسا اور نرمی سے جواب دیا۔

"نہیں موکی ہم دوست نہیں ہیں ــــ ہم اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ تم ہم میں سے کسی ایک کو اپنے لئے انتخاب کر لو۔

موکی نے ایک سے دوسرے کی طرف دیکھا زول کا عظیم جسہ دھوپ میں نہر کے پانی کی طرح چمک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی پست لیکن طاقت ور رنٹ کھڑا تھا۔

بارہا اُس نے آنکھیں ایک سے ہٹا کر دوسرے پر جما دیں لیکن

آخر پریشان سی ہو کر سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہنے لگی
"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"
ذول اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
"اِدھر دیکھ!" اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا اور اس کا جسم سخت ہو گیا۔ کھال کے نیچے چھاتی کی ہڈیاں فولاد کے تاروں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست نظر آئیں اور سینے کا اتار چڑھاؤ سمندر کے مدوجزر کی طرح۔ موکی دیکھ رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک دیو۔ ایک پہاڑ —— کھڑا ہے جس کے پہلو میں ایک بونا ایستادہ ہے۔
موکی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ آنسو انگلیوں میں سے بہہ بہہ کر کچھ زمین پر گر رہے تھے اور کچھ رخساروں پر ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ اُس پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی چھائی جاتی تھی اور اس کی آواز اس کے گلے میں اٹک رہی تھی۔ آخر وہ بولی "میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"
اب رنٹ نے اس سے کہا۔ "موکی اِدھر دیکھ"
اس نے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا آنکھیں حیرانی سے پھٹ گئیں کیونکہ اس کے سامنے کھڑے ہوئے بونے نے اپنے ساتھی کے گلے میں بازوؤں کو حائل کر رکھا تھا اور اس کی چھاتی پھیلتی جا رہی تھی۔ لڑکی حیران تھی کہ کہیں پھٹ نہ جائے تب رنٹ نے ایک ہاتھ ذول کی ران پہ اور دوسرا اس کی گردن پر رکھ کر اس کو زمین سے اٹھا کر سر سے اوپر اچھالا اور پھر دبوچ کر زمین پر کھڑا کر دیا۔
"اب انتخاب کرو" اس نے لڑکی سے کہا۔
لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی "میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں انتخاب نہیں کر سکتی۔"
ذول نے حیرانی سے موکی پر ایک نگاہ ڈالی۔
"کیا تو مجھے اس بونے اور بدصورت شخص پر ترجیح نہیں دے سکتی؟"
"نہیں نہیں میں تم میں سے کسی کو بھی کسی پر ترجیح دے سکتی ہوں اور نہ ہی کسی کو کسی سے گھٹا سکتی ہوں۔ مجھے تم دونوں سے محبت ہے۔"
"تب" ذول نے کہا "ہم خود انتخاب کریں گے کہ کون حقدار ہے۔ کل ہم میں سے ایک آ کر تمہیں اپنے جھونپڑے میں لے جائے گا۔"
رنٹ نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور مسکرایا۔
موکی خاموش تھی لیکن منہ کو ڈھانپے ہوئے رو رہی تھی۔
"یہ اچھی بات ہے" رنٹ نے کہا "کل صبح ہم میں سے ایک آ کر تم کو لے جائے گا۔ تم خوشی سے اس کے ساتھ چلی جانا اور دوسرے کو بھول جانا۔"
دونوں لڑکی سے رخصت ہو کر خلیج کے ساتھ ساتھ تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ چلے گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جب وہ ساحل پر پہنچ گئے تو موکی نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ناامید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ لحظہ بھر میں دو انسانی جسم کھجوروں کے جھنڈ میں جہاں نیلا اور سبز پانی خلیج سے ٹکراتا ہوا ساحلی ریت پر پھیل رہا تھا گم ہو گئے

. . . .

ماگل نے انگریز کی طرف دیکھا "ماسٹر! یہ ایک دردانگیز داستان ہے کیا اس سے آگے بھی سناؤں؟"
انگریز خاموش رہا۔ ماگا کچھ عرصے تک اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر کہانی کو جاری رکھا۔
"جب ٹیکو میں یہ بات مشہور ہوئی کہ ذول اور رنٹ موکی کی خاطر مجادلہ کرنے والے ہیں تو سردار نے فوراً ایک کونسل طلب کی جس میں ان دونوں کو بھی بلایا گیا اور حکم دیا کہ وہ مجادلے سے فیصلہ نہ کریں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کے نہیں تھے۔ ذول بہت طاقتور تھا اور جنگل کے درندے تک اس کے غصے سے لرز اٹھتے تھے اور کوئی متنفس بھی اس کے خونی نیزے کے وار کو نہیں روک سکتا تھا۔ رنٹ اس کے مقابلے میں محض بونا سا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اسے دیو کا ایک دھکا ہی کافی ہو گا۔
اس موقعہ پر جب کہ یہ بحث جاری تھی کہ ان کو کس طرح فیصلہ کرنا چاہئے۔ ایک بوڑھا کھڑا ہوا جو ناتوانی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ رعشہ سے لرز رہے تھے، اُس نے تجویز پیش کی کہ ان کو پانسہ پھینکنا چاہئے کیونکہ ان دنوں انگریز سوداگروں نے انہیں یہ بھی سکھا دیا تھا۔ لیکن نوجوانوں نے اس تجویز کو نہ مانا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان میں ایک تو پانسہ پھینکنے میں بہت ماہر تھا اور دوسرا بالکل نادان۔
"اگر یہ بھی نہیں تو روپیہ پھینک لو" سردار نے کہا لیکن اس تجویز کو بھی ناپسند کیا گیا کیونکہ اس طرح بہت جلد موکی کی قسمت کا فیصلہ

ہو جاتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ صرف ایک ہی لمحے میں وہ جیت لی جائے

اس پر جزیرے کا سردار کھڑا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "ہم روپیہ نہیں پھینکیں گے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا حسین ترین پھول ایک دفعہ روپیہ پھینکنے سے جیتا جائے بلکہ یہ فیصلہ تاش کے پتوں سے کیا جائے گا۔ ذول اور رنٹ کے سامنے تاش کے پتے رکھ دئیے جائیں گے۔ ہر ایک باری باری پتے کھینچے گا۔ جس کے حصے میں حکم کا یکہ آ گیا وہی اُسے اپنے جھونپڑے میں لے جائے گا۔"

تمام نے اس تجویز پر صاد کیا اور دوسرے دن کے اجتماع کے لئے ساحل پر ایک مناسب جگہ تلاش کر لی گئی جہاں پر لوگ دوسرے دن جمع ہو گئے۔

جب ذول اور رنٹ کو بلایا گیا تو مجمع پر مکمل خاموشی چھا گئی اور دل سینوں میں تیزی سے دھڑک رہے تھے گویا وہ بھی باہر نکل کر یہ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ماسٹر اکونسل نے کارڈ میرے سپرد کر دیے تھے کہ میں ان کو اچھی طرح آپس میں ملا لوں تاکہ کوئی بھی خواہ اس کو زمین و آسمان کا علم ہی کیوں نہ بخش دیا گیا ہو۔ حکم کے یکے کی جگہ نہ بتا سکے۔ کونسل کو صرف مجھی پر اعتماد تھا۔ میں ان پتوں کو لے کر اپنی جھونپڑی میں آ گیا۔ اسی وقت موکی خود میرے جھونپڑے میں چٹائی پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ تسکین حاصل کرنے آئی تھی۔

جب دونوں "عاشق" ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے تو موکی وہاں موجود نہ تھی۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جاتا تو لوگوں کو میری جھونپڑی کے دروازے پر ایک لڑکی دکھائی دیتی جس کی آنکھیں اور رخسار آنسوؤں سے پُرنم تھے۔ جب وقت قریب آیا تو سردار نے ان کے سامنے لکڑی کا ایک تختہ رکھ دیا اور مجھ سے کہا،

"ماکا تم نے پتوں کو اچھی طرح ملا دیا ہے؟"

میں نے سر ہلایا۔ سردار نے مجھ سے کارڈ لے لئے اور اُن کے درمیان رکھ کر ایک طرف کو ہو گیا۔

"میں روپیہ پھینکوں گا" اس نے کہا۔ "رنٹ بتاؤ کون سی طرف لو گے۔ بادشاہ یا خالی۔ اگر تمہاری طرف اوپر آئی تو پہلا موقع تمہیں ملے گا۔" "خالی" یہ سن کر اس نے روپیہ ہوا میں پھینکا جو ایک لمحہ دھوپ میں ٹھہر کر نیچے آ گرا۔ "خالی ہے" رنٹ نے بے تابی سے کہا، لیکن روپیہ بادشاہ کی طرف پڑا تھا۔ سردار نے سر ہلایا اور کہا "نہیں رنٹ پہلی باری ذول کو ملے گی۔"

اب کارڈ اٹھانے کی پہلی باری ذول کو ملی۔ اس نے ذرا آگے کو جھک کر اوپر والا کارڈ اٹھا لیا۔ محفل پر خاموشی چھا گئی۔ میں اُن کو پُرغور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، کیونکہ دونوں بہت ہوشیار تھے۔ وہ تاش سے ہر قسم کا کھیل کھیل سکتے تھے۔ ہر قسم کا دھوکا دے سکتے تھے اور لوگ محض اسی وجہ سے ان پر نظریں گاڑے ہوئے تھے لیکن رنٹ کی طرح احتیاط اور غور سے کسی نے بھی ذول کی انگلیوں کی حرکت کو نہ دیکھا۔ آخر ذول نے زیر لب کچھ کہا اور سب کو دکھانے کے لئے کارڈ مجمع کی طرف کر دیا۔

یہ حکم کا یکہ نہیں تھا۔ اب رنٹ کی باری تھی، لیکن اس نے باری لینے میں کوئی عجلت نہ کی نظر بچا ایک منٹ تک سر کو ذرا سا آگے جھکانے کے سوا کوئی حرکت نہ کی۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کارڈوں کی طرف لے گیا۔ اُن کو چھوا اور ایک پتہ نکال کر لوگوں کی طرف کر دیا۔

یہ حکم کا بادشاہ تھا۔

اگر اس وقت سمندر کی کوئی بڑی لہر ریت پر پھیلتی ہوئی ان کے حلقے میں آ جاتی تو انہیں اس کی خبر تک نہ ہوتی۔ مجمع پر ایک بے پناہ خاموشی ایک سکوتِ مرگ اور ایک جمود مطلق چھایا ہوا تھا۔ ہلکے سانسوں کی آواز کے سوا جو سینوں میں اُلجھ رہے تھے، کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔ اس حالت میں ذول کو کارڈ اٹھانے کے لئے کہا گیا وہ اٹھانے کے لئے جھکا۔ اتنے میں بہت دور ایک انسانی جسم ظاہر ہوا جس کی طرف کسی نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ جتنے عرصے میں رنٹ نے کارڈ نکال کر لوگوں کو دکھایا۔ وہ صورت کئی سو فٹ قریب آ گئی لیکن ابھی تک یکہ کسی نے بھی نہ نکالا تھا۔ اب پھر ذول کی باری تھی۔ جب وہ کارڈ اٹھانے لگا تو تمام آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کارڈ اٹھا کر اوندھا اپنے سامنے رکھ دیا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر مخالف کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا "کھینچو"

رنٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور جب کارڈ نکالا تو وہ انسانی صورت جو اس دوران میں ہر لمحہ آگے بڑھ رہی تھی۔ مجمع میں آ گئی جس سے لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ موکی خود فیصلہ گاہ میں پہنچ گئی تھی۔

اب رنٹ کا کارڈ بھی اُلٹا زمین پر پڑا تھا اور ذول اُسے انتہائی نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"دکھاؤ" ذول غرایا۔ لیکن رنٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ذول کا چہرہ انتہائے شوق سے سفید ہو رہا تھا اور آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے نمودار ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی تک رنٹ نے کوئی جنبش نہ کی تھی۔

ایک ہی لمحے میں ذول کے غصے کی انتہا ہو جاتی۔ لیکن کونسل کے صدر نے کہا "جب میں تین کہوں تو اپنے اپنے کارڈ کو سیدھے کر دو تاکہ سب دیکھ سکیں —— ایک —— اب سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یکہ کس کے پاس ہوگا۔ ذول نے اپنے بڑے تیقن کو اپنے کارڈ پر رکھ دیا —— دو —— کسی نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی، تمام مجمع ٹیکو کی چٹانوں پر چھا جانے والی طوفانی موج کی طرح آگے کو جھک گیا —— تین —— دونوں کارڈ سیدھے منہ ریت پر پڑے تھے۔ رنٹ کے سامنے حکم کا یکہ تھا جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں اُس کے اپنے کارڈ پر نہ تھیں۔ اور ان میں فتح کی چمک نہ تھی۔ کیونکہ رقیب کے سامنے بھی حکم کا ہی یکہ تھا۔

لوگ خاموش تھے رنٹ کی آنکھیں ذول کی آنکھوں میں کھبی جا رہی تھیں۔

ذول کی آنکھیں بھی رنٹ سے ایک لمحہ کے لئے ملیں لیکن جب دونوں نے اپنے اپنے پتوں کو دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اب دونوں کے سینے امنڈتے سمندر کے مدوجزر کی طرح حرکت کر رہے تھے۔

اچانک دونوں ایک دم کھڑے ہو گئے۔ لوگ پیچھے کو ہٹ گئے تاکہ ہونے والی لڑائی کے لئے جگہ خالی کر دیں جس کو اب صرف جنگ کے دیوتا کا حکم ہی روک سکتا تھا۔

"کس نے دھوکا دیا ہے" انہوں نے دل میں کہا "کون جعلی کارڈ لے آیا۔"

وہ ایک لمحہ تک ایک دوسرے کو خموشی سے گھورتے رہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک جنگلی بلی اپنے سے چھوٹی مگر وحشت ناک اور ظالم بلی سے جنگل میں ملتی ہے اور لڑائی ہونے سے قبل دونوں اسی طرح کھڑی ہو جاتی ہیں اور موکی شکار کی طرح جو موت کا منتظر ہو۔ باچشم پرنم اپنے عاشقوں کو دیکھ رہی تھی۔

رنٹ اچھلا۔ اس کا حملہ ایسی سرعت سے ہوا کہ نظر بھی نہ آسکا ذول بچاؤ کے لئے ایک طرف ہو گیا لیکن دوسرے حملے میں دونوں زمین پر گتھم گتھا ہو رہے تھے اور رنٹ کے ہاتھ ذول کی گردن پر تھے وہ دیوانے جانوروں کی طرح زور لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو موت کی نیند سلا دینا چاہتا تھا تاکہ موکی کو حاصل کر سکے۔ لیکن رنٹ کی گرفت ذول کے گلے پر سخت سے سخت ہو رہی تھی اور اس کے گلے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے موت کی اذیت میں کوئی جانور چیخ رہا ہو۔

لیکن ماسٹر! یہ سخت حیرانی کی بات ہے کہ ذول جو بظاہر ایک ہی لمحہ میں اپنے دشمن کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ اپنے گلے کو اس کی خونی گرفت سے آزاد نہ کر سکا۔ اسی اثنا میں ذول کے لمبے لمبے بازو رنٹ کے گرد اس اژدہے کی طرح لپٹے ہوئے تھے جو اپنے شکار کے گرد گھیرا ڈال کر لحظہ بہ لحظہ اس کو بھینچتا جاتا ہو لیکن رنٹ کی انگلیاں اس کے گلے میں کھبی جا رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دونوں اسی طرح ختم ہو جائیں گے۔ ماسٹر! اب بھی میری آنکھوں میں وہ منظر پھر رہا ہے کہ کس طرح دیو قامت ذول نے اپنے گلے کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ وہ ایک حیوانی طاقت کا کام تھا۔ پھر اُس کی انگلیوں سے رہائی پاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور رنٹ کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ بہت دور جا پڑا۔

ذول فتح مندی کے نشے میں مخمور فاتح شیر کی طرح غراتا ہوا اپنی فتح کی تکمیل کو آگے بڑھا اور رنٹ نے آخری کوشش کرتے ہوئے بازوؤں پر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنے میں ذول اس کی چھاتی پر بیٹھا ہوا غصے میں اُسے گھور رہا تھا۔

فولادی چاقو پر روشنی کی چند کرنیں پڑیں اور رنٹ آخری کوشش کرتے ہوئے ریت ہی پر سرد ہو گیا اور ذول اس کی عریاں چھاتی سے چاقو نکالتے ہوئے پیچھے ہٹا اور گرا ——

ماسٹر اس کے بعد کئی لمحوں تک خاموشی رہی موکی مجمع سے نکل کر اپنے چاہنے والوں کی لاشوں کے قریب آئی اور ان پر گر پڑی۔ ٹیکو کے لوگ اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا کر ایک ایک کر کے سر جھکائے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بہت دیر بعد موکی اٹھی۔ چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپے روتی ہوئی گھر کو چلی گئی۔ تب ماسٹر! میں نے یہ دو حکم کے یکے اٹھائے اور اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔

. . . .

معمر پادری نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کارڈوں کو پرغم نگاہوں سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ماسٹر میں نے نہیں کہا تھا کہ یہ ایک پرغم داستان ہے"

انگریز نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کچھ عرصہ تک کوئی جواب نہ دیا اور پھر کہا،

"بتاؤ کہ دھوکا کس نے دیا؟"

"پادری نے سر اٹھایا اور کہا۔ میں ابھی بتاتا ہوں"۔

"ہاں اگر تم مجھے بتا دو" انگریز نے کہا" تو میں اس راز کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا کل میرا جہاز یہاں سے جانے والا ہے اور اس کے بعد میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا"

ناگا اٹھا دروازے کو کھولا کر چند لمحے تاریکی میں دیکھتا رہا۔ واپس آکر اس نے دروازے کو زنجیر لگا دی اور کہنے لگا۔

"ماسٹر! میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ فیصلہ سے قبل کارڈ میرے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ میرے سوا اور کوئی ان کے قریب ہی نہ آسکتا تھا اور میں نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ موکی محض تسکین دل حاصل کرنے کے لئے وہاں آئی تھی۔

ماسٹر اس کے الفاظ یہ تھے۔

"ناگا مجھے ان دونوں سے محبت ہے۔ وہ دونوں طاقتور ہیں۔ کیا یہ درست ہے کہ مجھے تاش سے بتیت لیں۔ کیا میں نہیں چاہتی کہ میں خوبصورت طاقتور اور ایسے بچوں کی ماں بنوں جو تمام جزیرے میں لاثانی ہوں"۔ ماسٹر وہ یہ کہتی تھی نا۔

انگریز نے رضامندی کے طور پر سر ہلایا۔

"ماسٹر! یہ میری غلطی سمجھ، یا دانائی" ناگا نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" کہ میں کچھ عرصے کے لئے اسے جھونپڑے میں اکیلا چھوڑ کر باہر چلا گیا"—— !!

(ترجمہ)

تابش صدیقی

قطعات

یارب
کشتیِ امید پہ بیٹھا ہوں، کھینا ہے مجھے
موجِ طوفاں سے الگ دنیا ہے مجھے
تاب آ جاتی ہے دل پہ یاس
اے غریبِ آرزو ایسا مجھے

بےخودی
اب کہاں ہوں کہاں نہیں ہوں میں
جب جہاں ہوں وہاں نہیں ہوں میں
کون آواز دے رہا ہے مجھے
کوئی کہہ دو یہاں نہیں ہوں میں

اختر انصاری

غزل

چھوڑا معاملاتِ محبت کو ہار کر
ناچار بیٹھنا ہی پڑا جی کو مار کر

امید کی خیال پرستی بھی مٹ گئی
میری ہر اک خوشی کو لحد میں اتار کر

کتنی طبیعتوں کو پریشان کر چلے
آئے تھے آپ کس لئے زلفیں سنوار کر

سودا ہے جان و دل کا زیادہ تو کچھ نہیں
جی بھر کے پیار کر اُسے جی بھر کے پیار کر

اک مستقل عذاب ہے ایماں کا فکر بھی
آسودگی کی دُھن ہے تو کفر اختیار کر

کہتا ہے نازِ حسن عدمؔ ہر حسین کا
مجھ کو بھی ایک سجدۂ بے اختیار کر

عدمؔ

حُسنِ تغزل

محبت کو ملے آنسو وہاں سے — ستارے بن کے آتے ہیں جہاں سے

ابھی امید ہے ان سے وفا کی — کوئی کہہ دے یہ مرگِ ناگہاں سے

زمانے بھر میں رسوا ہو گئے ہیں — بگڑ بیٹھے تھے اک دن راز داں سے

صدائے گریہ پیہم آ رہی ہے — کوئی بچھڑا ہوا ہے کارواں سے

خدا جانے کدھر کو جا رہے ہیں — نہیں معلوم آئے تھے کہاں سے

کوئی منزل بھی ہے اس رہگزر کی — کبھی پوچھوں گا میں عمرِ رواں سے

وہ آئیں تو جدائی کی کہانی — سناؤں کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے

نہ جاؤ اس طرح منہ پھیر کر تم

کوئی منہ پھیر لے گا اس جہاں سے

حفیظ ہوشیارپوری

انتقام

موسم خزاں کی ایک شام تھی۔ سورج خودغرض ——— مطلبی دنیا پر رخصتی نظریں ڈال رہا تھا۔ تاریکیاں روشنی پر تسلط جما رہی تھیں اس وقت اس نے اپنے مضبوط شانوں کو جنبش دے کر اپنی ماں کو بندوق کے نشانے سے ہلاک کر دیا۔ یہ عجیب واقعہ اس آفریدی نوجوان کے نزدیک خلاف معمول نہ تھا۔ وہ اس کے مردہ جسم پر ایک نظر ڈالے بغیر بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

وہ خیالات میں ڈوبا ہوا جھونپڑے کے باہر اکٹھے ہونے والے آدمیوں کی آوازوں کو سنتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کے گلابی چہرے کا رنگ، اس کی خوں فشاں آنکھوں میں آکر جمع ہو گیا تھا۔ اُن میں تاسف کے جذبے کی جگہ نفرت کا عنصر غالب تھا۔

اس آفریدی نوجوان کا نام شاہزاد خاں تھا اس کی پرورش سرحدی فضا میں ہوئی تھی۔ یہ اُس مرتفع علاقے کا باشندہ تھا، جہاں کسی کی عملداری نہیں۔ جو انگریزی اور افغانی حکومتوں کی حدود میں گھرا ہوا ہے، جہاں بندوق اور طاقت کے سوا کوئی قانون نہیں، جہاں کے رہنے والے طویل القامت، شہ زور اور جواں مرد ہیں۔ جہاں فقط گہری دوستی اور گہری دشمنی کے روادار بستے ہیں۔ جہاں دوگانہ حیثیت باعث ننگ و عار سمجھی جاتی ہے جہاں مخلص مہمان نواز اور جنگی دلیروں کے ڈیرے ہیں۔ جہاں قدرت ظالم اور جابر ہے، جہاں سنگلاخ چٹانیں، دشوار گزار راہیں اور بے آب و گیاہ میدان ہیں، جہاں زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت اور کم سے کم روزی ہے۔ جہاں وسائل معاش مسدود ہیں۔ جہاں قدرت ان خامیوں کے مداوے سے محروم ہے۔ شاید اسی لئے اس سنگلاخ زمین کے ساکن فطرتاً سخت، جابر اور وحشی ہوتے ہیں۔

شاہزاد خاں اس سنگین ماحول کا ایک سنگدل نوجوان تھا۔

شاہزاد خاں نے جھونپڑے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی جو تیز تیز قدم اٹھاتا جھونپڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بوڑھے پٹھان نے قریب پہنچ کر، اپنے اضطراب کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا! "کیا بات ہے گولی تم نے چلائی تھی؟" شاہزاد خاں نے تیوری چڑھا کر، تند اور گستاخ نظروں سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہاں ہاں! میں نے گولی چلا کر، ماں کو لقمۂ اجل بنایا ہے۔"

بوڑھے نے ایک لمبی، گہری، سرد آہ بھری۔ اس وقت اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے لیکن حیرانی کا نام نشان بھی نہ تھا۔ کیونکہ آفریدی حیرت سے طبعاً بیگانہ ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ، بوڑھے پٹھان کا خوف، غصے کی شکل اختیار کرتا گیا۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں۔ اس نے ایک بار پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے ——— ایسا کیوں کیا؟" شاہزاد خاں متوجہ نہیں تھا۔ اس لئے اس کے جواب میں قدرے تاخیر ہوئی۔ وہ ان بنجر، غیر آباد اور ہولناک پہاڑیوں کے منظر میں کھویا ہوا تھا جو خط افق پر سیاہ ماتمی لباس پہنے کھڑی تھیں۔ اس وقت اس کی آواز جذبات و حسیات سے یکسر خالی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک گم شدگی کے عالم میں کھڑا، کسی خواب کے قصے کی طرح، کسی کی موت کی سرگزشت، ارد گرد جمع ہو جانے والے پٹھانوں کو سنا رہا ہے۔ اس نے سب کچھ سچ سچ کہہ دیا!

شاہزاد خاں کی مرحوم ماں نے گھر کے اخراجات سے تراش خراش کر تین سو روپے کی رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ اتنا اثاثہ ایک اسراف پسند پٹھان عورت عمر بھر جمع نہیں کر سکتی کیونکہ قبائلی لوگ غریب، نادار اور مفلوک الحال ہوتے ہیں۔ وہ قرب و جوار کے علاقوں میں ڈاکہ ڈال کر پیٹ پالتے ہیں۔ کاشتکاری پر بھی ان کی گزران ہے لیکن یہ اس پتھریلی زمین میں دشوار ہے۔ بہر حال ان ہی دو وسائل پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔

شہزاد خاں نے آج سورج نکلنے سے پہلے ماں سے روپیہ کے لئے درخواست کی تھی۔ وہ پشاور میں جو وہاں سے صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا ایک دُکان کھولنی چاہتا تھا لیکن اس کی ماں نے روپیہ دینے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ اس کی غیر ذمہ دارانہ زندگی سے

اچھی طرح واقف تھی۔ ایک پٹھان ماں کے دل میں جو کچھ تھا۔ اس کے
لب اسے چھپانے سے عاجز تھے۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ
دیا کہ یہ رقم میں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کے لئے رکھی ہے۔
وہ ذی شعور ہو جائے گا تو اس کو دے دوں گی۔ لیکن شہزاد خاں کو
ماں کی ماستا پر اب بھی بھروسہ تھا اس نے آج تک مایوسی کا منہ نہیں
دیکھا تھا اس لئے اس نے لجاجت سے، منت سماجت سے روپیہ
حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ در اصل پشاور کی نازک اندام
نغمہ نواز رقاصہ لڑکیاں اسے اس کام پر آمادہ کر رہی تھیں لیکن اس کی والدہ
کے پہلے اور آخری فیصلے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اُس نے اُسے کوسا اور
کہنے لگی کہ تم اپنے باپ کے لئے شرم و ندامت کا باعث ہو۔ وہ تمہاری
بدعنوانیوں کے باعث ہر کسی سے نادم ہے اور شرفائے دیہہ کے
سامنے آنکھ تک نہیں اٹھا سکتا۔ نہ جانے تمہارا کیا حشر ہوگا؟ ایسے
آوارہ لڑکے کبھی چین نہیں پاتے۔

معاملہ طول پکڑ گیا۔ مسلسل کئی گھنٹے کی ذہنی کشمکش کے بعد
شاہزاد خاں نے ماں کو اپنی مایوسی اور نا امیدی کا نشانہ بنا دیا!

قتل کی خوفناک اور لرزہ خیز خبر نے سرگوشیوں کی شکل اختیار
کی۔ سرگوشیاں آہستہ آہستہ بلند گرجتی ہوئی آوازوں میں تبدیل
ہو گئیں!

ایک پٹھان متعدد مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دے تو
کوئی مضائقہ نہیں لیکن عورت کا قتل جو کمزور ہونے کے علاوہ ماں
بھی ہو۔ ایک خوفناک فعل تھا جو ان خونخوار لوگوں کے نزدیک بھی
پست اور ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

مجمع سے ایک تیز و تند آواز آئی کہ اس بزدل اور نابکار لڑکے
کو توپ کے منہ میں ٹھونس دو۔ اور اسے اس کے کئے کی سزا دو۔
زمین میں گاڑ دو۔ ۔ ۔ "

اس آواز پر ہر شخص نے لبیک کہی اور ایک لمحہ کے اندر مجمع
میں رضامندی کی رو دوڑ گئی لیکن ساتھ ہی انہیں اپنی بے بسی کا
بھی احساس تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک جرگہ اپنا فیصلہ صادر
نہ کردے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جرگہ ـــــ اکابر دیہہ اور شرفائے
قبائل پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس کا اجتماعی فیصلہ انصاف
سمجھا جاتا تھا۔ اس فیصلے میں عامۃ الناس کی رائے کو مطلقاً دخل نہ تھا۔
جرگہ کو کلی اختیار حاصل تھا۔ وہ جو چاہے کر سکتا تھا۔

شام ہوئی جرگہ بلایا گیا۔ عمر رسیدہ پٹھان آ آ کر بستی سے ملحق
کھلے اور وسیع میدان میں بیٹھتے گئے۔ نوجوان طبقہ ان کے ارد گرد
منڈلاتا رہا اور زیر لب بڑبڑا کر غصے کا اظہار کرتا رہا۔ یہ نوخیز جوان اس
غیر معمولی واقعہ سے بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان
کا رابطہ محبت اپنی ماؤں سے ہنوز استوار اور تازہ تھا۔ جرگہ کے افراد
ایک حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اہل مجلس کے چہروں سے رعب و اقتدار
ٹپکتا تھا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ مدھم لہجوں میں باتیں اور مشورے
ہونے لگے۔ بندوقیں پشتوں پر ان کے شانوں کے درمیان اٹک
رہی تھیں۔ نالیں کبھی کبھی ڈوبنے والے سورج کی احمریں کرنوں سے ٹکرا کر
ایک خوفناک چمک پیدا کر دیتی تھیں۔

تاریکی بڑھ رہی تھی۔ سورج قریب کی سیاہ چوٹیوں کے عقب
میں چھپ چکا تھا۔ ان بے مروت پہاڑیوں کی نیلی سرحدیں ڈوبنے
والے سورج کے سنہری اور نارنجی رنگوں کے عکس سے ایک غیر ارضی
سماں پیدا کر رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں سے اُس طرف، شمالی جانب
بہت دور تک پست، تاریک اور چٹیل پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔
ان پر تاریکی نے افسردگی کا دھندلکا پھیلا دیا تھا کہیں کہیں کوئی بنجر
اور ویران چوٹی، کسی بے قرار اور مایوس روح کی طرح آسمان کی جانب
ہاتھ اٹھائے نظر آتی تھی۔ اس وقت خدا جانے کتنے جان کے پیاسے
انسانی درندے اُن کی آڑ میں گھات لگائے بیٹھے ہوں گے کتنے سنگدل
اور سفاک انسان جن کی بندوقوں کی باڑیں بے باکی سے چلا کرتی
ہیں جن کے نزدیک قدرت کا صرف ایک قانون قابلِ احترام ہے اور
وہ یہ کہ توانا اور مضبوط مخلوق ہی دنیا میں رہنے کی حقدار ہے۔ آہ! ان
وادیوں میں کتنے قافلے لٹ چکے ہیں۔ کتنے جسم نشانۂ بندوق بنائے جا چکے
ہیں۔ آہ! یہ کس قدر خوفناک مقام ہے۔ جہاں گولیاں بارش کی طرح
برستی رہتی ہیں اور ہمیشہ ٹھیک نشانے پر بیٹھتی ہیں لیکن ان کے چلانے
والوں کا کبھی پتہ نہیں چلتا اور ارد گرد کی بستیوں کے رہنے والوں کے
دلوں میں ہمدردی کا جذبہ کروٹ تک نہیں لیتا۔ وہ مست و سرشار
بڑے حقے پیتے ہیں اور یہ سوچ کر ٹال دیتے ہیں کہ انہیں بھی ایک
نہ ایک دن اس جہانِ فانی سے اسی طرح کوچ کر جانا ہے۔

شاہزاد خاں اپنے باپ کے ہمراہ آہستہ آہستہ لیکن استقلال

اور استقامت سے قدم اٹھاتا ہوا آپہنچا تو مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا باپ بیٹے آکر حلقے کے عین وسط میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک طویل القامت اور بارعب سفید ریش بزرگ جرگے کے افراد سے مخاطب ہوا۔ وہ صدر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی آواز دھیمی، پرشکوہ اور موثر تھی۔ اس کا انداز تقریر پس وپیش اور تذبذب سے بالکل پاک تھا اُس نے نہایت موثر اور ہمدردانہ پیرائے میں سارا جانکاہ واقعہ دہرایا حاضرین ساکت وصامت سرجھکائے بیٹھے سنتے رہے۔ مقرر نے تقریر کے خاتمے پر چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہوئے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا۔ بھائیو! ہم واردات کی تفصیلات سے واقف ہو چکے ہیں۔ اب انصاف کا وقت ہے۔ ہنگامی جذبات کی رو میں بہنا ہمارا شعار نہیں ہم آفریدی ہیں، ہمارا مسلک انصاف ہے۔ خواہ ہمیں مصائب ہی سے دوچار ہونا پڑے۔ ہمیں انصاف سے خائف نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے خدا نے انصاف کا معیار، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان بتایا ہے۔ اس آسمانی اصول کے مطابق ہمیں اس لڑکے کی جان لینے میں ہرگز کوئی پس وپیش نہ ہونا چاہیئے۔

ایک لمحہ کے لئے مجمع میں بدنظمی سی پھیل گئی۔ سب نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں ایک پرعظمت آواز بلند ہوکر دوسری مدھم آوازوں پر چھا گئی۔ یہ ملزم کے ماموں یعنی مرحومہ کے بھائی کی آواز تھی۔ اس کی پیشانی کی وسعت شکنوں کے باعث سمٹ گئی تھی غیض وغضب کی تحریریں، غصے کی لکیریں اس کے ماتھے پر عیاں تھیں۔ اس کے الفاظ میں ایک تشنگی، ایک پیاس پنہاں تھی۔ اس نے غصے سے لرزاں لب کھولے اور کہنا شروع کیا۔

"ہاں بالکل درست! جان کا بدلہ جان۔ انصاف کا یقیناً یہی تقاضا ہے۔ شاہزاد اپنی ماں کے قتل کا مرتکب ہے۔ یہ ایک ہولناک گناہ ہے۔ کیونکہ پٹھان کبھی عورت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتا۔ اس کا گناہ ہرگز بخشش کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اب زندگی کی قیمت صرف زندگی سے ادا ہو سکتی ہے۔ اس نافرجام سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑا لینا ہمارے لئے فایدے سے خالی نہ ہوگا۔"

اس تقریر کے ہر لفظ کا پسندیدگی نے استقبال کیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک بے ربط لیکن جذبات سے معمور آواز آئی۔ یہ شاہزاد کے باپ کی آواز تھی۔ اُس نے کہنا شروع کیا۔ بھائیو! میرا لڑکا ناقابل بخشش گناہ کا مرتکب ہے۔ اس کے متعلق دوبارہ کچھ کہنا فضول ہے۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ کہ یہ اس کی سزا بھگتے (زیرلب آوازوں میں رضامندی کا اظہار) لیکن آپ سب کو معلوم ہے کہ اس حادثے میں سب سے زیادہ زخم خوردہ اور مظلوم میں ہوں۔ مجھے اپنی رفیقہ حیات کی جدائی کا از حد قلق ہے۔ وہ اس آخر عمر میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ مجھ بدنصیب انسان کی آخری التجا یہ ہے کہ میرے بیٹے کو صحیح وسالم چھوڑ دو۔ میں آپ سے رحم کی بھیک، اپنی آنکھوں کا نور اور زندگی کا سہارا مانگتا ہوں۔ رسم کے مطابق پانسو روپیہ خوں بہا ادا کر دوں گا۔"

حالات بدل گئے۔ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ خود اس کا باپ رحم کے لئے ملتجی تھا۔ لیکن پھر بھی مجمع میں انصاف! انصاف کے لئے چیخ پکار جاری تھی۔ رسومات کے آقا —— سفید ریش پٹھان کا ہاتھ ایک بار پھر اٹھا۔ مجمع کا سکوت واپس لوٹ آیا۔ بڈھے نے بالکل پہلے کی طرح دبی زبان سے سحر پھونکنا شروع کیا۔ اب موضوع بحث بالکل متضاد تھا۔ بھائیو! تم نے شاہزاد خاں کے باپ کی عرضداشت سنی ہے۔ ہم اُس سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں۔ ہم اس کو اس کے بیٹے کی جان بچانے کے لئے دلائل پیش کرنے سے روک نہیں سکتے۔ یہ رسم صدیوں سے ہمارے آباؤ اجداد میں چلی آرہی ہے۔ اگر وہ ایک نابکار لڑکے کو پناہ دینا چاہتا ہے تو یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے ہم بزرگوں کے نقش قدم سے منحرف نہیں ہو سکتے، اس لئے جرگہ کو مقررہ رقم ادا کر دینے پر لڑکے کی جان بخشی کر دینی چاہیئے۔"

نصف گھنٹہ بعد مجمع تتر بتر ہوا تو اُس نوجوان کی جان بخشی ہو چکی تھی۔ پٹھان اس فیصلے پر بہت ناراض اور خشم گیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک پرانے بوسیدہ اور دقیانوسی قانون سے دھوکا دیا گیا ہے۔ جسے منسوخ یا مسترد کرنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ مرنے والی کے اکثر رشتہ داروں نے اُس سے بدلہ لینے کی قسمیں کھائیں لیکن ان بے وقعت دھمکیوں کا انہیں اچھی طرح احساس تھا۔ کیونکہ جرگے کا فیصلہ اٹل اور ناقابل دخل اندازی تھا۔ اور پھر اس سرزمین بے آئین میں، جہاں صرف ایک یہی جماعت انصاف کی علمبردار سمجھی جاتی تھی۔ اس کا انصاف خواہ کیسی ہی وحشت کا آئینہ دار کیوں ہو قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔

بوڑھے پٹھانوں نے افسوس کے ساتھ سفید سروں کو جنبش دی اور گھروں کو واپس چلے گئے۔ شاہزاد خاں کے باپ کے سوا کسی کو لڑکے کے برے یا بھلے ہونے کا کیا احساس ہو سکتا تھا۔ باپ ــــ صاحب دل انسان، مظلوم خاوند اور فراخ دل باپ خوشی کی گدگدی اور غم کے داغ کو تازہ کئے ہوئے اپنے جھونپڑے میں آگیا۔ گاؤں والوں کا غم و غصہ امتداد زمانہ کے ساتھ فرو ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ سانحہ ایام کی دوری اور وقت کے دھندلکے میں ایک قصہ پارینہ بن کر رہ گیا۔

شاہزاد اب غیر ذمہ دارانہ زندگی کے دور سے نکل کر جوانی کے قدرے بلند تر عہد میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی شادی کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ تاریخ مقرر ہو گئی۔ گاؤں بھر میں غوغائے مسرت تھا۔ ایک نوجوان کی زندگی کا انقلاب درپیش تھا۔ وہ مختلف الصنف افراد کی اغراض اور مسرتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہونے والی تھیں۔

اس کی شادی کی تقریب بہت کامیاب رہی۔ رقص و سرود کے لئے پشاور سے گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ "ننوں" کا ناچ کوئی کم خوشی کا باعث نہ تھا۔ ہر شخص مسرت و انبساط سے جھوم رہا تھا، وہ لوگ جو اس کے خون کے پیاسے اور جان کے دشمن تھے، ان مسرت افزا لمحات میں اس کی خوشی کے شریک بن گئے۔ ایک ہفتہ تک تمام گاؤں میں خوب چہل پہل رہی۔ دولھا کا باپ سب سے زیادہ مسرور تھا اور خوشی کے مارے جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔

دن مہینوں میں بدلتے گئے۔ مہینے سال بنے۔ ایک عرصہ گزر گیا شاہزاد خاں اب گاؤں کے معززین میں شمار ہونے لگا تھا۔

یہ مسلم بات ہے کہ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ لوگ اس واقعہ کو بھول چکے تھے۔ برسوں کی مسافت شاہزاد خاں کو متین اور سمجھ دار بنا چکی تھی۔ وہ اب دو ارجمند بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ صحت، عزت، دولت بیوی، بچے سب دنیاوی آسائشیں اُسے میسر تھیں۔ اس خوشگوار زندگی میں وہ خود بھی بھول چکا تھا کہ کبھی وہ ایک تاریک گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ عہد گزشتہ کی یاد اس کے لئے اذیت کوش تھی، اس لئے وہ اس یاد سے اپنے آپ کو افسردہ اور مغموم نہیں کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی گزشتہ داستان الم اور دلائل سے مبرا آفریدی انصاف اس کے لئے وجہ کاہش تھا۔ وہ اس داستان کو دل میں دہرانے سے گریز کرتا تھا۔

موسم خزاں کی ایک شام تھی۔ سورج خود غرض طلبی دنیا پر رخصتی نظریں ڈال رہا تھا۔ تاریکیاں روشنی پر تسلط جما رہی تھیں۔ شاہزاد خاں کی بیوی باہر کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ وہ کھلیان کے پاس بیٹھی ہوئی، گندم صاف کر رہی تھی اور خوشی میں ایک آفریدی گیت گنگنا رہی تھی۔ اس کا خسر اس کے پیچھے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ گلے کو صاف کرنے کے لئے کھانسا تو عورت نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور خوشی سے مسکرا دی۔ وہ نزدیک آگیا۔ اس کا جھریوں سے معمور چہرہ موت کی طرح بھیانک تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ میں لرزش تھی۔ اس سے پہلے کہ بہو کوئی بات کرے۔ معمر پٹھان گھٹنوں کے بل جھک کر یوں گویا ہوا۔ "میری بیٹی مجھے بخش دو۔ تم شاید نہ سمجھ سکو۔ لیکن رحمٰن عالم الغیب ہے۔ ہر معاملے کو دیکھتا اور سمجھتا ہے" اس کے بعد وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ گویا الفاظ اُس کے منہ میں منجمد ہو گئے تھے اور جذبات نے اس کی زبان سلب کر لی تھی۔ اس نے خاص افغانی انداز میں کندھوں کے پیچھے لٹکنے والی بندوق اتاری اور قبل اس کے کہ وہ کوئی لفظ کہتی، اس نے اس کے دل کو نشانہ بنا لیا اور خود مردہ عورت پر ایک نظر ڈالے بغیر ان سیاہ ویران اور سنسان پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ انصاف ہو چکا تھا۔

(انگریزی سے) **خورشید بی ایس سی**

تجلّیات

تری جبینِ نیاز آگیں میں شوقِ سجدہ تپاں نہیں ہے
وگرنہ وہ کونسی زمیں ہے جو غیرتِ آسماں نہیں ہے؟

ہر ایک ذرّہ ہے بزمِ آفاق میں حریمِ نگارِ فطرت
وہ رازِ قدرت ہے کون ایسا مجاز میں جو عیاں نہیں ہے؟

نہاں ہیں تاریکیاں ضیا میں ضیا ضیا سے ان وں ہے اندھیرا
نگاہِ اہلِ نظر میں مطلق تمیزِ سود و زیاں نہیں ہے

چٹک میں کلیوں کی اک ترنم جبینِ شبنم پہ سو تبسم
خموشیوں میں سمانے والے! تری حکایت کہاں نہیں ہے

بساطِ صحرا پہ ان دنوں ہیں مرے فورِ جنوں کے چرچے
وہ کونسا خارِ رہگزر ہے جو آج رنگیں زباں نہیں ہے

تجلّیِ مہر سے ہوا جلوہ زارِ تنویر ذرّہ ذرّہ
مگر شعاعِ امید کا میرے دل میں کوئی نشاں نہیں ہے

چمن میں حسن کی لطافتیں ہیں فضا میں حسن کی حرارتیں ہیں
بتاؤں کیا اے ضیائے ناداں کہ وہ کہاں ہے کہاں نہیں ہے؟

پرشوتم لال ضیاؔ

سپاسِ دوست

مجھے تو ناز ہے اے دوست اپنی ہستی پر — کہ تیرے جام کا سایہ ہے میری مستی پر
ترے شباب سے رنگین ہیں مری راتیں — مرے نیاز کا سرمایہ ہیں تری باتیں
مری شباب نگاری ترے لئے مشہور — مرے قلم میں کرم سے ترے ملاحتِ حور
تری جبیں کی تجلی سے ہے غمگسار مری — تری رہین ہے طبعِ سخن گزار مری
ترے لبوں کی حلاوت تری نگاہ کی مے — مرے سمندِ تخیل پہ تازیانہ ہے
میں تیرے در کا پجاری تو میرا محرمِ راز — میں تیرے حسن کا نغمہ تو میرے عشق کا راز
جھکی ہوئی ہے ترے پاؤں پر جبیں میری — اسی لئے تو یہ دنیا ہے ریزہ چیں میری
اسی لئے تو وطن ہے مرا ستاروں میں — ہیں تذکرے مرے شعروں کے ماہ پاروں میں
جہانِ عشق کا تابندہ آفتاب ہوں میں — کہ تیری محفلِ عشرت میں باریاب ہوں میں

ترے حریم میں گردن جھکائے بیٹھا ہوں
خدا گواہ۔ خدا کو بھلائے بیٹھا ہوں

احمد ندیم قاسمی

مُنّا

میں اُن دنوں شمالی ہندوستان کے مشہور مقامات کی سیر میں مشغول تھا اور کوئٹہ کے روح فرسا واقعے کے دوران میں اپنے احباب کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر تھا، آگرہ سے واپسی پر میں نے احمد کو اپنی جائے قیام کا پتہ پیشتر ہی لکھ دیا تھا، چنانچہ دہلی پہنچنے کے تیسرے دن مجھے احمد کا ایک خط ملا، احمد نے مجھے کوئٹہ بلایا تھا، کچھ تو احمد کی تاکید اور کچھ اس فطری جذبے کے ماتحت جو میرے دل میں اخبارات کے ذریعے پیدا ہو گیا تھا میں کوئٹہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دوستوں سے کہا مگر کسی نے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر نہ کی،

احمد میرا بچپن کا دوست تھا، ہم ایک ہی ساتھ بڑھے تھے اور ایک ہی ساتھ پڑھے تھے، انٹرنس کے بعد اس نے ڈاکٹری کا کورس لے کر ایل سی پی ایس کی سند حاصل کر لی تھی اور سند ملتے ہی اس کے لئے ایک معقول ملازمت کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔ میری اس کی آخری ملاقات سات سال پیشتر ہوئی تھی، اس کے بعد کچھ تو مشغولیت اور کچھ ملازمت کی مجبوریوں سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔

کوئٹہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ مریضوں کی کثرت کے باعث مزید طبی امداد منگائی گئی ہے۔ چنانچہ احمد بھی اسی سلسلے میں کوئٹہ آیا تھا، ڈاکٹر کا کیمپ مریضوں کے کیمپ سے ذرا دور واقع تھا، مریضوں کی دیکھ بھال میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے لینے کے لئے اسٹیشن بھی نہ آیا، صرف ایک ملازم کو بھیج دیا، اور جب میں احمد کی جائے قیام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اس سے پیشتر مریضوں کے کیمپ کو روانہ ہو چکا ہے، ملازم نے میرا مختصر سا اسباب قرینے سے لگا دیا اور کھانے وغیرہ کے انتظام میں مشغول ہو گیا۔

احمد کے سٹیشن پر نہ آنے سے میں نے پہلے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ واقعی ایک بہت بڑے کام کی انجام دہی میں مشغول ہے، چنانچہ کھانا ختم ہوتے ہی میں نے ملازم سے کیمپ چلنے کے لئے کہا اور ہم بہت جلد کیمپ پہنچ گئے۔

میں سات سال کے بعد احمد سے مل رہا تھا، مجھے گمان بھی نہ تھا کہ احمد جیسا شوخ اور زندہ دل شخص سات سال کے عرصے میں اس قدر خاموش، متین اور سنجیدہ ہو جائے گا، اُسے دیکھ کر میں واقعی ششدر رہ گیا۔ چلنے سے پہلے میں نے سوچا تھا، احمد اپنے مخصوص انداز میں زمین تک جھک کر اپنے ہاتھ کو تیزی سے ہوا میں لہراتے ہوئے مجھے سلام کرے گا، پھر لپک کر بغلگیر ہو جائے گا اور اپنی کرخت آواز میں خط نہ لکھنے کی شکایت میں مجھ پر دو چار آوازے کسے گا، مگر احمد مجھے دیکھ کر ایک عجیب انداز میں مسکرایا اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا طالب علمی کے زمانے میں ہم میں سے کوئی بھی احمد سے ہاتھ ملانے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا، اس کی سخت گرفت سے گھنٹوں انگلیوں میں درد رہتا، مگر وہ ہاتھ اب بالکل ملائم اور نرم ہو گئے تھے، اس کی آواز جو اپنی کرختگی کے باعث دوستوں میں تنقید کا باعث ہوا کرتی تھی اب بالکل دھیمی پڑ چکی تھی۔ اور اس میں کچھ کچھ شیرینی بھی پیدا ہو گئی تھی، اب اس کی ہر حرکت سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔

مریضوں کی کثرت اور چیخ پکار، آئڈو فارم اور دیگر ادویات کی بے پناہ بدبو۔ نرسوں اور نوکروں کی دوڑ دھوپ اور ڈاکٹروں کی مصروفیت نے عجیب سماں پیدا کر رکھا تھا، ہر شخص پریشاں حال اور اپنی دھن میں محو تھا، اور احمد جو ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ نہایت اطمینان سے مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک مریض سے دوسرے مریض کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مجھے اس سے پیشتر کئی مرتبہ ہسپتال جانے کا اتفاق ہوا تھا، مگر یہ نقشہ ہسپتال کا کبھی نہیں دیکھا تھا، حشر کے متعلق میں نے شاعروں کے بہت سے اشعار پڑھے تھے مگر اس نقشے نے حشر کا جو صحیح نقشہ میرے دل پر ثبت کر دیا۔ شاید ہی کسی شاعر کے دماغ میں آ سکے۔

احمد ایک مریض کے پاس جاتا زخموں کو دیکھتا اور نرسوں کو جلد جلدی ہدایات دے کر آگے بڑھ جاتا، میرے لئے ہر مریض ایک یاس و حسرت کا مجسمہ تھا جسے زیادہ سے زیادہ فکر اور رحم کی ضرورت تھی

چاہتا گھنٹوں ان کے پاس بیٹھ کر ان کا غم غلط کروں، مگر احمد ان میں سے ہر ایک کے معائنے میں بہ مشکل دو یا تین منٹ صرف کرتا۔

میں اب تھک چکا تھا مگر وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھا۔ میں اپنے دل کی بات کہہ بھی نہ سکتا تھا کہ شاید میری وجہ سے اُس کے کام میں حرج ہو، مگر اس کی تجربہ کار آنکھوں نے فوراً تاڑ لیا۔ چنانچہ جب وہ کیمپ کے وسط میں پہنچا جہاں چند کرسیاں ایک میز کے گرد بچھی ہوئی تھیں تو فوراً مجھے بیٹھ جانے کے لئے کہا، ملازم سے چائے منگوائی، اور خود اپنے کام میں بدستور مشغول ہو گیا۔

میں نے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی ہی تھی کہ یکایک میری پشت کی جانب سے ایک ہلکی سی چیخ اور رونے کی آواز نے میری تمام توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، قریب ہی چارپائی پر سفید چادر کے اندر سے ایک خوب صورت چہرہ سنہری بالوں سے تقریباً نصف ڈھکا ہوا نظر آیا، میں نے جوں توں چائے ختم کی اور اٹھ کر چارپائی کے پاس گیا اور مریض کو بغور دیکھنے لگا۔

وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی، بہ مشکل پانچ برس کی، چہرے کی ساخت اور ملاحت کچھ اس درجہ دلفریب تھی کہ میں منٹوں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں تاروں کی سی چمک تھی، زندگی میں میں فرشتوں کے بھولے پن اور خوبصورتی کا صحیح تخیل صرف اسی پنج سالہ بچی کے ذریعے قائم کر سکا، میں نے جھک کر آہستہ سے پوچھا،

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مُنا" اس نے جواب دیا،

اُس کی آواز کی شیرینی بیان کرنے کے لئے میرے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں میں نے مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، پاس ہی ملازم کھڑا پٹیوں کو قرینے سے تہ کر رہا تھا، میں نے اُسے بلا کر پوچھا

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

"یہ بچہ؟" نوکر نے کہا "حضور یہ بچہ پہلے اپنے والدین کا تھا، مگر اب اس کا کوئی نہیں" اور پھر ایک معنی خیز انداز سے کہا

"اب یہ یتیم ہے"

"یتیم؟" میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی،

"ہاں حضور" نوکر نے لاپروائی سے جواب دیا "اس بچے کو اس کے باپ ہی نے بچایا، مگر اس سے فائدہ، وہ خود اپنی جان کھو بیٹھا!"

میں ابھی اس سے مزید سوالات کرنے ہی والا تھا کہ اُس نے کہنا شروع کیا۔

"حضور اس کے باپ کی لاش مکان کے اندر دبی ہوئی ملی تھی، گود میں یہ بچہ تھا، باپ کے سخت چوٹ آئی جس سے وہ بچ نہ سکا، بچے کی پسلی ٹوٹ گئی ہے، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بچنے کی امید ہے"

میں ہمہ تن گوش ملازم کی باتیں سن رہا تھا، اور اس کا ہر جملہ میرے تعجب میں اضافہ کر رہا تھا

"تو اب اس کا کوئی نہیں؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"کوئی نہیں" ملازم نے پٹی پر مرہم جماتے ہوئے کہا "اس کی ماں کا تین سال پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے، اس کا باپ کوئٹہ کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا، آپ نہیں سمجھ سکتے اس نے بیوی کے انتقال کے بعد اس بچے کی پرورش کس جانفشانی سے کی ——"

نوکر ابھی پوری طرح جملہ بھی نہ ختم کرنے پایا تھا کہ کسی زخمی مریض کی دلخراش چیخ نے تمام کیمپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی،

میں خاموشی سے چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا، اور "مُنا" کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا، یکایک وہ مسکرائی۔

"ابا کب آئیں گے؟" اس نے بھولے پن سے پوچھا،

میں اس کی معصوم مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا، اور یکایک اُٹھ کھڑا ہوا،

"ابا کہاں ہیں؟" اس نے دوبارہ پوچھا،

میرا دل دھڑکنے لگا، اس سے پیشتر میں مدرس رہ چکا تھا، بچوں کے عجیب و غریب سوالات کے برجستہ جوابات دینے میں مجھے خاص ملکہ تھا، گر "منا" کے اس سوال نے میرے حواس گم کر دیئے، معلوم ہو رہا تھا کہ میرا دماغ معطل ہو گیا ہے اور قوت گویائی مجھ سے چھین لی گئی ہے میں ٹکٹکی باندھے برابر اس کے خوبصورت بالوں کو دیکھ رہا تھا، سورج کی کرنوں میں وہ کندن کی طرح دمک رہے تھے،

میں بہ دقت تمام اپنے جذبات پر قابو پا سکا،

"تمہارے ابا —— تمہارے ابا ابھی آئیں گے، ابھی —— تھوڑی دیر میں"

میں نے جوں توں جملہ ختم کیا

وہ مسکرائی، شاید میرے جملے سے اس کی تشفی ہو گئی تھی،

"ابا جان جنت سے کھلونے بھی لائیں گے نا ——؟" اُس نے ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جنت سے —— ؟ ہوں، —— ہاں ہاں کھلونے بھی" میں خود بھی نہ جان سکا کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔

"میرے پاس جنت کے بہت سے کھلونے ہیں —— سب اماں نے بھیجے ہیں —— تمہاری اماں بھی جنت میں رہتی ہیں —— ہے نا؟"

"ہاں، ہاں" میں نے جلدی سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے میری آنکھوں سے ڈھلک کر میری [illegible] میں جذب ہو گئے۔

"ابا کہہ رہے تھے سب کی اماں جنت میں رہتی ہیں، ابا کی اماں بھی میری اماں بھی اور آپ کی اماں بھی ——" اس نے بھولے پن سے کہا۔

"حضور! صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں" ملازم نے مجھ سے آ کر کہا۔

میں جلدی سے اٹھا، رومال کو آنکھوں پر دو تین مرتبہ پھیرا اور احمد کی طرف جو گھر جانے کے لئے جیپ کے دوسرے سرے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا چل دیا۔

راستے میں احمد نے مجھ سے دوستوں کے متعلق بہت سے سوالات کئے مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں نے ان کا جواب کیا دیا اور کیسے دیا۔

کھانے پر بھی موضوع گفتگو یہی رہا اور میں احمد کے ہر سوال کا جواب صرف سر کی جنبش سے دے دیتا۔ کبھی کبھی دو چار بے ربط جملے بھی کہہ دیتا مگر بے ربط، میرے دل و دماغ پر منا کا معصوم چہرہ اپنا تسلط جمائے ہوئے تھا، اس کے الفاظ بار بار میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتے ہوئے میرے دل کی گہرائیوں میں اتر رہے تھے۔

"منا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے، احمد؟" بالآخر میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"منا؟" احمد میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں منا ——" مجھے احمد کی اس عجیب و غریب لاعلمی پر سخت قلق ہوا۔ "کیا تم اپنے مریضوں تک کو نہیں جانتے؟" میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا۔

"مریض" احمد نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "دوست تم جانتے ہو، میں نے آج تقریباً ڈیڑھ سو خیموں کا معائنہ کیا ہے۔ ڈیڑھ سو! پھر کیا یہ میرے لئے ممکن ہے کہ میں ان میں سے سب کا نام یاد رکھوں، یا اُن کے متعلق کسی اچانک سوال کا جواب بآسانی دے سکوں؟"

میں اپنی غلطی کا احساس کر کے جھینپ سا گیا۔

"تو یہ منا کون ہے ——؟" احمد نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنا شروع کیا۔

"منا —— وہی پانچ سالہ لڑکی جس کا باپ کوئٹہ کا بہت بڑا رئیس تھا اور جو اسی زلزلے کی زد میں آ کر اپنی بچی کو سینے سے چمٹائے ہوئے چل بسا۔" میں نے رک رک کر کہا۔

"او ہو! تو تم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس کا باپ کون تھا، خوب! اچھا تو تم اُس کے متعلق اور بھی کچھ جانتے ہو گے ——؟"

وہ رک گیا، اس کی آنکھوں میں برسوں پہلے طالب علمی کے زمانے کی شرارت جھلک رہی تھی۔

"میں مذاق کو پسند ضرور کرتا ہوں احمد، مگر جہاں اس کی ضرورت ہو" میں نے طنزاً کہا۔ احمد مسکرایا۔

"اچھا تو آؤ سنجیدگی کی باتیں کریں، بولو منا کے متعلق تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" اُس نے کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید ہے یا نہیں؟" میں نے بے صبری سے پوچھا، احمد ایک بڑے فلسفی کی طرح اپنی نگاہوں کو چھت کی طرف اٹھا کر کہنے لگا،

"دوست امید کا ہمارے کیمپ میں گزر نہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہو جائے اُسے حقیقت یا اتفاق سمجھو، اور جو نہ ہو اُسے محض ایک خواب پر محمول کرو جس کی تعبیر کے متعلق کسی کو بھی علم نہیں، تم نے آج اموات کی رپورٹ پڑھی —— بتیس جانیں صرف ہمارے کیمپ میں۔ اور پھر ہر قسم کی طبی امداد موجود —— کیا خیال ہے تمہارا منا کے متعلق؟"

اُس نے مجھ سے ایک وکیل کی طرح سوال کیا، جو کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم سے اس کی بدحواسی کا فائدہ لیتے ہوئے پوچھتا ہے، میں چپ ہو گیا۔

اس رات میں اچھی طرح نہ سو سکا، اور جب صبح اٹھا تو سر میں درد محسوس ہو رہا تھا، احمد مجھ سے پہلے ہی مریضوں کے کیمپ کو روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے ناشتہ ختم کر کے کار منگوائی اور شہر کے کھنڈروں کو دیکھنے کی غرض سے روانہ ہو گیا، واپسی پر پھیری والے سے کچھ انگور اور سیب خریدے اور آتے ہی سیدھا مریضوں کے کیمپ کا رخ کیا۔

منا اب تک سو رہی تھی، میں نے پھلوں کو میز پر رکھ دیا اور احمد کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا، وہ دور کیمپ کے وسط میں کھڑا نرسوں کو ہدایات دے رہا تھا، میں نے قریب جا کر اس سے پوچھا۔

"تم نے منا کو دیکھا؟"

"نہیں" اس نے کہا "میں تمہارا ہی منتظر تھا، اب تم آ گئے ہو چلو اب ہم اُسے چل کر دیکھیں"۔

منا اس وقت تک بیدار ہو چکی تھی، احمد اس کے زخم کا دیر تک بغور معائنہ کرتا رہا، پھر یکایک سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"افسوس! زخم بہت کاری ہے بغیر اپریشن کے کوئی امید نظر نہیں آتی" اس نے افسردہ خاطر ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اُس نے منا کی دیکھ بھال کے لئے نرس کو خاص طور پر ہدایت کر دی، اس کے جاتے ہی میں نے منا کے سرھانے انگور اور سیب رکھتے ہوئے کہا۔

"منا! دیکھو یہ سیب اور انگور تمہارے ابا نے بھیجے ہیں، دیکھو تو کیسے میٹھے ہیں" اور میں نے انگور کا ایک دانہ لے کر اس کے منہ میں ڈال دیا

"ابا! اور وہ کہاں ہیں؟ ابا نے مجھے یہاں اکیلا کیوں چھوڑ دیا — ؟ اب ہم گھر کب جائیں گے؟" اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا،

"بس اب کل صبح ہی تمہارے ابا یہاں آئیں گے اور تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے" میں نے منا کے خوبصورت بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، وہ میرا جواب سن کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

اس روز میں کئی مرتبہ منا کے پاس گیا، جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اُس کے چہرے کی شگفتگی اور دلفریبی پژمردہ ہوتی جا رہی تھی، اور اس کے سرخ دمکتے ہوئے رخسار ماند پڑ رہے تھے،

اس تھوڑے سے عرصے میں منا مجھ سے اس قدر ہل گئی کہ معلوم ہوتا تھا وہ مجھے برسوں سے جانتی ہے۔

اس رات مجھے منا سے متعلق عجیب عجیب خواب دکھائی دیتے رہے، اور میں اطمینان سے سو بھی نہ سکا، صبح اٹھا تو سورج دیر سے نکل چکا تھا۔ صبح کی ڈاک سے ملازم نے ایک خط میرے نام لا کر دیا، یہ خط دوستوں نے دہلی سے لکھا تھا جس میں مجھے فوراً واپس آنے کے لئے کہا گیا تھا کیونکہ وہ لوگ بہت جلد دہلی سے واپس روانہ ہونے والے تھے، میں نے جوں توں کر کے ناشتہ ختم کیا اور لباس پہن کر چھاونی کی طرف چل دیا، اس روز میں نے بے حد تلاش کے بعد بدقت تمام کچھ کھلونے منا کے لئے خریدے اور انہیں لے کر سیدھا کیمپ پہنچا۔

وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"دیکھو منا تمہاری اماں نے یہ کھلونے تمہارے لئے بھیجے ہیں تم ان کے ساتھ کھیلو گی نا! مگر ابھی نہیں، جب تم اچھی ہو جاؤ گی تو ان سے خوب کھیلنا" میں یہ سب نہایت اطمینان سے کہہ رہا تھا، جیسے یہ سب بالکل سچ ہے، وہ کھلونوں کو دیکھ کر مسکرائی، میں نے اُسے نہایت احتیاط سے اٹھا کر تکئے کے سہارے بٹھا دیا، وہ کھلونوں کو ایک ایک کر کے بغور دیکھنے لگی،

"اور ابا کہاں ہیں! تم نے کہا تھا آج وہ آئیں گے"۔ اس کے الفاظ تیر کی طرح نکل کر میرے دل و جگر میں پیوست ہو گئے۔

"ہاں ہاں وہ آج ضرور آئیں گے" میں نے اپنا ہاتھ بے پروائی سے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا، یکایک میرا ہاتھ جیب میں اس خط سے ٹکرایا جو آج ہی صبح کی ڈاک سے میرے نام آیا تھا،

"دیکھو یہ خط تمہارے ابا نے جنت سے بھیجا ہے"

اور میں نے خط کو جیب سے نکالتے ہوئے بے تکلفی سے پڑھنا شروع کیا۔

"منا کے ابا کی طرف سے منا کو پیار، ہم آج ضرور منا کو لینے آئیں گے اور اپنے ساتھ طرح طرح کے کھلونے اور خوب مٹھائی لائیں گے، منا کی اماں بھی ساتھ آئے گی"۔

میں یکایک رک گیا۔ منا بڑے غور سے میرے الفاظ کو سن رہی تھی اور میں جوں جوں خط پڑھ رہا تھا اُس کا چہرہ خوشی سے چمکتا جا رہا تھا، آخری جملے پر اُس کے ہونٹوں پر ایک ایسی معصوم مسکراہٹ دوڑ گئی جس کا نقش اب تک میرے دل پر تازہ ہے۔

یکایک میرا دل دھڑکنے لگا، میں یہ کیا کر رہا ہوں، میں غریب منا کے جذبات سے کھیل رہا ہوں، ایک بھولی معصوم بچی جسے یہ بھی نہیں معلوم موت کیا بلا ہے، میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی، مجھے خود سے نفرت معلوم ہونے لگی، مگر ——— میں نے سوچا، یہ سب کچھ میں منا کے لئے کر رہا ہوں، صرف اس کی خوشی یا کم از کم اس کی تشفی کے لئے کیا وہ دنیا کی فریب کاریوں سے بے خبر نہ تھی؟ اور کیا اُسے تلخ حقائق

۔۔۔۔ اور خواب و خیال کی مطمئن اور پرلطف فضا میں گم رکھنا ہی میرے لئے بہتر تھا،

میں بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔۔۔ وہ ہر بات میں اپنے ابّا کی مثال پیش کرتی، اُس کی توتلی زبان میں جادو کا اثر تھا جو سخت سے سخت دل کو بھی مسحور کر لیتا،

شام کی گاڑی سے میں دہلی روانہ ہوگیا، آتے وقت میں منّا سے نہیں ملا۔ اُسے دوبارہ دیکھنے کی تاب مجھ میں باقی نہ رہی تھی، میں نے رخصت کے وقت احمد سے وعدہ لے لیا کہ کوئٹہ کا کام ختم ہونے کے بعد وہ چند دن کے لئے آرام کی غرض سے پونا ضرور آئے گا، منّا کی صحت کے متعلق میں نے اُسے پہلے ہی تاکید کر دی تھی، اور واقعی اس کے علاج میں وہ غیر معمولی دلچسپی سے کام لے رہا تھا۔

پونا پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد مجھے احمد کا ایک خط ملا، مختصر مگر معنی خیز:

مجتبیٰ!

سلام! امید کے خلاف مجھے ابھی یہاں دو ہفتے مزید ٹھہرنا پڑے گا، لہذا وعدہ خلافی کی معافی چاہتا ہوں میں سر دست پونا نہیں آسکتا، ممکن ہے کام ختم ہونے کے بعد کشمیر چلا جاؤں میری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے،

اور ہاں! تمہارے جانے کے دوسرے روز منّا کا اپریشن کیا گیا، مگر بدقسمتی، وہ غریب جانبر نہ ہوسکی، کل اس کا کیمپ میں انتقال ہوگیا، اس کی تجہیز و تکفین میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کی ——

خط میرے ہاتھ سے گر پڑا، میں نے دوبارہ اٹھایا، پڑھا اور پھر پڑھا، میں جوں جوں خط دہراتا مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوتا، آخر منّا آزاد ہوگئی، دنیا کی کشاکش سے اس کی بے رخی اور بے اعتنائیوں سے اب وہ یقیناً اپنے ابا اور اماں سے جنت میں مل جائے گی —— ایک دائمی مسرّت،

میرے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی، طویل مسکراہٹ — میں منّا کی موت پر خوش تھا ——

بے حد خوش ——

محمد فاروقی

قصّۂ زلفِ درازِ دوست

آنکھوں میں ہے کبھی نگہِ نیم بازِ دوست
دل ہے اسیرِ حلقۂ زلفِ درازِ دوست

طولِ شبِ فراق میں یارب کمی نہ ہو
باقی ابھی ہے قصّۂ زلفِ درازِ دوست

اپنی نظر بلند ہوئی عشقِ دوست میں
دشمن کی ہے تمیز نہ ہے امتیازِ دوست

پڑھتا ہوں اس طرح میں نماز اپنی زاہدو!
میرا سرِ نیاز ہے اور پائے نازِ دوست

ضبطِ فغاں کا رازِ نہاں آج کھول دوں!
ڈر ہے کہ خواب سے نہ کھلے چشمِ نازِ دوست

اپنی فسوں طرازیاں واللہ بھول جائے
نرگس جو دیکھ لے نگہِ نیم بازِ دوست

آزادیوں کو ہیچ سمجھنے لگا ہوں میں
ہو کر اسیرِ حلقۂ زلفِ درازِ دوست

آسی کروں گا جانِ حزیں بھی میں نذرِ یار
دل کر چکا ہوں وقف پے مشقِ نازِ دوست

آسی رام نگری

فریب امید

خیال کے دھندلکے میں کوئی پھر اپنے جلوے دکھا رہا ہے
کہ عیش ماضی کا بھولا بسرا فسانہ پھر یاد آ رہا ہے

سیاہ بختی کی ظلمتوں میں ضیائے الفت بکھر رہی ہے
خیالِ دیدارِ دوست دل میں فسردہ شمعیں جلا رہا ہے

غم و الم کی سیاہ راتوں میں پھر امیدیں جھلک رہی ہیں
یہ کون میرے اجاڑ باغوں میں پھر بہاریں بسا رہا ہے

پھر ان کی الفت بھری نگاہوں کی یاد مژدے سنا رہی ہے
کہ عہدِ رفتہ کا لمحۂ جاں نواز نزدیک آ رہا ہے

جلا چکا ہوں جہاں نشاطِ شباب کی دل نشیں بہاریں
کوئی پھر اس آتشیں جہاں کو کشاں کشاں لے کے آ رہا ہے

بد نصیبی پہ میری تقدیر زیر لب مسکرا رہی ہے
کہ دیکھیں کیا ہو ندیم پھر اک فریبِ امید کھا رہا ہے

ندیم بصیردی

چینی معاشقہ

چین کے ایک مجموعۂ نظم کا نام "کتاب شعر" ہے۔ اس میں تین سو پانچ نظمیں اور گیت وغیرہ موجود ہیں جن میں سے تقریباً سو نظمیں معاشقے اور شادی بیاہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قدیم چین میں ان کی تشریح استعارۃً کی جاتی تھی، اور ان سے اخلاقی افادیت کا کام لیا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے عیسوی مذہب والے انجیل کے پرانے عہد نامے میں "سرود سلیمانی" ایسی عشقیہ شاعری کا لطف اخلاقی تشریحات کی آلودگی سے بے مزہ کر دیتے ہیں یا ہندوستان کے علمائے کرام گیتا تو ہند کرشن مہاراج کے دوسرے مدحی گیتوں کی شرح میں خوش اعتقادی کی وجہ سے دور از کار تصورات کو بروئے کار لاتے ہیں لیکن شاعری سے صحیح مفہوم کی گرفت اور لطف اندوزی کے لئے ضروری ہے خصوصاً اس مادی دور میں، کہ ہم ایسی زاہدانہ وضاحت سے دور ہی رہیں تاکہ شاعرانہ پردے میں کسی ملک کے رسم و رواج اور نفسیات کے جو اشارے پنہاں ہوں ہمیں ان کا کماحقہٗ احساس ہو سکے۔

اس جگہ ان چند منتخب نظموں کو ایک خاص سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے یعنی عشق و عاشقی کے جھمیلوں سے لے کر شادی کے درجے تک جو بھی دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں ان سب کا ذکر ہے اور یوں یہ محض شاعری ہی نہیں رہی بلکہ اس میں ایک معاشرتی اہمیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

ان نظموں میں ہمیں دیہاتی گیتوں کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ نیز ان کے مطالعے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کے خیال میں ہر وہ بات جو قدرتی طور پر ظہور میں آتی ہے۔ ایک تمثیلی اہمیت لئے ہوتی ہے۔ یا وہ کسی بات کی وضاحت کرتی ہے یا وہ کسی اچھے یا بُرے شگون کی حامل ہوتی ہے۔ قدرت اور انسان میں اس طرح کا احساسِ تطابق قدیم چینی شاعری کی ایک ترقی یافتہ خصوصیت ہے۔

اس مضمون کے لئے ان نظموں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ معاشقہ اور شادی۔ امراء کی شادیاں ان کے والدین کے انتظام کے ماتحت عمل پذیر ہوا کرتی تھیں اس لئے ان کے تجربات عشق سے معاشقہ قدرتاً خارج ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عقد کے دن ہی ان کی پہلی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشقے کی سرخی والے گیتوں میں آپ کو عوام کی زندگی کی مثالیں نظر آئیں گی۔ امراء کا بیان ان میں نہ ہو گا۔ اس کے مقابلے میں امیر طبقے کے لئے عقد کا معاملہ ایک وضاحت طلب اور لمبا چوڑا جھنجھٹ ہوا کرتا تھا۔ عوام کی طرح، غربت کی وجہ سے، ایک سیدھا سادا واقعہ نہ تھا۔ اس لئے دوسرے حصّے کی نظموں میں ہمیں ایسے ہی اشارات ملیں گے۔

معاشقے کی ابتدا عموماً دونوں جنسوں کی عام مخلوط محفلوں میں ہوا کرتی ہے (جیسے کہ اردو میں بھی رسیا کے بے شمار گیتوں سے اکثر ظاہر ہوتا ہے) مغرب میں بھی یہی حال ہے اور چین کے نواحی ممالک میں بھی یہی طریق کار تھا۔ لیکن قدیم چین میں یہ سلسلہ نہ تھا۔ وہاں لڑکیوں اور نوجوانوں کی شناسائی دیہاتی ملاقاتوں کی حیثیت رکھتی تھی جسے اردو کے ایک گیت کے مطابق یوں بیان کیا جا سکتا ہے:-

"دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر
"شرما کے مسکرا کر، آنچل سے منہ چھپا کر،
"جاؤ نہ پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر،
"کھیتوں میں چھپ چھپا کر"

معاشقہ

پہلا گیت:-

(سرخ مرچ کے پودے سے چین میں استعارتاً تند جذبات مراد لی جاتی ہے)

مرچ کے بیجوں سے میری ٹوکری بھر رہی تھی،
بیج اس میں سے اُبل کر باہر گر پڑے،
اور تعجب ہے
کہ ایک نوجوان نمودار ہوا،
وجیہہ اور سرو قد۔
اور مرچ کے پودے کا کیا حال ہوا!!
اس کی ٹہنیاں کیسی پھیل گئیں!
مرچ کے بیج میرے ہاتھوں سے بھی گر گئے،
اور تعجب ہے،
کہ ایک نوجوان نمودار ہوا،
پودے کی ٹہنیاں پھیل کر کیسی کیفیت لائیں!

اس جگہ میں اس گیت کی وضاحت ذرا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ استعارے کے پردے نے مفہوم کو بہت حد تک چھپا رکھا ہے۔ گیت کا مطلب مختصر طور پر یہ جانئے کہ میرا دل تیز جذبات سے معمور تھا۔ ایک وجیہہ اور سرو قد نوجوان کو دیکھ کر وہ امنڈ پڑے اور ظاہر ہو گئے اور پھر جذبات میں فراوانی پیدا ہوئی (ٹہنیاں پھیل گئیں) جذبات میرے قابو سے بھی نکل گئے (بیج ہاتھوں سے بھی گر گئے) ایک جوان کے دیکھنے سے جذبات پرورش پا کر کیسے زیادہ ہو گئے!!

دوسرا گیت

لڑکیوں میں سب سے خوبصورت لڑکی سے
مجھے دیوار کے سرے پر ملنا تھا۔
لیکن وہ تو چھپ گئی، اور خود کو دکھاتی ہی نہیں!
اور میں حیران اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہوں!
لڑکیوں میں سب سے خوب صورت لڑکی نے
مجھے ایک لال رنگ کی بنسری دی
اس لال رنگ کی بنسری کا نغمہ
اس لڑکی کے حسن کی وجہ سے ہی بیش افزا ہے!
وہ سبزہ زاروں سے میرے لئے پھول چن کر لائی،
وہ پھول بہت نادر اور خوبصورت تھے۔
اے پھولو! خوبصورت تم نہیں ہو۔
بلکہ جس لڑکی کے ذریعے تم مجھ تک آئے وہ خوبصورت تھی!

انسانی ذہن کی حرکات ہر جگہ یکساں ہیں اور چین کا ملک بھی اس نظریے سے مستثنیٰ نہیں۔ وہاں بھی عشاق راتوں کو چھپ کر اپنی محبوبہ سے ملنے جایا کرتے ہیں۔ وہاں بھی جنسی افسانوں کی ہیروئنیں اپنے بانکے جانبازوں سے اس کی متوقع رہتی ہیں کہ وہ یہ کہتے ہوئے اپنی بہادری کا اظہار کریں کہ ؎

کرنا کوئی دیوار تری وصل سے نہ ہوگا،
جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا۔

لیکن ساتھ ہی وہ یہ توقع بھی رکھتی ہیں کہ اس کو دو پھاند میں نہ تو کتا اجنبی کی بو سے چونک کر بھونک اٹھے اور نہ ہی والدین دروازہ کھلنے کی آہٹ سے بیدار ہو جائیں۔ اور اس بات کی رات گزرنے پر جب صبح کے ظالم آثار نمودار ہوتے ہیں تو چین میں بھی پریمی اور پریتم بمشکل خود کو دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات ہمیں اپنے دیہاتی گیتوں (خصوصاً رسیا کے گیتوں) سے معلوم ہیں۔ ذیل کے گیت میں اسی طرح کی ایک جھلک ہے۔

تیسرا گیت۔

پیارے!
ہمارے گھر میں دیوار پھاند کر نہ آ۔
اور نہ ہی آنگن میں لگے ہوئے پودوں کو کچل!
اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پودوں کا خیال ہے،
بلکہ میں اپنے ماں باپ سے ڈرتی ہوں۔
یقین جاننا کہ میں تیری مشتاق ہوں،
لیکن آخر مجھے یہ بھی تو خیال آتا ہی ہے۔
کہ میرے ماں باپ کیا کہیں گے!

پیارے!
ہمارے آنگن میں دیوار پھاند کر نہ آ،
اور نہ ہی دیوار سے لگی ہوئی بیلوں کو توڑ!
اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مجھے بیلوں کا خیال ہے،
بلکہ میں اپنے بھائیوں سے ڈرتی ہوں،
یقین جاننا کہ میں تیری مشتاق ہوں،
لیکن آخر مجھے یہ بھی تو سوچنا چاہئے۔
کہ میرے بھائی کیا کہیں گے!

پیارے!
باڑ پھاند کر ہمارے باغ میں نہ آ،
اور نہ ہی بنی سنوری کیاریوں کو بگاڑ،
مجھے کیاریوں کا خیال مطلق نہیں ہے
میں تو لوگوں کی سرگوشیوں سے ڈرتی ہوں۔
میں تمہاری مشتاق ہوں۔
لیکن مجھے رسوائی کا بھی تو خیال ہونا چاہئے۔

ذیل کا گیت چینی سے آزاد نظم میں منتقل کیا گیا ہے۔

چوتھا گیت

شمالی ہوا سرد ہے — سرد ہے!
ہیں اس برف باری میں کیفیتیں
کہ روئی کے گالوں کی برسات ہے!
مجھے چاہ تو، مہرباں مجھ پہ ہو،
مرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام!
مرے ساتھ لے آ کے لطفِ خرام !
مگر دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے،
کسی بات کی ہم کو جلدی نہیں!
شمالی ہوا کی سنسناہٹیاں!
یہ ہیں برف باری میں کیفیتیں
کہ چکرا کے گرتے ہیں ذرّے تمام!
مجھے چاہ تو، مہرباں مجھ پہ ہو!
مرے ہاتھ کو ہاتھ میں اپنے تھام!
مرے گھر چلا چل مرے ساتھ ساتھ۔
مگر دھیرے دھیرے، ٹہلتے ہوئے؛
کسی بات کی ہم کو جلدی نہیں!

اس گیت کا آخری بند میں نے کسی حد تک بے معنی سا ہونے کی وجہ سے ترجمہ نہیں کیا۔ لیکن گیت یوں بھی مکمل ہے۔ اس میں عورت کے جذبات کی شدت قابلِ غور ہے جس کی جبلی ہلکے ہلکے اشارے کر رہے ہیں۔ لیکن وہی ہلکے اشارے ہی عورت کی محتاط اور جھجکتی ہوئی طبیعت کا پتہ دے کر اس گیت کو نفسیاتی لحاظ سے دلچسپ بنا دیتے ہیں اور ایک خاص قسم کی نزاکت معانی سے ہمیں لطف اندوز کرتے ہیں۔

پانچواں گیت

مشرقی در کے صنوبر ہیں جہاں۔
برگ ہائے سبز ہیں جن کے گھنے،
ہم کو ملنا تھا وہیں پر شام کو!
اب نکل آیا ستارہ صبح کا!
رات پوری ہو چکی دن آ گیا!
مشرقی در کے صنوبر ہیں جہاں،
جن کے پتے ہیں گلے ملتے ہوئے،
شام کو ملنا تھا ہم کو بھی وہاں!
زرد ہوتا جائے ہے نجمِ سحر!

اس گیت میں انتظار کی کیفیات کا اشارہ ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسے دلِ حزیں سے ظاہر ہوا ہے جس میں اپنے محبوب کی بے حد لگن ہے۔

چھٹا گیت

نکلا اُجلا اُجلا چاند
اس کی سیمیں کرنوں نے،
میرے من کی پیتم کو،
سندر اور بنا یا ہے۔
چاند کی سیمیں کرنوں نے
میرے من کی پیتم کا
موہن روپ بڑھایا ہے!
نرم اور نازک سندر تا،
روپ ہے اس کا جادو سا،
درد نے من کے مندر میں
اپنا رنگ جمایا ہے!

(۲)

نکلا اُجلا، اُجلا چاند،
اس کی کرنیں چمکتی ہیں،
موہن، میٹھے مکھڑے پر!
چاند کی اجلی کرنوں نے

روپ سے پریتم کے مل کر،
میرے من کو لبھایا ہے!
نرم اور نازک پھول کھلا،
ایسا چہرہ پریتم کا،
ایسے چہرے نے میرے
من کا گھاؤ دکھایا ہے!

(۳)

نکلا اُجلا اُجلا چاند،
اس کی روشن کرنوں نے۔
مرے من کی پریتم کا
موہن روپ بڑھایا ہے!
پریم کی بازی جیتنے
میرے آگے ہاری ہے!
جیت کے نشے نے میرے
دل کا درد بڑھایا ہے!
پاگل مجھ کو بنایا ہے!

یہ گیت اپنی تمثیلی کیفیات کی وجہ سے بہت دلکش ہے

شادی بیاہ

شادی بیاہ کے متعلق ذیل کا پہلا گیت ایک ایسی خاتون کے جذبات کا ترجمان ہے جس کے احباب اور متعلقین نے اس کی شادی مرضی کے خلاف کرنے کی کوشش کی، ترجمہ نثر میں ہے۔

پہلا گیت

صنوبر کے تختوں والی کشتی الٹ گئی،
موجوں کے جھکولے کھاتی ہوئی یہ بہتی چلی جاتی ہے۔
میرے دل میں بھی ایک طوفان ہے۔
میں سو نہیں سکتی!
لیکن میرا درد کوئی نہیں جانتا!
کھانے پینے رہنے سہنے کے سامان کی میرے پاس ارزانی ہے۔
میرا دل آئینہ تو ہے نہیں،
کہ لوگ جو اس میں دیکھنا چاہیں۔ وہی انہیں دکھائی دے،
میرے بھی کئی بھائی ہیں،
مجھ سے زبردستی چھین کر اوروں کے بس میں نہیں کیا جاسکتا!
لیکن، آہ! یہ میری خام خیالی تھی۔
جب میں نے انہیں اپنی مصیبت سنائی،
تو وہ الٹے مجھ ہی پر ناراض ہوئے!
میرا دکھیا دل بہت بے چین ہے، اور میں حیران پریشان!
میری پریشانی کا باعث لوگ ہیں!
میں فکر و اندیشہ میں کافی الجھ چکی،
میری کافی توہین ہو لی!
رات کے سکون میں میں اسی پر غور کرتی ہوں!
اور صبح آنے پر بھی کوئی مداوا نظر نہیں آتا،
تو اپنی چھاتی پیٹتی ہوں!
اے چاند! اور اے سورج!
تم دونوں بدل کیوں گئے؟ دھندلے کیوں ہو گئے؟
بھیگے ہوئے کپڑے کی طرح
درد میرے دل سے چمٹا ہوا ہے!
میں رات کے سکون میں اسی سوچ بچار میں رہتی ہوں،
کہ میرے پر لگ جائیں اور میں کہیں اڑ کر چلی جاؤں!

دوسرا گیت

جھینگر بے چینی سے بول رہا ہے،
ٹڈا گھاس پر بے تابی سے اچھل رہا ہے،
اپنے آقا سے ملنے سے پہلے
میرے دل میں بھی اضطراب ہی تھا!
مگر اب کہ میں نے اسے دیکھ لیا،
اب کہ میں اس سے مل چکی۔
میرے دل کو چین آگیا!
میں اس جنوبی پہاڑی پر جا پہنچی،
تاکہ میں پیڑوں کی چھال لے آؤں،
اپنے آقا کو دیکھنے سے پہلے
میرا دل غمگین تھا!
مگر اب کہ میں نے اسے دیکھ لیا،
اب کہ میں اس سے مل چکی،

میرے دل کو چین آ گیا!

ذیل کا گیت ان جذبات کا مظہر ہے جو سسرال سے برگشتہ خاطر کسی عورت کے دل میں میکے کی یاد سے پیدا ہوتے ہیں۔

تیسرا گیت

اے پیلے پنچھی!
فصلوں پہ نہ بیٹھ! انہیں خراب نہ کر،
ورنہ اس ملک کے باشندے تو میرے کھانے کا خیال نہ کریں گے!
مجھے لوٹنا ہی پڑے گا۔ مجھے گھر جانا ہی ہوگا۔
جہاں میری اپنی زمین ہے اور اپنے لوگ!
اے پیلے پنچھی!
فصلوں کو خراب نہ کر،
اس ملک کے لوگوں سے کوئی نباہ کر سکتا ہے!
مجھے لوٹ کر گھر جانا ہی ہوگا
جہاں میرے بھائی ہیں!
اے پیلے پنچھی!
یہاں کے کسی پیڑ پر گھونسلا نہ بنا۔
یہاں کے لوگوں کے ساتھ رہنا سہنا ناممکن ہے!
مجھے جانا ہی ہوگا۔ مجھے گھر لوٹنا ہی پڑے گا۔
جہاں میرے اپنے آدمی رہتے ہیں!

چوتھا گیت (منظوم ترجمہ)

چمک چمک بیری گھن گرجے،
پربت پر اور میدانوں میں!
جگ کی ایسی ریت بھلا کیوں،
دور رہو تم، دور رہوں میں!
آؤ نہ تم، دکھ کس سے کہوں میں!
آؤ سوامی! اب آ جاؤ،
برہ اگن کو آ کے بجھاؤ!
چمک چمک بیری گھن گرجے
پربت پر اور میدانوں میں!
میں بھی اکیلی، تم بھی اکیلے،
ایسا دکھ من کیسے جھیلے!
آؤ کبھی آرام بھی کر لو،
اور آباد کرو تم گھر کو،
آؤ سوامی! اب آ جاؤ!
چمک چمک بیری گھن گرجے،
پربت پر اور میدانوں میں!
دور رہو تم اور میں اکیلی،
پریم کی بازی پھر کیوں کھیلی!
آؤ آ کے گھر کو بساؤ،
آؤ اپنا روپ دکھاؤ،
آؤ سوامی! اب آ جاؤ،
برہ اگن کو آ کے بجھاؤ!

میراجی

رباعی

اے دوست اُٹھا جام کہ ہم شاد رہیں!
اندیشۂ آفاق سے آزاد رہیں!
آ رقص کریں زہرہ جبینوں کے گرد
اور شیخ خرابات میں آباد رہیں!

سعید احمد اعجاز

مارچ
منگلوار
۱
سے
مارچ
۳۱
تک

بیمار

چالیس سال گزر گئے ابھی کل کا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ مسافر اپنے پہلے سفر پر اپنے والدین کی معیت میں نکلا تھا۔ جہاں انہیں ذرا سکون ملا وہ ہمیشہ سفر میں رہنے والے خانہ بدوشوں کی طرح مقیم ہو گئے۔ وطنیت کے خیال سے نہیں۔ ذرا دم لینے کے لئے کیونکہ نہ ختم ہونے والا سفر زندگی ابھی درپیش تھا۔ شاید وہ پہلی منزل سے یہاں تک پہنچتے تھک گئے تھے۔ مسافر ہر منزل کو وطن سمجھتا تھا۔ چالیس سال ہاں پورے چالیس سال ہوئے کہ اُسے منزل پر وطن کا شبہ ہوا۔ مکتب میں داخل ہوا، دل جمعی کے ساتھ۔ چھ سال کی عمر میں کتنے بچوں کو احساسِ زندگی ہوتا ہے؟ لیکن مسافر کو نہ صرف زندگی کا علم تھا بلکہ زندگی کی آزمائش کا بھی۔ زندگی کے آلام اور اس کی نظر فریبیوں کا وہ دلدادہ تھا۔ کیا اُسے محبت کا علم ہو چکا تھا۔ نہیں، یہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ عقل پہلے سراسیمہ کرتی ہے یا محبت دل جمعی کی امید دلاتی ہے۔ اگر عقل کا شعور پیدا ہو گیا ہوتا تو محبت کا احساس مسافر کے لئے تا دمِ مرگ خارج از امکان ہو جاتا۔ محبت سے وہ ضرور متاثر تھا کیونکہ اپنی عمر اور شعور سے فزوں تر افکار میں وہ مبتلا رہتا تھا۔ یہ آلامِ حیات کا آغاز تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں احساسِ حسن کا پیدا ہو جانا شاید پختہ کار حکماء کو غیر ممکن معلوم ہو۔ لیکن محبت کے تاثرات کا وفور اس کا بدیہی ثبوت تھا۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ واقعات سے آنکھیں بند کیسے کی جا سکتی ہیں۔ امر واقع یہی ہے کہ ایک نامعلوم کشش اُسے آج سے ٹھیک چالیس سال پہلے مصروفِ طواف رکھتی تھی۔ آج کہ تخیل کی فسانہ بافیوں نے عشق کو بھی بے باک و گویا کر دیا ہے ہم سمجھ نہیں سکتے کہ محبت کے ساتھ حیا اور خاموشی ہم سے پہلوں کا شعار تھا جس طرح سارے اس نظامِ شمسی میں گردش پر مجبور ہیں۔ اس طرح مسافر حسن کے محور پر گھوم رہا تھا مگر بے آرزو و بے جستجو۔ اس وقت بھی دل آمادۂ فنا اور جاں صدقۂ نیاز تھی۔ چالیس سال کی مزید بادیہ پیمائی نے نظریۂ عقیدت اور جانِ نذر میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

اس کی تمام زندگی معروفِ سفر رہی اور نذرِ وفا۔ کیا دل ہوگا جس میں چھ سال کی عمر میں تسلیمِ جاں کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ اس دلِ خانہ برباد سے کس قدر کام لئے گئے کہ آخری منزل سے بہت دور ہی اس نے اپنے تئیں صدقہ کر دیا۔ کیا دل ضعیف تھا؟ اگر الماس کا ٹکڑا بھی ہوتا تو کہاں تک تابِ خدمت لا سکتا۔ مگر تیس سال بعد بھی یہی انجام ہوتا خواہ اُسے آلام و افکار سے محفوظ رکھا جاتا۔ لیکن اُس نے معروفِ نیاز رہ کر پیمانۂ زیست کو خود مختصر کر دیا۔

میر افضل علی مرحوم

نقد و نظر

مطائبات

سندباد جہازی کے اڑتالیس مختصر مضامین کا مجموعہ مطائبات کے نام سے اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا حجم ۱۷۶ صفحات ہے۔ کاغذ معمولی۔ لکھائی چھپائی اچھی قیمت ایک روپیہ

سندباد جہازی جو دنیائے صحافت میں مولانا چراغ حسن حسرت اور دوستوں میں صرف حسرت صاحب کے نام سے مشہور رہیں روزنامہ احسان کے ادارہ تحریر میں شریک ہیں اور ہر روز مطائبات کا کالم لکھ کر داد انشا پردازی دیتے اور خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ ساڑھے تین سال میں مطائبات کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے اس کا انتخاب زیر نظر کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ حسرت کو زبان اور محاورے پر قابلِ رشک قدرت حاصل ہے۔ وہ نہایت صاف منجھی ہوئی پختہ اور شستہ اردو لکھتے ہیں اور طرہ یہ کہ انہیں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا بہت پاکیزہ مذاق حاصل ہے۔ اُن کی ظرافت نگاری محض ہنسی دل لگی نہیں۔ وہ باتوں باتوں میں ایسے نکات بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک طرف اُن کے طرزِ تحریر کی شگفتگی اور اندازِ بیان کی حلاوت سے متاثر ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن کے علمی و ادبی اور معاشرتی و سیاسی معلومات سے استفادہ کرتا ہے۔ پند و نصائح کی وہ باتیں جو سنجیدہ طور پر کہی جائیں تو شاید ایک تلخ اور بے مزہ وعظ کی صورت اختیار کریں۔ یہاں نہایت دلاویز پیرائے میں جسے ظرافت کی چاشنی نے اور زیادہ پرلطف بنا دیا ہے۔ بیان کی گئی ہیں۔ مطائبات میں اگرچہ بعض ایسے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے جن کی نوعیت ہنگامی تھی لیکن حسرت کے قلم کی گلکاری نے ان چیزوں کو بھی ایسا رنگ دے دیا ہے کہ ان کی ادبی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

ٹوڈی اور درباری۔ لفظ پارس کی تحقیق۔ بقراط و وٹ کی تلاش میں۔ حساب جمل اور نماز۔ دل محمد روڈ۔ مسلمانوں کی رنگین لڑائی ایسے مضامین ہیں جو زبان و اسلوبِ بیان کی خوبیوں کے علاوہ اپنے معنوی محاسن کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہیں جو لوگ صحیح اور شستہ اردو پڑھنا یا سیکھنا چاہیں مطائبات کا ضرور مطالعہ کریں۔

نورِ مشرق

مہرلال صاحب سونی ضیا فتح آبادی ایم اے کی نظموں کا مجموعہ نورِ مشرق کے نام سے حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ سائز $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم ۱۳۶ صفحات۔ کاغذ بہت اچھا۔ لکھائی چھپائی نہایت شگفتہ۔ کتاب مجلد ہے اور مصنف کی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ دفتر ادبی دنیا لاہور۔

ضیا صاحب پنجاب کے اُن نوجوان شعرا کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری ان کے فطری ذوق اور وجدان کا نتیجہ ہے جنہیں قدرت کی طرف سے حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ دقتِ نظر بھی عطا ہوئی ہے، جو مظاہرِ فطرت و جذباتِ انسانی کی نیرنگیوں کو بغور دیکھنے اور ان کے تاثرات کو قبول کرنے کے عادی ہیں۔ ضیا صاحب کا کلام اکثر ادبی دنیا میں شائع ہوتا رہتا ہے اور ناظرین اُن کے روح پرور رنگِ سخن سے بخوبی واقف ہیں۔

اس مجموعہ کے شروع میں جوش ملیح آبادی، حکیم آزاد انصاری اور منظر اکبر آبادی کے تعارف درج کئے گئے ہیں۔ جوش اور آزاد نے مجمل طور پر ضیا کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ منظر کا تعارف ضیا کے شخصی محاسن سے متعلق ہے۔ اس کے بعد کتاب کا اصلی حصہ شروع ہوتا ہے جس میں چالیس نظمیں سات گیت اور ریو سانٹ ہیں۔ نظمیں مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں مثلاً طلوعِ سحر، گھٹائیں، مطربہ سے، ڈیوک آف ونڈسر، آئینے کے سامنے، کرشن، تعلیمِ اسلام، ہندوستان، انسان اور فرشتہ، تلاش،

گل نوشگفتہ۔ اگر خدا ہے ان میں سے بعض نظمیں جذبات انگیز اور خیال آفریں ہیں بعض میں صرف منظر کشی کی گئی ہے اور بعض شاعر کے قلب کی گہرائیوں میں آرام کرنے والے اسرار کی آئینہ دار ہیں لیکن ہر نظم شاعر کے تخیل کی مینا کاری اور اس کی رنگینی سے مرصع ہے۔ ضیا کے انداز نگارش میں روانی بھی ہے سلاست بھی ہے اور سرمستی و جوش بھی ہے۔ وہ موت و حیات اور مذہب و فطرت کے حقایق بیان کرتے وقت زبان کا ترنم برقرار رکھنے میں حد درجہ کامیاب رہے ہیں۔ سن و سال کے اعتبار سے ضیا اگرچہ جوانی کی رنگین مرادوں کے دن کی منزل میں ہیں لیکن ان کے کلام کی پختگی اور ان کے خیال کی رفعت و پاکیزگی دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ ذہنا و فکرا ایک کہن سال شاعر ہیں۔ وہ اظہار جذبات میں بے حد محتاط ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ بعض نظموں میں ان کے شباب کی بے قراریاں تڑپ تڑپ کر الفاظ کی اوٹ سے جھانک رہی ہیں۔ آخر ضیا کی شاعری تو ضیا کی جوانی کی کہیں نہ کہیں تو رعایت کرنی تھی۔ نور مشرق بلاشبہ دور حاضر کے نوجوان طبقے کے شاعرانہ رجحانات کا ایک نہایت پاکیزہ، لطیف اور قابل قدر مرقع ہے۔

"ع"

پریم ترنگ عرف ترانۂ الفت (حصہ اول)

یہ کتاب جو لالہ کانشی رام صاحب چاولہ سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر ہوشیار پور نے تصنیف کی ہے پہلی مرتبہ گزشتہ اپریل میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن ہمیں ریویو کے لئے موصول ہوا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں دنیا بھر کے مختلف مذاہب کے پیغمبروں اور بانیوں اور ہر زمانے کے بڑے بڑے مفکروں کے سبق آموز اخلاقی اقوال کو مختلف عنوانات کے تحت بڑی خوبی سے جمع کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ایک مذہب یا ملت کے پیرو دوسرے مذاہب کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔ ہندوستان ایسے ملک میں جو آئے دن فرقہ وارانہ کشمکشوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اس قسم کی کتابوں کی اشاعت ضروری ہے کیونکہ یہ افراد کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ مشہور ہے کہ نصیحت انسان کو تلخ معلوم ہوا کرتی ہے، مصنف نے اس تلخی کا علاج فارسی اور اردو کے قدیم و جدید شعرا کے ان پاکیزہ اور شیریں اشعار سے کر دیا ہے جو کتاب کے ہر صفحے پر نظر آتے ہیں۔

مصنف نے کتاب کی ترتیب میں کافی محنت سے کام لیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل وطن ان کی کاوش کی داد دیں گے اور جس مقصد کو وہ سامنے رکھتے ہیں اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اتحاد و یگانگت کے اس راستے پر گامزن ہوں گے جو آزادی کی شاہراہ سے جا ملتا ہے۔ کتاب درسی کتابوں کے سائز کے تین سو سے زیادہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے، مصنف کی عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ مجلد نسخہ ایک روپے میں اور غیر مجلد ایک روپے میں مصنف سے براہ راست مل سکتا ہے۔ (ح - ۵)

کاروباری دنیا

امرت دھارا کی سالانہ رعایت

کارخانہ امرت دھارا لاہور نے جو اب ایک شہرۂ آفاق انسٹی ٹیوشن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ماہ مارچ میں رفاہ عام کی غرض سے عظیم الشان رعایت کا اعلان کیا ہے۔ امرت دھارا کے موجد پنڈت ٹھاکر دت صاحب شرما وید کی ذات کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں آپ طب ہندی کی بیش بہا خدمات انجام دینے کی وجہ سے غیر فانی شہرت کے مالک ہیں اور دیسی طریقۂ علاج میں بہت سی ایجادات کر چکے ہیں۔ امرت دھارا کی اس رعایت کی وجہ سے ماہ مارچ پر لاکھوں انسانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں اور شری گرو رتن وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت جی شرما وید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی تیار کردہ مشہور عالم دوائی امرت دھارا ہر سال اس ماہ میں رعایتی قیمت پر فروخت کی جاتی ہے۔ اس نایاب چیز سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ امرت دھارا ہی ہے جسے آج ہم ہر ایک گھر میں موجود پاتے ہیں۔ امرت دھارا کے علاوہ پانچ صد کے قریب دیگر ادویات بھی موجود ہیں۔ جس کے لئے کارخانہ مذکور نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔ دمہ، بواسیر، ناسور یا وغیرہ کو دور کرنے کے لئے پر اثر ادویات موجود ہیں اور بچوں کی بیماریوں کے لئے بھی مفید ادویات موجود رہتی ہیں۔ یہ رعایت ماہ مارچ ہی میں دی جاتی ہے جبکہ جملہ ادویات نصف قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں اور امرت دھارا اور اس کے مرکبات (مرہم۔ بام۔ لوشن وغیرہ) ۳/۴ قیمت پر۔ پنڈت جی کی تقریباً چار درجن کے قریب تصنیف کردہ کتابیں جو انسانی صحت و حکمت پر لکھی گئی ہیں اور جن کا مطالعہ ہر انسان کے لئے بے انتہا مفید ہے۔ نصف قیمت پر امرت دھارا کے دفتر سے مل سکتی ہیں۔ آپ ضرور ماہ مارچ

کے رعایتی اعلان سے فایدہ اٹھائیے!

بیس ہزار روپے کی خیرات

مسٹر برن جیون سی۔ ڈیسائی مالک چائینز میڈیکل سٹور بمبئی کی بیوی مسز ترویبی بائی بی۔ ڈیسائی مبارک باد کی مستحق ہیں جنہوں نے مورخہ پانچ فروری ۱۹۳۸ء کو اپنی ذاتی جائداد میں سے مبلغ بیس ہزار روپے سر ہرکیشن داس ہسپتال بمبئی کے ٹرسٹ کو بطور خیرات عطا فرمائے۔ آپ نے یہ رقم ہسپتال مذکور کے ٹرسٹیز دی بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی کو ادا کر دی ہے۔ پبلک کی خدمات کے لئے آپ کی یہ گرانقدر قربانی قابل ستائش و تقلید ہے اور آپ ہر طرح مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ ذی استطاعت حضرات یا خواتین جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ایسی قربانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محترمہ موصوفہ کے اس نیک عمل کی تقلید کریں اور ایسی مفید ملکی خدمات انجام دیں۔

"سپلا" کی لاہور برانچ کا افتتاح

دنیائے طب میں مشہور و "اوکاسا" کے موجد ڈاکٹر کے۔ اے۔ حمید صاحب کی شخصیت کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ ہندوستان کی صنعتی پستی کا احساس کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے زر کثیر کے صرف سے بمبئی میں آج سے چند ماہ پیشتر دی کیمیکل انڈسٹریل اینڈ فارمیسوٹیکل لیبارٹریز لمیٹڈ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد بہترین طبی تجربے کے ساتھ وہ ادویات تیار کرنا ہے۔ جو ہندوستان ہر سال ممالک غیر سے کروڑوں روپے کی خریدتا ہے کمپنی مذکور بمبئی میں ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد کامیابی سے چل رہی ہے۔ اب کمپنی مذکور نے اپنی پنجاب برانچ ۵۔ ڈنگا سنگھ بلڈنگ میں کھولی ہے۔ افتتاح کے موقع پر مختلف جرائد کے نمایندگان کے علاوہ متعدد ڈاکٹر اور معززین لاہور موجود تھے۔ اپنی تقریر کے دوران میں ڈاکٹر حمید صاحب اپنے ان تجربات پر روشنی ڈالی جو موصوف نے جرمنی میں ادویات کے متعلق حاصل کئے۔ معزز مقرر نے افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستانی صنعت میں بہت کم توجہ کارخانے بنانے اور کاروبار کو مغربی اصولوں پر چلانے کی طرف کی جاتی ہے۔ ہندوستانی سرمایہ اب تک دوسری کمپنیوں میں لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن صنعت ادویات سازی پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ موصوف نے اپنی کمپنی کی مختصر سی کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے امید کا اظہار کیا کہ وہ جلد اس کمپنی کو دوسری کمپنیوں کا سرتاج بنا دیں گے۔

آپ کی تقریر کے بعد سردار حبیب اللہ خاں صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں اس کمپنی کی فیکٹری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمایا جسے موصوف بچشم خود دیکھ چکے ہیں۔ موصوف نے ڈاکٹر حمید صاحب کی کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے [illegible]

سے دریغ نہ کرے گی کہ کمپنی مذکور نے اپنی جو سپلا لیبارٹریز کی تیار کردہ ادویات کو فروغ دے گی۔

ASSOCIATED CEMENT COMPANIES LIMITED.

Twenty two years of manufacturing Experience behind the above brands of Cement.

ہر پڑھے لکھے گھر میں رکھنے والی

کتابیں

پرشین ٹیچر فارسی ترجمہ سیکھنے کے لئے مفید کتاب ہے
قیمت دس آنے (۱۰/)

انوواچندرکادے سنسکرت ٹرانسلیشن کا بہترین رہنما ہے
قیمت بارہ آنے (۱۲/)

سکول کمپوزیشن اس میں لیٹرز، سٹوریز، سمریز، ایسیز، ڈایالاگ، اسپیچز وغیرہ شامل ہیں جو طلبا
مڈل اور ہائی دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔
قیمت:۔
ایک روپیہ دو آنے (۱؍۲)

ایڈیومیٹک انگلش ٹرانسلیشن پاکٹ ایڈیشن
اس میں ۱۲۰۰ سے زائد
فقرات درج ہیں۔
قیمت
چار آنے (۴/)

ایڈیومیٹک انگلش ٹرانسلیشن مصنفہ لالہ برج لال
اس میں روزمرہ استعمال کے ۳۰۰۰ سے زائد فقرات یونیورسٹی
کی طرز پر بامحاورہ انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے
قیمت:۔ بارہ آنے (۱۲/)

رفیق مضمون نگاری اردو جواب مضمون پر لاجواب کتاب ہے
قیمت ایک روپیہ چھ آنے (۱؍۶)

نیو ماڈل انگلش کمپوزیشن جس میں اسیز، لیٹرز، سٹوریز، ڈایالاگ طلبا
مڈل ہائی کیلئے نہایت مفید ہے قیمت (۸/)

نوٹ:۔ جہاں ہر گھر میں ہی لائبریری لازمی ہے وہاں مندرجہ بالا کتب کا ہونا بھی ضروری ہے | مکمل فہرست کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر لکھئے

پنجاب کتاب گھر رجسٹرڈ ۱۹ موہن لال روڈ لاہور

دنیائے ادب

نعرۂ انقلاب

اشتراکی - میں اس مساوات کے گیت گاتا ہوں، جہاں پہنچ کر سب اختلافات اور تفرقے مٹ جاتے ہیں۔

جس کے سائے میں ہندو اور بدھ مسلمان اور عیسائی ہمدوش ہو جاتے ہیں۔

میں اسی مساوات کا نغمہ سنج ہوں

تم کیا ہو؟ --- پارسی جین یا یہودی۔ بولو تو سہی کیا ہو۔

تم جو بھی ہو۔ تمہاری مرضی ہے۔

پیٹھ پر خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو۔

قرآن پران انجیل۔ وید۔ تمہارا جی چاہے تو انہیں گھول کر پی جاؤ۔

لیکن یہ تو کہو اس در دسر سے مدعا کیا؟ ان کاغذی پھولوں پر جان کیوں دیئے دیتے ہو۔ وہ دیکھو باغ جہاں ہیں نئی چمن بندی ہو رہی ہے۔ سارے زمانے کے علم کو کھنگالنے والو! ذرا کتابِ دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو۔

تمہیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگمگاتا ملے گا اور تمہارا دل وہ کعبہ ہے جو بنی نوعِ انسان کا قبلہ نما ہے۔

مردہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں ناحق مارے مارے پھرتے ہو۔

تمہارا دل جو مشعل نور ہے تمہاری اس کور چشمی پر حقارت سے ہنستا ہے۔

بڑے بڑے تاجدار اسی دل کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

وہی تیرتھ ہے وہی کعبہ ہے وہی کاشی ہے وہی یروشلم ہے

دیر و حرم، کعبہ و کلیسا سب کچھ اسی دل میں ہے۔

عیسیٰ اور موسیٰ نے اسی خانہ دل میں بیٹھ کر حق کی جھلک دیکھی تھی

یہی وہ میدان جنگ ہے۔ جہاں کرشن نے گیتا کا ورد کیا۔

اور اسی کوہ میں بیٹھ کر نبیوں نے حقیقت کی تھاہ پائی۔

یہی وہ کوہ ندا ہے جہاں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت کی پکار سُنی اور اس کی نجات کی خاطر راج پاٹ تج دیا۔

اسی دل کے مندر میں بیٹھ کر رسولِ عربی نے اپنا پیغام سنایا۔

ہوم تو کس فریب میں مبتلا ہے۔

سچ جان کہ اس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے۔

خدا - تم آکاش پاتال اور دشت و جبل میں کس خدا کو ڈھونڈھتے پھرتے ہو۔

درویشو، صوفیو، تم نے بھی کمال کر دیا۔

دنیا تمہارے منہ کو تک رہی ہے اور تم ہو کہ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو۔

خالق کی تلاش یعنی تم آپ اپنی تلاش میں سرگرداں ہو۔

عقل کے اندھو دل کی آنکھوں سے دیکھو تو آئینے میں تمہیں اپنے چہرے کی ہر رگ پر اس کی صورت نظر آئے گی۔

یہ سُن کر آگ بگولہ نہ ہو جاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ خدانخواستہ تم ہی اللہ میاں کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو!

ہر شے میں اس کا نور ہے اور وہ ہر انسان سے شناسا ہے۔

سوداگر ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں لیکن انہیں سمندر کی تھاہ کیا معلوم۔ یہ موتی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن سمندر کی گہرائی کی خبر انہیں کیا۔

اس سمندر میں تو بہتے کبھی نہیں گئے۔

ہمدم! تو ان کتابوں کو چھوڑ دو، پائے حقیقت کے اندر بیٹھ کر دیکھ
کہ کیا تماشا نظر آتا ہے۔

انسان:- میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔

ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر نسل میں، جتنے انسان ہوتے ہیں
—— سب ایک ہی سطح میں شامل ہیں۔ وہ سب انسانیت
کے زمرہ میں شامل ہیں۔

پجاری! دروازہ کھول، بھوک کا دیوتا دروازے پر کھڑا ہے۔ آؤ
کہ پوجا کا وقت ہو گیا۔

خواب میں یہ آواز سن کر پجاری چونک کر اٹھ بیٹھا اور عبادت گاہ کا دروازہ
کھول دیا۔ سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سب دلدر دور ہو جائیں۔

مسافر کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے اور وہ بیچارہ مجنوں کی طرح لاغر تھا۔
بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "بابا! سات دن کا بھوکا ہوں۔"

مگر دروازہ بند ہو گیا اور بے اماں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے
میں کانپتا ہوا وہیں گر پڑا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر
کہا "دیوتا یہ تیرا نہیں پجاری کا مندر ہے۔"

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ، قورمہ کی خوشبو سے ملا للچائی
ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مسافر آیا جس کا جسم تکان
سے چور چور ہو رہا تھا۔ بولا بابا میں سات روز سے فاقہ کر رہا ہوں۔

ملا نے دھتکار کر کہا "مردود! یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے
کبھی نماز بھی پڑھتا ہے تو؟"

بھکاری نے کہا "جی نہیں"۔ ملا نے چیخ کر کہا "ملعون نکل خدا کے
گھر سے" یہ کہہ کر مسجد میں اس نے قفل جڑ دیا۔

فقیر نے آہ بھر کر کہا "یا رب! اسی سال کی مدت میں میں نے تجھے
کبھی یاد نہیں کیا، تاہم میری روٹیوں پر تو نے پابندی نہیں لگائی۔
تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے۔ پنڈتوں اور ملاؤں
نے ان پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے۔"

ہلاکو، چنگیز، غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان مقفل عبادت گاہوں
کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے۔"

خدا کے گھر پر کون تالا لگاتا ہے۔ کون زنجیر لگاتا ہے۔

لاؤ ہتھوڑی اور کدال مسمار کر دو ان سیہ خانوں کو۔

اے عبادت خانو! تمہارے میناروں پر چڑھ کر منافقت نفس
پرستی کا پرچم لہراتی ہے۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

قرآن، وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کم بخت مرے جاتے ہیں
بے نا سمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انہیں بتلائے کہ انسان
کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں اور ان کتابوں
کے صدقے میں انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانیوں کا خون بہہ رہا ہے۔

ہم انہیں کی اولاد ہیں۔ ہم بھی اُن جیسے انسان ہیں۔ معلوم نہیں ہم میں
سے کون ان کے رتبہ کو حاصل کرے۔

ہمدم! میرا مذاق نہ اڑا۔ "انا" کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے!
ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی کلجگی اوتار ہو۔ کوئی مہدی ہو۔ کوئی
عیسیٰ ہو۔

پھر تو کس سے نفرت کرتا ہے۔ کس پر وار کرنا چاہتا ہے۔
ارے نادانو! اس کا سینہ بھی بیت اللہ ہو سکتا ہے۔
اگر وہ بیمار اور نحیف ہے۔ اگر نادار اور مفلس ہے تو کیا ہوا!
دنیا کے تمام عبادت خانے اس ایک پیکر خاکی سے زیادہ
مقدس نہیں ہو سکتے۔

ممکن ہے کہ اسی دکھیاری عورت کے بطن سے ایک ایسا
انسان پیدا ہو جو تاریخ عالم میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔
جس بطل نو کو آج تک دنیا نے نہیں دیکھا
جس ندا کو سننے کے لئے زمانہ اب تک گوش بر آواز ہے۔
ممکن ہے کہ وہ اسی کی جھونپڑی کو نوازے۔

انہیں گورکن کہہ کر حقارت سے نہ ٹھکراؤ۔ ان کے اندر نہ جانے
کتنے مہر و چندر چھپے ہوئے ہیں۔ کل انہیں میں سے کوئی سربلند ہوا تو تم
اس کی آستان بوسی کو اپنی معراج سمجھو گے۔

گوالا کہہ کر اسے کیوں نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہو سکتا ہے
کہ ان میں پھر کوئی کرشن پیدا ہو۔

کسان کے نام پر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو۔ سچ پوچھ

تو وہی دنیا کا سرتاج ہے۔

ان گدڑیوں پر نہ ہنسو۔ انہیں میں ایک ایسا نبی پیدا ہوا جس کا پیام ابتک دنیا کو منور کر رہا ہے۔

تمہارے دروازے پر کوئی فاقہ زدہ آیا تھا اُسے تم نے دھکے دے کر بھگا دیا۔ تم کیا جانو کہ اس بھیس میں کون دیوتا تمہارا امتحان لے رہا تھا۔

ہمدم! تیرے سینے میں حرص و آز کی آگ سلگتی ہے اور آنکھوں سے خود غرضی ٹپکتی ہے۔ وہ نہ تو دیکھتا کہ تو فرشتوں سے قلبی کا کام لے رہا ہے۔

دردِ دل ہی لذتِ حیات ہے

لیکن ادنیٰ فطرت، اسی جوہرِ انسانیت کو اپنے نفس پر قربان کر رہا ہے۔

تجھے خبر نہیں کہ حرص و ہوا کا چنگل تجھے تیرہ و تار موت کے غار کی طرف دھکیل رہا ہے۔

اُس نے اپنی روح اگر ثواب کے سپرد کی تو اپنا جسم گناہ کے حوالے کیا۔

ہمدم! یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برہما، وشنو اور مہا دیو جیسے جغادری ـــــ انسان کا ذکر ہی کیا ہے، بڑے بڑے رشی منی ـــــ ان سب کی روح لے رہا ہو تو ہو، لیکن ان کے کالبد خاکی لہو و لعب کے پتلے تھے۔

یہ دنیا سیہ خانہ ہے جہاں ہر مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا خیالی پالان پڑا ہوا ہے۔

یہاں سب پرانے پاپی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے گناہ کے راز و پردہ دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔

چوٹی اور داڑھی کے پردے میں کیا تم اپنی ریاکاری کو چھپا سکتے ہو پولیس کا وجود جس طرح چوروں کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے اسی طرح یہ پرفریب وضع تمہاری سیہ کاریوں پر دلالت کرتی ہے۔

گناہ

گناہ:۔ میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔

سب گناہ گار میرے بھائی بہنیں ہیں۔

اور میں! ـــــ میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے تیرتے پاپیوں کا سردار ہوں۔

۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے بارِ گناہ سے جہنم دبا جا رہا ہے۔

لیکن انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر ملائک نے بہشت کی راہ پہچانی ہے۔

آدم سے لے کر نذر الاسلام تک ـــــ ہر فرد بشر نے عذاب کی چھری سے ثواب کا گلا ریتا ہے۔

یہ تو پاپیوں کی بستی ہے

اس کے آدھے حصے پر خدا کی حکمرانی اور آدھے پر شیطان کی کارفرمائی۔

مذہبی دیوانو! سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو تو دیکھو۔

نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں۔

اس جہانِ جبیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔

کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ نہ رکھ سکا۔

ایک روز فردوس بریں میں معصوم فرشتوں نے احتجاجی جلسہ کیا۔

موضوعِ بحث یہ تھا کہ اللہ میاں ہماری عبادت سے تو بے نیاز رہتے ہیں لیکن ان کی تمام رحمت اس خاکی عاصی ناری انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے

یہ شکوہ خالق کے کانوں تک پہنچا تو اُس نے مسکرا کر کہا کہ اس خاک کے پتلے نے کمال نازک دل پایا ہے، اس کی دنیا میں ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے

ہر نین میں جادو ہے اور ہر لبِ لعلیں زہر ہلاہل میں ڈوبا ہوا ہے، وہاں صندل بھی تپِ آرزو میں مبتلا ہے، اور چاند بھی بوسوں کی گرمی سے سیاہ پڑ رہا ہے۔

وہاں ہر حسین آنکھوں میں کاجل لگائے، گلے میں چندن ہار ڈالے پیروں میں مہندی لگائے، ہونٹوں کو خوناب کئے ـــــ عالم کو تہ و بالا کرنے کے درپے ہے۔

اس دنیا میں شیطان حسن کی پوشش میں ملبوس ہے اور حسن کی نگاہوں میں تیر ہے تو مسکراہٹ میں انی ہے"۔

یہ سن کر فرشتوں نے کہا کہ معبود! ہمیں بھی تک اس جہان کی سیر کرا دے جہاں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ کملائیں، مرجھائیں اور پھر پیوند خاک ہو جائیں۔

دربارِ باری سے ارشاد ہوا کہ تم میں سے دو جو سب سے افضل
ہیں اس خاکدان کی طرف جائیں اور فریبِ ہستی کا تماشا دیکھیں
اجازت ملتے ہی ہاروت اور ماروت، ٹوٹے ہوئے ستاروں
کی طرح آسمان سے زمین پر اترے
یہاں آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ذرہ ذرہ دامِ تزویر ہے۔
پتا پتا نقشِ فریب ہے۔ آسمان پر تو فقط ایک مہتاب جلوہ
ساماں ہے لیکن آبِ دریا میں اس کی صدہا پرچھائیاں اتر آئی ہیں۔
یہاں کی ہر ندا، ہر رنگ و بو حسن خوں آشام کی تفسیر ہے
جس ٹھاٹ پر دیکھو روپ کی نگری کھل کھلا رہی ہے
لیکن اس کی صدائے بازگشت بانسری کے سروں میں
فریاد بن گئی ہے۔
دو دن کے اندر ان آتش نفس فرشتوں کی رگ رگ میں مٹی کا
رس سما گیا اور ان کے دل ایک جادو نظر کے گرفتار ہو گئے
جب زہرہ لہنگا پھڑکا کر اور گگری چھلکا کر سامنے سے نکل گئی۔
تو ان خلد نشینوں کے پیروں میں عشق کی زنجیر پڑ گئی۔
آتشِ جہنم کا خوف لبِ شکریں کی شیرینی میں سرد ہو گیا۔
اور شرابِ کوثر کا لطف مٹی کے پیالوں کے آگے ہیچ
ہو گیا۔
وہ ریاضت اور عبادت کہاں گئی! ——— اب خدا کے
ان مجلسیانِ خاص کو دیکھو کہ کس مزے سے ساغر لنڈھا رہے ہیں۔
ادھر اللہ میاں نے فرشتوں پر طعن کس کر کہا۔ دیکھو زمین
لئیم نے ہاروت و ماروت کا کیا حشر کیا!
ہم نشین! یہاں ایک ایک جادو بھرے نین میں وہ قدرت
ہے کہ اس کے ایک اشارے کے سیل میں مدتوں کا زہر تنکے کی طرح
بہہ جاتا ہے۔
مادرِ گیتی کا حسن سدا بہار ہے۔
اور اس پر کسی جبار و قہار کا حکم نہیں چلتا بلکہ اس پر محبت کا دیوتا
اپنی رانی کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

طوائف:- تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟
ممکن ہے کہ تو سیتا جیسی کسی ستی کی بیٹی ہو۔
تو جو بھی ہو، ہماری ماؤں بہنوں کی ہم جنس تو ہے
تیرے بچے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں یا چچا
ان کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکسِ رخ نظر آ جائے
وہ بھی توقیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز بھی روح القدس سے
ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ پیدائش کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے
کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا!
اگر اہلیا[1] کو نجات حاصل ہو سکتی تھی اور میری[2] عصمت کی دیوی بن سکتی
تھی تو۔
تو بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابلِ عزت بن سکتی ہے۔
تیری اولاد کو جو لوگ نطفۂ ناتحقیق کہہ کر ٹھکراتے ہیں اُن سے میں
پوچھوں گا کہ اے نیکی کے فرشتو! دنیا والوں میں سے کتنوں نے جذبۂ شہوت
کو ٹھکرایا ہے؟ ان میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟ ہم سب کو اسی شہوانی
بھوک نے جنم دیا ہے لیکن کوئی ہمارے غرور کو تو دیکھے۔
نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق ——— وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے۔
اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھہرا تو شہوت پرست
باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا۔
میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں۔

عورت:- دُنیا کے حشمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اتنا
ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا۔
سوز و ساز، تپش و خلش، آگ اور آنسو ——— ان کی تخلیق میں
مرد کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا عورت کا۔
دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے -!
کہہ دے کہ گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا

---

[1] اہلیا "گوتم رشی کی حسین و جمیل بیوی تھی جس پر اندر دیوتا سو جان سے فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی خفیہ محبت کا پتہ چلنے پر رشی جی نے اہلیا کو بددعا دی کہ پتھر کی مورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اس پر پڑے تو اس نے پھر انسانیت کا جامہ پہنا۔

[2] میری" ایک فاحشہ عورت تھی جسے زناکاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انہوں نے جواب میں وہ معرکۃ الآرا جملہ کہا۔ "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو وہ اس پر پتھر چلائے"۔ بعد ازاں اس عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

یا یوں کہو کہ وہ نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ خواجہ سرا ہے! اور دونوں میں پل مل کر رہتا ہے۔

اس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر ابھرتے ہیں عورت ہی نے ان میں رنگ و بو، شیرینی و لطافت کی روح پھونکی

ہمنشین! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے؟

اندر ممتاز سوتی ہے، باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔ عورت دل ہے، مرد جسم ہے۔

اگر مرد سورج کی تپش اور باد سموم کا جھونکا ہے، تو عورت چاند کی کرن اور نسیم صبح گاہی ہے۔

اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جام کوثر ہے

مرد نے ہل چلایا، عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے سنجوگ سے کھیتی لہلہا اٹھی۔

سونے اور چاندی کی زنجیریں عورت کے جسم سے چھو کر حسین زیوروں میں مبدّل ہو جاتی ہیں۔

عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا۔

عورت سلسبیل ہے، مرد مجسم پیاس ہے۔

پانی اور پیاس ان دونوں کے میل سے ایک نیا آدم پروان چڑھتا ہے۔

مرد کی ہر فتح و نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔

تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا۔

لیکن یہ کون بتلائے گا کہ اس کے لئے عورتوں نے کس طرح اپنا سہاگ اجاڑ دیا؟

ماں نے جگر پاروں کو کیسے نکال پھینکا؟

شجاعت کی داستانوں میں یہ کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا۔ راجہ پرجا پر حکومت کرتا ہے مگر راجہ پر رانی راج کرتی ہے۔ ملکہ کی محبت، حاکم کی نخوت کو دھوتی ہے۔

اے بے درد مرد! سن، کہ عورت نے اپنا خون دے دے کر تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے۔ تاریخ جن لوگوں کے نام پر واری قربان ہوتی ہے، وہ سب خود فراموشی کے ایک لمحہ میں پیدا ہوئے تھے۔

عیاش باپوں کے ذہن میں ان کا تخیل بھی نہ تھا۔

ماں کی ممتا بچہ کو رحم و کرم، الفت و محبت کا سبق پڑھاتی ہے

مرد کی وفا ناآشنا آنکھوں میں عورت ہی دردمندی کا کاجل لگاتی ہے

لیکن مرد کی احسان فراموشی تو دیکھو کہ وہ عورت سے کس طرح پیش آتا ہے۔ جس نے اسے گود میں کھلایا اسی کا گلا گھونٹتا ہے۔

جو شخص نے اپنے باپ کا حکم مان کر اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ اسے انسان، اوتار سمجھ کر پوجتا ہے پرشرام جنہوں نے اپنے باپ کا حکم پاکر اپنی ماں کو قتل کیا تھا۔

لیکن سن رکھو! اب وہ دن بیت گئے جب عورت مرد کی پابند تھی۔

یہ مساوات، انسانیت اور اشتراکیت کا زمانہ ہے۔

باد صبا یہ پیغام لائی ہے کہ غلامی کے سب بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اب نہ کوئی غلام ہے نہ کوئی غلام فروش۔

اگر مرد عورتوں کو قید رکھنے کی کوشش کرے گا۔

تو وہ دن دور نہیں ہیں کہ یہ طوق خود اس کے گلے کا پھندا بن جائے گا اور وہ آپ اپنے دام میں تڑپتا رہے گا۔

دور حاضر للکار کر کہہ رہا ہے کہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودیں گے وہ خود اسی میں گر کر مٹ جائیں گے۔

او مٹی کے بلبلو! عورت پر جتنا تشدد روا رکھو گے اسی قدر نامرد ہوتے جاؤ گے۔

عورت بتلا تو سہی، ان سنہری روپہلی بیڑیوں میں تمہیں کس نے جکڑ رکھا ہے؟

یہ کیوں ہے کہ اب تو اپنی جھلک سے آپ بھڑکتی ہے۔

اور تیری آواز اس خیال سے کانپتی ہے کہ اسے کوئی سن نہ لے۔

آج تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔

تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، پاؤں میں، بیڑی اور چہرے پر گھونگٹ۔

عورت، کب تک تو اس ظلم کو برداشت کرے گی۔

توڑ دے ان پابندیوں کو، نکل آ اس زنداں سے!

یہ زیور تیری غلامی کا تمغہ ہیں، انہیں مردوں کے منہ پر پھینک دے۔

مادر گیتی کی لاڈلی بیٹی، پہاڑ اور جنگل کیوں اب تیری آواز سے نہیں

گوئٹے:

کیا یونانی سچ کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ ایک روز تجھے اپنے
اندھیرے تہہ خانہ میں قید کر آیا تھا:
ہاں ہاں، یہی ہوا تھا تو وہ ازل کی زندانی ہے
لیکن تو ڈرتی کیوں ہے۔ جب تو اپنے قید خانے کی دیواروں
کو توڑ کر نکلے گی تو تیری چوڑیاں تاریک راستہ کو اجال دیں گی۔
مرد جو عزرائیل کا کھلونا ہے، اپنے مالک کے ساتھ تیرے قدموں
پہ لوٹتا نظر آئے گا۔

عورت! اپنے نازک ہاتھوں سے دنیا کو آج تک تو نے امرت
کے پیالے پلائے ہیں۔ اللہ! اب انہیں ہاتھوں سے سم قاتل پلا دے!
پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب آسمان مرد کے ساتھ عورت کا بھی جیکار
منانے لگے گا۔

ڈاکو: بھائی! تجھ پر جو چوری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ
آج یہی قانون کا زمانہ ہے۔ حکومت منظم ڈکیتی نہیں
تو اور کیا ہے
کون ہے وہ زمانی فوج دار جو چوری کی برائیوں پر وعظ
کہہ رہا ہے؟
اس سے کہو کہ دنیا سے ایک بھی فرد بشر نکال کر لا دے جو ڈاکو
نہیں ہے۔
منصف صاحب! ان قانون کے پوتھوں کو طاق پر رکھئے
غریبوں کی جیب کاٹ کاٹ کر آج سرمایہ دار جاہ مند بنے
پھرتے ہیں۔
جو شخص جتنا بڑا بے ایمان، فریبی اور جعلساز ہے۔
ہمارے سماج میں اتنا ہی معزز اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔
رعایا کی ہڈیوں سے راجہ کے محل کی اینٹیں اور رعایا کے خون
سے محل کا گارا تیار ہوتا ہے۔
حریص سرمایہ داروں کے کارخانے غریبوں کی محنت سے تیار
ہوتے ہیں۔ ان کی مشینیں غریبوں کے خون سے چلتی ہیں، مگر ان کے
چلتوں انگنت انسان بیکار ہو کر در در مارے مارے پھرتے ہیں۔
بے شمار انسانوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کر کے

ل کا مالک شغل ناؤ نوش میں مست رہتا ہے اور سونے کے تاروں سے
مکڑی کا جالا بنتا ہے۔
مہاجن کی توند اسی وقت بڑھ سکتی ہے، جب غریب بھوکے
ہیں، اور زمیندار اسی حالت میں آرام کر سکتا ہے کہ غریب کی جھونپڑی
کا دیا بجھ گیا ہو۔
دنیا بیسوا ہے، گناہ رقص ہے،
دولت سرود ہے، سرمایہ دار تماشائی ہے۔
روٹی، صحت، اُمید اور زبان ——
انسان ان سب نعمتوں سے محروم ہے اور تباہی کی طرف بھاگا
جا رہا ہے۔
اور کوئی رستہ نہیں ہے —— کیونکہ سرمایہ داری نے ہر
قدم پر گڑھے کھود رکھے ہیں۔
سارا جہان زنداں ہے اور ڈاکو اس کے پہرے دار ہیں
چوروں نے مالکوں کو قید کر رکھا ہے کہ کہیں وہ باہر نکل کر
مال چھین نہ لیں۔
ہمدم! کون کہتا ہے کہ تو چور ہے، کون کہتا ہے کہ تو ڈاکو ہے
تو نے ایک مٹھی اناج کی چوری کی ہے۔ دلوں کا خون نہیں کیا ہے۔
وہ بھی ہیں جو چوری نہیں کرتے تاہم انسان نہیں ہیں۔
تو نے چوری کی ہے، پھر بھی انسان ہے۔

حاکم اور محکوم: میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
جسے سن کر دردِ انسانی سب کو ایک بار
رلا دیتا ہے۔
کتنی سیدھی سادی بات ہے کہ جب سب ایک ہی
اولاد ہیں تو ان میں سے کوئی حاکم اور کوئی محکوم کیوں ہو۔
لیکن لوگو، یہ تماشا دیکھو کہ کوئی سیدھی سی بات کو زور سے
تو وہ بغاوت کا مجرم ٹھہرتا ہے۔
رعایا تو حاکم کی باغی کہی جا سکتی ہے۔
لیکن اگر حاکم ظالم ہو تو رعایا کا باغی نہیں کہا جا سکتا۔
پرجا ہی راجہ کی خالق ہے۔ راجہ رعایا کو پیدا نہیں کرتے
لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ رعایا کی حالت غلاموں سے

امن وامان کی قیمت ہم نے اپنی آزادی کی صورت میں ادا کی ہے
کس سے فریاد کریں کہ ہم اپنے ہاتھوں محل بناتے ہیں۔ لیکن خود
بے خانماں ہیں۔
جن کے لئے حکومت قایم ہوتی ہے، حکومت پر اُن کا ہی کوئی
زور نہیں چلتا۔
ناصر اور دیوتا ہمارے منہ کا نوالا کھا جاتے ہیں اور خود ہم بھوکے
موتے ہیں۔
مگر یہ فریاد کس سے کیجئے۔ بھلا! [illegible] ہیں ہے کہ ہمیشہ حکومت زندہ
باد کے نعرے بلند کرتے رہیں۔
عدالت رعایا کے گناہوں کی سزا کے لئے ہے۔ حاکم تو [illegible]
[illegible]۔
دیکھو نقارہ جنگ پر چوب پڑی!!
او ہمارا [illegible] ہوئے توپوں اور تلواروں پر ٹوٹ پڑے، وہ [illegible]
[illegible] سینے لگے۔
فتح کا ناقوس بجتا ہے اور اس کی صدائے بازگشت [illegible]
[illegible] سنائی دیتی ہے۔
[illegible] ڈھول پیٹتے جاؤ کیونکہ فتح کی دیوی کا رتھ گزرنے
وا[illegible]
کیا کوئی بہن اپنے بھائی کے لئے ماتم کر رہی ہے؟
کیا کوئی ماں اپنے لخت جگر کو رو رہی ہے!
میدان جنگ سے اکلوتا بیٹا نہیں لوٹا!
شوہر موت کا شکار ہو گیا! بھائی کی خبر نہیں ملی!
تو کیا ہوا! یہ سب شہید ہو گئے!!! ان سب نے جام بقا پیا ہے!!
پریشان نہ ہو کیونکہ ہماری حکومت فتح یاب ہوئی ہے!
فغان و فریاد کا موقعہ ہی کیا ہے!
فتح و نصرت کا پرچم بلند کرو! بادشاہ زندہ باد کا نعرہ لگاؤ!
نقاروں پر ضرب لگاؤ!
دیکھو تو سہی کہ حضور پر نور کتنے عرصے کے بعد حرم سرا سے باہر تشریف
لائے ہیں۔
ان [illegible] کی دیدہ دلیری تو دیکھو [illegible] اللہ کی سواری کے
[illegible] نہیں ہٹتے!!

یہ اندھے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا! جاں بلب ہیں تو کیا!
حکومت کی فتح! بادشاہ کی کامرانی!
ہمدم! رعایا کا خون بہتا ہے۔ لیکن فتح حاکم کی ہوتی ہے۔ اسی کا
نام دنیا ہے۔
سرکاری نوکروں کی تنخواہ رعایا کی جیب سے جاتی ہے۔
لیکن وہ حاکم کے نوکر ہیں محکوم پر تشدد کرنے کے لئے۔
رعایا کے نوکر رعایا پر ظلم کرنے کے لئے ——— کیا بوالعجبی ہے؟
لیکن آسمان کروٹ بدل رہا ہے۔
یہ امید اب موہوم نہیں ہے کہ بہت جلد کائنات کا ذرہ ذرہ محکوموں
کی فتح کے ترانے گائے گا۔

~~~~~~~~

مزدور:۔ اُس روز ریل میں دیکھا کہ ایک قلی کو بابو صاحب نے دھکا
دے کر نیچے گرا دیا۔
یہ دیکھ کر دل بھر آیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
کیا دنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہیں گے؟
جو مزدور اپنے گوشت و پوست کے ایندھن سے ریل چلاتا ہے وہ
خود تو پٹریوں پر پڑا ہوا ہے۔ ریل پر بڑے لوگ بیٹھتے ہیں
کیا کہا تنخواہ دیتے ہیں! معاذ اللہ۔ کتنے شرم نہیں آتی۔ مزدور کو چند
پیسے دے کر تم نے دولت کے انبار لگا لئے ہیں۔
سڑکوں پر موٹر، سمندر پر جہاز، فضا میں طیارے اور شہروں میں
مشینیں۔ یہ سب کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ اور کون انہیں چلاتا ہے؟
تمہارے قصر والوان کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی
ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانہ درد کندہ ہے؟ خاک کے ایک ایک ذرہ کو
اس جاہ وجلال کا اصل راز معلوم ہے۔
لیکن وہ مبارک ساعت آ پہنچی۔
قرض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اُسے فوراً ہی بے باق
کرنا ہے۔
ہتھوڑی اور کدال سے جو آسمان بوس پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے
راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔
تمہاری خدمت کے لئے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ اختیار
کیا ہے۔
~~~~~~~~

تمہاری بار برداری کے لئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔
وہی ۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔
میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔
اُس کا دُکھا ہوا دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا۔
یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشیں صرف اس وجہ سے تمہاری توقیر
کریں گے کہ تم بالانشین ہو۔
جو لوگ فرطِ محبت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں
اب یہ زمین اپنے کو انہیں کے سپرد کرے گی۔
میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں، جن میں یہ خاک پاک خود بخود
لپٹ جاتی ہے۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون میں رنگ کر بطن گیتی سے
آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
اب تمام بندھنوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو۔
فلک کج رفتار کو چاہیئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے
پر گر پڑے۔
ہمارے سر پہ چاند سورج اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں
کہ ہم نے ایک جہانِ نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔
ساری دنیا کے انسان سن لیں کہ ہم سب ایک ہی کارواں
کے مسافر ہیں۔
اگر ایک کو تکلیف ہو گی تو سب کے دل اس کی کھٹک محسوس
کریں گے۔ ایک کی توہین بنی نوعِ انسان کی توہین ہے۔
ایک نئی دنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں کے ساتھ
راہ حیات پر گام زن ہو رہی ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔

. . . .

اختر حسین رائے پوری ”ساقی“

جسمانی توانائی کے لئے آیورویدک دنیا کی لاثانی اکسیر
سکھ سنچارک دراکشاسو
تمام اقسام کی جسمانی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا سکہ رواں ہے۔
چند روزہ استعمال سے پژمردہ اور بے رونق چہرے سرخ ہو جاتے ہیں ہاضمہ میں اضافہ اور جسمانی اعضا کو نشوونما بخشتا ہے۔
یہ خالص انگوری دارخ سے تیار شدہ دراکشاسو بے حد خوش ذائقہ اور فرحت بخش ہے۔
ہر موسم میں اور ہر زن کے لئے یکساں مفید ہے ہندوستان بھر میں فروخت ہوتا ہے پنجاب کے ہر شہر و قصبہ میں ایجنٹوں کی جلد ضرورت ہے، قواعد ایجنسی و فہرست مفت طلب کریں
بال سدا سندھو بچوں کو صحت مند اور تندرست رکھنے کے لئے اکسیر ہے۔
ملنے کا پتہ۔ سکھ سنچارک کمپنی متھرا
دن کو بہتر طور پر شروع کریں
گلائیکو تھامولین
کا روزانہ استعمال ناک اور دانتوں کی صفائی کے لئے اور دانتوں کو گرنے سے بچانے کے لئے بہترین عمل ہے سائنس کے جدید اصولوں پر بنا ہوا یہ سیال نہایت خوشگوار مزہ رکھتا ہے اور منہ کو خوشبودار اور صاف کر دیتا ہے اور جراثیم کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔
ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے۔
تیار کردہ۔ کرائس اینڈ اوون کمپنی نیویارک۔ امریکہ
ہندوستان کے باضابطہ اور مختار ایجنٹ برائے ہندوستان۔ برما و سیلون
ایم اے جے نوبل نمبر ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

قسمت کی آزمائش کا سنہری موقعہ

موٹر کار کا انعام حاصل کریں

جوہر وسمہ مہندی

تیل کی شکل میں تیار ہوگیا ہے
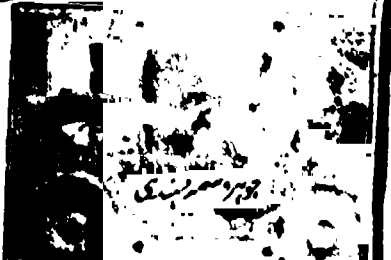
ہم نے سال گزشتہ میں اپنے مجربات کی قیمت نصف کر دی تھی جس سے اہل ملک نے کافی فایدہ اٹھایا ہے اب اعلان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ایک نہایت عمدہ **موٹر کار شیورلیٹ** چھ سلنڈر جس کا فوٹو اشتہار ہذا میں دیا گیا ہے اور جو تمام پنجاب میں چکر لگا رہی ہے۔ انعام میں دی جائے گی۔ ذیل کے تحفہ جات کے ہمراہ انعامی ٹکٹ دئے جاتے ہیں مئی ۱۹۳۵ء میں بمقام راولپنڈی کارخانہ صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ آموں کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے مفت قسمت آزمائیے۔ یہ قیمتی موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا آج ہی ذیل کے نایاب تحفہ جات کا آرڈر دے کر ٹکٹ مفت حاصل کریں۔

سفید بال خوشبودار تیل سے قدرتی سیاہ ہو جاتے ہیں ٭ ہندوستان کی ایجادات میں قابل قدر اضافہ

ہم نے جوہر وسمہ مہندی کو تیل کی شکل میں تبدیل کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا جو بارہ سال کے طویل عرصہ میں پورا ہوا ہے آج ہم مسرت کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ سے اعلان کرتے ہیں کہ وہ شوقین جو بال سیاہ کرنے والے تیل کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے آج خوشبودار تیل استعمال فرما کر اپنے سفید بالوں کو سیاہ کر سکتے ہیں اگر ہمارے اس تیل سے ایک منٹ میں بال سیاہ نہ ہوں تو دگنی قیمت واپس دی جائے گی۔ ہم دغاباز اشتہار بازوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ یہ شیشی کافی عرصہ کام دیتی ہے

ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے کمیشن معقول دی جاتی ہے

صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ آزاد منزل نیا کٹڑہ راجہ بازار راولپنڈی

برانچ آفس صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ کرنال شاپ بلڈنگ انارکلی لاہور ٭ سول ایجنٹ برائے ضلع لاہور میاں محمد امین ڈبی بازار۔ لاہور

ایجنٹ برائے نواں شہر دوآبہ:۔ یوسف علی

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھئے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب۔ یوپی وصوبہ سرحد
کے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے
"سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ" بہترین درسگاہ ہے جو گورنمنٹ
رجسٹرڈ بھی ہے اور ایڈڈ بھی۔ ہر قابلیت اور ہر مذہب و ملت
کے طلبا کے لئے یہ سکول کھلا ہے۔ گورنمنٹ سے مالی امداد
ملنے پر سکول کمیٹی نے فیس میں ایک تہائی کی رعایت کردی ہے جو
ماہوار لی جاتی ہے۔

پراسپکٹس مفت

مینیجر

واردات۔ منشی پریم چند کی نئی کتاب یہ منشی صاحب کے ان تیرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں منتشر تھے یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی چلتی جاگتی تصویریں ہیں ظاہری خوشنمائی خاص طور سے ملحوظ رکھی گئی ہے قیمت مجلد ...

مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ۔ لاہور

BANISH UGLY Superfluous HAIR

جلد کو خراب، سیاہ اور بدنما کرنے والی ہڑتال اور خراب چیزیں مت خریدیئے۔ اپنے زیادہ بالوں کو دور کرنے کے لئے

بادشاہی سوپ اور پاؤڈر

استعمال کیجئے جس سے آپ کی جلد قدرتی حالت میں نرم، صاف اور ملائم رہے گی

کوئی محروم نہ رہے

ASSOCIATED CEMENT COMPANIES LIMITED

Twenty-two years' manufacturing experience behind the above brands of Cement

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ سنہ ۳۸ء

جلد ۱۶ — تصاویر:- ۱۔ حافظ شیراز ۲۔ حکیم عمر خیام — نمبر ۳

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

آئینۂ عالم

بحیرۂ روم کی جنگی اہمیت

ایک بار پھر وقتاً فوقتاً بحرِ اعظم جو گزشتہ زمانہ میں مختلف یورپی حکومتوں کی توجہات کا مرکز بنا رہا ہے آج یورپ کی حکمتِ عملی کے لئے اوّلین اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔

بہت سے واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ یورپی سیاسیات کے اثرات اپنی تخلیق کی سرزمین سے شروع ہو کر بہت دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ مسولینی کے دعاوی "محافظتِ اسلام" اور ریڈیو کے ذریعے سے اطالوی پروپیگنڈے سے بحیرۂ روم کے اطراف میں بہت ہل چل مچ گئی ہے۔ فلسطین میں جو بہت عرصے سے خون خرابے اور فسادات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ برطانیہ اور اہلِ یہود کے مخالف احساسات اب مائل بہ اطالیہ ہیں اور یروشلم کے مفتیٔ اعظم نے جو شام کی طرف فرار ہو جانے سے برطانوی طاقت کے چنگل سے بچ گیا تھا۔ اب اٹلی میں پناہ گزیں ہونے کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ فرانس جس کے سامنے حال کے فسادات کا منظر اور شام میں عربوں کے روبہ ترقی قومی جذبات کا تکلیف دہ مسئلہ درپیش ہے۔ نہیں چاہتا کہ یہ ناخواندہ مہمان شام یا فرانس کی کسی افریقی نوآبادی میں پہنچ سکے کیونکہ اُن تمام علاقوں میں انتشار اور بے چینی ہے اور کہیں کہیں فسادات بھی نمایاں ہیں جس کی وجہ قوم پرست عربوں اور اطالیہ کا پروپیگنڈا ہے۔

اطالیہ نے سات ہزار کا لشکر لیبیا کو روانہ کر دیا ہے اور فرانس نے بھی گزشتہ ہفتے اپنی طاقت کے اظہار کے لئے اعلان کیا ہے کہ وہ بھی بحیرۂ روم کی طرف اپنے جنگی بیڑے کی روانگی کے بعد اسی جنگی طیارے اپنی شمالی افریقہ کی نوآبادیات کو روانہ کر رہا ہے۔ مانچسٹر میں انگلستان کے وزیرِ اعظم نیول چیمبرلین نے اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم مدافعت کرنا بخوبی جانتے ہیں اور بحیرۂ روم میں منورکا کے گرد و نواح میں برطانوی اور فرانسیسی بحری افواج موجود ہیں تاکہ اُن ہسپانوی سرکش افواج سے اس جزیرے کو محفوظ رکھا جائے جن کی مدد اطالیہ کر رہا ہے اور اس بحری گشت کے جواب میں جرمن اور اطالوی طاقتوں نے سپین کے مشرقی اور جنوبی ساحل کے پاس کے جزائر میں اپنے ڈیرے جا دیئے ہیں برطانوی فوجی مشن کے افسرِ اعلیٰ نے مصری حکومت سے اس برے لمحے کے مقابلے کے لئے جس کا سب کو خدشہ ہے مدافعت کی تیاریوں کے لئے کہا ہے اور یہ بحیرۂ روم کے خلفشار کی ایک اور علامت ہے۔

لیکن بحیرۂ روم کے تمام ایسے نازک موقعوں میں ہسپانوی مراکو شاید سب سے زیادہ بے چینی کی آماجگاہ ہے۔ وہاں اطالوی، جرمن ہسپانوی، فرانسیسی اور برطانوی سبھی طاقتیں برتری کے لئے کوشاں ہیں۔ اور اس طرح ایک متواتر کشیدگی اور خونریزی وہاں پر قایم ہے ہسپانوی مراکو اگرچہ یورپ کی بیرونی چوکیوں میں سب سے چھوٹی جگہ ہے مگر اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ یہیں سے وہ فوجیں تیار کی گئی تھیں جو اس سرکش طاقت کا ایک بڑا حصہ تھیں جو جنرل فرانکو کے ماتحت ہسپانوی خانہ جنگی کے ابتدائی ایام میں میڈرڈ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ ہسپانوی مراکو میدانی اور پہاڑی علاقوں کی ایک مختصر پھانک سی ہے جس کا رقبہ اٹھارہ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ساڑھے سات لاکھ لیکن چونکہ یہ جبل الطارق کے عین مقابل واقع ہے اس لئے جنگی لحاظ سے اس کو ایک نمایاں اہمیت ہے۔ اٹلی اور جرمنی کی توجہ ہسپانوی مراکو کی طرف

اس کی معدنی پیداوار کے باعث ہے۔

فرانسیسی مراکو جس کا رقبہ دو لاکھ مربع میل اور آبادی پچاس لاکھ ہے (جن میں سے سینتالیس لاکھ مسلمان ہیں) ہسپانوی مراکو کی نسبت زیادہ مستحکم علاقہ ہے۔ لیکن یہ جنگی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

الجیریا جس کا نیا بحری مرکز مرس الکبیر ہے اور ٹیونس جس کا بحری مرکز بظرتہ ہے۔ فرانسیسی شمالی افریقہ کے ملحق علاقے ہیں اور ان کی اضافی اہمیت اس عربی ضرب المثل سے ظاہر ہے کہ "ٹیونس ایک عورت ہے الجیریا ایک مرد ہے اور مراکو ایک شیر ہے"۔ مجموعی طور پر فرانس کے ماتحت اس کی شمالی افریقہ کی نوآبادیات ہیں ایک کروڑ چالیس لاکھ آدمی گیارہ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس وسیع و دراز حکومت سے فرانس کو جنگ کی صورت میں پندرہ لاکھ فوج مہیا ہونے کی توقع ہے اور اس کی حفاظت کے لئے فرانس نے اس وقت ایک لاکھ پچاس ہزار سپاہیوں کی فوج متعین کر رکھی ہے جس میں سے ساٹھ ہزار صرف مراکو میں متعین ہیں اور باقی الجیریا اور ٹیونس میں۔ شمالی افریقہ کے ان تین بڑے صوبوں میں تقریباً دو سو طیارے ہیں۔

الجیریا اور ٹیونس اس وقت ہسپانوی مراکو اور اطالوی لبیہ کے فسطائی اثرات کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ اطالوی لبیہ کا رقبہ چار لاکھ دس ہزار مربع میل ہے اور اس میں سات لاکھ پچیس ہزار نفوس آباد ہیں۔ یہ علاقہ فرانسیسی نوآبادیات کی طرح قدرتی ذرائع کے لحاظ سے مفید نہیں ہے مگر اپنی وسعت سے برطانوی مصر اور برطانوی مصری سوڈان اور حبشہ پر چھایا ہوا ہے۔

لبیہ کی تنظیم کی طرف مارشل بالبو کے ماتحت گزشتہ چند برسوں میں بہت توجہ کی گئی ہے۔ اس کے ساحل پر ٹیونس سے مصر تک بارہ سو میل لمبی ایک سڑک ابھی ابھی تیار کی گئی ہے جس پر ہوائی بندرگاہوں اور ہوائی پل کا ایک سلسلہ قائم ہے اور بن غازی اور طبرق کے مقاموں پر اہم فوجی قیام گاہیں تیار کی جا رہی ہیں۔ مسولینی کی لبیہ میں طاقت کا حال مکمل طور پر ظاہر نہیں ہے۔ لیکن اس کی سپاہ کا اندازہ تیس ہزار تک پہنچتا ہے جس کے مقابلے پر فرانس کے سپاہی تیس ہزار ہیں جو ٹیونس کے علاقے میں متعین ہیں۔ لبیہ میں تقریباً دو سو اطالوی طیارے ہیں اور وہاں کی طاقت کو رفتہ رفتہ مضبوط سے مضبوط تر بنایا جا رہا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ لبیہ سے پانچ ہزار سالانہ کی جبری فوج تیار ہو سکتی ہے اور حبشہ سے اس سے چھ گنا زیادہ۔ شمالی افریقہ میں مصر اپنے روئی کے کھیتوں اور نیل کی زرخیز وادی کو لئے ہوئے ایک بے حد اہم علاقہ ہے جو برطانیہ کے زیر اثر ہے اور نہر سویز کا انتظام بھی اسی سے متعلق ہے۔ انگلستان اور مصر کے ۱۹۳۶ء کے معاہدے کی رو سے مصر میں دس ہزار برطانی سپاہیوں اور چار سو طیاروں کی موجودگی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس وقت نہر کی حفاظت کے لئے برطانوی افواج کی تعداد اس حد تک پہنچ چکی ہے جس کی معاہدے کی رو سے اجازت تھی۔ ان کے پاس ستر ٹینک ہیں لیکن طیاروں کی تعداد صرف چونسٹھ تک ہی پہنچی ہے۔

مصری فوج کا شمار جسے اب از سرِ نو جدید ضروریات کے لحاظ سے تنظیم دیا جا رہا ہے، صرف گیارہ ہزار تک پہنچتا ہے۔ اس کے پاس ہوائی جہازوں کی کوئی اہم طاقت نہیں ہے اور جدید ساز و سامان کی بھی بے حد کمی ہے۔ گزشتہ معاہدے کی رو سے برطانیہ کو اب بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسکندریہ اور پورٹ سعید کو جنگی محاذ کے طور پر استعمال کرے اور مصری حکومت جنگی نقطۂ نظر سے مفید سڑکوں اور دوسری فوجی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اور لبیہ کی سرحد پر بھی مختلف مقاموں پر مورچہ بندی کر رہی ہے۔

اگرچہ مصر میں برطانوی طاقت نسبتاً کم ہے مگر فلسطین کی برطانوی طاقت سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ فلسطین کی برطانوی طاقت کا مرکز حیفہ میں ہے۔ وہاں برطانوی طاقت دس ہزار باقاعدہ اور بارہ ہزار نیم فوجی سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک سو طیارے ہیں۔

شام میں فرانس کی طاقت تیرہ ہزار تک ہے۔ طرابلس اور بیروت کی بندرگاہیں ایک نمایاں اہمیت کی مالک ہیں لیکن فرانسیسیوں کو روز افزوں عربی قومیت کے احساسات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن میں اطالوی ریشہ دوانیاں کارفرما ہیں۔ حیفہ اور طرابلس اس لئے بھی بے حد اہم ہیں کہ موصل اور کرکوک کے چشموں کا تیل انہیں راستوں سے برآمد کیا جا سکتا ہے

اس طرح نوآبادیات کا یہ طویل سلسلہ جو بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے اور جو دول یورپ کی رقیبانہ استعماریت کا اکھاڑہ

ہے۔ اپنی سیاسی، فوجی اور اقتصادی صورت حالات سے یورپ کی اندرونی بے چینی اور انتشار کا آئینہ دار ہے اور یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ یورپ کی جنگی تجاویز اور سیاسی جوڑ توڑ میں اس کے افریقی مقبوضات ایک نہایت اہم حصہ رکھتے ہیں۔

آیندہ عالمگیر جنگ

کیا یورپ جنگ سے نزدیک تر ہو رہا ہے یا دور جا رہا ہے؟ اس سوال کے جواب کا روشن پہلو بھی ہے اور تاریک بھی۔ اس سلسلے میں مختلف خیالات کے حامیوں کی توضیحات اس قدر یکساں مدلل ہیں کہ ایک عام شہری کو اُن سے حیرانی اور الجھن کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کے پیرو بہت زیادہ ہیں کہ گزشتہ معاہدۂ صلح کے بعد اگر ہم کبھی نئی عالمگیر جنگ کے نزدیک تر تھے، تو وہ آج ہیں۔ ایسے لوگ صرف تاریک پہلو کو ہی مدنظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظروں میں مختلف ممالک کی اسلحہ بندیوں کا صرف ایک ہی مقصد اور نتیجہ ہے اور وہ یہ کہ ایک بار پھر تباہی بربادی اور خون آشامی کی گھٹائیں امن عالم پر چھا جائیں اور یورپ کا معاشی نظام جس کی بنیادیں آگے ہی متزلزل ہیں زمین سے آلگے اور امن کے پروپیگنڈے کی عالی شان تعمیر جس کا مرکز جینوا ہے ایک سراب ثابت ہو کر رہ جائے وہ اپنے خیالات کے جواز میں یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ آلاتِ حرب کی یہ تیاری کسی غیر معین مدت تک یوں ہی جاری نہیں رہ سکتی۔ ایک دن ایسا ضرور آکر رہے گا کہ شاعر کے لفظوں میں "تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"۔ نیز کثرت سے آلاتِ حرب کی تیاری اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی نقصان دہ ہے۔ کیونکہ وہی روپیہ کسی اور مفید طریق سے ملک و قوم کی بہتری کے لئے صرف کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگی ساز و سامان کی فیکٹریوں میں سائنسدانوں کے ذریعے سے نت نئی ایجادات و اختراعات اس تیزی اور شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہی ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب تمام موجودہ آلاتِ حرب جنگی کارروائیوں کے لئے محض ایک بیکار سی شئے ہو کر رہ جائیں گے اس لئے ان سے اس کے علاوہ اور کوئی مفید مقصد پورا نہیں ہو سکتا کہ یہ اُن اقوام سے تجارت کے سلسلے میں کام آئیں جو فوجی ساز و سامان کے لحاظ سے کم پایہ ہیں۔

جرمنی اور اٹلی میں برطانیہ کی اسلحہ بندی کی جدید تجاویز پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ ماہرینِ جنگ کا خیال ہے کہ اگر برطانیہ ۱۹۴۱ء تک اپنی تجاویز کے مطابق آلاتِ حرب کی تیاری میں مصروف رہا اور اُس نے جنگی ساز و سامان کی تیاری کے پروگرام کو پورے طور پر عمل کر لیا تو دنیا کی طاقتوں کا کوئی مجموعہ انگلستان امریکہ اور فرانس کی متحدہ طاقت کو شکست نہیں دے سکے گا۔ اس لئے اگر دنیا کی کوئی طاقت یہ سمجھتی ہے کہ اسے برطانیہ سے کسی نہ کسی دن جنگ آزمائی ضرور کرنی پڑے گی تو اس کے لئے اب موقعہ ہے کہ وہ میدانِ کارزار میں کود پڑے کیونکہ اس وقت فتح کی تھوڑی بہت توقع ضرور کی جا سکتی ہے جبکہ برطانیہ اپنے مخالفوں کی نسبت جنگ کے لئے بہت ہی کم تیار ہے۔

یہ خیالات جنگی مسئلے کو تاریک پہلو سے دیکھنے والوں کے ہیں۔ روشن پہلو کے حامی یہ کہتے ہیں کہ آلاتِ حرب کی اس شدید اور روز افزوں تیاری کے باوجود ابھی جنگ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تک کسی قوم اور ملک نے میدانِ جنگ میں محض اس لئے قدم نہیں رکھا کہ اس کے پاس آلاتِ حرب کی کثرت تھی۔ زمانہ ماضی کی تمام جنگوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی گہرا مقصد پنہاں ہوا کرتا تھا جس قدر ممالک جنگی سامان کی تیاری میں مصروف ہیں وہ اُن سب کے اندازِ نظر کا علٰحدہ علٰحدہ تجزیہ کرتے ہیں۔ اور ان تجزیوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاید جرمنی کے علاوہ یورپ میں کوئی ایسا ملک نہیں جس کو عالمگیر جنگ سے کسی منفعت کی توقع ہو۔ برطانیہ اور فرانس امن کی پالیسی کے حامی ہیں اور خواہ کچھ ہی ہو جائے وہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور جنگ سے محترز رہیں گے۔ روسی خطرہ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ مدافعت کی تیاری کے لئے محض ایک بہانے کی حیثیت رکھتا ہے: تاکہ جرمنی اور اٹلی میں اشتراکیت کی روک تھام کی جا سکے۔ روس اپنے اندرونی تنازعات اور ردوبدل کی وجہ سے ایک عرصے سے نقصان اٹھا رہا ہے اور وہ اپنی موجودہ سیاسی صورتِ حالات کے پیشِ نظر جنگ میں پیش قدمی نہیں کر سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جرمنی اپنی نو آبادیات کے لئے جنگ کرے گا۔ جرمنی کے ماہرین اقتصادیات کا ایک گروہ ایسا ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ اس وقت جرمنی ایک عالمگیر جنگ کے اخراجات برداشت

کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور چونکہ جدید جنگ میں محض فنی ساز وسامان اور فوجی برتری کی وجہ سے ہی فتح حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ بہت حد تک فتح کا انحصار اقتصادی حالت پر ہوتا ہے اس لئے اگر موجودہ صورت میں جرمنی نے میدانِ جنگ میں قدم رکھا تو اس کے لئے فتح کے بہت ہی کم امکانات ہیں۔ نازی یہ کہتے ہیں کہ یہی تو ایک وجہ ہے جو انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ جنگ کے ذریعے سے اپنی نوآبادیات کو از سرِ نو حاصل کرکے اپنی اقتصادی پستی کو دور کرلیں۔ کیونکہ اس پستی سے جرمنی اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ وہ اپنی مختلف صنعتوں کے لئے خام اشیا مہیا کرنے کا انتظام نہ کرے۔ لیکن یہ طرزِ تعلیل تو گویا ایک دائرے میں گھومنے کے مرادف ہے جس کا کوئی نتیجہ نہیں۔ جنگ سے جرمن فوج کے احتراز کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اسے اٹلی کی دوستی پر پورا اعتماد نہیں ہے بلکہ فوج کے احساسات تو یہ ہیں کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں اٹلی نے جرمنی سے غداری کی ۱۹۱۴ء میں اٹلی، آسٹریا ہنگری اور جرمنی کے سہ گونہ معاہدے کی رو سے اٹلی جرمنی کا حامی اور معاون تھا لیکن ۱۹۱۵ء میں جنگ میں شامل ہوکر اس نے انہیں ممالک کی مخالفت میں حصہ لیا۔ شاید جرمنی اور اٹلی کے موجودہ معاہدے کی نسبت جرمن افواج کا عدمِ اعتماد اسی واقعے کی بنا پر ہے۔ ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ جرمنی اور اٹلی معاہدے کی رو سے متحد ہیں مگر مشرقی یورپ میں ان کے مقاصد ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی اپنے مفاد کو خطرے میں ڈالے بغیر دوسرے کو یورپ میں برترین طاقت بننے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مثال کے طور پر آسٹریا کی خود مختاری کا مسئلہ اٹلی اور جرمنی کی دوستی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ ہٹلر نے آسٹریا کو جرمنی کا ایک صوبہ بنادیا ہے۔ لیکن اٹلی ابھی تک خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا ہے

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت یورپ کی تقدیر ہٹلر کے ہاتھوں میں ہے۔ کسی کو اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہٹلر نے جرمنی کے احیا میں ایک تاریخی اور درخشاں حصہ لیا ہے لیکن اگر اُس کی یہی قومیت پرستی انتہا کو پہنچ گئی اور اُس نے بین الاقوامی امن کے لئے نازی اعتقادات کی اشاعت اور مختلف ممالک پر جرمنی کی برتری کو ضروری خیال کیا تو پھر یقیناً تمام دنیا کے لئے نقصِ امن کا اندیشہ ہے۔ اگرچہ اس وقت تک یورپ کی دوسری قومیں اس کے اقدامات کو ایک ذلت آمیز خاموشی سے دیکھ رہی ہیں۔

بسنت سہائے

۱۹۸۸ء کی دنیا

مستقبل کے متعلق ایچ۔ جی۔ ویلز کے خیالات

دنیا کے موجودہ حالات کو دیکھ کر ہم ذرا سی سوچ بچار کے بعد یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر دنیا اسی طرح ترقی کرتی رہی تو ۱۹۸۸ء میں کیا ہوگا۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پڑ پوتوں کے پڑپوتوں کے لباس کیسے ہوں گے۔ مگر ہم اتنا معلوم کرسکتے ہیں کہ ان کے لباس اونچے ہوں گے اور آزادخیالی ان میں ہم سے زیادہ ہوگی۔ مگر ہم کتنی ہی کوشش کریں۔ مستقبل کی صحیح تصویر پیش کرنا ناممکن ہے۔ اس کے برعکس ہم ماضی کو جب چاہیں پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر فلم کے ذریعے سے مستقبل کو پیش کرنے کا خیال ہم ترک کردیں تو بھی اپنے ذہن میں یہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ مستقبل میں کیا کیا امکانات موجود ہیں۔ باوجود جنگ کے خطروں کے ہمارے پڑپوتوں کے پڑپوتے ہم سے زیادہ خوش و خرم ہوں گے اور بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف ہوں گے۔

آج کل کی دنیا کسی طرح جنگ کے خطروں سے خالی نہیں بہت سی تباہیاں آنے والی ہیں مگر اتنی نہیں جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ کثیر تعداد دیری موت مرنے والی ہے۔ بہت سے لوگ بوڑھے ہونے سے پہلے مرجائیں گے۔ مگر بہرحال انسان کو ایک دن مرنا تو ضرور ہے۔

انسانی آبادی میں بہت کچھ کانٹ چھانٹ کی جائے گی۔ نوآبادیاتی حکومتوں کو شاید توڑ پھوڑ کر برباد کردیا جائے گا۔ وارسائی کا عہدنامہ اس قدر احمقانہ تھا کہ اس دستاویز پر کسی نے غور نہیں کیا ورنہ ان حکومتوں کو اسی وقت ختم کردیا جاتا۔ ان بے پروائیوں کی سزا ہم اب بھگت رہے ہیں۔ سیاسی تاریخ بھی ابھی مدتوں تک بے ایمانی، دغابازی، بدعہدی اور بے رحمی کے ستونوں پر قایم رہے گی اور مدتوں بعد اس وقت اس میں تبدیلی پیدا ہوگی۔ جب عوام کے دماغ میں دنیا کو پھر سے سدھارنے کا خیال پیدا ہوگا۔ مگر اس سیاسی اور معاشی پاگل پن سے کشت وخون کا بازار گرم نہ ہوگا۔ جس طرح آج کل موٹروں اور ریلوں کی ٹکروں سے دنیا کی آبادی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس یہی حال آیندہ تمام شورشوں کا ہوگا۔ یہ جنگ کی تیاریاں لوگوں کی ترقی اور نئی ایجادوں میں کوئی رکاوٹ

پیدا نہیں کریں گی۔ روز مرہ کے کاموں اور انسانی ترقی پر ان کا کچھ اثر نہ ہوگا

آج کل کے عام لوگ ۱۸۸۸ء کے لوگوں سے زیادہ صحت مند ہیں۔ زیادہ عام واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کو کھانے کو بھی اچھا ملتا ہے۔ ان کے گھر اور ان کی ظاہری حالت بھی ان کے اجداد سے بہتر ہے اور نقل و حرکت کے وہ ذریعے ان کو حاصل ہیں جو اس وقت کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے اور وہ ہر روز ترقی کی طرف زیادہ راغب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۸۸ء میں دنیا کی کیا حالت ہوگی بہت سے دماغ زندگی کو زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے نئی نئی ایجادیں کرنے میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں اور یہ کوششیں کسی حال میں بھی رک نہیں سکتیں۔ ہم عہد تاریک کی تاریکیوں کی بہت سی کہانیاں سنتے ہیں۔ جب دنیا میں ہر طرف توہم پرستی جاری تھی۔ لیکن اس وقت بھی دنیا برابر ترقی کر رہی تھی۔ وقت کی تقسیم کاغذ کی صنعت، جہاز رانی کا فن اور مشینوں کی ایجادیں اسی عہد تاریک کے عملیات ہیں۔

آج کل لوگوں کے دماغ میں کام کرنے کے صحیح طریقے پر غور کرنے کا مادہ پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔ آج کل خواہ کسی ملک میں آمریت کا دور دورہ ہو یا جمہوریت کا، کام کرنے سے پہلے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب دنیا میں پہلے سی تاریکی باقی نہیں رہی پیٹر اعظم اہل روس اور ساری دنیا سے چھپا کر جو چاہتا تھا کر سکتا تھا۔ مگر اسٹیلن ایسا نہیں کر سکتا۔ عام شہری خواہ غلام ہو یا حاکم ہر حالت میں حکومت کو اس کے لئے رہنے کی جگہ بنانی پڑتی ہے۔ اس کو کام کرنے کا موقع دینا پڑتا ہے اس کی سیر و تفریح اور دوسری دلچسپیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ایک حد تک آزادی بھی دینی ضروری ہے۔

ان تبدیلیوں کا اثر انسان کی گھریلو زندگی پر بہت ہو رہا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا بالکل خاتمہ ہوتا جا رہا ہے ۱۸۸۸ء میں ہر معمولی انسان ایک گھر کا مالک ہو کرتا تھا یا وہ گھریلو زندگی شروع کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میاں بیوی مل کر ایک گھر بناتے تھے۔ ان کے تین چار یا درجن بھر بچے ہوا کرتے تھے۔ گھر کو صاف اور گرم رکھنا خود گھر والوں کا کام ہوتا تھا۔ اپنے کپڑے بھی وہ گھر ہی میں دھویا کرتے تھے۔ سب طرح کا کھانا گھر ہی میں تیار ہوتا تھا اور گھر ہی میں بیٹھ کر کھا لیا جاتا تھا۔ بازاری ڈبوں میں بند مربے اچار وغیرہ اور بازاری ڈبل روٹی سے وہ لوگ بالکل ناواقف تھے۔ چھوٹے بچوں کے کپڑے اکثر گھر میں ہی سیئے جاتے تھے۔ یہ تھی پچاس برس پہلے کی گھریلو زندگی۔

دیہات میں ترکاری کے کھیت اسی زمانے میں لگانے شروع کئے گئے تھے۔ ملوں کا رواج ابھی شروع ہی ہوا تھا لیکن اس کے باوجود گھر کا اندرونی کام کرنا گھر والی کا ہی فرض تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی گھر کے کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ ابتدائی تعلیم بارہ تیرہ برس کی عمر تک یا اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے اکثر مدارج گھر ہی مکمل ہوتے تھے۔ وہ لوگ بیرونی دنیا کے اکثر حالات سے بے خبر رہتے تھے۔ اس قسم کی گھریلو زندگی شروع کرنا اور اس کو قائم رکھنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسی غرض سے وہ کماتا تھا اور اپنی پوری زندگی اس میں صرف کر دیتا تھا۔ جب تک کہ اس کے بچے بڑے ہوں اس کی زندگی ختم ہو چکتی تھی۔ اب اس کے لئے زندگی میں کچھ لطف باقی نہیں رہتا تھا۔

۱۸۸۸ء کی معاشری زندگی بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھی۔ محلے والوں اور رشتہ داروں کے سوا وہ لوگ کسی اور سے بہت کم تعلقات بڑھاتے تھے۔ مرد میل ملاپ کے لئے اکثر شراب خانوں میں چلے جاتے تھے۔ زندگی میں کچھ تبدیلی پیدا کرنے کے نام سے وہ لوگ گھبراتے تھے۔ ہر نئی چیز کو خوف اور شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اب ایسا گھر جس کا تمام کام گھر کے مالک خود ہی کریں۔ معاشی لحاظ سے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہی یہ پرانے گھر آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہوتے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور بچوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ انہیں اب گھر کے کاموں میں بھی نہیں لگایا جاتا۔ اب گھر کے معنے صرف وہ چند کمرے ہیں جہاں ایک خاندان کھانا کھاتا ہے اور رات کو سوتا ہے۔ اسکول بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہو گیا ہے جہاں وہ لوگ اپنے بچپن کا بہت سا حصہ گزار دیتے ہیں۔ دنیا میں بہت تیزی سے گھروں کے کام کاج میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ اسکولوں کی تعداد اور رقبہ روز بروز ترقی پر ہے۔ یہ تبدیلیاں کسی طرح رک نہیں سکتیں۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی ہوتی رہے گی۔

شادی کے بعد اب بھی لوگ گھر بناتے ہیں اور دنیا سے بے تعلق

ہوکر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ تھوڑے ہی دنوں بعد ایسی زندگی سے بے زار ہوکر۔ دنیا کی عام دلچسپیوں میں حصہ لینے لگتے ہیں اور گھر سے بے پروائی برتتے ہیں۔ خود گردوپیش کے معاشری حالات بھی ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

دنیا کے دولت مند لوگ بھی اب عوام کے ساتھ مل کر رہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ بھی انہیں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہی خیالات ان کے دماغ میں سرایت کرتے ہیں۔ اس طرح اب ان کی علحدگی بالکل ناممکن ہوگئی ہے۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۱۹۸۸ء میں خانگی زندگی کا بالکل خاتمہ ہوجائے گا۔ پرانے زمانے کی طرح کوٹھری میں بند رہنا ضروری نہ ہوگا۔ انسانوں میں جو اجنبیت اس وقت پائی جاتی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے کام کو دلچسپی کی نظر سے دیکھیں گے۔ مگر حسد کا مادہ نہ رہے گا۔ بجائے اس کے کہ وہ صرف رشتہ داروں اور چند دوستوں سے محبت کریں۔ ان کو عام لوگوں سے بھی انس ہوگا۔ کیونکہ ان کی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ عوام کے ساتھ گزرے گا۔ وہ ہم لوگوں سے زیادہ صاف گو اور ملنسار ہوں گے۔ زیادہ تندرست اور چست و چالاک ہوں گے اور قد میں ہم سے کم از کم ایک انچ زیادہ لمبے ہوں گے اور طبیعت سست ہونے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔

اسی قسم کی بے تکلفی اور خوش حالی ان کے لباس اور گھروں کے سامان اور عمارتوں بلکہ شہر کے نقشوں میں بھی ظاہر ہوگی۔ آج کل کی عمارتیں اکثر ایسی بنائی جاتی ہیں کہ عمارت کی اندر کی چیزوں کو عوام کی نظروں سے بالکل پوشیدہ رکھا جائے۔ اصل پوچھو تو گھر اسی کو کہتے ہیں جہاں ہم عام لوگوں سے چھپ کر زندگی بسر کریں۔ اب تک ہم دروازوں۔ قفلوں اور چار دیواریوں کے اندر مقید زندگی بسر کرتے ہیں۔

ابھی سے یہ کہنا کہ گھر کے نقشے اور نمونے کیا ہوں گے۔ ناممکن ہے مگر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کوئی چیز ذاتی اور خاص باقی نہ رہے گی۔ راستوں سڑکوں اور کھیتوں پر یہ نوٹس لگانے کی ضرورت نہ ہوگی کہ "اندر آنا منع ہے" بلکہ ہر جگہ ہر شخص بلا تکلف جا سکے گا۔

کاریگر کو چھپ کر کام کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہر ایک کاریگر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی مشین سے طرح طرح کے معجزے دکھلائے تو لوگ اس کے آس پاس کھڑے ہوکر اس کی تعریف کریں۔ اس زمانے میں لوگ بلا اجازت ہر جگہہ جا سکیں گے۔ ان کے گھر اور کپڑے ایسے نہ ہوں گے جن سے یہ ظاہر ہو کہ وہ کسی چیز کو چھپانے یا محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آج کل عمارتیں بنانے میں صرف لکڑی پتھر اور اینٹ کام آتی ہے۔ صرف چند سال سے ہم لوہا اور شیشہ بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ کپڑے بھی صرف چند چیزوں کے بنتے ہیں۔ ریشم۔ اون۔ روئی اور چمڑے کے سوا انسان کسی اور چیز کا استعمال جانتا ہی نہیں۔

مگر اب یہ سب چیزیں ختم ہو جانے والی ہیں۔ کاریگروں کے سامنے بہت سی دوسری چیزیں زیادہ کار آمد مضبوط اور خوب صورت موجود ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان چیزوں کو کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ہنری فورڈ تھوڑے دن ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اب میری موٹریں لوہے کے بجائے سویابین کے بیجوں سے بنا کریں گی"۔ کپڑوں کا بھی یہ ہی حال ہے کہ کاریگر اپنے نئے تجربوں کو کام میں لانے کے لئے زور و شور سے تیاری کر رہے ہیں۔ اور اب تک ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ان موقعوں کو کس طرح کام میں لائیں۔ مگر ان کے باپ دادا ان سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بھی ان کی طرح کھوکھلے دماغ والے سست اور ظاہر پرست ہوں۔

آنے والی نسل سے ہم کو بہت سی امیدیں ہیں۔ وہ لوگ اپنی نئی ایجادوں سے ہر طرح کے کام لیں گے۔ حالانکہ ان کو بعض جگہہ ناکامی بھی ہوگی۔ مگر وہ ہم سے زیادہ کشادہ دماغ اور صحت مند اور ہر چیز میں دلچسپی لینے والے ہوں گے۔

مشینوں کی زیادتی کی وجہ سے ہمیں فرصت کے اوقات پہلے سے زیادہ ملتے ہیں اس لئے ہم اپنا وقت کھیل کود میں صرف کرتے ہیں۔ آئندہ جب زیادہ فرصت ہوگی (کیونکہ مشینوں کا دور دورہ ہوگا) تو لوگ کھیل کی طرف زیادہ مائل ہو جائیں گے۔ شہری کام کرنے والے ہوا کریں گے۔ کہ محنتی غلام۔ زیادہ محنتی اور گندہ کام مشینوں سے ہو جایا کرے گا۔ اس زمانے کا معمولی کاریگر بھی آج کل کے بہترین کاریگر سے بہتر ہوگا۔

بعض لوگ سوال کریں گے "کیا وہ لوگ ہم سے زیادہ خوشی اور قناعت کی زندگی بسر کریں گے"؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ لوگ ہماری ہی طرح نئی روشنی کو اور مشینوں کو برا بھلا کہتے پھریں گے اور وہ یہ سوچ کر خوش ہوں گے کہ وہ اور زیادہ تبدیلیوں کے زمانے تک زندہ نہیں رہیں گے۔ وہ ڈکنس کے OLIVER TWIST اور LITTLE NELL پڑھ پڑھ کر سوچیں گے کہ کاش ہم بھی اس زمانے میں پیدا ہوتے اور دنیا سے الگ اندھیری کوٹھڑیوں میں زندگی بسر کرتے۔

(س) معتصمۃ الرحمٰن

مجبوریاں

کی ہم نے بے وفا سے وفا اور رو لئے — جب اس طرح بھی کچھ نہ ہوا اور رو لئے

مجبوریاں بھی رات کی تنہائیاں بھی تھیں — تاروں سے دل کا حال کہا اور رو لئے

نکلا نقابِ ابر اُٹھا کر جو ماہتاب — اُن کا خیال آ ہی گیا اور رو لئے

جس مستِ ناز نے ہمیں بالکل بھلا دیا — ہم نے اُسی کو یاد کیا اور رو لئے

آئے تو لب پر آنہ سکا حرفِ آرزو — چُپ چاپ اُن کو دیکھ لیا اور رو لئے

کچھ اختیار ہی میں نہ تھا اپنے غیر ازیں — دل بے وفا کی نذر کیا اور رو لئے

تارے بھی اور پھول بھی اپنے گواہ ہیں — رونے پہ جب نہ ضبط ہوا اور رو لئے

کہتے رہے فسانۂ گل، قصۂ بہار — کہنا جو تھا مگر نہ کہا اور رو لئے

اک نامرادِ شوق سے ہم نے کہا ضیاؔ
رونا نہیں جنوں میں روا۔ اور رو لئے

ضیاؔ ایم اے

حافظ غیرار

گارڈنر خاندان کے اردو شعرا

(۲)

ہم بتا چکے ہیں کہ کرنل ولیم لینیوس گارڈنر کے ساتھ ان کے برادر اصغر ولینٹائن گارڈنر بھی ہندوستان آئے تھے ان کا تعلق بحری فوج سے تھا۔ انہوں نے اپنی ہی قوم میں شادی کی تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے ہیری فیرنگٹن گارڈنر تھے۔ ان کی زمینداری قصبہ مرہچی (ضلع ایٹہ) میں تھی، بلکہ کہنا چاہئے کہ قصبہ مرہچی انہیں کی زمینداری میں واقع تھا۔ اس قصبہ میں ان کی ایک نہایت وسیع کوٹھی تھی جس میں خود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑی عمارت بھی تھی جو قلعہ کے نام سے مشہور تھی۔ قلعہ میں خاندان کے دیگر افراد کی رہائش تھی۔

جب ہیری فیرنگٹن گارڈنر کا انتقال ہوا ہے، اس وقت ان کے دونوں بیٹے نابالغ تھے۔ چھوٹے صاحبزادے کی عمر دس سال تھی۔ دونوں کو سب کچھ چھوڑ کر اپنے رشتہ کے بھائی مرزا دانیال شکوہ گارڈنر المتخلص بہ شکر کے پاس موضع چھاونی کو جانا پڑا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جائیداد کچھ تو باپ کے قرضہ میں گئی اور جو بچ رہی تھی وہ رشتہ داروں کی رستہ کشی کی نذر ہو گئی۔ دونوں صاحبزادوں کے سن بلوغ کو پہنچنے تک بالکل صفایا ہو گیا۔ اب صرف کاسگنج میں ایک کوٹھی باقی ہے جس کو مرحوم کی اولاد اپنا کہہ سکتی ہے۔ البتہ مرہچی کے قلعہ اور کوٹھی کے کھنڈر آنے جانے والوں کو سڑک پر سے اب بھی نظر آ جاتے ہیں۔

ہیری فیرنگٹن گارڈنر کے صاحبزادوں کا نام برتھالمیو گارڈنر اور رابرٹ گارڈنر تھا۔ دونوں بھائیوں میں ڈھائی تین برس کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ ان کی نوعمری کا زمانہ چونکہ شکر کی صحبت میں گزرا ہے اس لئے ناممکن تھا کہ ان میں شاعری کا مذاق پیدا نہ ہو جاتا۔ شکر کی زندگی کا حاصل شعر تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ تین گاؤں کی ساری آمدنی صرف دو باتوں میں صرف ہوتی تھی۔ اول کبوتر بازی اور دوسرے شاعری۔ اس زمانے میں گلدستوں کی کثرت تھی۔ کوئی ایسا گلدستہ نہ تھا جو شکر کے نام نہ آتا ہو۔ خاندان مغلیہ کے ایک شہزادے، مرزا وحید الدین حیدر المتخلص بہ فلک رشتہ میں شکر کے ماموں تھے، اور مصاحب بھی تھے۔ وہ بھی فدائے شعر تھے اور اچھا کہتے تھے۔ یہ صحبت ہیری فیرنگٹن گارڈنر کے دونوں صاحبزادوں کو لے اڑی۔ اور کیوں نہ لے اڑتی، وہاں دن رات یہی مشغلہ تھا۔

برتھالمیو گارڈنر صبر تخلص کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ رابرٹ گارڈنر بفضلہ حیات ہیں اور آسین تخلص کرتے ہیں۔ برتھالمیو گارڈنر کے فرزند ارجمند کا نام پیرک گارڈنر ہے یہ بھی شاعر ہیں، اور شوق تخلص کرتے ہیں۔ گارڈنر خاندان کی اس شاخ میں یہی تین اردو شاعر ہیں۔

برتھالمیو گارڈنر المتخلص بہ صبر

پادری برتھالمیو گارڈنر صاحب صبر بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ مسیحی شعرا میں ممتاز اور پرگوئی کے لئے مشہور تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہوئے تھے۔ لیکن دو ہی چار غزلوں پر اصلاح لی تھی کہ انہیں سفر آخرت پیش آ گیا۔ پھر کسی اور کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ مرحوم کے کلام سے استفادہ کرتے رہے۔

صبر نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا ہے۔ مسیحیوں میں جب کبھی کوئی تقریب ہوتی تھی تو آپ نظم ضرور کہتے تھے۔ آپ کے ذخیرۂ کلام میں اس قسم کی بہت سی نظمیں ہیں۔ کسی کو سالگرہ کی مبارک باد دی ہے تو کسی کی شادی پر اظہار مسرت کیا ہے۔ کسی کی آمد پر خوشی منائی ہے تو کسی کے رخصت ہونے پر آنسو بہائے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ پرگو تھے اور آپ کی طبیعت ہر وقت حاضر رہتی تھی۔

بارہ تیرہ برس کی عمر تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد چند سال جناب شکر کے پاس رہے، اور جوانی میں قدم رکھا ہی تھا کہ مشن کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے ایک سال بعد، ۱۸ سال کی عمر میں پادری محبوب خاں (کاسگنج) کی بڑی بیٹی سے شادی ہوئی۔ دوران

ملازمت میں آپ کا قیام کاس گنج، ایٹہ، متھرا، فتح پور، فرخ آباد، فتح گڑھ، بلہور، اور الٰہ آباد میں رہا۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں پنشن لے کر اپنے ذاتی مسکن واقع کاس گنج میں جا رہے۔

راقم الحروف سے اول مرتبہ ۱۹۲۸ء میں کان پور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میرے قیام لکھنؤ کے زمانے میں بار بار ملاقات ہوئی۔ آپ کے بیٹے لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے، اس لئے آتے جاتے رہتے تھے اور جب کبھی لکھنؤ آتے تھے مجھ سے ضرور ملتے تھے۔

صبر صاحب بڑے خلیق اور خوش مزاج تھے۔ کوٹ کوٹ کر فروتنی بھری تھی۔ انکساری کا یہ حال تھا کہ حتی الامکان اعتراض نہ کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۰-۳۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے، لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں دوسری بیوی بچوں سے بدسلوکی سے پیش نہ آئے، تنہا رہنا گوارا کیا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۳۳ء کو بعمر ۵۹ سال آپ نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ آپ کے برادرِ اصغر پادری رابرٹ گارنر صاحب اسبق زمانہ علالت میں آپ کو اپنے ساتھ بلند شہر لے گئے تھے۔ اپنی موت سے دو تین روز قبل آپ نے فرمایا:-

میں جانتا ہوں کہ میرا وقت آگیا ہے لیکن موت کا مجھے مطلق خوف نہیں۔ اگر خدا مجھے بلانا چاہتا ہے تو میں تیار ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی تمام زندگی اسی کی خدمت میں صرف کی ہے!

صبر صاحب نے اپنی مذہبی خدمت کو ہمیشہ قابلِ فخر تصور کیا اور مختلف پیرایوں میں اس کو افضل و اعلیٰ ظاہر کیا ہے۔ مثلاً

زہے قسمت کلامِ پاک کا میں بھی مبشر ہوں
سلاطینِ جہاں سے کچھ نہیں رتبہ ہے کم میرا

زبانِ حق کا کرتے ہیں اظہار کوبکو، شرمندہ روزِ حشر نہ ہوں گے خدا قسم

کلامِ پاک پڑھتے ہیں، یہی سنتے سناتے ہیں
ہمارا نام پھر کیوں ہو گنہگاروں کے دفتر میں
غلامانِ مسیحا ہیں، ہمیں دنیا سے کیا مطلب
ہماری شان و رتبہ دیکھنا دربارِ محشر میں

کیا کہوں میں کون ہوں، کس کے طلبگاروں میں ہوں
میں مسیحِ ناصری کے کفش برداروں میں ہوں

جب سے اے صبر خداوند کی خدمت کی ہے، اک عجب طرح کی دولت مرے ہاتھ آئی ہے

ہم اور کلامِ پاک کی خدمت، زہے نصیب
اے صبر دل ہی دل میں ہم اترائے جاتے ہیں

آپ کی وفات پر آپ کے برادرِ اصغر جناب اسبق نے تاریخ کہی تھی

بھائی میرا اے خدا شاہد بہت خوش حال تھا — بامروت تھا، سخی تھا، اور نیک اعمال تھا
نام تھا ہنری تھامس پی گارنر اس دہر میں — عمر کا اندازہ گر پوچھو تو انسٹھ سال تھا
تھا بلاشک وہ حقیقی ہادیِ دینِ مسیح — دولتِ روحانیت سے بھی وہ مالامال تھا
راہیِ ملکِ بقا ہونے کی یہ تاریخ ہے
نیک عادت، نکتہ داں، اور صاحبِ اقبال تھا (۱۹۳۳ء)

جو لوگ صبر سے واقف ہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں فی الحقیقت یہ خوبیاں پائی جاتی تھیں۔

آپ ایک غیرت مند مسیحی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کے دنوں میں شاید آپ کو کوئی دنیوی خدمت پیش کی گئی تھی جس میں زیادہ آمدنی کا امکان تھا لیکن آپ نے انجیل کی خدمت نہیں ترک کی۔ تعجب نہیں کہ آپ کے بعض احباب نے آپ کے اس رویے کو نافہمی پر محمول کر کے پھبتیاں کہی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں ؎

خدمتِ انجیل چن لی، زر کی کچھ پروا نہ کی
صبر دیوانہ نہیں، ناداں نہیں، ہشیار ہے

صبر کے کلام میں مسیحی تلمیحات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ مثلاً توراۃ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی "صورت" پر خلق کیا۔ آپ نے اس صورت کے بگڑ جانے کی وجہ بتائی ہے ؎

وہ خوشی، وہ نیک بختی، اور خالق کی شبیہ
چھن گئیں سب خوبیاں حوا کے پھل کھانے کے بعد

آدم کی نافرمانی کا نتیجہ ؎

ایک آدم کے بگڑتے ہی قیامت آگئی، پاپ کی سارے جگت میں حکمرانی ہو گئی

خطا کرتے ہی آدم کے جہاں کا رنگ یوں بدلا
زمانے بھر میں دورہ ہوگیا شیطان مرتد کا

مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں۔ ہر شعر میں کلام مقدس کی کسی نہ کسی آیت کی طرف اشارہ ہے ؎

جب کچھ نہ تھا تو قدرت حق کا ظہور تھا قندیل عرش میں یدِ قدرت کا نور تھا

ہمیں تو بحرِ دنیا میں بجز خلاقِ عالم کے
سہارا ناخدا کا ہے نہ کشتی کا نہ ساحل کا

خلوت میں مزا ملتا ہے اے صبر نرالا آتا ہے عجب لطف مجھے یاد خدا میں

مثال موج جہاں میں ہے زندگی اپنی ہماری عمر کی تشبیہ ہے حباب کے ساتھ

صبر میں تو کچھ نہیں یہ سب اسی کا فضل ہے مجھ کو ساری برکتیں دی ہیں خدا کی یاد نے

بنا کر اشرف المخلوق اپنا دوست ٹھہرایا
عنایت پر عنایت یہ تری ناچیز انساں پر

پہنو ایماں کی عبا صبر یہ وہ جامہ ہے نہ پھٹے تن پہ نہ اترے کبھی میلا ہو کر

صبر مرحوم کے ذخیرۂ کلام میں ہر رنگ موجود ہے۔ آپ نے ہر قسم کے مضامین نظم کئے ہیں، لیکن متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جوانی کے کلام میں شوخی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

ولولے تھے وہ سب جوانی کے اب وہ سودا ہمارے سر میں نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ پادری ہو جانے کے بعد آپ نے وہ رنگ ترک کر دیا اور مجاز سے حقیقت کی طرف جھک گئے۔ آخری زمانے کا کلام مذہبی جذبات سے مملو ہے۔ بسا اوقات آپ نے بعض دقیق فلسفی مسائل کو بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے ؎

آپ ہی آپ تو پیدا نہیں ہوتا کچھ بھی غور کر اپنی ہی ہستی پہ تو کہتا کیا ہے
عقل و ادراک کے بھی ہم نے نتیجے دیکھے کوئی بھی خالق مطلق کو نہ سمجھا کیا ہے
عقل سے غور کیا غور سے حاصل یہ ہوا آج تک یہ بھی نہ سمجھے کہ یہ دنیا کیا ہے

ساری مخلوق میں ہے صبر خدا کا جلوہ ذرہ ذرہ سے یہاں اور ہویدا کیا ہے

صنعت بغیر صانع مطلق کہیں نہ ہو ممکن نہیں جہاں ہو جہاں آفریں نہ ہو
ممکن نہیں کہ لطف حقیقت کے اٹھ سکیں جب تک کہ دور ہیں دل خلوت نشیں نہ ہو

اس دہر بے ثبات کو اے صبر دیکھ کر
ہر سانس پر گماں ہے دم واپسیں نہ ہو

قدیم ذات خدا ہے جہان حادث ہے بوقت مرگ سمجھ میں یہ لے جناب آیا

وہم میں کیوں پھنسا ہوا ہے اجب قدرت حق سے آشنا ہے دل
جزو میں لطف کل اٹھاتا ہے الفت حق سے بھر گیا ہے دل

موت کو زیست سے ہر آئینہ اچھا جانا خوب ہی ہم نے حقیقت کا نتیجہ جانا

امریکہ کا تمول مشہور ہے۔ اس کے ساتھ "بے دینی" کا بھی وہاں آئے دن مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ترقی دین کی دولت سے ہونا غیر ممکن ہے
تم امریکہ کی ان خبروں کو سن کر کیوں پریشاں ہو

اپنی اہلیہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد آپ نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان تھا "وفادار بیوی" خوب نظم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سب کو ہے تیری حاجت محتاج سب ہیں تیرے بچہ ہے یا کہ لڑکا، بڈھا ہے یا جواں ہے
آرام سب جہاں کے بس تیرے دم تلک ہیں جب تو نہیں ہے گھر میں آرام پھر کہاں ہے
غم تجھ سے بھاگتا ہے ڈرتا ہے رنج تجھ سے تو راحت مجسم آرام بے بیاں ہے
ہمراز اور ہمدم ہر درد اور دکھ میں ایسا جہاں میں کوئی نایاب ہے نہاں ہے
تیمار دار دکھ میں سکھ میں انیس خلوت تجھ سا رفیق و ہمدم سنسار میں کہاں ہے

بیوی کی تاریخ وفات بھی کہی تھی ؎

ضبط ہوتا نہیں کیسا غم جانکاہ ہے ہائے کس مصیبت میں غم جانکاہ ہے ہائے
اک قیامت کا نمونہ ہے ڈیر کا مرنا اشک تھمتے نہیں ایسا غم جانکاہ ہے ہائے
سال تاریخ کی تھی فکر کہ ہاتف نے کہا
صبر کو صبر نہیں کیا غم جانکاہ ہے ہائے (۱۹۰۷ء)

کبھی کبھی صبر صاحب مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ آپ کے قیامِ قنوج کے زمانہ میں جناب محبوب خاں صاحب رئیس قنوج نے اپنے ہاں مشاعرہ کیا تھا۔ آپ نے طرح پر غزل کہی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

نہ پرسش تھی عدم میں کچھ نہ گنتی ہے یہاں میری
ضرورت ہے یہاں میری نہ حاجت تھی وہاں میری

جوانی میں مئے وحدت بھری تھی شیشۂ دل میں
اسی مے کی یہ موجیں ہیں نہیں ہیں جھرّیاں میری

یہی گر سوزِ فرقت ہے کسی گل کا تو گلشن میں
بنیں گی پھول جل کر ایک دن یہ ہڈیاں میری

دعا کرتا ہوں رو رو کر یہی ہر دم کہ محشر میں
الٰہی آبرو رہ جائے وقتِ امتحاں میری

مسافر تھا عدم میں بھی یہاں پر بھی مسافر ہوں
سفر ہی میں کٹی ہے آج تک عمرِ رواں میری

کسی آئینہ رو کے ہجر میں حیرت کا پتلا ہوں
عجب حیرت سے تکتی ہیں مجھے حیرانیاں میری

قیامت کے مضامیں خونِ دل پی پی کے لکھے ہیں
غزل یہ غور سے سنئے ذرا محبوب خاں میری

پھنسا ہے مرغِ جاں اس میں رہائی صبر مشکل ہے
اجل نے جال ڈالا ہے نہیں یہ جھرّیاں میری

ایک اور مشاعرہ کی طرح پر یہ غزلہ کہا ہے ؎

نہ دعا آتی ہے ہم کو نہ دوا آتی ہے — بندۂ حق ہمیں تسلیم و رضا آتی ہے
بس یہی فرق ہے مخلوق میں اور خالق میں — عفو کرنا اُسے اور اس کو خطا آتی ہے
تخلیہ کر جو کہا اُن سے تو ہنس کر بولے — تخلیہ ہو نہیں سکتا ہے حیا آتی ہے

اس زمانے میں کسی مسیحی شاعر کا صاحبِ دیوان ہونا تھوڑی بات نہیں ہے چنانچہ آپ نے اس کے لئے بھی خدا کا شکریہ ادا کیا ہے ؎

شکر کس منہ سے بجا لاؤں ترا اے خالق
کہ ترے فضل سے اب صاحبِ دیوان ہیں

اپنے فرزندِ ارجمند پیٹرک گارڈنر کی شادی کی تقریب پر ذیل کی دعوت نظم کیا تھا۔ چند شعر دیکھئے۔ فرماتے ہیں ؎

عقدِ فرزند جگر بند کی از حد ہے خوشی — دم بدم فرض ہے کرنا مجھے شکرِ غفار
شکر صد شکر ہے لختِ جگر کی شادی — شبھ گھڑی آئی سی تاریخ کو پائی ہے قرار
ہے نویں جنوری انیس سو بائیس ہے سن — پیر کے روز منتوبہ میں ہے ان کا انہار
اس لئے عرض ہے سب خویش و طلاں آئیں ضرور — آئیے شوق سے کچھ ہو نہ تکلف زنہار

بھتیجے (ہربرٹ گارڈنر) کی شادی پر سہرا کہا تھا ؎

رخِ روشن کی تجلی نے غضب ڈھایا ہے — عکسِ رُخ سے ہے چراغِ تہِ دامن سہرا
اس محبت کا خوشی کا بھی ٹھکانہ ہے کہیں — شیخ جی لکھتے ہیں پڑھتا ہے برہمن سہرا

ہے یہ برسوں کی دعاؤں کا نتیجہ اے صبر
سارے کنبے کی دعاؤں کا ہے خرمن سہرا

آپ کے ذخیرۂ کلام میں اور بھی متعدد سہرے ہیں۔ ایک کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بندھا ہے سر پہ مگر عاجزی کو دیکھ تو — لٹک کے لیتا ہے نوشاہ کے قدم سہرا
قبول اس کو کرو شوق سے کہ لائے ہیں — وفورِ جوشِ محبت سے کہہ کے ہم سہرا

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں میرٹھ میں اردو لٹریری ایسوسی ایشن کا جلسہ منعقد ہوا۔ یہ ایک ادبی اجتماع تھا۔ اس جلسہ میں آپ نے بھی ایک طویل نظم پڑھی تھی، جس میں پہلے تو اردو کی خوبیاں بیان کی ہیں بعد ازاں جوانوں کو ترغیب دی ہے کہ اپنی مادری زبان سے غفلت نہ برتیں۔ فرماتے ہیں ؎

. . . .

اے مری قوم کے ممتاز جوانو سن لو — منحصر قوم کی آگے ہے ترقی تم پر
اور کیا ہوگا زمانے میں بھلا پھر تم سے — جب کہ قابو ہی نہیں اپنی زباں کے اوپر
اپنی بولی نہ بگڑ جائے غرض ہے اپنی — مدعا یہ نہیں سیکھو نہ زبانِ دیگر
شوق سے انگلش و جاپانی و جرمن سیکھو — بھول جاؤ نہ مگر اپنی زبانِ مادر

اس کے بعد اردو کی کہانی بیان فرمائی ہے۔ پھر کہا ہے۔

ریختہ غالبِ مرحوم نے لکھا ہے اسے — ہے سب الفاظ کے لینے کا اس میں جوہر
کسی بولی سے تعصب و تکلف ہی نہیں — ہر گھڑی سب کے لئے اس کا کشادہ ہے گھر
عربی۔ فارسی۔ بھاشا پہ نہیں ہے موقوف — ہے کرم ملکۂ اردو کا برابر سب پر
ایسی دلچسپ وسیع اور زباں ہی ہی نہیں — شوق سے سب کو بٹھا لیتی ہے گھر کے اندر
اب تو انصاف کرو، سچ کہو سچ ہے کہ نہیں — یہ زباں اور زبانوں کی حقیقی دلبر
پھر بھی افسوس ہے، اس کی نہیں پروا ہوتی — کونسا ظلم ہے پھر سوچئے اس سے بڑھ کر

بہرحال سیکھوں میں صبر صاحب کا دم غنیمت تھا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے بعض متروکات کو استعمال کیا ہے اور کلام میں کہیں کہیں بندش بھی سست نظر آتی ہے، اور شاید بعض خیالات جنہیں انہوں نے نظم کیا ہے زیادہ بہتر صورت میں ادا کئے جا سکتے تھے۔ لیکن، اس بات کو نظرانداز نہ کرنا چاہئے کہ صبر صاحب کی تمام زندگی اس ماحول میں بسر ہوئی ہے۔ جہاں ہر طرف شاجیت کی قومیت شکن گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں جس طبقہ میں صحیح لفظ کو جان بوجھ کر غلط بولنے کا مرض عام ہو اور جس میں اردو سے بیگانگی کو معیارِ قابلیت یا بڑائی تصور کیا جاتا ہو اُسی میں گھل مل کر رہنا اور اتنا کچھ کر دکھانا تھوڑی بات نہیں ہے۔ اس نظر سے دیکھئے گا تو صبر کے کلام کو قابلِ قدر پائیے گا۔ مجموعی حیثیت میں ان کا کلام بہت صاف اور حشو و زوائد سے بالعموم پاک ہے۔

صبر کے کلام کا جو انتخاب ذیل میں پیش کیا جاتا ہے وہ ہر رنگ کے کلام پر مشتمل ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ بعض اشعار ایسے لاجواب ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی ؎

ستائش گر ہوں اے زاہد میں اس خورشیدِ خوباں کا
گلِ خورشید بھی اک پھول ہے جس کے گلستاں کا
رہا اندازِ گریہ ہی جنونِ فتنہ ساماں کا
تو صورت دل کی وہ ہوگی جو نقشہ ہے گریباں کا
رہی جب تک دل ہی دل میں محبت ہم سے اور اُن سے
مزا آتا رہا کیا کیا شکایت ہائے پنہاں کا
ہجومِ جوشِ وحشت نے نہ چھوڑا تار تک باقی
وگرنہ قافیہ مشکل نہ تھا کچھ بھی گریباں کا

حیرت میں کیوں حضور ہیں آئینہ دیکھ کر سچ سچ بتایئے کہ نمودار کیا ہوا

کبھی شباب، کبھی بچپنا، کبھی پیری مسافرت ہی میں اپنا بسر زمانہ ہوا
مزا ہے سوئیں گے آرام سے قیامت تک نہ ہے نصیب پسِ مرگ تو ٹھکانہ ہوا
نہ جانے کون ازل سے ہے منتظر کس کا قضا کے آتے ہی جو شوق سے روانہ ہوا

رہ شوق سے جہاں میں گر یہ خیال رکھ اس گھر میں کوئی تجھ سے بھی پہلے ضرور تھا

تصور میں مرے ہر وقت وہ اے صبر رہتے ہیں
کریں گر لاکھ پردہ، مجھ سے پردا ہو نہیں سکتا

نہ آنکھ کھول کے اے صبر اس نے کچھ دیکھا مثالِ بحر جہاں میں عبث حباب آیا

فلک پہ رحمتِ حق بن کے وہ سحاب آیا دعا قبول ہوئی وقتِ مستجاب آیا
وہ رند ہوں کہ مجھے دیکھ کر پئے تعظیم اُتر کے طاق سے خود شیشۂ شراب آیا

اللہ رے شوقِ دید کہ اُس بیوفا سے ہم ملنے کو پہنچے خواب میں، تدبیر دیکھنا
آئے تو دولتے صبر مرے گل کے ہاتھ میں بن جائے گا خود آئینہ تصویر دیکھنا

عدم سے ملکِ ہستی تک فقط ہے راہ اک دم کی
نشاں اس میں بھلا پھر کیا بنے فرسنگ و منزل کا
بگولے گردِ محمل کے نہیں ہیں نجد میں ہرگز
غبارِ قیس نے پردا کیا ہے آ کے محمل کا

خوشامد صبر ہم سے ہو کسی کی، غیر ممکن ہے زمانہ ہو خوشامد کا کہ دورہ ہو خوشامد کا

شب بھر شبِ وصال رہا چاندنی کا لطف سو یا لپٹ کے وہ مہِ تاباں تمام رات
میں اُن کے انتظار میں تارے گنا کیا چُنتے رہے وہ ماتھے پہ افشاں تمام رات
کرتا ہے بتکدہ میں برہمن بھی رام رام کرتا ہے ذکرِ حق جو مسلماں تمام رات
میں وہ الم رسیدہ و فرقت نصیب ہوں غم بھی رہا نہ سینے میں مہماں تمام رات

زباں ہے لکھنوی، اسلوب دلکش، طرز رنگیں ہے
مگر موقوف ہے دادِ سخن طبعِ سخنداں پر

سخت حیران ہوں سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی لوگ کیوں دل میں حسد رکھتے ہیں انساں ہو کر
خیر سے کیا نظر آیا ہے، کچھ ہم بھی تو سنیں آئینہ رکھ دیا کیوں آپ نے حیراں ہو کر

چشم نرگس ہے دہن غنچہ ہی قد ہے بوٹا   وہ مرے سامنے پھرتے ہیں گلستاں ہوکر
ایک یہ اور قیامت ہے قیامت دیکھو   وہ چھپے ہیں مرے دامن میں پشیماں ہوکر
صبر اس جوشش وحشت نے دکھائے ہیں دن   چاک ہو جامۂ ہستی نہ گریباں ہوکر

خیال کا کل جاناں میں تھی بلا سر پر   وہ درد تھا کہ پٹکتا تھا سر کو بستر پر
قصور میں نے کیا خط لکھا میں نے   خدا کی شان بلا آ گئی کبوتر پر
بتوں کے عشق میں گھر کھو کے خوب پھل پایا   حصول خاک ہوئی سر گھسا جو پتھر پر
تماشا دیکھ رہی ہے قضا نزاکت کا   وفور ناز سے ہیں دونوں ہاتھ خنجر پر
ہلال عید مجھے ابر میں نظر آیا   پڑا جو ابروے جاناں کا عکس خنجر پر
یہ شوق قتل ہے اے صبر ہجر بردیں   کہ رکھ دیا ہے گلا آج خود ہی خنجر پر

حیف جو دل میں تھا اس کو نہ دیکھا ہم نے   دور دریا سے رہے ساحل دریا ہوکر
بچپنا کھو کے جوانی کو لٹا کر مرکر   دیکھا اس عالم ایجاد کو کیا کیا ہوکر
رات دن ہے یہ لب گور غریباں کی صدا   سب کو آنا ہے یہاں یکہ و تنہا ہوکر

منظور وہ کریں نہ کریں اختیار ہے   ہم تو کریں گے حشر میں بھی ندیا ئل

کچھ اس میں شک نہیں ہے کہ مرنا ضرور ہے   پھر کیوں جہاں میں جان چرائیں قضا سے ہم
بحر فنا میں کشتیٔ عمر رواں ہے غرق   فریاد نا خدا سے کریں یا خدا سے ہم
ہیں شرمسار اپنے گناہوں سے حشر میں   کس طرح عذر جرم کریں کبریا سے ہم

پہر سے بڑھ کے ہوش ہ ذرہ صحرا میں ہوں   زور دریا کا جو گھٹتا ہے وہ قطرہ میں ہوں
بیخودی نے مجھے گم ایسا کیا فرقت میں   کہ نہیں جانتا یہ کون ہوں اور کیا میں ہوں
اس طرف ناز و ادا غمزہ و کرشمہ قاتل   سخت حیرت ہے ادھر یکہ و تنہا میں ہوں
کل میں ہیں جزو ہوں اور جزو میں ہوں کل دیکھو   خرمن دہر میں اس طرح کا دانہ میں ہوں
آپ معلوم نہیں مجھ کو سمجھتے کیا ہیں   آپ کے سر کی قسم آپ کا شیدا میں ہوں
شکل انساں میں ابھی ہوں ابھی مٹ جاؤں گا   قدرت حق کا زمانے میں تماشا میں ہوں

اپنے کو پوچھتا پھرتا ہوں ہر اک سے اے صبر
ایسا غافل ہوں نہیں جانتا اتنا میں ہوں

چل رہی ہے کیا بہار افزا ہوا برسات میں   کیوں نہ ہو داغ جگر اپنا ہرا برسات میں

باغ کی کلیاں جو اس گلشن کی گردن میں پڑیں
رونق گلشن یہ بولی میں نہیں ہاروں میں ہوں

پھر رہا ہے اثر دعا کے لئے   کیوں دعا قبضہ اثر میں نہیں
آج مہمان ہے غم جاناں   اور لہو بوند بھر جگر میں نہیں
میری صحت ہے میرے مرنے پر   اور یہ دست چارہ گر میں نہیں
لو غم یار نے بھی چھوڑ دیا   صبر اب درد بھی جگر میں نہیں

سیکڑوں دیوان دیکھے وہ مزا آتا نہیں   جو مزا اے صبر آتا ہے کلام میر میں

مر کر جہاں کی گرد مصیبت سے چھٹ گئے   داخل ہوئے جفائے صنم سے ثواب میں

. . . .

خون جگر ہے پینے کو غم کھانے کو بہت   فرقت میں آب و دانہ میسر نہیں نہ ہو
ہاں ہاں ہمیں قبول ہی جو کچھ کہو گے تم   پر یہ بھی ہو کہ وصل کی شب پھر نہیں نہ ہو

پایا ہے مزا فقر کا جب سے مرے دل نے   ہے خاک کا بستر مجھے قاقم سے زیادہ
بس خاتمہ ہے حسن کا اور عشق کا حضرت   مجھ سے کوئی بڑھ کر نہ کوئی تم سے زیادہ

اپنی صورت پر فدا وہ ماہ پیکر ہو گیا   ایک دن دیکھا تھا اس نے مسکرا کر آئینہ
ایک سی جب دو ہوئے پھر لطف یکتائی کہاں   اس لئے دیکھا نہ کیجے بندہ پرور آئینہ

شہید ہو کے سے اس نے کیا عتاب کے ساتھ   ثواب مل گیا کس لطف سے عذاب کے ساتھ
وہ بال کھولے تبسم کناں ہیں گلشن میں   کہ برق کوندرہی ہے کہیں سحاب کے ساتھ

کہلے خدا کی یاد دل بے قرار دیکھ   اس زندگی کا کچھ بھی نہیں اعتبار دیکھ

. . . . .

درد فراق، درد جگر، دشمنوں کا زور   کس کشمکش میں ہوں مرے پروردگار دیکھ

پیری میں لطف دیتا ہے ذکر شباب یوں   جس طرح صبح بات کہے کوئی خواب کی
پچھتا رہے ہیں کس طرح اب کچھ نہ پوچھئے   جب تھا شباب قدر نہ کچھ کی شباب کی

صبر توبہ کی ہے تو کیا ڈر ہے پی بھی لو
توبہ میں توبہ ہے کوئی توبہ شباب کی

ایک دن چھوڑ کے سب جاہ و حشم جانا ہے
صبر دیکھو نہیں دنیا سے محبت اچھی

حیف ہے اک آن میں رخصت جوانی ہو گئی
ایک پل کی بات تھی اور اب کہانی ہو گئی

کیا بتاؤں کس طرح سے روز محشر بچ گیا
رحمت حق کام آئی مہربانی ہو گئی

طاعت حق کا مزا گلوں سے پوچھا چاہئے
خضر کو حاصل نوید جاودانی ہو گئی

ضعف پیری میں خدا کی یاد ہوتی کس طرح
صرف یاد حق نہ ہے قسمت جوانی ہو گئی

فقر میں کیسا مزا ہے حب دل میں بس گیا
کائنات دہر سب آنکھوں میں فانی ہو گئی

جس کی چاہت تھی ازل سے بعد کو وہ مل گیا
موت کیا آئی ہماری زندگانی ہو گئی

یاد حق میں وہ مزا ہے صبر جس کو مل گیا
ہر گھڑی ذکر خدا اس کو کہانی ہو گئی

ہوا جو کچھ ہوا، ہوگا جو کچھ ہوگا مقدر سے
بتوں کو پوج کر کیا ہیں ہم کیوں سر کو پتھر سے

کسی کے عشق میں اس طرح زور ناتوانی ہو
نہ بستر ہم سے اٹھتا ہے نہ ہم اٹھتے ہیں بستر سے

خجالت سے مہ نو ابر میں پوشیدہ ہو جائے
نقاب اے ماہ اٹھ جائے جو تیرے روئے انور سے

برنگ زر دو دنیا میں قیام اپنا نہیں اک جا
کبھی اس گھر سے اس گھر میں کبھی اس گھر میں اس گھر سے

نہ ہے کچھ خوف شیطاں کا نہ کچھ دنیا کا اندیشہ
بھروسا صبر پورا ہے مسیح پاک دلبر سے

مشغلہ ہو شعر کا شاید عدم میں بھی دلا
اس لئے ساتھ احتیاطاً اپنا دیواں لے چلے

کسی کو دیکھا تھا ازل میں اس دل ناشاد نے
عمر بھر بے چین رکھا ہے کسی کی یاد نے

جب کرم ہم پر کیا اس بانیٔ بیداد نے
جان کھائی یار لوگوں کی مبارکباد نے

میں اگر بے چین ہوں تو چین سے وہ بھی نہیں
مضطرب ان کو بھی کر رکھا ہے میری یاد نے

خدا سے تنفر بتوں کی پرستش
یہ اندھیر دنیا میں کیا ہو رہا ہے

زباں سے زباں وصل میں کب ملی ہے
زبانوں میں باہم گلا ہو رہا ہے

سنا ہے مرنے پہ قصہ تمام ہوتا ہے
تو پھر مزار پہ کیوں ازدحام ہوتا ہے

مثال برق کہیں ایک دم نہیں رکتا
سوار عمر بھی کیا تیز گام ہوتا ہے

تصدق جاں کرکے صبر پروانہ یہ کہتا ہے
کسی کے پاؤں چھونے کو ہماری لاش آتی ہے

چھوڑ کر حق کو جو دنیا میں پھنسے ہیں اب تک
ہوش میں آئیں سنبھل جائیں قضا آتی ہے

سکون تھا نہ عدم میں نہ چین ہستی میں
وہاں سے روتے ہوئے یاں سے اشکبار چلے

رہا نہ کوئی جلال و امیر و داغ یہاں
جہاں سے سوئے عدم کیسے نامدار چلے

مرے غفور ترے فضل و رحم کے صدقے
کہ ہم سے لوگ بھی دنیا سے باوقار چلے

مرا ہو ساقی مطلق ہو اور مئے تکبیر
غریب رند ہوں اور ساغر بہار چلے

صبر کو زندہ خوش رکھا تو نے
دولت عزت بھی دی خدا تو نے

بچے ایمان تندرستی دی
سات کیں نعمتیں عطا تو نے

بہتر ہوگا کہ اسی سلسلے میں صبر صاحب کے فرزند ارجمند پیٹرک گارڈنر متخلص بہ شوق کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔

پیٹرک گارڈنر المتخلص بہ شوق

شوق صاحب کاسگنج ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۷ فروری ۱۸۹۵ء تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائی تعلیم فرخ آباد و فتح گڈھ میں ہوئی۔ پھر لکھنؤ کے کرسچن کالجیئٹ اسکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کا کام سیکھا اور اپریل ۱۹۱۴ء میں سند حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہو کر کچھ روز حصار (پنجاب) میں ایک مشنری کے سکرٹری رہے۔ بعدہ کان پور چلے آئے اور پتلی گھر کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس طرح دس برس تک شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ کی خدمات انجام دیں اور اوائل ۱۹۲۶ء میں دینی خدمت کے سلسلے میں منسلک ہو گئے۔ دو تین برس میں ضروری امتحانات سے فارغ ہو کر دسمبر ۱۹۳۱ء میں بمقام آرہ (بہار) پورے پادری بن گئے۔ دینی خدمات کے سلسلے میں آپ کا قیام باندہ، بستی، مظفرپور میں رہا۔ آج کل الہ آباد میں مقیم ہیں۔ بڑے خلیق، ملنسار اور نیک طینت ہیں۔ آپ کی شادی گارڈنر خاندان کی لارڈ شاخ میں ہوئی ہے۔

بزرگوں کے فیض صحبت سے آپ کو بھی شعر کا مذاق پیدا ہو گیا۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتے ہیں۔ طبیعت میں جدت ہے اور مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کلام سے ظاہر ہے کہ ابھی شاعری کی ابتدا ہے۔ اگر مشق جاری رہی تو خاصا کہنے لگیں گے۔ فن شعر میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں

تو اپنے چچا جناب اسبق سے مشورہ کرتے ہیں. کلام موصولہ کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے:

دنیا میں اے خدا کوئی تجھ سا غنی نہیں   داتا ہے سب کا، دھن کی تجھے کچھ کمی نہیں
دیتا ہے ساری خلق کو ہر روز تو خورش   لیکن ترے خزانے میں کوئی کمی نہیں
گر بھیجے معتقد کوئی آئے ترے حضور   محروم ہو کے جائے یہ ممکن کبھی نہیں

نہ رکھا ہم نے ثابت ایک بھی ٹکڑا سلاسل کا
نتیجہ وحشیو دیکھو ہماری وحشتِ دل کا
بہت ہوں ناتواں، کہتا ہے لیکن حوصلہ دل کا
اسی حالت سے ہوگا سامنا مقتل میں قاتل کا
بہت پھولا ہوا تھا اے چمن تو اپنے پھولوں پہ
نہ نکلا ایک بھی اُس گل کے گالوں کے مقابل کا
جھکائی میں نے گردن اس نے مجھ کو قتل کر ڈالا
کس آسانی سے پورا ہو گیا یہ کام مشکل کا
گرے ہیں سیکڑوں پروانے مرکر شمع ہے گریاں
یہی بس مختصر سا تذکرہ ہے اپنی محفل کا
یہ حالت ہے تصور میں ترے دستِ حنائی کے
لہو اب تھوکتا ہوں ہو گیا مجھ کو مرض سل کا

اختیارِ بخششِ عصیاں ہے تیرے ہاتھ میں   جس کو چاہے بخش دے تو مالک و مختار ہے
عشقِ عیسیٰ ہو گیا جب سے یہ حالت ہے مری   مست ہیں میں بادۂ عرفاں سے دل سرشار ہے

کیا ہے نام ہم نے عاشقِ زلفِ دوتا ہو کر
ہوئے مشہور دنیا میں گرفتارِ بلا ہو کر
گھٹا جاتا ہے دم مرتا ہوں، حالت جانکنی کی ہے
خیالِ زلفِ پیچاں دل میں آیا ہے قضا ہو کر

چھڑایا تو نے پیچا درد سے غم سے مصیبت سے
قضا ممنون ہوں تیرا کہ، تو آئی دوا ہو کر
شہیدِ ناز کا کب خون چھپتا ہے چھپانے سے
ترے ہاتھوں میں وہ ظاہر ہوا رنگِ حنا ہو کر
وہ شے پاس اس کے ہے کایا پلٹ دیتی ہے انساں کی
چلے ہیں در سے ہم پیرِ مغاں کے کیا سے کیا ہو کر

اس درجہ ہم کو فکر تھی اپنے مآل کی   تھی وقتِ نزع یاد فقط ذوالجلال کی
جس خوبرو کے حسن سے روشن ہو کائنات   مشتاقِ دید چشم ہے اس کے جمال کی
جس دن سے ہم کو دولتِ ایماں ہوئی نصیب   کچھ فکر دل میں زر کی رہی اور نہ مال کی

ایک ہے غیر ترے وصل سے جو شاد رہا   ایک ہم ہیں جو ترے ہجر میں ناشاد رہے
فصلِ گل آئی ہے پنجرے ہی چمن میں رکھ دے   کچھ تو احساں اسیروں پہ بھی صیاد رہے
زندگی قید میں گزری ہے تو اب گور میں بند   نہ پسِ مرگ نہ ہم زیست میں آزاد رہے
ذبح کے وقت معلوم ہو کہ دل کہتا ہے   سر اسی طرح تہِ زانوئے جلاد رہے
کر کے خونِ خشک یہ اشعار کئے ہیں پیدا
تا کہ اے شوق مرے بعد یہ اولاد رہے

گارڈنر خاندان کی اس شاخ کے تیسرے اردو شاعر جناب رابرٹ گارڈنر صاحب اسبق ہیں. اسبق صاحب بڑے اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں کسی آیندہ اشاعت میں اُن کے حالات و کلام بھی نذر کئے جائیں گے. اس وقت اُن کا ایک شعر سن لیجئے:

بھاگتا ہوں سوئے صحرا گرد ہیں سارے عزیز
میرے دم کو حلقۂ احباب زنداں ہو گیا!

(حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر میرٹھی

محوّیت

لبِ جو، صحنِ گلشن، نیم شب، چاند اور ہم دونوں — مگر فطرت نے جنّت سے چرائے تھے یہ نظّارے
طلسم آرائیِ خاموشیِ شب کی یہ حالت تھی — بھلا بیٹھے تھے طائر بھی خوش آہنگی کے فن سارے
جونہی مہرِ خموشی توڑ کر میں نے کہا تجھ سے — "ذرا اپنی سریلی بانسری مجھ کو سنا پیارے"
کچھ اِس انداز سے اپنے لبوں کو تو نے جنبش دی — کہ ہر سوراخ سے چھوٹے حسیں نغموں کے فوّارے
تڑپ اُٹھّی ترانہ بن کے ہر موجِ نفس تیری — یہ نغمے تھے ترے یا بہہ رہے تھے سوز کے دھارے
میں سر نیچا کئے یوں کھو گئی سپنوں کی دنیا میں — جھکی ہو جس طرح گردن کسی کی شرم کے مارے
مِری آنکھوں میں لہرانے لگے خوابوں کے یوں جلوے — فضا میں جھومتے ہوں جس طرح پھولوں کے گہوارے
تخیّل لے اڑا مجھ کو فلک سے بھی بلند اتنا — کہ اک پل میں مرے پاؤں تلے روندے گئے تارے
ابھی میں کر رہی تھی سیر ان دل کش نظاروں کی — کہے جن کو سخن ور عالمِ غیبی کے نظّارے

کہ تو نے دفعتہً پوچھا "یہ کیا تجھ کو ہوا پیاری؟"
میں چونکی، مسکرائی، بول اٹھّی "کچھ نہیں پیارے"

تخت سنگھ

اجنبی

(مختلف یورپی اقوام کے خصائص کا ایک لطیف تجزیہ)

پہلا سین: ۔ دوپہر کا وقت۔ ایک آسٹرین ریلوے سٹیشن کا پلیٹ فارم
کمرے کے سامنے چند چھوٹی چھوٹی میزیں لگی ہیں۔ جن پر
بیٹھے چند مسافر کھانا کھا رہے ہیں۔ ایک دبلا پتلا بہرہ مطلوبہ اشیا
مہیا کر رہا ہے کمرے کے دروازہ کے سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی
پر ایک غریب عورت بیٹھی ہے ۔ اس کے دونوں طرف دو بڑی
بڑی گٹھڑیاں پڑی ہیں ایک پراسی کا ننھا بچہ سیاہ رنگ کی شال میں
لپٹا پڑا ہے۔

بہرہ۔ (ایک میز کے پاس آکر جس پر ایک انگریز سیاح اور اس کی بیوی
بیٹھے ہوئے ہیں) دو پیالی چائے!

انگریز۔ (پیسے دیتے ہوئے) تھینک یو (اپنی بیوی سے آکسفورڈ کے
لہجہ میں) کیا چینی بھی؟

انگریز عورت۔ (کیمبرج کے لہجہ میں) صرف ایک پیالی میں

امریکن سیاح (جس نے بڑے سائز کی عینک لگا رکھی ہے گلے میں
جو کیمرہ لٹک رہا ہے اور ایک دوسرے میز پر بیٹھا ہے) بہرے!
ذرا میرے لئے انڈے تو لے آؤ میں تو انتظار کرتے کرتے
تھک گیا ہوں۔

بہرہ۔ بہت اچھا حضور

جرمن سیاح (اس کی آواز بہت کرخت اور مونچھیں بہت موٹی ہیں
شکل وصورت سے بہت سخت گیر معلوم ہوتا ہے۔ بالوں میں
کچھ سفیدی آئی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ریٹائرڈ فوجی
افسر ہے) بہرے شراب۔

بہرہ۔ بہت اچھا حضور۔

(غریب عورت کا بچہ رونے لگتا ہے۔ ماں چپ کرانے کے لئے اسے
اٹھا لیتی ہے۔ سرخ وسفید رنگ کا ایک ولندیزی نوجوان جو ایک الگ
میز پر بیٹھا ہے۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے)

امریکن۔ بہرے لئے انڈے لاتے! جلدی کرو۔

بہرہ۔ بہت اچھا حضور۔ (بھاگا ہوا جاتا ہے)

(میزوں کے دائیں طرف ایک عجیب وغریب اور چھوٹے قد کا حبشی سا
آدمی بیٹھا دکھائی دیتا ہے اس نے بڑا ملائم اور صاف ستھرا ہیٹ پہن رکھا
ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ تیز رفتار بہرے کی طرف دیکھتا ہے اور پھر
ایک الگ میز پر بیٹھ جاتا ہے)

انگریز۔ (اپنی گھڑی دیکھ کر) ابھی دس منٹ باقی ہیں۔

انگریز عورت۔ اونہہ!

امریکن۔ (ان کو مخاطب کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں
کو انڈوں سے نفرت ہے۔ خیر!

(انگریز میاں بیوی اس کی طرف دیکھتے ہیں لیکن کوئی بات نہیں کرتے)

جرمن۔ (ناقابل برداشت انگریزی میں) ایسی جگہ سے کیا خاک مل سکتا ہے

(بہرہ بھاگا بھاگا آتا ہے اور ولندیزی نوجوان کے آگے پھلوں کی ایک
پلیٹ رکھ دیتا ہے اور اس کے دام لے لیتا ہے)

جرمن۔ بہرے۔

بہرہ۔ حاضر حضور (جرمن اپنا بل ادا کرتا ہے)

امریکن۔ (اٹھ بیٹھتا ہے اور بڑے غصے سے اپنی گھڑی جیب سے نکال
کر کہتا ہے) ادھر دیکھو۔ اگر پانچ منٹ کے اندر اندر میرے
لئے انڈے نہ لائے تو پھر تمہاری خیر نہیں۔

بہرہ۔ (تیز قدم اٹھانے لگتا ہے) بہت اچھا حضور

امریکن۔ (دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے انداز میں) میں تو کچھ
پاگل سا ہو گیا ہوں۔

(انگریز سیاح اپنے اخبار کے دو حصے کرتا ہے اور اشتہاروں والا حصہ

اپنی بیوی کو دے دیتا ہے۔ بچہ رو رہا ہے، ماں اُسے چپ کرا رہی ہے۔ دلنہ بزی نوجوان کھانا چھوڑ کر ہنسنے لگتا ہے۔ جرمن سگرٹ سلگاتا ہے۔ ہمارا ننھا اجنبی خاموش بیٹھا اپنے ہیٹ سے کھیل رہا ہے۔ بہرہ انڈے لے کر بھاگا بھاگا آتا ہے اور امریکن کے آگے رکھ دیتا ہے)

امریکن (اپنی گھڑی کو ایک طرف رکھ کر، خیر! میں کسی سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتا۔ کتنے پیسے؟

(پیسے دیتا ہے اور کھانے لگتا ہے۔ بہرہ تھوڑی دیر تک پلیٹ فارم کے کنارے پر کھڑا رہتا ہے اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اجنبی اُسے کنکھیوں سے دیکھتا ہے اور بلند لہجے میں کہتا ہے)

اجنبی۔ مسٹر بہرے (بہرہ گھومتا ہے) کیا مجھے بیر کا ایک گلاس مل جائیگا!

بہرہ۔ ہاں حضور۔

اجنبی۔ نوازش (بہرہ چلا جاتا ہے)

امریکن۔ (انڈے کھانے چھوڑ دیتا ہے اور ترش رو ہو کر کہتا ہے) معاف کیجیے گا جناب۔ ذرا آپ مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ نے اس ذلیل بہرے کو ہر اور بر د Herr Ober کیوں کہا۔ آپ غالباً یہ تو جانتے ہی ہیں نہ کہ اس کے معنی ہیں "بڑے بہرہ صاحب"۔

اجنبی۔ جی ہاں۔

امریکن۔ مجھے تو آپ کی بات پر ہنسی آتی ہے۔

اجنبی۔ کیا مجھے اس کو اس طرح نہیں مخاطب کرنا چاہیئے تھا۔

جرمن۔ (بے رُخی اور ترش روئی سے) نہیں۔ صرف بہرہ کہنا چاہیئے تھا۔

امریکن۔ واقعی۔ صرف بہرہ کہنا چاہیئے تھا۔

(انگریز عورت ایک لمحہ کے لئے اپنے اخبار پر نظر دوڑاتی ہے۔ دلنہ بزی کھانا چھوڑ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اجنبی باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے ہیٹ پر ہاتھ پھیرتا جاتا ہے)

اجنبی۔ میں اس کے احساسات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جرمن۔ خوب۔

امریکن۔ ہم اپنے ملک میں بے حد جمہوریت پسند ہیں۔ لیکن وہاں کی تو بات ہی الگ ہے نہ۔

انگریز مرد (چائے کی پیالی اپنی بیوی کو دیتے ہوئے) کیا اور چاہیئے؟

انگریز عورت۔ بس! تھینک یو۔

جرمن۔ (بڑی تیزی سے) اگر آپ ایسے لوگوں سے اس طرح نرمی سے پیش آئیں تو یہ بہت گستاخ ہو جاتے ہیں۔ آپ ابھی دیکھئے گا کہ یہ آپ کی شراب لے کر نہیں آئے گا۔

(ابھی بات ختم نہیں ہوتی کہ بہرہ اجنبی کے لئے شراب لے آتا ہے اور میز پر رکھ کر واپس چلا جاتا ہے)

امریکن۔ واقعی مساوات اسی کا نام ہے (اجنبی کو مخاطب کر کے) کیا آپ انجمن اخوت انسانی سے تو تعلق نہیں رکھتے؟

اجنبی۔ (چونک کر) نہیں تو۔

امریکن۔ میں خود ٹالسٹائی کے بہت سے اصولوں کا قائل ہوں۔ واقعی وہ ایک بلند روح رکھنے والا پُر عظمت انسان تھا۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو چاہیئے کہ ان چھوٹے آدمیوں کو منہ نہ لگائیں۔ (انگریز کو مخاطب کر کے، جو تھوڑی دیر کے لئے بڑی لاپروائی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے) آپ ضرور اس بات کی داد دیں گے۔ آپ نے تو خود دیکھا ہے نہ کہ وہ کتنی دیر میں انڈے لے کر آیا ہے۔

(انگریز میاں بیوی اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دیتے ہیں اور اپنے منہ کو دوسری طرف پھیر لیتے ہیں)

(بہرہ سے جو بوتلوں والی الماری کے پاس کھڑا ہے) اِبہرے۔ بیر کی ایک بوتل لاؤ۔ جاؤ۔ جلدی جاؤ۔

بہرہ۔ بہت اچھا حضور

جرمن۔ ابے سگرٹ بھی لیتے آنا۔

بہرہ۔ بہت اچھا حضور۔ (چلا جاتا ہے)

امریکن۔ (اجنبی کو مخاطب کر کے ——— بڑی نرمی سے) جناب اگر مجھے آپ سے پہلے شراب کا گلاس نہ ملا تو میں آپ کو استاد مان لوں گا۔

جرمن (تیز ہو کر) ٹالسٹائی کیا ہے۔

امریکن (دلیل کی معقولیت اور چاشنی کو محسوس کرتے ہوئے) درست لیکن یہ اپنے اپنے مذاق کی بات ہے۔ میں تو مساوات کا حامی ہوں۔ ذرا اِدھر تو دیکھئے نہ۔ اُس غریب بیکس اور عاجز عورت کو جو اپنے معصوم بچے کو گود میں لئے ہمارے پاس ہی بیٹھی ہے۔ میرے خیال میں آپ تو اُسے اپنے پاس بٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے!

جرمن (کندھوں کو ہلاتے ہوئے اور ناک منہ چڑھاتے ہوئے) ٹالسٹائی ایک جذباتی آدمی ہے اصل میں ننھے ہی ایک سچا فلاسفر ہے۔ باقی تو سب

ایسے ویسے ہی ہیں۔

امریکن۔ ہاں۔ آپ کا کہنا بالکل سچ ہے۔ بوڑھا نیٹشے واقعی بڑا بخیلا اور خفیف النفس انسان تھا لیکن مجھے تو ٹالسٹائی پسند ہے۔

(سرخ رو ولندیزی نوجوان کی طرف منہ پھیر کر) کہئیے جناب آپ کی کیا رائے ہے؟ مجھے آپ کی وضع قطع اور شکل وشباہت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ولندیزی ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں بھی ٹالسٹائی کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں؟

(ولندیزی نوجوان منہ بناتا ہے)

امریکن۔ واللہ کیا خوب جواب دیا۔

جرمن۔ ٹالسٹائی تو کچھ بھی نہیں۔ آدمی کو چاہئیے کہ اپنی ذات کا لوہا منوائے اس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔ وہ اپنی قوت کے استعمال میں دریغ نہ کرے۔

امریکن۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ ہم امریکنوں کا ایمان ہی "قوتِ عمل" ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آدمی کو دوسروں پر چھا جانا چاہئیے لیکن ہم "انسانی اخوت" کے اصول کے بھی قائل ہیں۔ گو ہم نے ایشیائی اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان حدِ فاصل قایم کر رکھی ہے۔ لیکن ہم ہر ایک کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ ہمیں اجتماعی حدود اور امتیازات کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔

انگریز مرد (اپنی بیوی سے) کیا آپ کو سردی لگ رہی ہے؟

انگریز عورت۔ (امریکن کی طرف اپنے کندھوں کو ہلا کر) ہاں ہے تو سہی۔

جرمن۔ ذرا صبر کیجئے۔ آپ ایک نئی قوم سے ہیں۔

امریکن۔ بیشک۔ ہم پر فرسودگی غالب نہیں آئی۔

(اجنبی کو مخاطب کر کے جو پر جوش نظروں سے ہر ایک کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے)

کیا آپ "انسانی فرائض" پر اپنے خیالات کا اظہار فرما کر ممنون نہیں فرمائیں گے؟

(اجنبی ذرا گھبرا سا جاتا ہے اور جواب دینے کے لئے اپنا منہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے)

امریکن۔ مثال کے طور پر کیا آپ اس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں کمزور، دائم المرض اور ایسے تمام لوگوں کو ہلاک کر ڈالنا چاہئیے جو چلنے پھرنے سے عاری ہیں؟

جرمن۔ (سر کو تائیدانہ طور پر ہلاتے ہوئے) اگر میرا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہو تو!

(ولندیزی نوجوان ہنسنے لگتا ہے)

امریکن۔ (ملامت آمیز نظر سے) یہ تو آپ کا انکسار ہے بہرحال آپ کی بات مطلب سے خالی نہیں۔ یہ گویا ایک تضمینہ ہے جس کے جواب سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کیا آپ ایسی صورت میں بھی ایسے لوگوں کی مدد کریں گے جبکہ آپ کو مصیبت میں گرفتار رہنے کا اندیشہ ہو؟

جرمن۔ نہیں نہیں۔ یہ تو حماقت ہوگی۔

اجنبی۔ (مستفسرانہ نظروں سے) غالباً نہیں اگرچہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ . . . آخر سینٹ فرانسس، سینٹ جولین۔ جیسے آدمی بھی تو ہو گزرے ہیں نا"

امریکن۔ کیا عظیم الشان ہستیاں تھیں۔ میرے خیال میں انہوں نے دوسروں کی خاطر جان دے دی (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) لیجئے ہاتھ۔ بندہ کا نام سبت (اپنا کارڈ دیتا ہے) میں برف کی مشین بناتا ہوں (اجنبی کے ہاتھ کو زور سے ہلاتا ہے) میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (بہرہ کو دروازہ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر) بہرے میرے لئے شراب لائے؟

جرمن۔ اور سگرٹ؟

بہرہ۔ ابھی لایا حضور (چلا جاتا ہے)

انگریز مرد۔ (گھڑی دیکھ کر) گاڑی لیٹ ہے

انگریز عورت۔ واقعی؟ اونہہ

(ریلوے پولیس کا ایک ہٹا کٹا اور تنومند سپاہی ادھر ادھر گھوم رہا ہے)

امریکن (اپنی جگہ پر بیٹھ کر اور جرمن کو مخاطب کر کے) امریکہ میں ہمیں اس قسم کے لوگوں سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں فطرتِ انسانی پر زیادہ اعتماد کرنا چاہئیے۔

جرمن۔ اوہ، اوہ۔ آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ "بیخودی" کا پورا پورا نمونہ ہو۔

اجنبی۔ (مستفسرانہ انداز میں) کیا آپ کو فطرتِ انسانی پر اعتماد نہیں!

امریکن۔ سوال تو واقعی بڑا ہیجان خیز ہے (دوسروں کی رائے معلوم کرنے کی خاطر وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہے)

(ولندیزی نوجوان ہنسنے لگتا ہے)

انگریز آدمی۔ (اخبار کے بقیہ صفحات اپنی بیوی کو دیتے ہوئے) یہ مجھے دے دیجئے۔

(بیوی دے دیتی ہے)

جرمن۔ فطرتِ انسانی پر میں اُس حد تک اعتماد کرسکتا ہوں جس حد تک کہ وہ میرے مشاہدے و تجربے میں آسکتی ہے۔

امریکن۔ یہ تو بہت بُرا خیال ہے اور فطرتِ انسانی کا مذاق اڑانے کے مترادف۔ میرا تو بطلیت (Heroism) پر ایمان ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ہیرو بن سکتا ہے بشرطیکہ اُسے موقع مل جائے۔

اجنبی۔ خوب۔ کیا واقعی آپ کا یہی خیال ہے!

امریکن۔ کیوں نہیں! میرے خیال میں ہیرو وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ ذرا اُس غریب عورت ہی کو دیکھئے، کیا وہ کسی ہیروئن سے کم ہے جو اپنے بچے کی خاطر ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔

جرمن۔ جانور بھی تو اپنے بچوں کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں

امریکن۔ اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس طرف کوئی گاڑی آجائے اور بچے کے اوپر سے گزرنے لگے تو ہم میں سے ہر ایک اس کی جان بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائے گا (جرمن کی طرف مخاطب ہوکر) میرے خیال میں آپ اپنی خوبیوں سے واقف نہیں ہیں (چونکہ جرمن اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف ہے۔ لہٰذا انگریز عورت کی طرف مخاطب ہوکر) میڈم۔ بڑی نوازش ہوگی اگر آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں۔

انگریز عورت۔ میں معافی چاہتی ہوں۔

امریکن۔ انگریز بڑے انسان دوست ہوتے ہیں۔ انہیں فرض کا بے حد احساس ہوتا ہے۔ یہی حال امریکہ اور جرمنی کے باشندوں کا ہے (ولندیزی نوجوان کو مخاطب کرکے) میرے خیال میں آپ کے چھوٹے سے ملک کے لوگوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ یہ مساوات اور بلند مقاصد کا زمانہ ہے (اجنبی کو مخاطب کرکے) جناب آپ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اجنبی۔ معاف کیجئے میرا کسی خاص قوم سے تعلق نہیں۔ میرا باپ آدھا انگریز اور آدھا امریکن تھا۔ اور میری ماں بھی آدھی جرمن اور آدھی ولندیزی تھی۔

امریکن۔ خوب۔ کیا عجیب و غریب سلسلہ ہے (سپاہی گزرتا ہے) میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اس وردی پوش جماعت کی کیا ضرورت ہے اب تو ہم بہت ہی نرم مزاج ہوچکے ہیں۔ خودی کے متعلق ہمارے سابقہ مفہوم میں کافی تبدیلی پیدا ہوچکی ہے۔

(بیرہ دروازے سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

جرمن۔ (بجلی کی طرح کڑک کر) بیرے سگرٹ لائے!

امریکن۔ (مسکرا کر) شراب کی بوتل لائے!

بیرہ۔ ابھی لایا حضور۔

امریکن۔ ذرا اس سے اور نرمی کا برتاؤ کرو ورنہ یہ اپنے آپ کو فرعون سمجھنے لگے گا۔ میں اب اس کے متعلق کچھ کہنے والا تھا ۱۹۳۱ء کے سال رواں میں مسیح کی بادشاہت افتاں و خیزاں چل رہی ہے۔ ہم عالمگیر اخوت کی خطرناک سرحد کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے کرنیل صاحب (جرمن کی طرف اشارہ کرکے) کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے یہ فولادی پنجہ کے مالک ہیں اور بڑی سخت طبیعت رکھتے ہیں لیکن اگر انہیں بھی اپنی فیاضی اور انسان دوستی کے اظہار کا موقع دیا جائے تو یہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا صاحب!

(جرمن مسرت اور سنکی پن (Synicism) کے عالم میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے)

اجنبی۔ مجھے اس میں شک ہے۔ ایک آدمی چاہتا تو ہے لیکن کسی نہ کسی سبب سے . . .

(اپنے سر کو جنبش دیتا ہے)

امریکن۔ آپ تو اس بات کے متعلق متذبذب سے معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو اس کا ذاتی تجربہ ہو۔ میں تو رجائی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں ہم شیطان کو بھی گنگنانے پر مجبور کردیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ شیطانی پارٹیوں کو ہمارے ہاتھوں بہت سی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ذاتی اغراض کا جلد خاتمہ ہو جائے گا بوڑھے نیٹشے کے دلدادہ کرنیل صاحب کبھی اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکیں گے۔ بہت جلد نہایت زریں موقع ہمارے ہاتھ آنے والا ہے۔

(ابھی یہ باتیں کر رہے ہے کہ دور سے ریلوے افسر کی آواز سنائی دیتی ہے جو جرمن زبان میں کچھ کہہ رہا ہے۔ آواز نزدیک آجاتی ہے اور

قابلِ سماعت ہو جاتی ہے)

جرمن (چونک کر گاڑی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے بیگ کو سنبھال لیتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر آموجود ہوتا ہے تھوڑی دیر تک وہ مسافروں پر نظر دوڑاتا ہے۔ ولندیزی نوجوان بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنا کوٹ اور ہیٹ اٹھا لیتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر چند ایک ہدایات دے کر واپس چلا جاتا ہے)

انگریز مرد یہ کیا کہتا ہے؟

جرمن۔ ہماری ٹرین دوسرے پلیٹ فارم پر آ رہی ہے اب صرف ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔

(سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

امریکن۔ یہ تو بہت ہی افسوس کی بات ہے۔ اب مفت شراب تو نہیں مل سکے گی۔

(مسافر جلدی جلدی اپنا سامان اٹھا رہے ہیں۔ اس پریشانی اور گھبراہٹ میں بے چاری غریب عورت اپنی دو بڑی بڑی گٹھڑیں اور ننھے بچے کو سنبھالنے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے۔ سعی لاحاصل ہے وہ سب کچھ نیچے رکھ دیتی ہے اور اپنے ہاتھوں کو ملنے لگتی ہے اور زور زور سے پکارتی ہے: "لوگو خدا کے لئے میری مدد کرو" حیرت زدہ مسافر اس طرف منہ پھیر لیتے ہیں۔ جس طرف سے آواز آ رہی ہے)

امریکن۔ یہ کیا ہے! مدد! (بھاگتا رہتا ہے اجنبی گھومتا ہے اور پیچھے بھاگ جاتا ہے اور بچے اور ایک گٹھڑی کو اٹھا لیتا ہے)

اجنبی۔ بھاگو۔ نیک خاتون بھاگو۔

(عورت دوسری گٹھڑی اٹھا لیتی ہے۔ دونوں بھاگنے لگتے ہیں بیرہ شراب کی بوتل ہاتھ میں لئے ہوئے برآمدے میں آتا ہے اور مسکرا کر مسافروں کی طرف دیکھتا ہے)

پردہ

دوسرا سین

ایک متحرک۔ برآمدے والی گاڑی کا دوسرے درجے کا ڈبہ۔ انگریز اور اس کی بیوی ایک دوسرے کے بالمقابل کونے کی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ایک بڑے سائز کے اخبار کے جہازی اوراق دوسرے مسافروں اور ان کے درمیان حائل ہیں۔ عورت کے ساتھ والی نشست پر جرمن اور مقابل والی نشست پر امریکن بیٹھا ہے امریکن کے پاس ہی ایک کھڑکی کے نزدیک ولندیزی نوجوان بیٹھا ہے۔ کھڑکی کے دوسرے کونے میں جرمن کا بیگ پڑا ہے۔ فضا کے سکون میں یا تو گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ یا اخبار کے اوراق کی چرچراہٹ اضطراب پیدا کر رہی ہے۔

امریکن۔ (ولندیزی نوجوان کو مخاطب کر کے) بہتر ہوگا اگر اس کھڑکی کو بند کر دیا جائے۔ سردی بہت لگ رہی ہے

(ولندیزی نوجوان ہنستا ہے اور کھڑکی کو بند کر دیتا ہے۔ انگریز اس بات سے کچھ خوش نظر نہیں آتے جرمن اپنے بیگ میں سے ایک کتاب نکال لیتا ہے)

امریکن۔ جرمن لوگ مطالعہ کے بے حد شائق ہوتے ہیں۔ یہ نہایت اچھی عادت ہے۔ میری بھی یہی عادت ہے جو کتاب میرے ہاتھ لگ جائے اُسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا۔

(جرمن کتاب کو اونچا اٹھاتا ہے تاکہ ہر ایک اس کا نام پڑھ سکے)

خدائی فوجدار نہایت اچھی کتاب ہے۔ ہم اہل امریکہ بڈھے کوئکزوٹ کے کارنامے بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ حرکات تو ان کی بے حد خفیف ہیں لیکن ہیں بہت پُر مزہ۔

جرمن۔ وہ تو مر چکا۔ بھیڑ کی طرح۔ لیکن تھا خوب

امریکن۔ امریکہ میں کافی حد تک ابھی شجاعت پائی جاتی ہے۔

جرمن۔ شجاعت کیا ہے۔ صرف جذبات کا نام۔ موجودہ زمانے میں اس کا کچھ فایدہ نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ جد و جہد اور کشمکش میں لگا رہے

امریکہ۔ تو گویا آپ کے نزدیک شجاعت یہ ہوئی کہ آدمی ریاست کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دے۔ ہمارے ملک میں افراد کو اس سے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ ہماری شرافت تقاضا کرتی ہے کہ کمزور اور درماندہ افراد کی مدد کی جائے۔ ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں۔

(ابھی وہ باتیں کر رہا ہوتا ہے کہ اجنبی برآمدے کے دروازے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بچہ اور دوسرے ہاتھ میں گٹھڑی ہے۔ وہ پریشانی اور گھبراہٹ میں ڈبے میں داخل ہوتا ہے۔ انگریز میاں بیوی اس کی موجودگی کو بری طرح محسوس کرتے ہیں اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے احساس کو دبا سکیں۔ ولندیزی نوجوان ہنسنے لگتا ہے)

جرمن۔ آہا ہا بہت خوب

امریکن۔ مہربان من۔

اجنبی۔ یہاں کوئی جگہ ہے؟ مجھے تو کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آتی۔

امریکن۔ ہاں۔ یہاں ایک آدمی کے لئے جگہ ہے۔

اجنبی۔ (گٹھڑی کو باہر رکھ کر اور بچے کو تھپک کر) کیا میں آسکتا ہوں!

امریکن۔ حضرت سیدھے چلے آئیے۔

(جرمن ناک منہ چڑھا کر اپنے بیگ کو سرکا لیتا ہے۔ اجنبی آگے بڑھتا ہے اور دھڑام سے نیچے بیٹھ جاتا ہے)

امریکن۔ اس کی ماں کہاں ہے؟

اجنبی۔ (افسردہ دلی کے ساتھ) مجھے خدشہ ہے کہ وہ گاڑی سے رہ گئی ہے۔

(دولہا یہ نوجوان ہنستا ہے۔ انگریز میاں بیوی غیر شعوری طور پر اپنے سروں کو ذرا اوپر اٹھاتے ہیں)

امریکن۔ اوہو۔ یہ تو بالکل ایک خانگی حادثہ معلوم ہوتا ہے۔

(انگریز دفعتہً چونک اٹھتا ہے "ہا ہا" اور اپنے اخبار کے پیچھے سر کو چھپا لیتا ہے۔ اخبار کے اوراق ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کھڑکھڑ اور گھر گھر کی آواز پیدا ہو رہی ہے)

جرمن۔ تو آپ اس کے بچے اور گٹھڑی کو اٹھا لائے ہیں۔ خوب (بڑی بھونڈی سی شکل بنا لیتا ہے)

امریکن۔ (بڑی سنجیدگی کے ساتھ) بہت خوب۔ میرا خیال ہے کہ قدرت نے آپ کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔

(بچہ بلبلانے لگتا ہے) (اجنبی محبت آمیز نظروں سے سب کے چہروں کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی شفقت سے بچہ کو تھپک رہا ہے۔ اس کی محبت خیز نظریں جس جگہ پڑتی ہیں وہیں مسرت و شادمانی چھا جاتی ہے۔ صرف امریکن ہی نے کچھ اس قسم کی سنجیدگی اختیار کر رکھی ہے کہ بظاہر وہ دور ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی)

امریکن۔ بہتر ہوگا۔ اگر آپ فی الفور واپس چلے جائیں اور بچہ کو اس کی ماں کے حوالے کر دیں۔ ایک ماں کو پاگل بنانے کے لئے یہ حادثہ کافی ہے۔

اجنبی۔ بے کس عورت۔ معلوم نہیں اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔

(ایک فلک شگاف قہقہہ سے گاڑی ہلنے لگتی ہے۔ انگریز میاں بیوی اپنے اخبار کو ایک لمحہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ قہقہہ کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اجنبی کے ہونٹوں پر پیارا آفریں تبسم کھیل رہا ہے)

امریکن۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) آخر یہ ہوا کیسے؟

اجنبی۔ ہم ٹھیک اسی وقت پہنچے جب ٹرین چلنے ہی والی تھی۔ میں اس خیال سے اندر کود پڑا کہ اس کو اوپر چڑھنے میں مدد دوں۔ لیکن ٹرین بہت جلد چل پڑی۔ اتنی جلد کہ وہ پیچھے رہ گئی۔

(قہقہہ کی آواز پھر بلند ہوتی ہے)

امریکن۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو بچہ ماں کی طرف پھینک دیتا۔

اجنبی۔ لیکن میں ڈرتا تھا کہ کہیں اس ننھی جان کو کچھ نقصان نہ پہنچے۔

(بچہ رو رہا ہے۔ چھوٹا آدمی اسے پچکارتا ہے۔ قہقہہ کی صدا پھر بلند ہوتی ہے)

امریکن۔ (نہایت سنجیدگی کے ساتھ) یہ نہایت ہی پر لطف واقعہ ہے۔ گو بچے کے لئے نہیں۔ یہ تو بڑا ہی اولڈ فیشن بچہ ہے (چھینک مارتا ہے) میرے خیال میں یہ بڑا اکھڑ ہے۔

اجنبی۔ میں نے تو اب تک اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔

امریکن۔ اس کی کونسی طرف اوپر ہے؟

اجنبی۔ میرے خیال میں سیدھا رخ۔ ہاں سیدھا ہی۔

امریکن۔ بہت اچھی بات ہے۔ بہتر ہوگا اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے اسے کھڑکی سے باہر نکال دیں۔ بچے بھی کیا عجیب چیز ہوتے ہیں۔

انگریز عورت (چونک کر) نہ۔ نہ۔ نہ۔

انگریز مرد۔ (بیوی کے گھٹنوں کو چھو کر) جان من

امریکن۔ محترم خاتون آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں باہر بہت سردی ہے۔ یہ بچہ بڑا قیمتی ہے اور ایک لحاظ سے ہم سب کی دلچسپی کا مرکز۔ یہ عالمگیر اخوت کا ایک جزو ہے۔ کیا یہ لڑکی ہے یا لڑکا؟

اجنبی۔ میں تو صرف اس کے اوپر کا حصہ دیکھ سکتا ہوں۔

امریکن۔ لیکن اس کو دیکھ کر بھی آپ شکل سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کو بری طرح ڈھانپ رکھا ہے۔ بہتر ہوتا اگر اس کے کپڑے اتار دئے جاتے۔

جرمن۔ نہیں نہیں نہیں۔

امریکن۔ کرنیل صاحب۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔ شاید کپڑے اتارنے سے نقصان پہنچے۔ مناسب ہوگا کہ محترم خاتون سے پوچھ لیا جائے۔

انگریز خاتون۔ ہاں ہاں۔ صحیح ہے۔ ہیں . . .

انگریز مرد۔ (اسے چھو کر چھوڑ دو اسے۔ ننھا گڈا گر بالکل ٹھیک ہے۔

امریکن۔ یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے۔ شاید یہ جذبۂ انسانیت کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص اس کے چہرہ کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اجنبی۔ (مسرور ہوکر) یہ میری انگلی چوس رہا ہے۔ دیکھئے۔ دیکھئے کتنا پیارا بچہ ہے
امریکن۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنے تصورات میں بچوں کی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔
اجنبی۔ نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔
امریکن۔ (جرمن۔ یہ تو پھر افسوسناک امر ہے (سب کی طرف منہ کرکے) میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنا چاہئے کہ آج ہم میں یہ ننھا اجنبی موجود ہے یہ اس حقیقت کا ایک بین ثبوت ہے کہ دورِ حاضر میں ناتوانوں اور بچوں کا ہم پر کس قدر اثر ہے۔ کرنیل صاحب جو بظاہر بہت سخت گیر اور سخت مزاج آدمی ہیں کیسی شانتی سے اس کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے ہیں (چھینکتا ہے) دیکھئے بچے کے چہرے پر کس قدر درخشانت ہے۔ یہ حسن و دلبری کی علامت ہے۔ اسی چیز نے کرنیل صاحب میں طفلیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔
اجنبی (دھیمی آواز میں) اب مجھے بچہ کا عجیب سا چہرہ نظر آتا ہے۔

(سب آگے کی طرف جھکتے ہیں)

امریکن۔ آخر اس کی شکل وصورت کیسی ہے؟
اجنبی۔ (پھر دھیمی آواز میں) مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی سوائے داغوں کے
جرمن۔ ارے ارے داغ؟

(ولندیزی نوجوان ہنسنے لگتا ہے)

امریکن۔ میں نے سنا ہے کہ یہ بیماری بچوں میں عام ہے۔ محترم خاتون شاید آپ اس کے متعلق کچھ بتا سکیں۔
انگریز عورت۔ بخوشی۔ آخر داغ ہیں کس قسم کے؟
اجنبی۔ یہ تو ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں (سب کے جسموں میں تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے) مجھے یقین ہے کہ اس کا بدن بالکل ٹھیک ہے۔
امریکن۔ خیر اس بات کا فیصلہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔ میں قدرے ذکی الحس ہوں اور جلدی امراض سے بہت کم واقف ہوں۔
جرمن۔ داغ؟ (کافی پرے کھسک جاتا ہے اور ایک لمبا سا سگار سلگا لیتا ہے)

(ولندیزی نوجوان اپنی ٹانگوں کو پیچھے کھینچ لیتا ہے)

امریکن۔ (سگار نکال لیتا ہے) میرے خیال میں بہتر ہوگا۔ اگر اس ڈبے کو صاف کروا دیا جائے۔ کیا آپ کے خیال میں بچہ واقعی کسی مرض کا شکار ہے؟
اجنبی (اجنبی پن کے ساتھ) میرے خیال میں تو نہیں؟ مجھے بچوں کے متعلق بہت کم واقفیت ہے۔ میرے خیال میں اس کے داغ اور طرح کے ہوتے ہیں۔
امریکن۔ کیا داغ آبلوں کی طرح تو نہیں ہیں؟
اجنبی۔ ہاں! ہاں!
امریکن۔ (بڑی سنجیدگی کے ساتھ ارد گرد دیکھ کر) میرے خیال میں اس بچہ کے خسرہ نکل آیا ہے۔

(جرمن حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور تمام جسم میں رعشہ پڑ جاتا ہے)

انگریز خاتون۔ بے کس بچہ، کیا ہیں؟

(کھڑی ہونے لگتی ہے)

انگریز مرد۔ (اسے پکڑ کر) نہیں نہیں۔ دفع کرو اسے
امریکن۔ خاتون میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات پر فخر کر سکتا ہے لیکن مجھے آپ کے شوہر سے بھی ہمدردی ہے۔ خسرہ نوجوان عورتوں کے لئے تو بڑی ہی خطرناک بیماری ہے۔
اجنبی۔ یہ میری انگلی کو بار بار پکڑتا ہے۔ واقعی بے حد پیارا بچہ ہے۔
امریکن۔ (چھینکتے ہوئے) خیر تو یہ ایک الگ بات ہے ان داغوں کے متعلق کہئے کیا یہ سرخی مائل ہیں؟
اجنبی۔ نہیں۔ بلکہ یہ سیاہ ہیں۔ بہت سیاہ۔
جرمن۔ خوب۔ متعدی بخار (اچھل کر انگریز خاتون کی نشست کے پاس چلا جاتا ہے)
امریکن۔ متعدی بخار۔ یہ تو بڑی خطرناک مرض ہے۔

(ولندیزی نوجوان دفعتہً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور برآمدے میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد جرمن بھی دھوئیں کے بادل اڑاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ انگریز اور امریکن کچھ دیر تک بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن بالکل خاموش۔ انگریز عورت کے چہرے پر خوف اور رحم کے جذبات طاری ہیں اور یہ اجنبی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ انگریز مرد کھڑا ہو جاتا ہے)

انگریز مرد۔ پیاری۔ آپ کے لئے یہاں بیٹھنا ذرا مشکل ہی ہے۔ ہے نہ؟

(اپنی بانہہ اس کی بانہہ میں ڈال دیتا ہے۔ اسے اوپر اٹھاتا ہے اور دروازے میں سے اس طرح باہر لے جاتا ہے جس طرح کوئی کسی کو دھکا دیتا ہے وہ چلی جاتی ہے۔ لیکن پیچھے مڑ کر دیکھتی جاتی ہے)

امریکن۔ (سنجیدگی کے ساتھ) میرے نزدیک جرأت سب سے زیادہ
قابلِ تعریف چیز ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ میں برآمدے
میں جا کر سگرٹ پیوں۔

(جب وہ باہر جاتا ہے تو اجنبی بڑی شوق آمیز نظروں سے اُسے
دیکھتا ہے۔ گوناک اور منہ چڑھا کر وہ بچہ کو اپنے سے ذرا پرے
کرتا ہے اور دھیرے دھیرے ہلانے لگتا ہے۔ اٹھ کر بچہ
کو مقابل والی نشست پر لٹا دیتا ہے اور کھڑکی کو نیچے کر دیتا ہے
اس کام سے نبٹ کر وہ بچہ کی طرف دیکھتا ہے جو رو رہا ہے
دفعتاً وہ اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھاتا ہے اور دونوں ہتھیلیوں
کو جوڑ دیتا ہے۔ بعینہٖ ایسے جیسے کوئی معصوم بچہ دعا مانگ رہا ہو
چونکہ بچہ چپ نہیں ہوتا، وہ اس کے ارد گرد بڑی پریشانی سے
گھوم رہا ہے۔ اُسے اٹھا لیتا ہے اور کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف
کر کے اُسے بہلانے لگتا ہے۔ جب بچہ چپ نہیں ہوتا۔ وہ
دھیمی اور بے سُری آواز میں اُس کے کانوں کے پاس منہ
لے جا کر گانے لگتا ہے۔ بچہ مسحور ہو کر چپ کر جاتا ہے۔ ابھی
وہ گا رہا ہے کہ امریکن ڈبے کے برآمدے میں آتا ہے۔ ساتھ والی
کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر دروازے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ کھڑکی
میں سے خشک ہوا اندر آ کر اُس کے بالوں کو سہلا رہی ہے۔
سگرٹ کا دھواں سب طرف چھایا ہوا ہے۔ اجنبی گانا بند کر دیتا
ہے اور شال کو ذرا اوپر اٹھا دیتا ہے تاکہ خشک ہوا بچے کے
سر تک نہ پہنچ سکے)

امریکن۔ (سنجیدگی کے ساتھ) ایسا مقدس واقعہ میں نے اس سے پیشتر
کبھی نہیں دیکھا۔ یہ تو اس قابل ہے کہ دنیا سے کبھی مٹنے نہ دیا
جائے۔ (اجنبی تعجب کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے)
بندہ پرور آپ سپارٹ جدیدہ کے احساسات و جذبات کا ایک
نادر نمونہ ہیں۔ آپ ان بلند خیالات کے حامل ہیں جو ہر شخص کے
دل میں پائے جاتے ہیں۔
(اجنبی بچے کو لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور امریکن کی طرف بڑھنے کے
لئے قدم اُٹھاتا ہے)
میرا خیال ہے کہ ڈائننگ ہال میں میرا انتظار ہو رہا ہے (غائب
ہو جاتا ہے۔

(اجنبی دوبارہ بیٹھ جاتا ہے انجن کی طرف پشت کر کے اور خشک
ہوا سے بچ کر۔ بڑے صبر و تحمل سے بچے کو اپنے گھٹنوں پر اچھالتے
ہوئے کھڑکی میں سے باہر دیکھتا ہے)

تیسرا سین

سٹیشن کا پلیٹ فارم۔ اجنبی، بچے اور گٹھڑی کو سنبھالے ہوئے
بڑے اضطراب کے عالم میں کھڑا ہے۔ مسافر گزر رہے ہیں
اور سامان اٹھایا جا رہا ہے۔ سٹیشن ماسٹر اور پولیس کا ایک سپاہی
ایک عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں)

افسر۔ (ہاتھ میں پکڑے ہوئے تار کو دیکھ کر) یہی آدمی ہے۔
(اجنبی کی طرف بڑھتے ہوئے)

افسر۔ کیا آپ نے یہ بچہ چرایا ہے؟

اجنبی۔ میں صرف انگریزی اور امریکن بول سکتا ہوں۔

افسر۔ یہ آپ کا بچہ تو نہیں ہے نہ؟
(بچہ کو ہاتھ لگاتا ہے)

اجنبی (اپنے سر کو ہلاتے ہوئے) ذرا دیکھئے گا یہ بیمار ہے۔
(افسر کچھ نہیں سمجھتا)
بچہ۔

افسر۔ (اپنے سر کو ہلاتے ہوئے) جھوٹ نہ بولنا۔ یہ آپ کا بچہ تو نہیں ہے نہ؟ ہیں!

اجنبی۔ (بڑے زور سے سر ہلا کر) نہیں بالکل نہیں۔

افسر۔ (تار کو کھڑکھڑا کر) خوب تو آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔
(سپاہی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اجنبی کو گرفتار کر لیتا ہے)

اجنبی۔ جناب کیا معاملہ ہے۔ میں اس مسکین بچہ کو لینا تو نہیں چاہتا۔

افسر۔ (گٹھڑی کو اوپر اٹھا کر) یہ آپ کی گٹھڑی تو نہیں ہے نہ؟

اجنبی۔ نہیں۔

افسر۔ خوب۔ بہر حال آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔

اجنبی۔ میں نے صرف اُس غریب عورت کی خاطر اسے اٹھایا تھا۔ میں
کوئی چور نہیں ہوں۔ میں، میں،

افسر۔ سر کو جنبش دے کر جھوٹ نہ بولو۔

(اجنبی اپنے بالوں کو نوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچہ بے چین ہو کر
رونے لگتا ہے)

اجنبی۔ (اسے پچکارتے ہوئے) میرے بیٹے۔ میرے ننھے چپ چپ!

افسر۔ چپ چاپ کھڑے رہو۔ آپ زیر حراست ہیں۔ ابھی معاملہ صاف ہو جائے گا۔

اجنبی۔ اس کی ماں کہاں ہے؟

افسر۔ وہ دوسری گاڑی سے آ رہی ہے۔ ابھی یہ تار آیا ہے کہ جس آدمی کے پاس اس قسم کا بچہ اور سیاہ رنگ کی گٹھڑی ہو اُسے گرفتار کر لیا جائے۔

(اجنبی سامان کی طرف دیکھتا ہے)

افسر۔ میرے ساتھ آؤ۔

(اجنبی کو اس دروازے کی طرف لے جاتے ہیں جس سے وہ آئے تھے۔ ایک آواز انہیں ٹھہرا لیتی ہے)

امریکن۔ (کافی دور سے) ذرا ایک منٹ ٹھہریئے۔

(افسر ٹھہر جاتا ہے۔ اجنبی بھی ٹھہر جاتا ہے اور ایک بنچ پر جو دیوار کے پاس پڑا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ پولیس کا سپاہی بت بن کر اس کے پاس کھڑا ہے۔ امریکن ایک دو قدم آگے بڑھتا ہے اور اشارہ کرتا ہے۔ افسر اس کے پاس جاتا ہے)

امریکن۔ یہ تو بلاشبہ کوئی آسمانی فرشتہ ہے۔ وہ وردی والے صاحب یہاں کیوں کھڑے ہیں؟

افسر۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

امریکن۔ اچھا۔ آپ میرے اشاروں کو سمجھتے جایئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ (اجنبی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر پرواز کرنے کی سی حرکت کرتا ہے) آپ کے سامنے آسمانی فرشتہ کھڑا ہے۔ آپ کے نزدیک ایک ایسا آدمی موجود ہے جس میں خدائی (اوپر کی طرف اشارہ کرتا ہے) صفات پائے جاتے ہیں۔ اسے گرفتار کرنا واجب نہیں (گرفتار کرنے کی حرکت کرتا ہے) میں صحیح عرض کرتا ہوں۔ جناب یہ فطرت کی ستم ظریفی سمجھئے کہ اُس بے چارے پر اس معصوم بچے کا بوجھ لاد دیا گیا (پیار کرنے کی حرکت کرتا ہے) یہ اجنبی سونے کا دل رکھتا ہے۔ (دل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک طلائی سکہ جیب سے نکالتا ہے)

افسر (یہ خیال کر کے کہ اُسے رشوت ملنے لگی ہے) جناب یہ اچھی بات نہیں۔

امریکن۔ آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے (اجنبی کی طرف اشارہ کر کے) صاحب (اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے) یہ (سکے کی طرف اشارہ کر کے) طلائی ہے۔ یہ ایک نہایت حسین پھول ہے۔ بے حد ظلم ہوگا کہ کوئی سرکاری کارندہ اُسے توڑ ڈالے۔

(ایک چھوٹا سا مجمع لگ گیا ہے۔ جس میں دو دو انگریز میاں بیوی جرمن اور ولندیزی نوجوان بھی شریک ہیں)

افسر۔ آخر اس کے معنی کیا ہیں! (تار پر ہاتھ مارتا ہے) بہرحال مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

امریکن۔ میں آپ کو صحیح صحیح حالات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک سفید رنگ آدمی ہے۔ غالباً خدا کی زمین پر اس سے زیادہ صاحب دل اور کوئی نہ ہوگا۔

افسر۔ خیر یہ مناسب ہو یا غیر مناسب مجھے تو ہر حال میں اپنا فرض ادا کرنا ہے (اجنبی کی طرف جانے کے لئے گھومتا ہے)

امریکن۔ اوہ بہت خوب۔ اچھا کر لیجئے اُسے گرفتار۔ اور اپنے فرض کو انجام دیجئے۔ یہ بچہ متعدی بخار میں مبتلا ہے۔

(متعدی بخار کا لفظ سن کر افسر رک جاتا ہے)

امریکن۔ (اشارے کرتے ہوئے) خطرناک متعدی بخار۔ سیاہ متعدی بخار۔ اب آپ سمجھے۔ مجھے آپ نیز اس وردی والے سپاہی پر رحم آتا ہے۔ اچھا آپ اپنا فرض انجام دیجئے۔

افسر۔ متعدی بخار۔ اس بچے کو متعدی بخار ہے!

امریکن۔ میں آپ کو بتا تو رہا ہوں۔

افسر۔ کیا گاڑی میں ہو گیا۔

امریکن۔ (مختصر سے مجمع پر نظر دوڑا کر) یہ صاحب میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔

افسر۔ (بڑی گھبراہٹ میں اور سپاہی کو مخاطب ہو کر کھڑا رہنے کا اشارہ کر کے) کیا یہ صحیح ہے؟

امریکن۔ آپ میری بات کو سچ جانئے۔

افسر۔ ابے پہرے دار ادھر آؤ۔

(پہرہ دار بچے کو لینے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ چاروں طرف سے لوگوں کا مجمع اجنبی کو تعجب کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور وہ حلقے کے مرکز میں بڑا اداس بیٹھا۔ بچے کو اچھال رہا ہے)

افسر۔ (اپنے نتھنوں کو اوپر اٹھا کر) اب کیا کرنا چاہئے؟

امریکن۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ بچے کو لے لیں۔

(خاموشی۔ اجنبی بڑی دھیمی آواز سے بچے کے پاس منہ لے جا کر سیٹی بجا رہا ہے اور اُسے پچکار رہا ہے)

افسر۔ (تار کو دوبارہ دیکھ کر) جس آدمی کے پاس سیاہ رنگ کا بچہ ہو اُسے گرفتار کر لو (اپنے سر کو جنبش دے کر) ہمیں ضرور اس نوجوان کو پکڑ لینا چاہئے (جرمن کی طرف منہ کر کے) ان سے کہئے کہ بچے کو نیچے رکھ دیں (اس طرح اشارہ کرتا ہے جس طرح کسی چیز کو نیچے رکھتے ہیں)

جرمن۔ (اجنبی کو مخاطب کر کے) یہ کہتے ہیں کہ بچے کو نیچے رکھ دیجئے

(اجنبی اپنے سر کو ہلاتا ہے اور بچے کو پچکارتا رہتا ہے)

افسر۔ آپ کو حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔

(اجنبی کا چہرہ خاموشی میں چمک اٹھتا ہے)

انگریز۔ (پیچھے سے بڑبڑا کر) نیک مرد

جرمن۔ اسے اپنی تو پروا ہی نہیں۔

افسر۔ (پھر اشارہ کر کے) آپ بچے کو نیچے رکھ دیجئے۔ (اجنبی برا منہ بنا کر اس کی طرف دیکھتا ہے) اور میرے ساتھ چلئے۔

(بچہ رونے لگتا ہے)

اجنبی۔ کیا اس معصوم بچے کو یہاں اکیلا چھوڑ جاؤں؟ آپ کس قدر بے رحم ہیں

امریکن۔ (بڑے جوش میں آکر ٹرنک پر چڑھ جاتا ہے) سنگدل

(انگریز تالیاں بجاتے ہیں۔ ولندیزی نوجوان ہنس پڑتا ہے۔ افسر بڑے غصے سے کچھ بڑبڑا رہا ہے)

امریکن۔ یہ جبر جنگ کیا کہتا ہے؟

جرمن۔ یہ کہتا ہے کہ اجنبی نے اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کے لئے بچے کو پکڑ رکھا ہے اور یہ بڑا ہی ہوشیار ہے۔

امریکن۔ میرے خیال میں آپ اس سے ناانصافی کر رہے ہیں (اپنے ہاتھ کو زور سے اجنبی کی طرف ہلاتے ہوئے) یہ پاک باطن اور نیک آدمی ہے۔ اس کے پاس ایک سیاہ فام بچہ ہے جسے وہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ میرے خیال میں اگر ہمیں بھی موقع ملے تو ہم بھی ایسے حالات میں اس قسم کے شریفانہ رویے کا ثبوت دیں۔

(اجنبی بچے کو پکڑے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک دو قدم آگے بڑھتا ہے۔ مجمع جو پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے گزرنے کے لئے راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ امریکن پہلے سے بھی زیادہ اونچے ٹرنک پر چڑھ جاتا ہے۔ اجنبی ایک طرف ہو کر پھر بیٹھ جاتا ہے)

امریکن۔ (افسر کو مخاطب کر کے) بہتر ہو گا اگر آپ اپنے ارادے سے باز رہیں اور بچے کی ماں کا انتظار کریں۔

افسر۔ (اپنے پاؤں کو زمین پر مار کر) ماں کو بھی بچے کو متعدی بخار کی حالت میں باہر لے جانے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور (اجنبی کو مخاطب کر کے) بچے کو نیچے رکھ دو (اجنبی مسکراتا ہے) کیا آپ نے سنا؟

امریکن۔ (افسر کو مخاطب کر کے) ذرا میری طرف دیکھئے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بات کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ یہ منظر کیسا حسین ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی شخصیت موجود ہے جو اس سیاہ فام بچے کی خاطر جس کا اس پر کوئی حق نہیں ہے، جان قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ جناب عالی! ان کا طرزِ عمل بالکل ایک سچے عیسائی کا سا ہے۔

افسر۔ (بڑے غصے میں آکر) اپنے فرض کی سرانجام دہی کے لئے مجھے کسی کو حکم دینا پڑے گا۔

امریکن۔ یہ واقعی قابلِ لطف چیز ہو گی۔

افسر۔ (سپاہی کو مخاطب کر کے) اس سے بچے کو لے لو۔

(سپاہی کچھ بڑبڑاتا ہے لیکن بچے کو نہیں لیتا)

امریکن۔ (جرمن سے) میں نہیں سمجھا۔

جرمن۔ یہ کہتا ہے کہ وہ اس کا افسر نہیں ہے۔

امریکن۔ یہ تو واقعی بڑی افسردہ کن بات ہے۔

افسر۔ (اردگرد دیکھ کر) کیا کوئی آدمی اس بچے کو نہ لے گا؟

انگریز عورت۔ (افسردہ دل کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھا کر) ہاں! میں . . . .

انگریز آدمی۔ (اس کا بازو پکڑ کر) برائے خدا، کیا آپ . . .

افسر۔ (بچے کو لینے کی زبردست کوشش کی تیاری کر کے، اور ایک دو قدم آگے بڑھ کر) میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ (ذرا ٹھہر جاتا ہے اور اس کی آواز ساکن ہو جاتی ہے) یہاں بیٹھ جائیے۔

امریکن۔ خوب۔ کیا ہی عجب آدمی ہے۔ کیا فرض شناسی ہے۔

(دلشیزی نوجوان مسکراتا ہے۔ افسر ماں کی طرف دیکھتا ہے لیکن اس اثنا میں بچے کی ماں دوسرے جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی آتی دکھائی دیتی ہے)

ماں۔ لوگو۔ لوگو۔ میرا بچہ۔

(اس کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ وہ اجنبی کی طرف جھپٹتی ہے)

افسر۔ (سپاہی کو) اس عورت کو گرفتار کر لو۔

(سپاہی عورت کو پکڑ لیتا ہے)

افسر۔ (خوف زدہ عورت سے) اس بچے کو تم کیوں باہر لئے پھرتی ہو۔ یہ تو متعدی بخار میں مبتلا ہے۔

امریکن۔ (بڑی بے تابی کے ساتھ) اس نے کیا کہا؟ میں ایک ایک لفظ سننا چاہتا ہوں۔

جرمن۔ یہ کہتا ہے کہ تو کیوں اس بچے کو اپنے ساتھ لائی جو متعدی بخار میں مبتلا ہے۔

امریکن۔ خیر سوال تو معقول ہے۔

(اپنی دوربین کو ٹھیک کرتا ہے اور بچے کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

ماں۔ (پریشان ہو کر) میرا بچہ۔ متعدی بخار میں مبتلا؟

(اپنے سر کو بڑے زور سے ہلاتی ہے) ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

افسر۔ اس کو متعدی بخار ہے۔

ماں۔ (اپنے سر کو ہلا کر) نہیں نہیں۔ نہیں۔

امریکن۔ (اپنی دوربین میں سے دیکھتے ہوئے) میرے خیال میں یہ ٹھیک کہتی ہے۔ میرے خیال میں جس گیلے کپڑے پر بچہ لیٹا ہوا تھا۔ اُسے متعدی بخار تھا اور اُسی سے بچہ کو ہو گیا ہے۔

(دلشیزی نوجوان ہنسنے لگتا ہے)

افسر۔ (اس کی طرف بڑے غصے سے دیکھ کر) اس کو ہے متعدی بخار۔

امریکن۔ وہاں سے آپ کو ٹھیک نظر نہیں آتا۔ یہاں میرے پاس آ کر دیکھئے۔

(افسر اوپر چڑھ جاتا ہے اور دوربین سے دیکھتا ہے)

امریکن۔ (اجنبی سے) بچے کی ٹانگوں پر سے کپڑا اتار دیجئے۔ اگر ہمیں اُن پر داغ نہ ملے تو میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔

(اجنبی بچے کے ننھے سے سفید پاؤں کو آگے کرتا ہے)

ماں۔ میرا بچہ۔ (مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے)

امریکن (دھلے ہوئے گیلے کی طرح سفید) (افسر سے طنزاً) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے متعدی بخار کا نام اسلئے لیا کہ ہم سب کو احمق بنا دیا ہے۔

افسر۔ عورت کو جانے دو۔

(سپاہی عورت کو چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے بچے کی طرف بھاگتی ہے)

ماں۔ میرے بچے۔

(بچے کو چونکہ اجنبی کے گرم ہاتھوں کی جگہ اب ماں کے سرد ہاتھ چھو رہے ہیں اس لئے رونے لگتا ہے)

افسر۔ (نیچے اتر کر اور سپاہی کو اشارہ کر کے) ملزم کو پکڑ لو۔

(سپاہی اجنبی کا بازو پکڑ لیتا ہے)

امریکن۔ اب کیا بات ہے کیا آپ اسے جیل ہی میں ٹھونس کر رہیں گے۔

(ماں جو ابھی تک بچے کو جس نے اب رونا بند کر دیا ہے پیار کر رہی ہے۔ اجنبی کو بغور دیکھتی ہے جو ابھی تک آنکھیں اوپر کئے بیٹھا ہے دفعتہً وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتی ہے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے پاؤں کو اوپر اٹھاتی ہے اور چوم لیتی ہے)

امریکن۔ (اپنے ہیٹ کو ہلا کر) زندہ باد، زندہ باد (جلدی سے نیچے اتر آتا ہے۔ اجنبی کے پاس جاتا ہے جس کے بازو کو سپاہی نے چھوڑ دیا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) برادرم مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ مسرت بخش موقع آج تک مجھے میسر نہیں ہوا (اجنبی کو مجمع کے سامنے کر کے) غالباً میں یہ کہنے میں آپ کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں کہ یہ لوگ اس بات میں اپنی عزت سمجھتے ہیں کہ اس اسٹیشن کی بے کیف فضا میں، اپنے اس ننھے سے دوست کی ہمراہی میں سانس لے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب ہم گھر جائیں گے تو اس کی یاد کو اپنے دلوں میں ساتھ لے جائیں گے اور غالباً ہمارے تمام یادگار واقعات میں سے یہ واقعہ افضل ترین ہوگا اور شاید یہ خاتون بھی جب گھر جائے گی تو ہمارے اس چھوٹے بھائی کی یاد کو ساتھ لے جائے گی۔ نوع انسان کے متعلق میرے ایقان میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ محترم خاتون و حضرات! میں آپ کے سامنے ایک شخص کو پیش کر رہا ہوں۔ جسے مافوق الفطرت ہستی بننے کے لئے صرف ہالہ کی ضرورت ہے (اجنبی کو مخاطب کر کے) از راہ کرم کھڑے ہو جائیے

(اجنبی جو اس بافتہ ہو کر کھڑا رہتا ہے۔ سب اس کے نزدیک آ جاتے ہیں۔ افسر

اس کے سامنے جھکتا ہے۔ سپاہی سلام کرتا ہے۔ ولندیزی نوجوان اپنا سر ہلاتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے۔ جرمن تن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بڑی پھرتی کے ساتھ دو دفعہ آداب بجا لاتا ہے۔ انگریز اور اُس کی بیوی کم از کم دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ پھر کسی مصلحت کے مدِ نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور واپس ہو جاتے ہیں۔ ساں اس کے ہاتھ کو چوم لیتی ہے۔ ہیرو ایک قندیل لئے جا رہا ہے جس کا عکس سورج کی کرنوں سے سطلا ہو کر جبنی کے چہرے پر پڑتا ہے۔ اور اس کی اوپر اُٹھی ہوئی نگاہیں روشنی کا مخرج ڈھونڈتی ہیں۔

امریکن۔ (آگے بھاگ کر اور اپنے گھٹنے ٹیک کر) براہِ خدا ایک منٹ تک اسی طرح کھڑے رہئے میں چاہتا ہوں کہ اس غیر معمولی واقعہ کا فوٹو لے لوں (اپنے جیبی کیمرہ کو ٹھیک کرتا ہے) یہ اول درجہ کی چیز ہوگی۔

(پردہ)

(چودھری) **اکبر علی** ایم اے

(گالنڈروی)

رباعی

یہ محوِ حرم اور وہ مشغولِ کنشت

یاں بحث و نزاع اور وہاں جنگ و خشت

میں کنجِ خرابات میں سب سے فارغ

ساغر کو لئے دیکھتا ہوں خوابِ بہشت

سعید احمد اعجاز

رہنے دے

دلِ حزیں کو مرے بے قرار رہنے دے

سرورِ غم سے اسے ہمکنار رہنے دے

ہوا پھر آج چمن گیر نغمۂ بلبل

چمن میں آج مجھے میگسار رہنے دے

مری بلا سے جو ہنستے ہیں پھول ہنسنے دے

اے گلعذار مجھے اشکبار رہنے دے

نہ پوچھ دردِ دروں شرحِ حالِ زار نہ پوچھ

مرے خدا کو مرا راز دار رہنے دے

عبث خیال ہے تجھ کو مرا خیال عبث

مجھے فریبِ نظر کا شکار رہنے دے

مرے الم پہ نہ تو اپنے دل کو میلا کر

مرے ہی دل کو مرا غمگسار رہنے دے

ترے کرم کی ضیا تاب لا نہیں سکتا

کئے جا پیار کی باتیں یہ پیار رہنے دے

پرشوتم لال ضیا

نوازشِ ناز

دیا خاکستری و نیلگوں رومال کیا مجھ کو
محبت کے دیئے گویا زمین و آسماں تم نے

کیا ہے آرزو کو ہمکنارِ لطفِ بے پایاں
عقیدت کو مری بخشی حیاتِ جاوداں تم نے

سنا کر پیار سے مہر و وفا کا قصۂ رنگیں
مٹا دی صفحۂ ہستی سے غم کی داستاں تم نے

دکھا دی راہ منزل کی بیابانِ محبت میں
کیا درماندہ رہرو کو امیرِ کارواں تم نے

کہاں میں اور کہاں اس درجہ پامالِ کرم ہونا
گریبانِ شکایت کی اُڑا دیں دھجیاں تم نے

تماشا دیکھنا منظور ہے اب شادکامی کا؟
مری محرومیوں کا کر لیا کیا امتحاں تم نے؟

قیوم نظر

باقیات تائب

نہ چھوڑا گردشِ قسمت نے کوئی امتحاں باقی
گیا دورِ محبت رہ گیا دورِ زماں باقی

کہاں کا ہوش کیسا جوش کس کی آرزومندی
نہیں یادِ شبِ عشرت بجز خوابِ گراں باقی

برائے نذرِ اہلِ شوق میرے پاس اب کیا ہے
نہ وہ زورِ بیاں باقی نہ وہ لطفِ زباں باقی

نہ ڈھونڈھ اے ہمنشیں میرے نفس میں سوزشِ الفت
شررآباد تھا جو دل نہیں اس میں دھواں باقی

نزاعِ ہمصفیراں برقِ فتنہ بن گیا آخر
نہ گلشن کا نشاں چھوڑا نہ میرا آشیاں باقی

دلِ صحرا میں مجنوں کی تمنا ڈھونڈھنے والے
مری خاکِ پریشاں ہے جنوں کی رازداں باقی

ٹھہر جاؤ مری خاکِ وفا کے منتشر ذرّو
فضائے دشتِ غم میں ہیں ابھی کچھ آندھیاں باقی

ابھی تک ہے تجھے ذوقِ فغاں تائب گلستاں میں؟
ابھی تک ہے بہارِ حسن کا تجھ کو گماں باقی؟

(ملک) مراتب علی خاں تائب

شکستِ پیہم

گھمنڈی لال آئے اور رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے چپکے سے کھاٹ پر پڑ رہے۔ ہوا زور سے چل رہی تھی گھر کا چراغ بجھ گیا تھا مگر ان کو سانس لینے کے لئے مزید ہوا کی ضرورت تھی۔ ذمہ داری کا احساس ان کی گردن پر سوار تھا۔ وہ دانت پیس کر خود کو کوسنے لگے۔ آخر وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سیدھا سادا تو بہانہ تھا کہلا دیتا کہ کسی تقریب میں گئے ہیں۔ لیکن اگر مداری نہ مرتا تو اپنے منہ پر کالک لگ جاتی۔ اور ساری عمر طعنے سنتا کہ جنم بھر کے دوست نے ضرورت کے وقت منہ پھیر لیا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ راج رانی جھلائے گی مگر دنیا تو نہ جانے گی۔ بہرحال طرح طرح سے اپنے دل کو سمجھا کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہوں نے کام تو برا نہیں کیا ہے لیکن آپس کی شکر رنجی کی وجہ سے نتیجہ اگر خراب نکلے تو دوسری بات ہے۔

بے چارے دن بھر کے بھوکے تھے مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ راج رانی کو بلا کر کچھ مانگ لیں۔ سوچتے تھے کہ جب تک بیوی کا سامنا نہ ہو غنیمت ہے۔

کیلاش ماں کے ڈر سے گھبرایا ہوا آیا اور گھمنڈی لال کی چارپائی پر ایک کنارے بیٹھ گیا۔ تاریکی میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے لیمپ جلایا تو ماں ڈھونڈھتی ہوئی پہنچے گی اور اُسے جبراً بکری کا دودھ پینا پڑے گا۔ پہلے تو اُس کے جی میں آیا کہ کسی پڑوسی کے گھر چل کر سبا کو پی آئے لیکن کھانے کا وقت قریب جان کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ اسی چارپائی پر پڑ رہیں اگر ماں کھوجتی ہوئی آئے گی تو کہہ دوں گا کہ اماں آنکھ لگ گئی تھی اور اگر بچ گیا تو کیا کہنا۔

گھمنڈی لال اس کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور نوکر سمجھ کر اس کی خوشامد کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن جب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اتنا چھوٹا قد کیلاش کے [illegible] کسی کا نہیں ہو سکتا تو ان کو اطمینان ہوا۔ انہوں نے دھیرے سے کہا کیلاش" اور چاہا کہ دو دن کی باتیں اس سے پوچھ لیں اور اگر ہو سکے تو بازار سے کچھ کھانے کے لئے بھی منگوا لیں۔ حالانکہ ایسا کرنے میں کچھ خطرہ بھی تھا۔ اگر کیلاش دو تین اڑا کر اس کے گر جانے کا بہانہ کر دے یا راج رانی آ جائے تو!

کیلاش نے سوچا "دادا افیم منگاتے ہوں گے چلو سے آئیں۔ بہانہ بھی مل جائے گا کہ بازار گیا تھا۔"

گھمنڈی لال نے کھونٹی سے لٹکتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ابھی بے چارے پیسے نکال بھی نہ پائے تھے کہ کمرے میں روشنی معلوم ہوئی۔ پیروں کی دھمک صاف بتلا رہی تھی کہ راج رانی کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ بھی غصے میں ہے۔

گھمنڈی لال کوٹ لئے ہوئے چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔ بدحواسی میں جیب سے ہاتھ نکالنا بھول گئے۔ کیلاش اُن کے پاس حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

راج رانی نے خاوند کو دیکھ کر کہا "او ہو آ گئے آپ۔ چوروں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں۔ باہر آئیے۔ مجھ سے ڈر لگتا ہو تو پردہ کر لوں گی۔ اچھا پیسے نکال رہے ہیں۔ افیم آئے گی۔ تولہ بھر تو تمہارے پاس ہی ہو گی۔ کیا آج زیادہ کھانے کا بچار ہے۔ لیکن پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ گئے کہاں تھے۔ اوئی بولتے کیوں نہیں۔ کیا منہ سے بولنا گناہ ہے یا اس مرتبہ مجھ سے بات کرنے کی قسم کھا کر آئے ہو"!

گھمنڈی لال نے انتہائی ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا "اتنی خفا کیوں ہوتی ہو۔ مداری بہت بیمار تھا اُسی کو دیکھنے گیا تھا۔ اگر نہ جاتا تو جنم بھر یہی سنتا کہ دوست بیمار تھا اور دیکھنے بھی نہ گئے"۔

"اچھا یہ بات ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ جب تم کبھی بیمار پڑتے ہو تو کوئی نہیں دیکھنے آتا۔ مداری تو دو دو دن تک پڑے رہتے تھے لیکن

کبھی بھول کر بھی اتنا نہ ہوا کہ دھیلے پیسے کی کوئی چیز لیتے آتے۔ یہاں گھر میں تو سب لوگ عمر میں اُن سے چھوٹے ہی تھے۔"

"بیچارہ اچھا تھا یا بُرا، اب اس کو کچھ نہ کہو۔ بڑی بُری موت پائی۔ سب جگہ آدمی بھیجے، تار دلوائے لیکن کہیں سے کوئی نہ آیا۔"

"ہاں تمہیں تو وہ خزانہ سونپ گئے۔ پھر تمہارے سوا بھلا کون جاتا!"

گھمنڈی لال سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا "یہ تو تم ناحق کہتی ہو۔ ہم دونوں بچپن کے دوست تھے۔ اسی کی رائے سے تو میں نے تم سے بیاہ کیا ـــ"

"تبھی تو میں اُس سے جلتی ہوں کہ میرا بیاہ تمہارے ایسے کھوسٹ سے کرایا۔"

گھمنڈی لال کو اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ "خیر تم چاہے جو کہو لیکن میں تو اُسے بہت مانتا تھا۔ مرتے دم تک اُس نے کسی اور پر اعتبار نہیں کیا۔"

"سوائے تمہارے! کیوں! لیکن اُن کے تو ایک لڑکی بھی ہے نہ؟ وہ کیسے سونپ گئے؟"

گھمنڈی لال جس بات سے گریز کر رہے تھے وہی سامنے آئی۔ مرتے وقت مداری اپنی اناتھ لڑکی کا ہاتھ گھمنڈی لال کے ہاتھ میں دے کر کہہ گیا تھا کہ دوست میں اس کو تمہیں سونپ جاتا ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میرے رشتے دار مجھے دم توڑتے دیکھ کر میری جائیداد کو کتوں کی طرح للچائی نظروں سے دیکھتے اور میری ہر طرح کی سیوا کے لئے تیار نظر آتے۔ لیکن آج کسی کا پتہ نہیں۔ معلوم نہیں مرنے کے بعد اس مٹی کی کیا درگت ہوگی۔ خیر جیتے جی کون سی حسرت رہ گئی جو مرنے کا غم کروں۔ لیکن بھیّا میری لڑکی کا خیال رکھنا۔ میری اولاد میں لے دے کر یہی ایک کنیا رہ گئی ہے۔ آدبڑا اور دت ہے۔ بھائی میں تم سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ مرتے وقت دنیا کی ساری چیزیں تو چھن ہی جاتی ہے کیا اچھا ہوتا اگر بولنے کی طاقت مرتے دم تک یوں ہی بنی رہتی۔ آدمی بول چال کر ہی اپنا ارمان پورا کر لیتا۔ بھائی تم بولتے کیوں نہیں۔ اچھا نہ بولو۔ میں جانتا ہوں تمہاری ایک چپ ہزار ہاں کے برابر ہے۔ . . ."

گھمنڈی لال اور مداری بابو دونوں بچپن کے دوست تھے۔ اس وقت سے جبکہ دونوں ننگے بدن کھیلتے تھے۔ ایک ساتھ مدرسے جاتے اور ایک ساتھ ہی وہاں سے گلی ڈنڈا کھیلنے کے لئے بھاگتے تھے۔ جوانی میں دونوں کو ایک ساتھ بازارِ حُسن کی سیر کا شوق پیدا ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ جوا کھیلنے جانے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ شراب پی اور ساتھ ہی ساتھ سر پھوڑے اور آخر کار دونوں اپنے اپنے گھروں میں آگ لگا کر ایک ساتھ بیٹھ بھی رہے۔ مداری دیہات چھوڑ کر شہر میں چلا گیا اور وہاں کسی طرح گزر اوقات کرنے لگا۔ گھمنڈی لال کو اتفاق سے لاٹری میں دو ہزار روپیہ مل گیا اور ذرا حالت سنبھل گئی۔ اور مستقبل شاندار نظر آنے لگا۔ لیکن مداری جوں کا توں رہا۔ خاک نشین۔ گھمنڈی کا رہین منت۔

آخر عمر میں مداری نے گھمنڈی لال کو سمجھنے میں غلطی کی۔ درحقیقت گھمنڈی لال کے عادات واطوار میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ لیکن اُس کی نئی بیوی سخت گیر واقع ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ عطیہ بھی انہوں نے مداری کی سفارش سے ہی قبول کیا تھا۔ راج رانی کو دونوں بڈھوں کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت ہی برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی اور بالکل ٹھیک سمجھتی تھی کہ دونوں کھوسٹ جب ایک ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے تو سوائے شراب اور افیم کے اُن کا شغل ہی کیا ہوگا۔ اسی لئے جب کبھی گھمنڈی لال غائب ہوتے تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ وہ فوراً تاڑ جاتی کہ بوڑھا ضرور مداری کے پاس گیا ہوگا اور اس کی بات ہمیشہ ٹھیک ہوتی تھی۔

گھمنڈی لال ڈرتے تھے کہ اس وقت جبکہ راج رانی غصہ میں ہے مداری کی لڑکی کا ذکر نہ چھیڑے۔ وہ اس ناخوشگوار داستان کو کسی خاص موقع تک کے لئے ملتوی رکھنا چاہتے تھے۔ جب وہ بیوی کی فرمائش کے بغیر اس کے لئے کوئی تحفہ لاتے اور وہ خوش نظر آتی اور ایسا ہونا اب ناممکن نہ تھا کیونکہ مداری مر چکا تھا لیکن افسوس یہ بات آج ہی چھڑ گئی۔ انہوں نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ لڑکی تو وہ میرے ہی . . .

"کیا! میں اس کی لڑکی کو اپنے یہاں ہرگز نہ رکھوں گی۔ اس کا حال کھوسٹ کی لڑکی جانتے ہو کیسی نکمی ہوگی۔ اُٹھ کر کبھی ایک گلاس پانی بھی تو نہ دے گی۔ تم اُس پر ریجھ گئے ہوگے۔ اپنوں کی روٹی کا تو ٹھکانا نہیں دوسروں کے لئے جھگڑا مول لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ لڑکی لانے سے کیا ہوتا ہے شادی بیاہ بھی تو تمہیں کو کرنا ہوگا۔ نابابا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میری مرضی بھی تو کوئی چیز ہے یا نہیں۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں" . . .

میاں بیوی دونوں میں ایک بات تھی۔

راج رانی سخت دل عورت تھی۔ وہ نہ تو کسی کے ساتھ نرمی سے پیش آتی تھی اور نہ کسی سے اس کو اچھے برتاؤ کی توقع تھی۔ کون ہے جو زہر دے کر اس کے جواب میں شہد پانے کی امید رکھتا ہو۔ دنیا میں پتھر کا

جواب پتھر سے دینے کا چلن ہے۔

گھمنڈی بات کے دھنی تھے۔ بیوی کا کھلے لفظوں میں مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ لیکن وہ اس کی پرواہی کب کرتے تھے۔ وہ بردبار آدمی تھے۔ حملہ نہیں کرسکتے تھے لیکن مدافعت کی طاقت اُن میں تھی۔ گھمنڈی لال چپ تھے۔ راج رانی بڑبڑا رہی تھی۔ پتھر پر اولے پڑ رہے تھے۔

(۲)

اُدھر کھڑی ہو کر کیا دیکھتی ہے! پاگل لڑکی۔ چاول پک گئے؟ ہائے رام میں کہتی تھی کہ اس مصیبت میں میں نہ پڑوں گی۔ لیکن اُن کو تو میری باتوں سے ضد ہو گئی ہے۔ میرے خلاف وہ ضرور کرتے ہیں"۔

اماں جی چاول تو کبھی کے تیار ہیں۔ آکر روٹی بنوائیے تو اندر چلوں ویسے وہاں جا کر کیا کروں"!

کشوری اکیلے روٹی بنا سکتی تھی محض حکم ملنے کی دیر تھی۔ راج رانی سے وہ بے حد ڈرتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب کشوری کوئی کام اپنی طبیعت سے کرتی تو راج رانی فوراً جواب طلب کرتی "آخر تم نے ایسا کس کے حکم سے کیا۔ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ تم نے سارا کام چوپٹ کر دیا۔ اسے یوں کرنا چاہئے تھا" اور اگر وہ حکم کا انتظار کرتی تو رانی اس کو بے اعتنائی کا مجرم قرار دے کر مورد الزام ٹھہراتی۔

کیلاش ساڑھے نو بجے اسکول جاتا تھا اسی لئے نو بجے تک کھانا تیار ہو جاتا تھا۔ گھر میں کل چار آدمی تھے، گھمنڈی لال۔ کیلاش۔ راج رانی اور کشوری لیکن راج رانی کی پریشانی دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک برات کا انتظام کرنا ہے۔ بات بات میں سخت سُست۔ جھاڑ جھپٹ طعنہ زنی یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت آ جاتی تھی۔ اگر کشوری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو طعنے کی جگہ مشفقانہ نصیحتیں لے لیتیں مگر سختی ہر حالت میں قایم رہتی۔ رانی کشوری کو زبان سے چاہے ہزار بار نکال دینے کی دھمکی دے مگر اُسے وہ کسی حالت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔ تنخواہ پر رہنا پیسے کوڑی کا نوکر کہاں ملتا ہے اور اگر مل بھی جائے تو اس پر اتنی آسانی سے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ آدمی روپیہ اور روٹی دونوں کا غلام ہے۔ روپیہ کا احسان بھلایا جاسکتا ہے لیکن روٹی کا احسان! تاں نمک کا غلام طعنہ زنی کے خوف سے کانپ جاتا ہے تنخواہ پانے والا نوکر ران۔ رانی کی سخت باتوں کا جواب دے سکتا تھا لیکن دونوں وقت آدھا پیٹ روٹی پانے والی کشوری! اس کی گردن میں احسان کا ایک طوق تھا۔ اگر کشوری رانی ہو جاتی تو بھی راج کو یہ کہنے کا خدائی حق حاصل تھا "کہ تجھ کو تمیز سکھلانے والی میں ہوں"۔ یہی تو بزرگوں کے خدا داد حقوق ہیں جن سے ہم انہیں کسی حالت میں بھی محروم نہیں کرسکتے! جو بزرگ پیدا ہوا ہے وہ ہر حالت میں بزرگ ہی رہے گا۔

کیلاش رفتہ رفتہ منزل شباب کے قریب پہنچ رہا تھا وہاں جہاں انسان دنیا کی ہر حسین چیز کا مستحق اپنے سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ کشوری سے بے نیاز تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ کشوری کی طرف متوجہ ہو سکے۔ بے چارہ تین برس سے نویں جماعت میں تھا اور ہر وقت اُسے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ اس سال بھی نہ رہ جاؤں، اس کے علاوہ دونوں کے درمیان نفرت کی ایک خلیج حائل تھی جو بدقسمتی سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ جب کبھی راج رانی کشوری پر خفا ہوتی تو کیلاش کشوری ہی کو ساری غلطیوں کا ذمہ دار سمجھتا۔ اُس وقت اپنی ماں اور پرائی بیٹی، کا خیال ماں کی اُن سختیوں کا خیال بھلا دیتا تھا جس کا اُسے کافی تجربہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ بچپن کی اُن سختیوں کو بھی بھول جاتا تھا جب ایک پیسے کے لئے روتے ہوئے دن کا دن گزر جاتا تھا مگر سوا طمانچے اور گھرکی کے کچھ نہ ملتا تھا۔

گھمنڈی لال مستقبل قریب میں کشوری کو اپنے لڑکے کی بہو بنانے والے تھے۔ اُن کے نزدیک ایسا کرنے سے جہاں وہ دوست کے فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ وہاں لڑکے کو بھی سندرسی بہو مل جاتی تیسرا فائدہ روپیہ کی بچت تھا۔ اتنی دور اندیشیاں اور یہی آرزوئیں ان کو بیوی کی سخت سُست کھوٹی کھری سننے پر مجبور کرتی تھیں۔ اگر وہ دلیری سے کام لے کر اپنا ارادہ راج رانی پر صاف ظاہر کر دیتے تو دونوں طرح کے نتیجے کی امید تھی ان کے بالکل خلاف یا بالکل موافق نتیجہ چاہے جو ہوتا لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ تذبذب میں نہ پڑے رہتے مگر وہ بیوی سے دو بدو گفتگو کرتے ہوئے اتنا خوف کھاتے تھے کہ اپنے خیالات کا راج رانی پر ظاہر کرنا اُن کے نزدیک اصل جرم کا ارتکاب کرنے سے بہت پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم قرار دینا تھا۔

اسی غم میں صبح و شام ہوتی تھی۔ جاڑے کے دن تھے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر بادل تھے۔ گھمنڈی لال چار بجے اُٹھ جاتے اور

کھانسنا شروع کر دیتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بیٹا کیلاش میں جاگ رہا ہوں۔ گڑگڑی تازہ کر کے دے آ۔ لیکن آج کوتوں کی آواز کے ساتھ لحاف کے اندر سے اُن کی نحیف آواز بالکل نہ سنائی دی۔ کیلاش تو تعمیلِ حکم کی غرض سے جاگ رہا تھا لیکن اُسے کیا پڑی تھی کہ باپ کو جگا کر دردِ سر مول لے۔ جب خوب سویرا ہو گیا تو تعریف کرانے کی غرض سے اُس نے گڑگڑی تازہ کر کے اس پر چلم لا کر رکھ دی۔ کچھ دیر میں چلم جل گئی مگر گھمنڈی لال نے منہ نہ کھولا۔ راج رانی اُدھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر لحاف اٹھا تو گھمنڈی لال مُنہ بنائے آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ گویا کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر بیوی کے ڈر سے کہہ نہیں رہے ہیں اور آنکھیں اس لئے بند تھیں کہ راج رانی کی خوفناک صورت دیکھ کر حرف مطلب نہ بھول جائیں۔

راج رانی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ دنیا اُس کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔

(۳)

راجیشور گھمنڈی لال کا چھوٹا بھائی تھا جو شہر کی کسی مِل میں کلرک تھا۔ جب سے راج رانی اور اس کی بیوی بسنتی میں اَن بَن ہو گئی تھی بے چارہ بھائی سے الگ رہتا تھا اس وقت والد زندہ تھے۔ باپ ایک وقت گھمنڈی لال کے یہاں کھاتا اور دوسرے وقت راجیشور کے گھر۔ اگرچہ جی یہی چاہتا تھا کہ اس کی خاطر تواضع کا بار بسنتی ہی لے مگر نہ تو بسنتی میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اس امر کا اعلان کر دے کہ بابوجی اب اُسی کے یہاں رہیں گے اور نہ بابوجی میں اتنی ہمت تھی کہ راج رانی کے نان نمک کو ٹھکرا سکیں۔ بوڑھا سوچتا تھا کہ چار دن کے لئے کیوں کسی سے دشمنی مول لے کر زبرے بنیں۔

بسنتی بہو کا لڑکا منوہر بی اے میں پڑھتا تھا۔ بچپن میں بڑا نٹ کھٹ رہا ہو گا لیکن اب شرارت کی جگہ ذہانت نے لے لی تھی۔ ہر گھڑی کتاب کھلی رہتی تھی۔

ایک دن راج رانی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ کھانا پکانے کا کام یوں تو گھمنڈی لال کے مرنے کے بعد کشوری ہی کے ذمہ تھا لیکن آج اس کو خاص طور پر ہدایت ملی تھی وہ جلد بھوجن تیار کر کے کیلاش کو کھلا دے۔ جب گھر میں ڈھونڈنے پر دیا سلائی نہ ملی تو بیچاری دوڑی ہوئی بسنتی کے گھر گئی۔ بسنتی کو یوں بھی کشوری کے دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا اور ان دنوں لڑکی پہلے سے بہت دُبلی ہو رہی تھی اُس نے پوچھا "تو کون ہے بیٹی؟"

کشوری نہ سمجھ سکی کہ کیا کہہ کر اپنا تعارف کرائے۔ منوہر بول اٹھا "ماں تم نے ان کو نہیں دیکھا۔ یہ تو چاچا کے یہاں بہت دنوں سے رہتی ہیں۔"

"چُپ۔ مجھ سے ہنسی کرتا ہے۔ وہ لڑکی تو بڑی سندر، گوری سی تھی اور اب بیاہنے کے لایق ہو گئی ہو گی۔"

منوہر کو ماں کی باتوں پر ہنسی آ گئی۔

اور کشوری کو؟

بسنتی سمجھ گئی اور رکیونی کجبتی۔ کیا وہ راج رانی کی عادتوں سے واقف نہ تھی۔ اُس نے اس وقت کشوری کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ماں اُس نے کشوری سے التجا کی کہ وہ کبھی کبھی فرصت کے وقت اس کے گھر بھی آ جایا کرے۔ کشوری نے ڈرتے ڈرتے اس بات کا وعدہ کیا۔

وہ دیا سلائی لینے آئی تھی اور لے کر چلی گئی۔

شام کو جب راجیشور آیا تو بسنتی نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ درحقیقت راجیشور کو اس میں کوئی آفت نہ تھی۔ سوال راج رانی کی ناراضگی کا تھا۔ ایک طرح سے کشوری رانی کی ملکیت ہو چکی تھی۔ آخر کار میاں بیوی کے مشورے سے یہ طے پایا کہ کشوری کو کبھی کبھی اپنے یہاں بلا کر راج رانی کے تیور دیکھے جائیں۔ اگر وہ مخل نہ ہو تو کام بننے کی توقع ہے ورنہ ہم لوگوں کا اختیار ہی کیا! "چلو رمیش چندر کے یہاں چلتی ہو!" راجیشور نے کہا

بسنتی نے کہا "چلتی تو ضرور لیکن منوہر نہیں ہے۔ آئے گا تو بھٹکے گا۔ اُسے بھی آ جانے دو۔"

راجیشور نے چھڑی زمین پر کھٹکھٹاتے ہوئے کہا "تو تم کل چلی جانا۔ میں جا رہا ہوں۔"

اتنے میں منوہر آ گیا۔ اُس نے اندر گھستے ہی کہا "اماں آج تو چاچی اُسے بہت پھٹکار رہی ہیں"

"کس کو؟" راجیشور نے پوچھا۔

"اسی لڑکی کو جو ابھی یہاں سے گئی ہے۔"

کشوری سسکتی ہوئی آئی اور ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

بسنتی نے اس طرح گویا اُسے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہا "آ گئی بیٹی۔ آؤ ادھر چلی آؤ۔"

کشوری ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ بسنتی نے شوہر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا "بات کیوں نہیں۔ میں اب نہ جاؤں گی تمہارا جی چاہے تو منوہر کو لیتے جاؤ۔"

راجیشور اور منوہر چلے گئے۔

بسنتی نے پوچھا "کیا ہوا بیٹی؟"

کشوری کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ آنکھوں کا اشارہ تھا کہ جو کچھ ہوا سمجھ جاؤ لیکن بسنتی کے پوچھنے پر چار ناچار کہنا ہی پڑا۔ درحقیقت منوہر کی ماں ساری سرگزشت پوچھ کر راج رانی کے حملوں تک لے گیا۔ جو وہ چاہتی تھی۔

کشوری نے سسکتے ہوئے کہا "اماں نے آج مجھے اس لئے مار کر یہیں دیا۔ سلائی لینے تمہارے یہاں کیوں آئی۔ میں نے کہا جب چیز لو ہیں نہ تھی تو پیسہ پاس نہ تھا تو سوا مانگنے کے اور کیا چارہ تھا۔ اس پر بہت جھلائیں اور کہا کہ تجھ سے پیسہ پیسہ ہی مانگ کر کیوں نہیں۔ تو میں نے کہا کہ مجھے پہلے سے معلوم ہی کہاں تھا کہ تم دیا سلائی نذر بند کر کے چلی جاؤ گی نہیں تو پہلے ہی کیا ضرورت تھی میں دیا سلائی مانگ کر پہلے پاس رکھ لیتی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اب تو بڑی باتیں بنانے لگی۔ بات بڑھ گئی اور انہوں نے مجھے بے قصور مار کر گھر سے نکال دیا۔"

"تو نہیں سمجھ سکتی بیٹی۔ منوہر کے باپ اور کیلاش کے دادا دونوں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہم لوگوں سے جلتی رہتی ہے۔ وہ ہم لوگوں کی کھوج میں رہتی ہے۔ جاؤ اب ایسی غلطی نہ کرنا۔ اس کے سامنے کبھی ہم لوگوں کا نام بھی نہ لینا۔"

"ماں اب میں کہاں جاؤں۔ اس نے تو مجھے مار کر نکال دیا ہے۔"

بسنتی دو منٹ تک چپ رہی۔ اس نے واقعات کو روشنی میں دیکھا۔ جب اچھی طرح اس کو معلوم ہو گیا کہ لڑکی اس کے کہنے سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے آ رہی ہے تو اس نے کہا "کیا برا ہے یہیں رہو بیٹی۔ تم جانتی ہو میں کتنی مجبور رہوں گی۔ ننگا خدا سے بڑا والی بات ہے۔"

(۴)

کشوری کو بسنتی کے یہاں رہتے ہوئے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ اتنے دنوں تک وہ پتھر کے نیچے دبی ہوئی دوب تھی۔ اب اس کی چھاتی سے پتھر ہٹ گیا تھا اور آزادی کی ہوا نے اس کا رنگ نکھار دیا تھا۔ اب نہ تو اس کو پچھلی مصیبتیں یاد تھیں اور نہ آئندہ کی پریشانیاں اس کا دل دکھاتی تھیں۔ ایک طرح سے وہ گھر کی مالکہ تھی۔

اس درمیان میں راج رانی کی طرف سے اس پر کئی حملے ہوئے۔ محض اس لئے کہ وہ بسنتی کے یہاں تھی۔ کتنے لوگوں سے اس نے کہا کہ لڑکی اس کے کچھ گہنے اٹھا کر بسنتی کو دے آئی تھی اسی وجہ سے اس نے اس کو نکال دیا۔ راج سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔ سب لوگ سن لیا کرتے تھے لیکن ایک دن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ جھینگر کی بہو سے اس نے کہا کہ سونی میرے سو روپے اٹھا لے گئی تو اس کے بدن میں آگ لگی۔ اس نے جواب دیا کہ ابھی تو رام دئی کے گونے میں میں نے تم سے دس روپے مانگے تھے تو تم نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بھلا کشوریا کے چلی جانے سے تم روپے والی تو ہو گئیں۔ صاف تو کیوں نہ اسے پہلے ہی بھگا دیا۔" لیکن راج رانی آسانی سے ہار ماننے والی عورت نہ تھی۔ آگ کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ آگ کی پیاس اس وقت بجھتی ہے جب اس کے شعلوں میں آنے والی تمام چیزیں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ ابھی راج رانی کے پاس ہتھیار تھے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی کبھی نہ تھکنے والی زبان تھی۔

(۵)

بہار کی کانپتی ہوئی دھوپ دنیا کو سکون کا پیغام دیتی ہوئی الوداع کہہ رہی تھی۔ دن بھر دانے دنکے کی تلاش میں بچوں سے جدا رہنے والے پرند آشیانوں کی طرف بے قرار کھنچے جا رہے تھے۔ پیلی سرسوں کے ہرے بھرے کھیتوں میں مٹر کے سفید نیلے اور سرخ پھول بہار کے جوبن کی یاد دلا رہے تھے۔ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے الاؤ جلانے کے لئے لکڑیاں چن رہے تھے۔ کہیں کھیت سینچے جا رہے تھے اور محنتی کسان اپنا کام دوسرے دن کے لئے باقی نہ رکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی بے زبان بیلوں کے پٹنے کی آواز چرند و پرند کے شور و غل میں صاف سنائی دیتی تھی۔ ایک عجیب سماں تھا۔ سکوت و ہنگامہ دست و گریباں تھے دونوں ایک دوسرے پر فتح پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے راج رانی اور جگیشور کے باہمی جھگڑوں کی پنچایت تھی۔ اپنی ملکیت حاصل کرنے کے لئے اکثر پنچایتیں اور عدالتیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ پرائے دھن کو اپنانے کے لئے پنچائت تھی۔ کشوری نہ تو راج رانی کی تھی اور نہ بسنتی کی۔

پنڈت چھوٹے رام جو گاؤں کے سب سے دھنی زمیندار تھے۔ سرپنچ تھے۔ کچھ آتا جاتا تو تھا نہیں مگر بے چارے کو مالدار ہونے کی یہ سزا

دی گئی تھی کہ زبردستی سرپنچ بنا دیئے گئے تھے۔ بزرگوں نے کسی وقت سنسکرت پڑھ کر نام پیدا کیا ہوگا۔ لیکن پنڈت چھوٹے رام کو تو دونوں وقت بدن میں تیل ملوا کر کسرت کرنے سے کام تھا۔ اُن کو کسرت کرنے سے دیر ہوتی جا رہی تھی کڑک کر پوچھا "ارے بھائی دونوں فریق حاضر ہیں"؟

راجیشور نے بڑھ کر پرنام کیا۔

"کیا بات ہے جی! بھا راج نے پوچھا۔

"مہاراج اس واقعے کو بھابی ہی اچھی طرح بیان کر سکتی ہیں"۔

راج رانی نے فرش کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج میرے گھر والے مرنے سے پہلے اپنے ایک دوست کی لڑکی پالنے پوسنے کے لئے لائے تھے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اُس کی سب کچھ میں ہی تھی۔ جب تک میرے گھر والے تھے اُن کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپ کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ میرے پاس آتے تو آپ کی تعریف کرنے لگتے تھے۔ ہاں تو جب تک وہ زندہ رہے ان لوگوں میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ لڑکی سے کچھ کہے۔ اب اُن کے سورگباش ہوتے ہی ان لوگوں نے لڑکی کو بہکا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اس کو آنے ہی نہیں دیتے"۔

چھوٹے رام اپنی تعریف سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "اچھا یہ بات ہے۔ لڑکی کی عمر کیا ہوگی"؟

"چودہ پندرہ کے درمیان ہوگی مہاراج۔ میں اُس کی ماں تو ہوں نہیں اندازے سے کہتی ہوں"۔

"لیکن چودہ پندرہ برس کی لڑکی تو بہکائی نہیں جا سکتی۔ خیر اب تم کیا چاہتی ہو لڑکی تم کو واپس دلا دی جائے"؟

راج رانی روگ نہ پالنا چاہتی تھی۔ اس کو تو کشوری کے سرپرستوں کو معقول سزا دینی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس نے کہا "مہاراج اب لڑکی میرے گھر میں کیا رہے گی۔ ہاں میرا سوال یہ ہے کہ مجھے اتنے دنوں تک پالنے پوسنے کا معاوضہ دلا دیا جائے"۔

مقدمہ چھوٹے رام کے فہم سے بالاتر ہو گیا۔ وہ قانون کی کمند پھینکنے لگے۔ لڑکی کو دلانا ان کے مقدور کی بات تھی لیکن معاوضہ دلانا اُن کی استعداد سے باہر تھا۔ انہوں نے سر کھجلاتے ہوئے جھگڑو شاہ کی طرف دیکھا۔

جھگڑو نے تمباکو کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "مہاراج یہ روپیہ چاہت ہیں۔ ان کا تو چنجھی کوڑی تک نہ ملنے چاہیے۔ ان کے پتی لڑکی کے سرپرستی کے وعدے کیں رہیں۔ اب پنچ ان کا لڑکی واپس کرائے دیت ہے اور اگر یہ لڑکی نہ چاہیں تو ان کا پانچ روپیہ مہینا جگیشور کو دینا پڑے۔ بھلا اسی میں ہے کہ راج رانی لڑکی سے ہاتھ دھوئیں۔ ہاں اگر یہ بات ثابت ہوئی جائے کہ لڑکی جبراً بھگائی گئی تو ہم جگیشور پر جرمانہ کر کے اس کو راج رانی کے واپس کر دیں"۔

لوگوں نے جھگڑو شاہ کے اس پُر مغز اور ٹھوس فیصلے پر تالیاں بجاتے ہوئے ان کو مبارک باد دی۔ چھوٹے رام نے کہا۔ "اجی واہ جی جھگڑو یہ تو ایسا فیصلہ ہے جس کی اپیل ہی نہیں ہو سکتی"۔

سب لوگ قہقہہ لگاتے ہوئے ایک ساتھ اُٹھے اور مختلف سمتوں میں چلے گئے مگر رانی سی آم کے درخت کے نیچے گڑ سی جا رہی تھی۔

(۲)

مئی کا مہینہ تھا سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ سکول کالج بند ہو گئے تھے کیلاش حساب میں فیل ہو گیا تھا۔ جولائی میں اُس کا دوبارہ امتحان ہونے والا تھا۔ وہ جیومیٹری کی شکلوں سے دماغ لڑا رہا تھا۔ پوسٹمین نے اس کا نام لے کر پکارا۔

کیلاش ایک لال لفافہ لئے اندر آیا۔ اس کو کھول کر پڑھا اور ٹیبل پر پھینک کر جیومیٹری کی شکلوں میں پھر اُلجھ گیا۔

راج رانی نے پوچھا "کیا تھا کیلاش"؟

"کچھ نہیں"۔

"نہیں کچھ تو ضرور ہے"۔

"منوہر کا بیاہ کشوری سے ہو رہا ہے"

"میری کشوری"! راج رانی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا پتلا قد۔ نازک بدن۔ گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں۔ بھونرے کی طرح کالے بال لمحہ بھر میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ "بے ایمانوں کو مفت ہی میں بہو مل گئی۔ ارے وہ تو میری بہو بھی بن سکتی تھی۔ ہائے رام میں نے اس کو پرائی لڑکی سمجھا اپنی ہونے والی بہو کیوں نہ جانا۔ اپنی قسمت! ایک پیسہ تک خرچ نہ کرنا پڑتا اور دنیا کی نظروں میں مفت کی نیکی بھی ہوتی۔ کیلاش کے باپو مجھے معاف کرنا مجھ سے بڑا اپرادھ ہوا"۔

آنسو کی دو لڑھکتی ہوئی بوندوں نے راج رانی کے خیالات کی تائید کی۔

اسی وقت دور باجے کی آواز سُن پڑی۔ خاموش فضا میں ایک گونج پیدا ہوئی جو سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک نکل گئی۔ آسمان پر چاند نہ تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی زمین کی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پے در پے شکست کھا کر ناکام واپس ہوتی تھی۔

کیلاش جیومیٹری کی ایک شکل حل کر رہا تھا!!

چندر بھوشن سنگھ

چند چینی نظمیں

جھیل کی سندری

جھیل کے ساکن کنارے پر وہاں
جس جگہہ پانی پہ سوئے ہیں کنول،
اور استادہ صنوبر ہیں جہاں،
نازک اک مثلِ ہلالِ آسماں،

جا رہی ہے نازنیں،
نیند اطمینان کی حاصل نہیں!
کون سے لمحے میں غمگیں دل نہیں؟
جھیل کے ساکن کنارے پر وہاں
جس جگہہ نیندوں میں کھوئے ہیں کنول،

اور استادہ صنوبر ہیں جہاں،
ماہ سے بڑھ کر کہیں تابش کناں
جلوہ گر ہے اک حسیں!
کروٹوں سے رات بھر ہے مجھ کو کام،
صبح بھی لاتی نہیں راحت کا نام! (کنفیوشس)

(۲)

افسردگی

مہرِ عالمتاب ہے ہر دم جواں،
ماہ ہر شب ہوتا جاتا ہے نہاں،
کس لئے ایسا ہے آئینِ جہاں؟
ہاں، مرا دل بھی کبھی پرنور تھا،
اب ہے یہ اک چاند کملاتا ہوا!
دیکھتا ہوں جب میں لیکن تیرے خواب،
مجھ کو ہو جاتا ہے تب اس کا یقیں،
صبحِ سیمیں پھر سے آئے گی یہیں،
اے مرے مہرِ منور! آفتاب! (کنفیوشس)

(۳)

بہاؤ

رکھتے ہیں دو نوجواں،
ناؤ میں اپنی، قدم!
ان کے لرزاں سائے سطحِ آب پر ۔ ۔ ۔ ۔ !
آہ! دو دل، بے گماں
جرأتِ رندانہ کو ہمدم کئے،
چل دیئے!
میرا دل بے چین ہے،
مجھ کو آتا ہے نظر انجامِ کار!
رکھتے ہیں دو نوجواں،

ناؤ میں اپنی، قدم!
آہ! اُن دونوں کی فانی زندگی،
دُور مجھ سے ہو گئی!
بیدِ مجنوں کے دھندلکے میں چھپی،
موت ان کی گھات میں
مجھ کو آتی ہے نظر،
اس خمِ دریا کے پار! (کنفیوشس)

(۴)

نالۂ نیم شبی

اُس درِ مشرق کے پاس،
دور ــــ اُن پیڑوں میں اک لرزش سی ہے!
شام سے تا بہ سحر!
میں یہیں ہوں منتظر!
منتظر ہوں بے صدا لمحوں میں میں اس کے لئے
راہ تکتا ہوں یہاں تک میں کہ آخر آسماں
آ گیا ــــ
لے کے پہلو میں درخشاں جلوۂ نجمِ سحر!
اس درِ مشرق کے پاس،
دور ــــ اُن پیڑوں پہ زردی چھا گئی،
شام سے تا بہ سحر،
میں یہیں ہوں منتظر!
راہ تکتا ہوں کہ آخر، آخری شعلہ بجھا
اور نیلا آسماں۔
آ گیا ــــ
لے کے پہلو میں درخشاں جلوۂ نجمِ سحر! (کنفیوشس)

میراجی

گراموفون

ہم نشیں اس بکس سے آتی ہے کیا دلکش صدا — دم بخود ہیں جس کو سن کر طائرانِ خوش نوا

بج رہے ہیں بربط و طاؤس و نے چنگ و رباب — مٹ رہا ہے امتیازِ نغمہ و شعر و شراب

مطربانِ قدس کا معجز نما گہوارہ ہے — قید اس میں یا کوئی جادو نوا عیّارہ ہے

قاف کی پریوں کا ہے اعجاز پرور آشیاں — ہو گئی ہیں اس میں یا مستور حورانِ جناں

طائرانِ گلستاں سے ہم سخن ہے خشک چوب — یا فراقِ مصطفےٰ میں نعرہ زن ہے خشک چوب

سامعہ افروز تھی پہلے غزل اقبال کی — اب تلاوت ہو رہی ہے سورۂ زلزال کی

روح پرور تھا ابھی غالب کا مستانہ کلام — اور ابھی دینے لگی ہے ہیر رانجھے کو پیام

تھا ابھی شیراز کا بلبل چمن میں نالہ ساز — اور ابھی گوپی ہے گنگا کے کنارے نے نواز

گانے والے ہیں عدم میں سُر یہاں سُنتا ہوں میں — آسماں پر رہنے والوں کی صدا سُنتا ہوں میں

تیرگی میں جس طرح آبِ بقا پوشیدہ ہے — یوں ہی ان مشکیں پلیٹوں میں نوا پوشیدہ ہے

جب انہیں منقارِ سوزن چومتی ہے پے بہ پے — ان کے سینے سے اچھلتی ہیں نوائیں مثلِ نے

خامۂ اعجاز کی تحریر گویا جانئے — یا انہیں نغمات کی تصویر گویا جانئے

بولتے اشعار ان اوراق میں پوشیدہ ہیں
ان سیہ پردوں میں زندہ زمزمے خوابیدہ ہیں

اصغر حسین خاں نظیرؔ

صحافت اور تحریک لائبریری

عوام کی تربیت میں صحافت نے سب سے بڑا حصہ لیا ہے۔ آج ہندوستان میں جو کچھ قومی بیداری نظر آرہی ہے۔ وہ زیادہ تر اخبارات کے ذریعے سے ہوئی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے "اخبار وہ آنکھ ہے جس کے ذریعہ جمہوریت دیکھتی ہے"

لیکن آنکھ دماغ کے تابع ہے۔ اگر صحیفہ نگار کا دماغ پوری طرح نشو ونما نہیں پاتا تو یقیناً اس کی بصیرت ناقص ہوگی۔ وسعت و رفعت نظر پیدا کرنے کا واحد ذریعہ مطالعہ اور تدبر و تفکر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو دوست ایک تصنیف کے سلسلے میں ایک پرفضا مقام پر گئے۔ تاکہ وہ اپنی قوت وجدان کو قدرتی نظاروں سے متاثر کر سکیں۔ وہ مقام ایک جنت ارضی تھا۔ جہاں کے مناظر دلفریب اور فضا روح پرور تھی۔ ان میں سے ایک نے ان تمام مناظر کو خوش نظری سے دیکھا اور اس کے وجدان پر پھول اور سبز پتوں نے اپنا اچھا اثر ڈالا۔ اس کی تمام تصنیف میں یہی رنگ غالب تھا۔ لیکن دوسرے نے قنوطیت سے کام لیا۔ پھولوں کی بہار دیکھ کر اسے ان کی خزاں کا زمانہ یاد آگیا۔ سبز پتوں کو دیکھ کر ان کے مرجھانے کا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے بچھ گیا۔ اس لئے اس کی تصنیف سے یاس کا رنگ نمایاں تھا۔ ایک ہی منظر سے دو شخص مختلف نتائج نکالتے ہیں۔ اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دماغ کو آنکھ پر کس قدر قابو حاصل ہے اور آنکھ اسی رنگ میں مشاہدہ کرتی ہے جو رنگ دماغ پر غالب ہو۔ صحیفہ نگار کو ہمیشہ زندگی کا مطالعہ روشن پہلو سے کرنا چاہیئے تاکہ اس کا پیغام صلح امید اور دلبستگی کا حامل ہو۔ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف ایسی کتب کا مطالعہ کرے جو اس کے علم اور معلومات کے خزانے کو ترقی دے سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی کو خوش نظری سے دیکھنے کی قوت کو نشوونما دے سکیں

صحافت اور لائبریری کی تحریک لازم و ملزوم ہیں۔ صحیفہ نگار جہاں لائبریری سے مستفید ہوتا ہے۔ وہاں وہ اس کی ترقی میں بھی ممد ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیفہ نگار کا پیدا کردہ لٹریچر ایک وقتی چیز ہوتی ہے۔ جسے لائبریری میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ صحافت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ایسا لٹریچر جو جلدی سے پیدا کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ صحیفہ نگار کو چند گھنٹوں میں اخبار کا مضمون لکھنا پڑتا ہے۔ وہ زیادہ دیر سوچ نہیں سکتا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی تحریر میں "دوام" نہیں ہوتا اور ویسے بھی اسے وقتی موضوعات پر قلم اٹھانا پڑتا ہے۔

مجھے ان لوگوں سے اختلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صحافت لٹریچر نہیں ہے۔ انگلستان کو ہی لے لیجئے۔ ایڈیسن صحیفہ نگار تھا۔ اس کا جریدہ Spectator اٹھارھویں صدی میں بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا جس طرح آج کل کا علم دوست طبقہ انگریزی ادب میں اس کے لٹریچر کو پڑھتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن ایسا نقاد بھی یہ کہنے پر مجبور تھا کہ اگر کوئی شخص انگریزی ادب میں بہترین اسٹائل سیکھنا چاہتا ہو تو وہ Spectator کا دن رات مطالعہ کرے۔ صحیفہ نگار ایڈیسن نے انگریزی ادب میں اپنے لئے بلند ترین مقام حاصل کر لیا۔ ڈاکٹر جانسن خود صحیفہ نگار تھا اور Rambler جیسا بلند پایہ اخبار کو ایڈٹ کرتا رہا جس کی انگریزی ادب میں ایک ممتاز حیثیت ہے۔

اب دورِ حاضر کو لے لیجئے۔ مسٹر ایچ جی ویلز جیسے بین الاقوامی شہرت کے مالک مصنف صحیفہ نگار ہیں۔ ان کی بعض کتب انگلستان

اور امریکہ کے جراید میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہیں۔ وہ اکثر ممتاز اخبارات اور رسائل میں اپنے مضامین طبع کراتے ہیں۔ پھر انہیں یک جا کر کے کتاب کی صورت دے دی جاتی ہے۔

اس زمانے میں تو ہر بڑا مصنف اپنی تصنیفات کو سلسلہ وار ملک کے کثیر الاشاعت جراید اور رسائل میں شائع کراتا ہے۔ ممالک غرب میں تو بعض ایسے اخبارات اور رسالے ہیں جن کی اشاعت لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ ایک مقالہ جو ایسے جرائد میں شائع ہو جائے یقیناً لاکھوں انسانوں کے مطالعہ سے گزرتا ہے۔ لیکن ناشر کیسا ہی عالی ہمت کیوں نہ ہو۔ وہ کسی بڑے سے بڑے مصنف کی تصنیف کو بھی اس قدر تعداد میں شائع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہر بڑے سے بڑا ادیب جو اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ کتاب شائع کرنے کے بجائے اپنے مقالے ایسے ہی اخباروں میں شائع کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

عام اخبارات و رسائل کے علاوہ ایسے مخصوص جراید بھی ہیں جو کسی خاص موضوع کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ مثلاً قانون۔ سائنس۔ ادب اور مذہب وغیرہ۔ ایسے رسائل میں بہت قیمتی اور محققانہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جنہیں بعد میں کتابی صورت دے دی جاتی ہے۔ گو اس طریق سے تصنیف مکمل کرنے میں ایک کافی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ مگر اس طرح جو کتاب تیار ہوتی ہے۔ وہ بھی ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہے۔ ہوتا اس طرح ہے کہ مصنف ایک کتاب کا خاکہ تیار کرنے کے بعد کسی خاص رسالہ کے ساتھ اس کی قسط وار طباعت کا انتظام کر لیتا ہے۔ جب یہ مضامین سلسلہ وار شائع ہوتے ہیں۔ تو لازمی طور پر اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ادیب اور نقاد اس پر تنقید کرتے ہیں۔ اور اس طرح مصنف جب ان طبع شدہ مقالوں کو کتابی صورت کے لئے جمع کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے افکار اور نظریوں میں ضروری ترمیم یا تبدیلی کر کے تنقید کی روشنی میں کتاب کو ہر لحاظ سے مکمل کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی تصنیف کو مکمل کرنے سے پہلے اسے کتاب کی شکل میں شائع کر دیتا تو کتاب کی حالت یہ ہرگز نہ ہوتی۔ شاید طبع ثانی کے وقت وہ دوسروں کی تنقید سے فایدہ اٹھا سکتا۔

صحافت بچوں کا کھیل نہیں کہ ہر معمولی تعلیم کا آدمی صحیفہ نگار بن جائے جب تک مطالعہ وسیع نہ ہو۔ کوئی شخص صحیفہ نگار بن ہی نہیں سکتا، اس کی کامیابی اور ترقی کا معیار اس کے مطالعہ اور لائبریری کے استعمال پر منحصر ہے اس کا علم وسیع اور اس کی نظر عمیق ہونی چاہئے اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب وسیع پیمانے پر کتابوں کو پڑھا جائے۔

عامۃ الناس کی تربیت صحیفہ نگار سب سے بہتر طور پر کر سکتا ہے چنانچہ جارج برنارڈ شا اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ "انگلستان کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کا منبع آکسفورڈ اور کیمبرج نہیں ہے۔ بلکہ ان کی تربیت کرنے والے ہیں، ویلز اور آرنلڈ بینٹ ہیں" بات سچ ہے۔ کیونکہ متوسط طبقے کے لوگ اپنے علم کا زیادہ حصہ اخبارات اور جرائد سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ صرف اسی طبقہ پر موقوف نہیں بلکہ بڑی بڑی ہستیاں بھی اس کی معترف ہیں کہ انہیں اخبارات اور رسائل سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ چنانچہ روزنامہ "ہندو" مدراس کے ایڈیٹر مسٹر کستوری رنگا آینگر کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور سیاسی لیڈر مسٹر سری نواس آینگر نے کہا کہ وہ اپنا تمام سیاسی علم و حکمت "ہندو" کے افتتاحیہ مقالات سے حاصل کیا کرتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخبارات رائے عامہ کے آئینہ دار ہوں یا وہ رائے عامہ کی رہبری کریں؟ میرے خیال میں تو اخبارات رائے عامہ کی تشکیل کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔ وہ دن گئے۔ جب اخبار چند خبروں کے مجموعے کا نام تھا۔ آج اخبار نام ہے۔ حالات زمانہ پر تبصرہ کرنے کا اور عامۃ الناس کو ایک خاص مسلک پر چلانے کا۔ اگر ایک اخبار صرف اس قدر کام کر رہا ہے کہ وہ اچھی اچھی خبریں فراہم کر کے پبلک کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا تو یقین جانئے وہ اخبار اس قابل نہیں کہ اُسے معیاری پرچہ کہا جائے۔ دنیا کے اچھے اچھے اخبارات میں رائے عامہ کا وہی پہلو نمایاں نظر آئے گا۔ جو خود انہوں نے پیدا کیا ہے۔ موجودہ "کانگرس اور وزارتوں کا قضیہ" ہی لے لو۔ اگر ہندوستان کے سر کردہ اخبارات اس پر زور نہ دیتے اور رائے عامہ کو اپنا ہم نوا نہ بنا لیتے تو یہ معاملہ اس طرح خوش اسلوبی سے طے نہ ہو سکتا۔

ایک عام آدمی جو ایک ہی معاملہ پر مختلف لوگوں کی آرا پڑھتا ہے یقیناً حیران ہو جاتا ہوگا کہ وہ کس کی بات مانے اور کس کی نہ مانے۔ اب یہ ایڈیٹر کا کام ہے کہ وہ ان مختلف الخیال مضمون نگاروں کی آرا کو جانچے۔ اور ان کے ہر ایک پہلو کو بنظر غور دیکھے۔ پھر حالات زمانہ اور قومی ضروریات کو مدنظر رکھ کر اپنا فیصلہ دے اور کوشش کرے کہ رائے عامہ اس کے خیالات

کو قبول کرے۔ ایک متوسط طبقے کے ناظر کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں کہ وہ ہر ایک موضوع کے متعلق اپنا نظریہ قایم کر سکے۔ وہ تو اپنی رائے کو کسی خاص اخبار کے نقاط کے ساتھ ساتھ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایڈیٹر کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے صحیح رہبری کرنے کی کوشش کرے۔ آج کل وقت کی قلت کا تقاضا ہے کہ ایڈیٹر اپنے مصروف ناظرین کے سامنے ایسی خبریں پیش کرے جو نہایت اہم ہوں۔

ایک زمانہ تھا جب اخبار کا لفظ لفظ پڑھا جاتا تھا لیکن وہ زمانہ اب گیا اب تو وقت پیدا کرنے کا سوال اس قدر پیچیدہ اور اہم ہے کہ اس سے فرصت غنقا ہے۔ آج اکثر لوگ محض اخبار کی سرخیوں کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے اخبار کی جان یہی سرخیاں ہیں جن کے ذریعہ کسی خبر کی اہمیت اور تمام خبر کا خلاصہ معلوم ہو جاتا ہے۔ صحیفہ نگاری میں "سرخی" کا موزوں کرنا ایک مستقل آرٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

صحافت تحریکِ لائبریری کو بہت بڑی مدد دیتی ہے اور درحقیقت اس تحریک کا بنیادی عنصر صحافت ہی ہے۔ مجھے اکثر دیہات میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ گاؤں کے لوگ ایک جگہ اکٹھے بیٹھے ہیں اور ایک آدمی ان کے درمیان میں بیٹھا اخبار پڑھ کر انہیں سنا رہا ہے جس کا اثر آج یہ ہے کہ دیہاتی بھی ہندوستان کے واقعات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور اس کا نتیجہ ہم گزشتہ انتخاب میں دیکھ چکے ہیں۔ ایک گاؤں کا رہنے والا بھی آج اخبار اور خبروں کے لئے بے تاب نظر آتا ہے اخبار دیہاتی آبادی میں وہی قومی خدمت انجام دے رہا ہے جو شاید لائبریری بھی نہ دے سکے۔ اگر آپ سوویٹ روس کی ذہنی بیداری کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں لائبریری کے لٹریچر سے کس قدر زیادہ اخبارات نے اپنا اثر دکھایا۔ گاؤں کے جھونپڑوں میں "رات کا سترا" روہ شخص جو سرکاری طور پر دہقانوں کو اخبار پڑھ کر سناتا ہے، کاشتکاروں اور مزدوروں کو باقاعدہ شام کے بعد اخبار سناتا۔ گاؤں کے لوگ شام کے منتظر رہتے اور اخبارات کے نظریوں کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی نشو و نما ہوتی رہتی۔

آج سے چند سال قبل فرانس کے ایک صحیفہ نگار نے یہ جدت دکھائی کہ اس نے "بولتا اخبار" جاری کیا۔ وہ اس طرح کہ شام کے بعد دفتر کے باہر ایک مجمع جمع کر لیا جاتا جس میں ایک اخبار نویس روز کی اہم خبریں اور ان پر مختصر تبصرہ سنا دیتا۔ آج یہی جدت ریڈیو میں تبدیل ہو چکی ہے۔ لیکن اس سے تحریک لائبریری کے لئے ایک عظیم خطرہ نظر آ رہا ہے۔ ریڈیو پر ایک شخص کھڑا ہو کر سارے ہندوستان کو اپنی باتیں سنا سکتا ہے۔ اس میں صرف قوت سامع مجہولاً استعمال ہوتی ہے اور ایک عام آدمی کہہ سکتا ہے کہ جب معلومات ہمیں سننے سے حاصل ہو سکتی ہیں تو پھر پڑھنے کی سردردی کون کرے"۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ قومی اور ذہنی بیداری کے لئے تحصیلِ علم لابدی ہے۔

جب ہم ایک لکچر سنتے ہیں تو اس وقت ہمارا دماغ صرف سننے کی طرف متوجہ رہتا ہے اور ہم تقریر پر کوئی تنقید نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمیں ایسا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن اس کے برخلاف جب ہم کسی کتاب یا اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں تو یقیناً ہمیں مصنف یا مدیر کے خیالات پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع مل جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ ذہنی ارتقا اور قوت تخیل کا نشو و نما ہو گا۔ صرف ریڈیو یا "بولتے اخبار" کے ذریعہ لوگوں کو معلومات بہم پہنچانا یقیناً یقیناً ان کے دماغی قوائے کو معطل کر دے گا۔

تحریک لائبریری کا مقصدِ واحد تو ملک میں علم پھیلانا ہے اور قومی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ گاؤں کا بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہو اور اخبار کے ذریعے وہ قومی ضروریات اور حالات حاضرہ سے با خبر رہے۔ ریڈیو کو صرف تفریح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس کو تعلیم کا ذریعہ بنانا۔ عامۃ الناس کے ذہنوں کو صدیوں کے لئے جہالت کے گڑھے میں پھینکنا ہے۔ جب ایک دیہاتی پڑھ لکھ کر اخبارات کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے نئی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس میں علم کو بڑھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس پیاس کو بجھانے کے لئے لائبریری کی ضرورت ہے جس کے لئے چاہیئے کہ گاؤں گاؤں میں لائبریریاں ہوں۔ تاکہ دیہات کو جہاں زراعت کے جدید آلات سے مزین کیا جا رہا ہے۔ وہاں علم کی روشنی کو پھیلانے کے لئے سامان کیا جائے

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ آج کل کے اخبارات صرف خبروں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اُن میں دلچسپ اور کارآمد مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ نئی کتابوں پر تبصرے اور تنقیدیں ہوتی ہیں۔ دیہات کے لوگ بھی ان کتابوں میں سے اپنے مذاق کی کتابیں منگوانے کی کوشش کریں گے وہی گاؤں جہاں صرف ایک اخبار تمام لوگوں کے کافی ہوتا تھا۔ وہاں تھوڑے عرصے میں گھر گھر چھوٹی چھوٹی لائبریریاں بن جائیں گی اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے صحافت، لائبریری کی تحریک کو مدد دے سکتی ہے اور اسی لئے میں نے شروع مضمون میں صحافت اور لائبریری کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔

اختر یزدانی

غزل

طرب خوش نوا بزن ہر رگِ تارِ ساز را   زود بگوش من رساں نغمۂ غم گداز را

ست جمالِ یوسفی گام بگام ضوفگن   سجدہ بہ سجدہ می کنم نقش رہِ نیاز را

شک مریز چشمِ یاس دعویٰ ضبط می کنم   فاش مکن بہ روئے یار درِ نہفتہ راز را

ر جمال جلوہ ریز پردہ بہ پردہ ضو دہد   سرمۂ معرفت بساز خاکِ رہِ حجاز را

بو حسن دل ستاں خواب ز چشمِ من ربود   فتنۂ حشر یافتم دیدۂ نیم باز را

ن و دلم ہمی رود ساغرِ آتشیں بدہ   آہ بیاں چگوں کنم گردشِ چشمِ ناز را

ین دہد غمِ فراق صبر کن اے دلِ حزیں   مقصدِ زندگی بساز دردِ خلش نواز را

منزلِ نازِ حسنِ دوست دور تر از گمانِ عشق
سحر چگونہ طے کنم رہگذرِ نیاز را

سید مرتضیٰ حسین سحر

شعلے

کیا بات ہے؟ کیسے آگ لگی؟ کیوں دل سے شعلے اٹھتے ہیں
یہ عشق ہے شاید جس کے آب و گِل سے شعلے اُٹھتے ہیں

گم ہو گیا آخر پروانہ اک شمع کے جلتے دامن میں
کیا مزرعِ عشق کا حاصل ہے، حاصِل سے شعلے اٹھتے ہیں

اے دردِ محبت لایا ہے مجھ کو تو کہاں! کس وادی میں
اک آگ کا دریا بہتا ہے، ساحِل سے شعلے اٹھتے ہیں

کیا مانگا تھا، کیا تو نے دیا، اس رنج و الم کی بستی میں
وہ چیزِ عطا کی دامانِ سائِل سے شعلے اُٹھتے ہیں

کشفی یہ غزل کیا تو نے پڑھی اک آگ لگا دی ہر دل میں
تحسین کے نعرے کیا ہیں مگر محفِل سے شعلے اٹھتے ہیں

کشفی ملتانی

محروم کی شاعری

اردو شاعری کا دورِ انقلاب تاریخ ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس مختصر دور میں جو بیسویں صدی کے زمانۂ قبل از جنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تقلید اور اجتہاد کی قوتیں اردو شاعری کی قسمت کا فیصلہ کر رہی تھیں۔ قیودِ زباں اور آزادیٔ خیال، صداقتِ احساس اور کمالِ فن، سادگی اور تکلف میں جنگ ہو رہی تھی۔ قدیم شاعری کے پرستار جن کی دنیا میں قصیدہ اور غزل کے سوا کچھ نہ تھا اور جن کے مذہب میں ممدوح اور معشوق کے نام کے سوا کسی اور کا نام لینا گناہ تھا "چشم بند و لب بہ بند و گوش بند" پر عمل کئے زمانے کی صدا سے بے خبر اور دنیا کے عمل سے بے نیاز ہو کر بیٹھے تھے۔ جس طرح ایک شخص کسی خستہ مکان میں بیٹھا ہوا زلزلہ کی تباہ کاریوں کو خاطر میں نہ لائے اور جانِ عزیز انقلابِ دہر اور اپنی سستی کی نذر کر دے۔ اردو کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ متزلزل ویرانے میں قدیم روایات کے ڈھیر کے نیچے دب کر جان دینا یا اس برباد ویرانہ کو چھوڑ کر کھلی دنیا میں کشمکشِ زندگی کو جاری رکھنا اور اگر ممکن ہو تو حادثے سے دور ایک نیا ایوان تعمیر کرنا۔

ایک حسین اور مانوس فضا میں ان محبوب چیزوں کو دیکھتے ہوئے جن کو ایک شخص سرمایۂ زندگی سمجھتا ہو جان دینے میں ایک قسم کی دلکشی تو ضرور ہے، جس طرح مردہ شوہر کی لاش پر جل مرنے میں یا اپنے دیوان کو اپنی محبوبہ کے ساتھ دفن کرنے میں، لیکن یہ امر قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح قدیم شاعری کی شمعِ مردہ کے پروانے ایک ایسے حسین لیکن فضول مقصد کے لئے سرگرداں تھے جسے کوئی صاحبِ عقل نظرِ استحسان سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ الفاظ کی شوکت پر فریفتہ تھے، زبان کی صفائی پر لٹو تھے، محاورہ اور روزمرہ کے شیدا تھے اور تشبیہ و استعارہ پر مرتے تھے۔ لیکن حسنِ معنی سے بے پروا تھے۔ ان کی نظر سادگی پسند نہ تھی، ان کے دل سوزِ حقیقی سے ناآشنا تھے۔ وہ انہی پرانے مضامین کو چمکا کر پیش کرتے تھے جن سے قدما کے دیوان بھرے پڑے تھے اور جو قدما نے صدیوں پہلے کے فارسی شعرا سے مستعار لئے تھے۔ وہ الفاظ کی ساحری سے دلوں کو مسخر کرتے رہے لیکن آخر ایک مردِ خدا کی دردناک آواز نے ان کا طلسم توڑ دیا۔

جدید اور قدیم شاعری کی کشمکش گویا دل اور زبان کا مقابلہ تھا جس میں دل کی جیت ہوئی۔ زبان اپنی دلکشی کے باوجود دل کے مقابلے میں ثانوی حیثیت قبول کرنے پر مجبور ہوئی اور اردو نے حالی کے اس ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ؎

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
چپ چاپ اپنی سیج سی کو جا دلوں میں گھر　　اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

"سیج سے دلوں میں گھر کرنا" جدید شاعری کا طغرائے امتیاز یہی ہے اور موجودہ دور میں اس امتیاز کا اہل پنڈت تلوک چند صاحب محروم سے زیادہ شاید ہی کوئی ہو جن کا کلام سراسر صداقتِ احساس پر مبنی ہے یا بہ الفاظِ دیگر وہ ازراہِ تکلف شعر نہیں کہتے بلکہ محرومیوں نے انہیں شاعر بنا دیا ہے۔

محروم نے اپنی جواں رفیقۂ حیات کی وفات پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ رقت اور دردانگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اگرچہ انہوں نے کمالِ شاعری دکھانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن پڑھنے والا ہر شعر پہ دل تھام کر رہ جاتا ہے۔ "اشکِ حسرت" کے پہلے دو بند ہی لیجئے:-

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری ؛ ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمہاری وہ طرزِ غمخواری ؛ کہ بے اثر ہیں مرے نالے بے اثر زاری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی
ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف ؛ چلے ہو تو دل کی چھاؤں میں کیوں عدم کی طرف

نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف — بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جان مرے قدم کی طرف

تمہیں تو روکتے ہو بار بار رونے سے

رکو گے کیا نہ مرے بار بار رونے سے

شوہر کے قدم کی طرف ہاتھ بڑھانا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافیاں مانگنا اور ایسی جزئیات جن سے ہندوستانی خاتون کے اخلاقی پہلو پر روشنی پڑتی ہے نوحہ کو بہت موثر بنا دیتی ہیں۔ واقعہ کی الم انگیزی اس بات سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ محروم کی دودھ پیتی بچی اپنے معصومانہ انداز میں شفیق ماں کی محبت کو ڈھونڈھ رہی ہے اور کوئی جواب نہ پا کر وہ بھی موت کی دل گداز حقیقت سے آشنا ہو جاتی ہے

اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے

خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے

یہ دل ہلا دینے والی حقیقت بھی شاعر کو دہریت کے آغوش میں نہیں دھکیلتی۔ وہ جی کڑا کر کے اپنی مصیبت کو برداشت کرتا ہے اور کہتا ہے "جو تجھے منظور ہو یا رب مجھے منظور ہے"۔ وہ نہ آسمان سے گلہ کرتا ہے نہ تقدیر کو کوستا ہے۔ اس کا فلسفۂ غم ایک زبردست اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہے جیسے ایک نظم "ناپائیدار رشتے" سے ظاہر ہوتا ہے۔

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں

یہ مادر و پدر زن و فرزند و اقربا — شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں

مل جل کے جائیں گے نہ بہم ہو کے آئے تھے — رشتے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں

چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں — عمرِ دو روزہ پر انہیں دھوکے بقا کے ہیں

محروم کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے غم کو تمام دنیا کا غم بنا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوسروں کے غم کو بھی اپنے غم کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ ان کے سینے میں ایک ہمدردِ مخلوقات دل ہے جس سے وہ نہ صرف نوعِ انسان کے مصائب کو محسوس کرتے ہیں بلکہ ہر ذی روح کی مصیبت سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں "چڑیا کی زاری" "بلبل کی فریاد" "مچھلی کی بیتابی" اور "کولہو کا بیل" اس دعوے کی شاہد ہیں۔

غمناک مناظر کے بیان کرنے میں محروم کو خاص قدرت حاصل ہے۔ ان کی طبیعت کا رجحان اسی طرف ہے، ان کا دل سوزِ غم سے آشنا ہے۔ اس لئے وہ کامیابی سے اوروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ رامائن کے المیہ مناظر کا نقشہ جس خوبی سے انہوں نے کھینچا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ رام چندر جی اور مہارانی سیتا کی درد بھری داستان سن کر کونسا دل ہے جو بھر نہ آئے۔ لیکن محروم نے راون کی موت کا منظر بھی اس دلگداز پیرائے میں بیان کیا جس کی ایک کامیاب مصور سے توقع ہو سکتی ہے۔ راون کی رانیاں اس کی لاش کو دیکھ کر سر پر خاک ڈالتی ہیں اور اس طرح نوحہ کرتی ہیں:

کہتی تھی بازوؤں کو کوئی تھام تھام کے — ہم زبلوں کا آہ سہارا یہی تو تھے

ان بازوؤں کی آہ! وہ قدرت کدھر گئی — جن سے اٹھے پہاڑ وہ طاقت کدھر گئی

کیوں گردنِ اجل میں حمائل ہوئے یہ ہاتھ — ہم سے بذوقِ وصل حمائل ہوئے یہ ہاتھ

کہتی کوئی یہ شعبدے بھاتے نہیں ہمیں — لو اٹھ کے بیٹھو موت کا آیا یقیں ہمیں!

طاقت سے اپنی زیر جو اندر کو کر چکا

وہ فانیوں کے تیرِ ہوائی سے مر چکا

شاعر نے سرکش دشمن کی عظمت کا نقشہ کن موثر الفاظ میں کھینچا ہے اور وفادار رانیوں کے جذباتِ محبت کی ترجمانی کس خوبی سے کی ہے۔ اللہ اللہ! گناہ کے سایہ میں بھی نیکی کے کیسے مظاہر ہوتے ہیں! راون کی خاص محل مندوری کی زبان سے یہ عبرت ناک داستان سنئے

کہتی تھی پران ناتھ! نہ کہتی تھی آپ سے — پاپی کی موت پاپ ہے باز آؤ پاپ سے

تقدیر تھی جو دشمنِ جانی ہزار حیف — میری نہ ایک آپ نے مانی ہزار حیف

وہ دن بھی تھے کہ آپ سے ڈرتے تھے دیوتا — دم آپ کے جلال کا بھرتے تھے دیوتا

لرزے میں جس کے دم سے تھے افلاک و تیغ — بے حس پڑا ہے اب وہ سرِ خاک وادریغ

ہوتا ہے یوں ظہور خدا کے عتاب کا — چرچا رہے گا دہر میں اس انقلاب کا

تا روزِ حشر باعثِ عبرت رہیں گے ہم — آماجگاہِ تیرِ ملامت رہیں گے ہم

محروم کی شاعری کا بیشتر حصہ درسِ عبرت کے لئے وقف ہے۔ عظمت و شوکت کو خاک میں ملتے دیکھتا ہے اور آہ سرد بھرتا ہے۔ خود روتا ہے اور اوروں کو رلاتا ہے۔ کبھی وہ جہانگیر کے مقبرے کو حسرت کی نظروں سے دیکھتا ہے کبھی نورجہاں کی شکستہ قبر پر نوحہ خوانی کرتا ہے۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے — کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورجہاں ہے

مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے — اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے خیال جس کے ہوا طور کا عالم — تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اسی نظم کا ایک بند حقیقت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شاعر ایک باکمال مصوّر کی طرح جزئیات اور تفاصیل کو کام میں لاتا ہے۔

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر ٭ آرام لیا کرتے ہیں اس روضہ میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر ٭ اڑا اڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

اللہ اللہ! کیا بھیانک منظر ہے! کون دل ہے جو اسے دیکھ کر پگھل نہ جائے گا۔ کون ذی فہم ہے جو اسے دیکھ کر انسان کی بے بسی کا اعتراف نہیں کرے گا۔

محروم کی دنیا میں انسان ایک بے بس اور حقیر مخلوق ہے۔ اس کے مقابل فطرت ایک پر جلال اور باعظمت شخصیت ہے۔ شاعر کا تمام زورِ بیان قدرت کے جلالی مظاہر کی تشکیل میں بروئے کار آتا ہے۔ "آندھی" اور "عالمِ آب" میں محروم کا کلام جوانی پر ہے اور ایسی نظموں پر اردو ادب ناز کر سکتا ہے۔ دیکھئے "آندھی" اس طرح چلتی ہے ؎

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے   بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ بادِ شمال ہے   آتی ہے فوجِ دیو نظر جال ڈھال سے
روپوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رخِ آسماں ہوا

مشہور ہے کہ تباہ کاری کے مناظر میں انگریزی شاعر بائرن کو خاص ملکہ حاصل ہے لیکن یہ نظم پڑھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ محروم انگریزی شاعر سے پیچھے ہے۔ اسی طرح "عالمِ آب" بائرن کی نظم "سمندر" کا مقابلہ کرتی ہے۔ سمندر کا جلال دیکھ کر جو مسرت کی کیفیت بائرن پر طاری ہوتی ہے۔ وہ کیفیت دریائے سندھ کی طغیانی سے حاصل ہوتی ہے ؎

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا   دور تک اپنے کناروں پہ سے پھیل گیا
ہر طرف پانی ہی پانی کا جو نقشہ دیکھا   مصرعِ نغز یہ کسی کا مرے لب پر آیا
ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

ہوئی اس درجہ سرِ سطحِ زمیں وسعتِ آب   کہ زمیں مجھ کو نظر آنے لگی مثلِ حباب

. . . . .
. . . .

ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

فطرت کے جمالی پہلو سے بھی محروم کا کلام خالی نہیں اور دلکش مناظر کی مصوری میں بھی انہوں نے معیار بہت بلند کیا ہے۔ ان کی بہاریہ نظمیں بھی اپنے رنگ میں قابلِ تعریف ہیں لیکن ان کی شاعری کا دامن

کے مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ہی سے شاعر کی پاک نگاہی اور اخلاق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

رشکِ فردوس ہے محروم فضا شملے کی ٭ نفسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی
چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں ٭ نہیں اٹھنے وقتِ نظارہ پردے کا دستور یہاں
راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے یہ کہسار نہیں ٭ سبز پریوں کے نشیمن یہ اشجار نہیں

تعجب ہے کہ شملے کی ہوش ربا اور زاہد فریب فضا میں بھی محروم کی نگاہِ ادب کو ملحوظ رکھتی ہے۔ نہ انہیں اس جنت میں کسی ارضی حور کی تلاش ہوتی ہے اور نہ ان کی نظر پردے کا دستور نہ ہونے کی وجہ سے بے باک ہوتی ہے۔ وہ راجہ اندر کے اکھاڑے کا ذکر بھی کرتے ہیں تو صوفیانہ انداز میں۔ نہ رقص و سرود کا ذکر ہے نہ کسی گل بکاولی کا ذکر غیر ایسے صبر آزما حالات میں بھی محروم نے معلمِ اخلاق کی شان کو قائم رکھا ہے

انہوں نے جب شراب کا نام بھی لیا ہے تو یہی کہا ہے۔ "نوجوانو! شراب سے بچنا!" لیکن از بسکہ شراب شاعری کے رگ و ریشہ میں سما گئی ہے۔ "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"۔ وہ فلک اخضری کو اپنا جام تصور کر لیتے ہیں۔ ان کی اس نظم کو پڑھیے اور روحانی شراب کا لطف اٹھائیے۔

اس کیف آور نظم میں میکشی کے سب سامان جمع ہیں اور پینے کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔

فلک اخضری ہے جام مرا

تھوڑی سی شرابِ خندۂ گل   رنگیں جس سے کہ ہو تخیل
پیمانۂ برگِ و یاسمن میں   یا ساغرِ لالۂ چمن میں
جس سے کہ خبر نہ ہو وہاں کو   کر لیجئے تازہ کام جاں کو
صہبائے شفق کے جامِ دو جام   پانی جس سے شرابِ گلفام
وہ بادۂ خوشگوارِ لعلیں   عالم نظر آئے جس سے رنگیں
یا صبح کی وہ مئے نظارہ   ہو جس سے چمک میں ماند تارا
چپکے سے خموشیٔ سحر میں   پی جائیے بس نظر نظر میں
خم خانۂ اخضرِ کہن کی   جس میں ہو چمک ڈگ گن کی
جامِ مہتاب سے چھلک کر   یہ چھینٹے چھینٹے گرے زمیں پر
ہر مست بقدرِ ظرف پی لے   اور لطفِ سرورِ بے خودی لے
محروم بھی بہرہ یاب ہو جائے   مستِ مئے فکرِ تاب ہو جائے

او ساقیٔ بزمِ مے گساری
کافی ہے مجھے یہ بادہ خواری

سچ ہے شاعری خود شراب کا اثر رکھتی ہے۔ جس کا دل و دماغ ہی نشہ و مستی میں ڈوبا ہوا ہو اسے شراب کی کیا حاجت ہے

حسیات

تجھے دلبری کا مذاق ہے تو ہجوم سرو سمن میں آ
بہ ہزار جلوہ دمِ سحر تو نکل کے گھر سے چمن میں آ

ذرہِ کرم کبھی اے صبا یہ پیام میرا اُسے سنا
کہ جلوسِ عالمِ نو لئے شبِ ماہ دہر کہن میں آ

نہ یہ ہے ریاضِ فرنگ میں نہ نواحِ دجلہ و گنگ میں
جو تلاشِ لیلیٰ آرزو ہے تجھے تو نجد کے بن میں آ

جو دل اضطراب فزا نہیں کوئی زندگی کا مزا نہیں
جو نہیں ہے شغلِ رباب و مے تو حریمِ اہلِ سخن میں آ

یہ کہا ہے اخترِ صبح نے کہ نہ بے خبر ہو مآل سے
یہ نشاطِ عمر ہے یک نفس نہ فریبِ چرخِ کہن میں آ

جو چڑھے تھے رنگ اتر گئے کئی ماہ و سال گزر گئے
ہے پرائے دیس کا ذوق کیوں تو نظیر اپنے وطن میں آ

اصغر حسین خاں نظیر

غزل

دل کو وقفِ رہِ نیاز کیا
اپنی ہستی پہ ہم نے ناز کیا

شعلہ حسن سے جو خاک ہوئے
عشق نے ان کو سرفراز کیا

آنکھ طے کر چکی تھی راہِ نیاز
جب درِ جلوہ تو نے باز کیا

ہم کھنچے جس قدر تری جانب
تو نے اتنا ہی احتراز کیا

آخری وقت آگیا اپنا
تم نے اب بھی نہ ترکِ ناز کیا

تاجور کیا غضب کیا تو نے
باتوں باتوں میں کشفِ راز کیا!

تاجور سامری

نندا دیوی

(قطب جنوبی کی طرح نندا دیوی بھی ایک ایسا مقام ہے جس پر ابھی تک انسانی قدم پڑے۔ کوہ ہمالیہ کی یہ سربفلک چوٹی الموڑا سے صرف ۷۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ ایرک شپٹن اس پر چڑھنے والی ایک پارٹی کے ممتاز رکن تھے۔ انہوں نے اپنی اس مہم کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں)

ستمبر کی ۲۹ویں تاریخ تھی۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہم نے کو پہلے ہی کسی اچھے دن کا انتظار کر رہے تھے۔ اپنی مہم کے آغاز کے لئے آج کے دن کو نہایت موزوں سمجھا اور تھوڑی دیر دھوپ کا لطف اٹھا کر چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ پھر مشورہ سے طے پایا کہ ہم لوگوں کو جنوب کی جانب والے برفانی دریا کی طرف سے اپنا سفر شروع کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اس برفانی دریا کے دہانے پر ہی سندر دھنک واقع ہے۔ لیکن جوں ہی ہم دریا کے کنارے پہنچے ایک دھواں سا اٹھا اور آن کی آن میں کالی گھٹا چھا گئی جس میں راستہ معلوم کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے وہیں پر رک جانا مناسب سمجھا۔ اتنے میں اندھیرا کچھ ہلکا ہونے لگا اور گھٹا چھٹنے لگی۔ حتیٰ کہ سورج پھر چمک اٹھا۔ جس کی تمازت سے ہمارے کانپتے ہوئے جسموں میں گرمی کی لہر دوڑ گئی اور ہمارا چھوٹا سا قافلہ پھر روانہ ہوا۔ لیکن دوپہر ڈھلتے ہی پھر ہوا چلنی شروع ہوئی جو بتدریج تیز ہوتی گئی اور کچھ ہی عرصہ بعد شدید برفباری شروع ہو گئی جس کے پیش نظر ہمیں اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑی مشکل سے ہم خیمے نصب کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن تند ہوا کے وحشی جھونکوں نے ان کے اندر بھی ہمیں آرام نہ لینے دیا گیس کے چولھے۔ گرم اوورکوٹ اور چائے کے پیالے سردی کی زد سے بچانے کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ غروب آفتاب کے وقت ہوا کچھ ہلکی ہوئی۔ میں نے اپنے خیمے سے نکل کر دیکھا تو بادل چھٹ چکے تھے مطلع بالکل صاف تھا۔ برفانی دریا کا پاٹ پہلے سے بہت چوڑا ہو رہا تھا۔ جابجا برف کے تودے پڑے تھے۔ ہمارے خیموں کے دائیں جانب بھی سفید سفید برف کا ایک بھاری انبار لگ رہا تھا جس پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں نہایت دلکش سماں پیدا کر رہی تھیں۔ قریب ہی برف کے اور بہت سے تودے لگے ہوئے تھے۔ لیکن ان پر جانے کا راستہ کوئی نہ تھا۔ صرف اس بڑے تودے تک پہنچنے کا ایک راستہ تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تودا عام راستے کے ایک ٹیلے پر واقع ہے۔

رات نہایت سرد تھی۔ ہوا اس قدر تند چلتی تھی کہ خیمہ تو ایک طرف بستر سے منہ نکالنا دشوار تھا۔ چنانچہ خاصے دن چڑھے تک بھی ہم میں سے کسی کو باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب سورج خوب بلند ہو گیا تو ہم نے زاد سفر باندھا اور اس بڑے تودے کی راہ پر چل پڑے۔ آج کا دن کل سے زیادہ خوشگوار تھا اور کل کی بہ نسبت ہم زیادہ تیز چل رہے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ جلد جلد سفر طے کر کے شام تک بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جائیں۔ لیکن ہمارے ایک ہمسفر نے جو قدرے بیمار تھا انیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ کیمپ تو وہیں پر لگایا گیا۔ لیکن چڑھائی بدستور جاری رہی یعنی ایک ساتھی اس بیمار کی دیکھ بھال کے لئے کیمپ میں چھوڑ کر میں اور ایک دوسرا ساتھی اپنی اپنی جمعیت کے ساتھ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن تھوڑی ہی دور جا کر اس پر بھی تکان کے آثار غالب آ گئے اور وہ ایک مزدور کو ساتھ لے کر نیچے اتر گیا۔ کچھ اوپر جا کر میرے ساتھیوں کو بھی تھکن محسوس ہونے لگی۔ لیکن ہم برابر سفر کرتے گئے۔ حتیٰ کہ شام ہونے کو آ گئی۔ ہمیں یہ معلوم کر کے از حد خوشی ہوئی کہ ہم لوگ پچھلے کیمپ سے پانچ سو فٹ اوپر آ گئے ہیں۔

غلطی سے ہم لوگ صرف ایک ہی خیمہ ساتھ لائے تھے اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ صرف دو آدمیوں کے لئے کافی تھا۔ مجبوراً ہمیں دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد آنے والی آرام دہ اور فرحت بخش رات بے چینی اور تکلیف میں بسر کرنی پڑی۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم لوگوں کے لئے ہلنا جلنا سخت دشوار ہو رہا تھا۔ ہم لوگ اس چھوٹے سے خیمے کے اندر صابن کی اُن ٹکیوں

چھوٹی ٹکیوں کی طرح جڑے ہوئے پڑے تھے جنہیں نکالنے کے لئے یا تو ڈبہ الٹنا پڑتا تھا اور یا ٹکیوں کو کاٹ کر علیحدہ علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔ ہم میں سے کسی کے بھی کروٹ بدلنے سے خیمے بھر میں کھلبلی سی مچ جاتی اور ہر ایک کو یہ کروٹ بدلنی پڑتی اور یا اپنی جگہ پر ہل جل کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک کرنا پڑتا۔ بعض لوگ کچھ ایسے ظریف الطبع واقع ہوتے ہیں کہ ایسے ایسے کٹھن مواقع بھی ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کی طبع ظریف کے لئے مشق ستم کا خاصہ سامان بہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری یہ حالت رفیق شیرپوس کے لئے بہترین مذاق بنی ہوئی تھی اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ ساری رات ہماری پھبتی اڑاتا رہا۔ میں فطرتاً سنجیدہ مزاج واقع ہوا ہوں۔ مجھے اس کی یہ حرکت بالکل پسند نہ تھی۔ لیکن اسے میری ذرا پروا نہ تھی۔ وہ برابر فقرے پر فقرہ چست کرتا رہا اور دوسرے ساتھی ہنستے رہے۔

ٹھیک چار بجے میں نے انہیں بیدار کیا اور بہت کوشش اور تکلیف کے بعد ہم چائے بنا کر پینے میں کامیاب ہوگئے۔ پندرہ روز سے ہم نے بوٹ نہیں اتارے تھے۔ انہیں اتارا اور گردوپیش کے تمام کپڑوں سے اپنے جسم کے ننگے اعضا کو ڈھانپنا شروع کیا۔ پانچ بجے تک یوں ہی مجنوں بنے پڑے رہے۔ کوئی چھ پونے چھ بجے سورج کی روشنی نمودار ہوئی۔ ہم باہر نکلے۔ سردی نہایت شدت کی تھی لیکن مطلع صاف تھا اور سورج کی سنہری کرنیں مشرق کی سفیدپوش چوٹیوں پر بکھر بکھر کر انہیں اور بھی زیادہ حسین بنا رہی تھیں۔ اس اثنا میں نندا دیوی کا جنوبی رخ بھی صاف نظر آنے لگا جس سے ہمارے دل کامیابی۔ شہرت۔ فخر۔ عزت اور رفقائے دوام کی خوشیوں سے معمور ہوگئے۔ اس نظارے نے نہ صرف ہمارے دل و دماغ پر اثر کیا بلکہ ہمارے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں بھی اس خوشی میں کچھ ایسے ہی بے خود و بے تاب ہو گئے کہ ہم سب کے سب دیوانہ وار ناچنے لگ گئے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ میں بدری ناتھ اور دوناگری کی بلند چوٹیوں کے یہ دل کش مناظر دیکھ سکوں گا۔ نیچے کی وہ تمام چوٹیاں جن پر ہم نے اپنی جد و جہد کے چالیس سال گزارے تھے اور جنہیں کبھی ہم ناقابل گذر سمجھتے تھے۔ یہاں سے بالکل پست اور حقیر معلوم ہو رہی تھیں۔ ہماری نگاہ میں ان کی وقعت ٹیلوں کے ایک سلسلے سے زیادہ نہ رہی تھی۔

چودہ ستمبر کی صبح نہایت خوبصورت تھی۔ ہم بھی جلدی ہی چل پڑے۔ ہمارے ساتھ معمولی خیمہ اور خورونوش کا سامان تھا۔ ٹلمن جو بیماری کے باعث پیچھے رہ گیا تھا اچھا ہو کر ہمارے ساتھ آملا تھا۔

سب سے پہلے ہماری راہ میں ایک گلیشیر پڑا جسے عبور کر کے ہم جنوبی کنارے سے ملحقہ وادی کی جانب بڑھے۔ شام کے وقت ایک مقام پر جہاں شفاف میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے سبز سبز گھاس پر برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موتیوں کی طرح بکھر رہے تھے۔ ہم نے اپنا خیمہ نصب کر دیا۔ طلوع آفتاب سے کوئی گھنٹہ بھر پیشتر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موسون ہوائیں رخصت ہو گئیں ہیں۔ برفانی دریا بالکل خاموش تھا اور پتھریلی سطح بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم خوش تھے کہ قدرت خود ہی ہماری مدد کر رہی ہے۔

اس کوہستانی سطح پر غیر معمولی خوشی اور جوش کے عالم میں زور زور سے قدم اٹھاتے ہوئے ہم منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے گئے اور کوئی چالیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سطح مرتفع ٹوٹ چکی تھی اور دہانہ قدرے اونچا ہو گیا تھا۔ جس سے ہمیں دوسری طرف جانے میں آسانی ہوگئی۔ قدرت کے اس کھیل کو بھی ہم نے اپنے لئے ایک نیک فال تصور کیا۔ گھنٹہ بھر کے سفر کے بعد ہمیں کچھ غیر معمولی حرارت سی محسوس ہونے لگی۔ تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ سورج کی شعاعیں عموداً پڑ رہی ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر ٹھہرنا ضروری سمجھا گیا اور کچھ عرصہ کے لئے سب نے اپنی کمریں ڈھیلی کر دیں۔ یہاں سے اردگرد کی چوٹیوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا جن کے معائنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جس دریا کے کنارے ہم سفر کر رہے ہیں۔ وہ نندا دیوی کے جنوب کی طرف سے آتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک عمیق وادی تھی اور اس کے پار برف کی ایک سفید دیوار کھڑی تھی۔ جس نے اس چوٹی کے جنوبی حصہ کو چھپا رکھا تھا ہم اس کے بالکل قریب تھے۔ اگرچہ اسے چھونے سے ہم قاصر تھے لیکن اس کا نظارہ بالکل عریاں اور صاف تھا۔ تھوڑا سا راستہ طے کرنے پر میرے دل میں غیر معمولی جوش پیدا ہونے لگا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم نندا دیوی تک پہنچ چکے ہیں۔ چونکہ دن اچھا تھا اس لئے صبح سے ہمیں یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ عین چوٹی پر کس طرح پہنچا جائے۔ چنانچہ ایک چٹان کے ایک کنارے کے نزدیک سے راستہ معلوم کیا گیا۔ لیکن مزید تحقیقات نے ثابت کیا اس کے مشرق کی طرف سے کم سے کم فاصلہ طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ القصہ چند ہی گھنٹوں میں یہ مسافت طے کر کے ایک ایسے

مقام پر پہنچے جہاں سے ایک چشمہ نیچے کی طرف بہ رہا تھا۔ اڑھائی بجے بعد دوپہر تک ہم نے اکیس ہزار فٹ کی بلندی طے کر لی۔ چڑھائی اگرچہ دشوار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یہاں تک تو چنداں مشکل پیش نہ آئی۔ ہم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ عزم راسخ اور پائے استقلال کے لئے کوئی بھی کام مشکل نہیں۔ اگر ایک منتظم پارٹی ایک کام کرنے پر تل جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ناکام رہے۔ ہمارے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ چڑھائی کی مشکلات کا ہمارے پر امید دلوں پر شمہ بھر بھی اثر نہ تھا۔ لیکن چڑھائی جسے اب تک کھیل ہی سمجھا گیا تھا در حقیقت موت کی چڑھائی تھی جس کے لئے انسان کو اعلیٰ درجے کا مستقل مزاج۔ توانا اور جفاکش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فضائے بلند میں طرح طرح کی تکالیف مثلاً سانس کا گھٹ جانا۔ یخ کر دینے والی سردی اور بعض اوقات خور و نوش کی قلت اور فاقے کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ موسم کا بھی خوشگوار ہونا نہایت ضروری ہے خراب موسم میں ایسی مسافت بہت مہنگی پڑا کرتی ہے۔ میدان میں تو ہمسفر ایک رحمت گنا جاتا ہے۔ لیکن کوہستانی سفر میں ہمسفروں کا زیادہ ہونا بھی زحمت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خیمہ کے لئے جگہ ہی نہیں ملتی اور اگر ملتی ہے تو بہت تنگ۔ جس میں سب کی گنجائش نہیں ہوتی۔ المختصر میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوہستانی مہم کے لئے ہمیشہ کم از کم افراد کو روانہ ہونا چاہیئے۔ بڑی بڑی پارٹیاں چاہے کیسی ہی منتظم توانا اور جفاکش ہوں ناکام رہیں گی۔

اب ہم کافی بلندی پر تھے اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں اچھی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس امر کے باوجود کہ میں کئی ماہ سے ان کوہستانوں میں مقیم تھا اور ہر طرح کے پہاڑی امراض و دیگر جسمانی تکالیف کا عادی تھا۔ مجھے بھی ایک عارضہ سا ہو گیا جس کی وجہ سے طبیعت کچھ ناسازسی اور قوائے مضمحل رہنے لگے۔ ہماری رفتار نسبتاً سست تھی۔ پھر بھی ہم کافی سفر طے کر چکے تھے۔ دن ابھی باقی تھا لیکن ہمارے ساتھی آگے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اس برفانی دریا کی راہ سے ہم اپنے کیمپ کی طرف واپس آ گئے۔ خوشگوار موسم۔ دلفریب نظارہ اور میٹھے پانی کے شفاف چشمہ نے سب کو کچھ ایسا اسیر کر رکھا تھا کہ سب کے سب کم از کم ایک رات اور اس سرسبز وادی میں گزارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ رات اس شاداب وادی میں کھلی ہوا اور چودھویں کے چاند کی چاندنی میں کاٹی گئی باقی مسافت دوسرے دن پر ملتوی ہوئی۔ ہمارے سارے سفر کے دوران میں یہی ایک ہفتہ تھا جس میں میرا دل بہت خوش۔ پُر امید لبشاش اور پرجوش رہا۔ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی۔ کامیابی۔ امید اور شادمانی نظر آتی۔ رات کے بارہ گھنٹے ہنسی کھیل اور خوش گپیوں میں تمام ہوئے۔ صبح نور کے تڑکے ہی کوچ کیا اور اُس برفانی دریا کے جنوب کی طرف جدھر ہمیں نندا دیوی کا گمان تھا۔ چل پڑے۔ ہمارے بوجھ قدرے زیادہ تھے جن کے نیچے ہماری پارٹی کا ہر فرد دب رہا تھا۔ میں چونکہ ایک عارضہ میں مبتلا تھا۔ اس لئے اپنا بوجھ مجھے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں سب سے پیچھے رہ گیا۔ کئی بار تو سستانے کے لئے بیٹھنا بھی پڑا۔ ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ میں گلیشیر کی برف میں گھرا ہوا ہوں۔ کیونکہ نیلی نیلی سطح پر میری صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ میری عقدہ کشا طبیعت نے اس معمہ کو حل کئے بغیر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آن کی آن میں کپڑے اتار پانی میں کود پڑا۔ اور شام تک برف کے اسی تالاب میں تیرتا رہا۔ ٹھنڈے دن کی رات بھی عموماً ٹھنڈی ہی ہوا کرتی ہے۔ شام کے وقت جب میں پانی سے نکلا تو معلوم ہوا کہ بہت سردی ہے۔ لیکن میں اپنے بھاری بھرکم بوجھ کے نیچے دبا ہوا۔ جلد سے جلد چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ گرم ہو سکوں سردی کی وجہ سے برف یخ ہو کر لوہا ہو رہی تھی۔ بوجھ کے نیچے دبا ہوا رہبر بھی پھسل پھسل پڑ رہا تھا۔ ہمارا تو ذکر ہی نہ کیجئے۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ ناک سے پانی کی ندی جاری تھی۔ پاؤں کے تلووں میں غضب کا درد ہو رہا تھا۔ جس سے ایک قدم اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔ سورج کی سمت تبدیل ہو چکی تھی اور ہم ایک ایسے مقام پر تھے۔ جہاں قدم قدم پر ٹانگیں گھٹنوں تک برف میں دھنس جائیں۔ ہر طرف خوف و دہشت برس رہی تھی۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ کب وہ اس برف میں دھنس کر کسی نامعلوم دنیا میں جا پہنچے گا۔ متعدد برفانی ندیوں اور جھیلوں کو پاٹ کر آخر ہم "کول" کے قریب پہنچ ہی گئے۔ چھ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد اگرچہ ہم بالکل مضمحل ہو چکے تھے۔ لیکن ہمتیں جوان تھیں اور ولولے تازہ تھے۔ کیونکہ اس خوفناک ڈل کے پار تھوڑی ہی دور ہماری نندا دیوی اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ ہمیں بلا رہی تھی۔ "کول" کی بابت کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا کہ کتنا گہرا ہے۔ ہاں اتنا پتہ لگتا تھا کہ اسے پار کر کے تھوڑی دور پرے جنوب کی طرف ہماری منزلِ مقصود نندا دیوی ہے۔ لیکن اس بحرِ بے پایاں میں اترنے کی کسی کو بھی جرأت نہ ہوئی۔ صلاح ٹھہری کہ کوئی ایسا راستہ معلوم کیا جائے۔ جس سے یہ ڈل راہ میں حائل نہ ہو سکے

چنانچہ کھوج شروع ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد راہبر نے بتایا کہ ایک راستہ ایسا ہے۔ لیکن پانسو فٹ نیچے اترنا پڑے گا۔ ہم نے غنیمت جانا اور اس مہیب ڈال کو آخری سلام کر کے نیچے اترنے لگے۔ یہاں سے سٹینڈرڈ ہنگا کی پرسحاب وادی صاف نظر آ رہی تھی۔

آج کی منزل نہایت کٹھن تھی۔ سوائے خورد و نوش کے سامان کے باقی سب کچھ برف کے نیچے دفنا دیا گیا۔ ماضی کے سیاحوں کی یادداشتوں سے ہمیں یہ بخوبی معلوم تھا کہ ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ سامنے نظر آنے والی دو چٹانوں کی راہ سے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ہموار چکنی سطح سے پاؤں کا صرف ایک بار ہی پھسل جانا ہماری زندگی کو موت میں تبدیل کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن ایک فائدہ بھی تھا یعنی ہم برف باری کے خطرات سے محفوظ تھے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ابر گھر آیا اور آن کی آن میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا ہم نے ایک دوسرے کو اندھوں کی طرح کندھوں سے پکڑ لیا اور بائیں طرف چلنے لگے۔ لیکن چند ہی گز کے فاصلے پر جا کر ہمارے راہبر کی چیخ نکلی اور سنائی دیا کہ سنگ باری ہو رہی ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پتھر بالکل بارش کی طرح لگاتار اور مسلسل برس رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں کالی سی کوئی چیز بھی نظر آئی جسے ہم چٹان سمجھے۔ گھنٹہ بھر کی بحث و تمحیص کے بعد ہم اس مرحلہ پر پہنچے کہ اگر نندا دیوی تک پہنچنا ضروری ہے تو اس خطۂ سنگ فشاں سے تو دوڑ کر گزر ہی جائیں آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا تاکہ نقصان جان نہ ہو اور اگر ہو تو تھوڑا ہو پتھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد برابر برس رہے تھے۔ اس لئے پارٹی کے کسی نہ کسی ممبر کا مجروح ہو کر گر جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس سنگ بار سرزمین کی وسعت کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ خدا جانے کہاں کسی کا دم ٹوٹ جائے۔ القصہ اس سفر کو التوا میں ڈال کر مشرق کی جانب گامزن ہوئے۔ تاریکی ابر کا یہ عالم تھا کہ پاس پڑی ہوئی چیز بھی پہچانی نہ جا سکتی تھی بیس منٹ کی مسافت کے بعد ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ ہم برف کے کسی بڑے بھاری تودے پر کھڑے ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی۔ یہ شیشے کی طرح صاف اور شفاف پتھر کی طرح سخت اور ہموار گلیشیر تھا۔ جو قریباً چھ ہزار فٹ لمبا چوڑا ہو گا۔ نظارہ تو نہایت دلفریب تھا لیکن پانی میں گرنے والے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے شور سے ایک زبردست گونج سی پیدا ہو رہی تھی جس سے دل دہل جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بادل کچھ ہلکے ہونے شروع ہوئے اور ہم پر واضح ہونے لگا کہ یہ راہ جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔ نندا دیوی کو نہیں وادیٔ موت کو جاتی ہے۔ کوسوں تک پانی ہی پانی تھا۔ چنانچہ مزید سفر تو ملتوی کر دیا گیا۔ البتہ نظارہ بازی ہوتی رہی یہ ایک غیر معمولی موقع تھا جو ہر ایک کو نہیں مل سکتا۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی شخص ہماری طرح اپنے پاؤں کے قریب سے گلیشیر کے پھسلنے کا نظارہ دیکھنے کا دعوے نہیں کر سکتا۔

اڑھائی بجے کے قریب ہم نیم جان ہو کر اپنے سامان کی طرف لوٹے تاکہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کی جائے۔ چائے کی ایک ایک پیالی نے پارٹی میں از سر نو زندگی پھونک دی اور چند تھکے ہارے مضمحل انسان قدرت کے خلاف معرکہ آرائی کرنے کے لئے پھر کمربستہ ہو گئے۔ یہ دن ایک مشغول ترین اور سخت محنت کا دن تھا جس میں بہت سے خوفناک حادثات بھی پیش آئے۔ گھنٹے گھنٹے کے بعد ہمیں اپنی گزرگاہ تبدیل کرنا پڑتی بعض اوقات تو ہمیں اپنے ساتھیوں کو رسوں سے اوپر کھینچنا ہوتا۔ اور بعض دفعہ سامان کو۔ چاقو کی طرح تیز دھار والی چٹان جس پر سے ہم گزر رہے تھے ہمیں کاٹ کر پھینک دینے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن ہمارے تیز نوکدار ڈنڈے آڑے آئے۔ صبح کی شدت کی سردی شدت کی گرمی میں تبدیل ہونے لگی۔ جس نے ہمارے اعصاب کو بہت حد تک سست بلکہ ناکارہ کر دیا۔ ہمارا بوجھ لڑھک لڑھک کر آگاہ کر رہا تھا کہ اپنا وزن متوازی رکھیں ورنہ چینی کے برتن کی طرح پاش پاش ہو جائیں گے۔ شام منجمد برف کے تین ہزار فٹ کے تودے پر آئی۔ ہمارے دائیں جانب کی چٹان جو ایک گلیشیر کی لائن کے میان میں واقع تھی۔ ہمیں بقائے دوام کا مرصع تاج پہنانے کو بالکل تیار تھی۔ لیکن ہم ہی اس سے کچھ دور تھے چنانچہ اس گلیشیر کے ایک کنارے سے سیڑھیاں کاٹنی شروع کی گئیں تھوڑے ہی فاصلے پر پھسلنے والے تودوں کی گزرگاہ پر برف کا ایک نہایت ہی ہموار ٹکڑہ نظر آیا۔ جس پر سے ہم چند منٹ میں گذر گئے۔ یہ کوئی ساٹھ فٹ کا ہو گا۔ دیکھ بھال سے معلوم ہوا کہ یہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہے پس تجویز ہوئی کہ خیمہ اسی جگہ نصب کیا جائے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے تودوں کو جمع کر کے ایک بڑا سا دائرہ بنا کر اسے رسوں سے مضبوط باندھ دیا گیا تاکہ اگر پھسلیں تو سارے ہی پھسلیں۔ خیمہ نصب کئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک طوفان سا آیا اور چوٹیوں سے

برف کے تودے نیچے گرنے لگے۔ حتیٰ کہ ہمارا نصب کردہ خیمہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔

دوسرے روز پھر چڑھائی شروع ہوئی۔ لیکن بے سود، ہم لوگ پچاس گز بھی نہ چڑھ سکے۔ سردی کی شدت، آکسیجن کی کمی اور بوجھ نے بہادروں کی کمر پر توڑ کر رکھ دیں۔ قدم قدم پر پاؤں پھسل جاتے ہم میں سے کئی ساتھی پھسل کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن افسوس کوئی بھی نندا دیوی کی فلک نما چوٹی تک نہ پہنچ سکا۔

جے کرشن مضطر

غزل

کب دلِ ناداں کو بہلایا نہیں
کب فریبِ آرزو کھایا نہیں

ہائے وہ ناکامیٔ دل کا سوال
جو مرے لب پر ابھی آیا نہیں

کچھ تو ہے ہنگامۂ دیر و حرم
تیرا گن ہم نے کہاں گایا نہیں

زندگی آلام کی زد میں رہی
تیرے دامن کا جہاں سایا نہیں

میرا عقدہ اے مرے عقدہ کشا
اور الجھایا ہے سلجھایا نہیں

تم تو دل لے کر بھی بیگانے رہے
میں تو دل دے کر بھی پچھتایا نہیں

اُن سے گو وابستہ ہیں امیدیں بہت
آج تک تو لطف فرمایا نہیں

لطیف انور گورداسپوری

سپاہی اور فقیر

(ایک مکالمہ)

(بادشاہ کی سواری کا اہتمام ہو رہا ہے، سڑک پر ایک سپاہی اور ایک اندھا فقیر باتیں کر رہے ہیں)

سپاہی۔ یہاں کیوں پھر رہے ہو؟
فقیر۔ کہاں؟
سپاہی۔ اس سڑک پر۔
فقیر۔ یہ سڑک ہے۔؟
سپاہی۔ کیا تو اندھا ہے!
فقیر۔ آنکھوں والوں سے پوچھ رہا ہوں،
سپاہی۔ یہاں کیا کر رہے ہو!
فقیر۔ جو دل کر رہا ہے۔
سپاہی۔ دل کے بچے! بادشاہی سواری آ رہی ہے!
فقیر۔ شاہی سواری؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ پھر تو اک ہجوم ہو گا؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ آنکھوں والے دیکھ رہے ہوں گے؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ روشنی بھی خوب ہو گی؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ کاش میں دیکھ سکتا!
سپاہی۔ تم نہیں جانتے،
فقیر۔ کس کو؟
سپاہی۔ بادشاہ کو،
فقیر۔ اسے تو جانتا ہوں،
سپاہی۔ پھر!
فقیر۔ تمہیں نہیں جانتا،
سپاہی۔ میں سپاہی ہوں
فقیر۔ سپاہی؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ بادشاہ کو تباہ کرنے والے،
سپاہی۔ کیا کہا؟
فقیر۔ رعایا کو دکھ دینے والے،
سپاہی۔ پھر کہو!
فقیر۔ بادشاہ کو بے تاج بنانے والے،
سپاہی۔ کیا بک رہے ہو؟
فقیر۔ خدا کو ملک سے باہر نکالنے والے
سپاہی۔ ایک طرف نہیں ہو گے!
فقیر۔ ساری طرفیں میری ہیں،
سپاہی۔ تمہیں بادشاہ سے ڈر نہیں لگتا؟
فقیر۔ انسان انسان سے نہیں ڈرتا۔
سپاہی۔ تم انسان نہیں فقیر ہو،
فقیر۔ اسی لئے انسان سے نہیں ڈرتا،
سپاہی۔ وہ ناقوس بجا!
فقیر۔ آنے دو،
سپاہی۔ کچلے جاؤ گے،
فقیر۔ بادشاہ کی ہستی چند منٹ کی ہے۔
سپاہی۔ اور تم!
فقیر۔ میں ہمیشہ یہاں رہوں گا،
سپاہی۔ کیسے!
فقیر۔ سواری گزرنے کے بعد یہاں کیا ہو گا!
سپاہی۔ کچھ بھی نہیں۔
فقیر۔ ہجوم بکھر جائے گا؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ چاروں طرف اندھیرا ہو گا؟
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ پھر میں یہاں بادشاہ ہوں گا،
سپاہی۔ کیا کہا!
فقیر۔ سواری گزرنے کے بعد!
سپاہی۔ ہاں!
فقیر۔ اندھیرا ــــ اجاڑ ــــ سنسان۔
سپاہی۔ ایک طرف ہو جاؤ،
فقیر۔ انسان انسان سے نہیں ڈرتا!!

خلیل

دنیائے ادب

گاندھی ازم اور سوشلزم

گاندھی جی ایک عجیب مجموعۂ اضداد ہیں اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال سے میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو انہیں غریبوں کے ساتھ ہے وہ کیوں ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور انہیں پچھ کچلتا ہے! اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشری نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہ چار و ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انہیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔ لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہیں۔ اور ان کی اشتراکیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں، جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے، ان کی تقلید میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے، اور اس سے اُن کی مُراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انہیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی ایسا کرتے ہیں۔ ہمارے اُن کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیراعظم کی مثال[1] موجود ہے۔ میں جانتا ہوں گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں۔ انہوں نے معاشیات اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔ لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ، بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے "اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کبھی قائل نہیں کر سکتا۔" جذبات ہمارے تصورِ زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی، اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے "انسان جو ارادہ کرے وہ کر سکتا ہے۔ مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں۔"

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی، جس نے انہیں بے حد متاثر کیا اور اُن کا سارا تصورِ زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے اُن کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قایم ہو گئے ہیں اور اُن کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں اُن کی باتوں کو وہ صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں، لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں، کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے۔ وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قایم ہیں کہ ان کے علاوہ تمام باتیں ان کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو اُن کے

[1] اپنے ایک پیام میں، جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کی جس کا جلسہ جنوری ۳۸ء میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا مسٹر میکڈانلڈ فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہی حقیقی اشتراکیت ہے۔ یہی حقیقی قومیت بھی ہے۔ بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔"

پیش نظر ہے۔ جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے، اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔

یہ میرے نزدیک اُن کے خیالات کی اصل بنیاد ہے وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدد سے وابستہ ہیں۔ "طبقوں کی جنگ" کے الفاظ ہی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی بو آتی ہے اور اس لئے انہیں اس سے نفرت ہے، وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیارِ زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے پائے۔ اس لئے کہ بلند معیارِ زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم بُرا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست بن گئے ہیں۔ یہ اور بھی بُرا ہوگا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں اُن کے پاس انگلستان سے آیا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملے میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں چاہیئے کہ ضبطِ تولید کا طریقہ استعمال کرکے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلے میں لکھا تھا کہ آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی ضبطِ نفس سے کام نہیں لیتے۔ اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو اُن کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل نہ پیش کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہو۔ کیا اُن کے لئے شراب پینا، جوا کھیلنا، تمباکو پینا ضروری ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر بھی غالب رہتے ہیں۔ اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی چاہنے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے! ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو، اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، بہت بڑے پیمانے پر پیدا کر دیں[1]"

[1] ضبطِ نفس پرستی مصنفہ ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش انگریز کان کنوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے۔ جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ اُن کی مزدوری کم کر دی گئی تھی اور وہ کام کرنے سے ہٹا دئے گئے تھے۔ بہر حال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبطِ تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیارِ زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بھی کوسوں دور ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پہننے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کر سکتی ہے اور ان کے معیارِ زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ وہ لوگوں کے معیارِ زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قائل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ اُن کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابلِ برداشت ہے۔ اس لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نبھا رہے ہیں اس لئے کہ یہ اتنی بُری نہیں اور پھر یہ ایک امرِ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات اُن کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور ان کی تقریر و تحریر میں ہمیں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ اُن کے خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ اُن کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں۔ بُری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں۔

اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُن کا کام یہ نہیں ہے کہ اُن کی مادّی زندگی کی سطح کو بلند کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اتر آئیں اور مساوی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی۔ یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو انہوں نے ۷ اردسمبر ۱۹۳۴ء کو شائع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بے کار ہے اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدایشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے، اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے، جس کی یہ آرزو ہے کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعوے کرتا ہوں"۔

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا ممتاز وار یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا۔ بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیں اور اپنے تعیشات اور بلند معیارِ زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں، جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطۂ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو، اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں، اور ہر چیز کو ماضی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا مٹھی بھر دولت مند آدمی اس زمانے میں سماج کے روحِ رواں تھے اور ان کا ہونا نظامِ دولت آفرینی کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے اخلاقی معلموں مصلحوں اور اہلِ دل نے اُن کے وجود کو جائز رکھا لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ اُن کے حاجت مند بھائیوں کا بھی اُن پر کچھ حق ہے، وہ غریبوں کے امانت دار ہیں، انہیں خیرات کرنا چاہئے۔ چنانچہ خیرات کا شمار اِن بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے۔ گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریے پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانتدار ہیں، ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔ پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے۔ امیروں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے خدمتِ خلق پر مامور ہیں اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیح نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے"۔ ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں، اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطۂ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم پیس یازدہم کا مشہور فرمان "ریرم نوارم" ہے جو مئی ۱۹۳۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوعِ انسانی قسمت میں لکھا ہے۔ انسان چاہے جتنی کوشش کرے۔ کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی زندگی کو اس درد والم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف دعوے کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں رنج والم سے نجات مل جائے گی اور دائمی راحت وعشرت نصیب ہوگی۔ دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کردیں گے۔ انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے، اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے"۔

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ "یہ کہیں اور" کا اشارہ کدھر ہے "اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُس کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ جب تک اس زندگی کا لحاظ نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جس حقیقتِ عظمیٰ کا سبق خود فطرت ہمیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قایم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اُن آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ اُس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلاوطنی کی جگہ بنایا ہے، نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت ومسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ۔۔۔۔"

یہ مذہبی طرزِ خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ معیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈا جائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے، اور انسان کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہو گئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں۔ البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے، جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارھویں، و تیرھویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں، یہ وہی زمانہ ہے جسے لوگ عہدِ ظلمت کہتے ہیں، اور اُسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں۔ جب اولیا کا دور دورہ تھا۔ عیسائی فرمانروا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ زمانہ بھی عیسائی جمہوریت کا تھا جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجے پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ صرف اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد۔ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہدِ خلافت کی اسلامی جمہوریت اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہابھارت کے زمانے کی دُھن میں رہتے ہیں اور "رام راج" کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ اس عہدِ ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، اور اُسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمراں طبقے کو، فرصت اور فراغت حاصل ہو، لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوتِ لایموت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اُسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے، جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قایم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فایدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے۔ لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام و دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا۔ امرا کا طبقہ بالکل بیکار ہے اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے، امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اُسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے، یعنی ایک تو اُن لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں، دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے اور فاقے کرنے پر مجبور کرتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گزرا لکھا تھا "ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں۔ خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔

دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے، اور اس سے کوئی فایدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا، اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں، کشتیوں، پلوں

مفادِ عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا۔ جانور آج بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کر دئیے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں برابر حقوقِ ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ، جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے، رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہئے۔ اور اس طرح مفادِ عامہ کی خاطر حقوقِ ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں۔ مفادِ عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفادِ عامہ کے خلاف کوئی کام کرے خواہ اس کی غرض اپنے حقوقِ ملکیت کا تحفظ ہو۔ اور پرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوقِ ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں، ہم "مستقل حقوق" کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے۔ محنت کرے اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمائے معدوم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے اُن اشخاص کو دوسروں پر بیجا اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیشِ نظر افراد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، اُن کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بُری عادتوں اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس بارے میں اختلافِ رائے ہو کہ ان میں کون چیز زیادہ بُری ہے اور کون کم۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطۂ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر، لالچ، خود غرضی، زر پرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آمیز جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہے "جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ سکے وہ رکھے"۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے اور سارا نظامِ انسان کی غارتگرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے، اور اُسے اُن سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی ابھارتا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو پیچھے گرا کر اُن کی جگہ لے لی جائے۔ جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے، ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انہیں ضرور کامیابی ہوگی لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی۔ اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کا نہیں ہے، بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنش کے مکاپر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔ اور نہ منفیانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالت پر قائم نہیں رہ سکتے یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

بلکہ گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بے حد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں اُن سے قطع تعلق کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئیے۔ محدود قومی معیشت کا کوئی سوال ہی نہیں، اور میں تو ذاتی طور پر اسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں۔ جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم حکومت کی نگرانی میں مفادِ عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہیئے، یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوعِ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو اُن کو مٹا دینا چاہیئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے۔ یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیں جو موجودہ نظام سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ کو قائل کر سکیں گے۔

کھادی کی تحریک، یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بُننا، جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے۔ ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ آج کل کے کسی اہم مسئلہ کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فایدہ پہنچا ہے، آیندہ بھی اس وقت تک [illegible] جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل [illegible] کرے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جاسکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں، حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بیروزگار ہیں، یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں، چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ نفسیاتی تبدیلی ہے، کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آگئی ہے، نمود و نمائش اور بدمذاقی کم ہو گئی ہے، اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں، اور اُن

لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی فوقیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر۔ اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگرس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے چلے جائیں۔ کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے ان کی روک تھام صرف بدیسی اور خصوصاً لنکاشائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دلعزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس قسم کا موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے۔ مثلاً جنگ چھڑ جائے، جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے، کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجایش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے

ان تمام فواید کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے، تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی، اس سے کام چلتا رہے، لیکن آیندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ اراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام اراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم بڑے پیمانے پر معقول طریقے سے کرنے میں حائل ہے، جدید عہد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹی چھوٹی زمینیں آسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کو اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے شاید کچھ چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں۔ مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام اراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو، لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے، وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں، ورنہ لگان یا مال گزاری کی ادائیگی کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے، اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زاید محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فایدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے۔ اس سے فوری طور پر ضرور فایدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا۔ مگر زیادہ تر

وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنا نمونے جو مٹ رہے تھے، محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں کلوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو، اور کرنے والے تھوڑے ہوں۔ لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے، تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں، فرصت کا وقت نکالا جائے، سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے۔" یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں لیکن اصل میں دقت کام کی کمی کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر آبپاشی کی اسکیم، حفظانِ صحت، طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماجی اور تمدنی خدمات، تعلیم اور اُن بیسیوں ضروری اشیاء کی فراہمی جس کی لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آیندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہو گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو اور سماج کی تنظیم مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویٹ یونین میں اور چاہے جو نقائص ہوں لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے، ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار نہیں ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے مزدوروں اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلی میں اصلاح اور ترمیم کی جائے اور ان کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی (بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے)، تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے گی اور اُس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہو گی جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ اُن ضروری مادی اور تمدنی اشیا کو بھی تیار نہیں کر سکتیں جو ہمیں اس وقت درکار ہیں اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیوں کر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں شلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مٹائی جا سکتی ہیں؟

یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے، جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے، نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کر سکتا ہے اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں اور کلیں بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں غرض یہ سلسلہ کسی طرح رکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف ہماری مادی اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے، جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی، چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو اُن کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں اُن کی مطلق گنجائش نہیں اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جا سکیں۔

کانگرس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر

مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی[1] ہے۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا برائی ہے کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں تیار نہ کی جائیں! واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے، اور وہی قیمتیں رکھے جا در ملکوں میں ہیں قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں اور اُسے اپنا مقررہ لگان یا مالگذاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے اس لئے وہ ایسی چیز بوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کرسکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اُس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاش میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکایک گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً گنے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوگئے، اور گنے کی مانگ بہت بڑھ گئی لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی۔ کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور گنے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے اور نہ ممکن کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں، اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے، بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور ان سے اور اُن سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔ تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں، اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔ پھر مجھے اس مجموعۂ اضداد یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے[2]، باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے پرجوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈھ رہے ہیں لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہوچکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً دیسی ریاستیں، بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام۔ ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا "امانتداری" کے اس نظریے کو عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دئے جائیں اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جاسکے افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کو اٹھانے کے اہل ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلط کر دئے جائیں لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے ذاتی مفاد میں اور اُن کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ

---

[1] ۴ر جنوری ۱۹۳۴ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمدآباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا کرنا نہیں چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔"

[2] ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگرس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ہندی ہند کے جن جن گروہوں کی اغراض کانگرس کے نزدیک قابل حمایت ہیں۔ ان سب پر مقدم اُن بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگرس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔"

کے لئے قائم ہو جاتا ہے، جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے تشدد سے یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہر حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہئے، اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہئے۔ جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان نہیں کرتے اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انہیں سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیر زمیندار، نیک نیت اور بامروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولتمندوں سے میل جول رکھتا ہے۔ میں خود ایک نمونے کا بورژوا[1] ہوں، اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی، اور اسی کے خیالات نے ابتداً مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیٹی بورژوا[2]" کہا تھا، اور بالکل ٹھیک کہا تھا، غالباً اب وہ مجھے "اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا" کہیں گے۔

لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل مہمل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے، وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں، برابر یہ دعوے کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے، میں اتنا بڑا دعوے نہیں کر سکتا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے اُسے اُن افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہی ہے۔ ملا نہیں ہم خیال بنانا ہے، اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہیں حائل ہے تو وہ مٹ کر رہے گا اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں اُن کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی۔ اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگزیر ہے۔ بہر حال یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی برائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی برائیاں نہ اُٹھ کھڑی ہوں، یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

---

[1] اوسط طبقے کا شہری [2] نیچے اوسط طبقے کا شہری

"کلیم"

جواہر لال نہرو

گیت

گیت کے ہاتھوں لُٹاتا جاتا ہوں میں
ہم سے کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں میں
مطربہ اے مطربہ اپنا مجھے
آپ اپنا بتکدہ آذری بنا جاتا ہوں میں

اختر انصاری

اشتہار بغرض حاضری مدعا علیہ

بعدالت جناب لالہ کل بھوشن صاحب بی اے ایل ایل بی سب جج مالیر کوٹلہ

بمقدمہ

ہزنام سنگھ پسر روڑا قوم زمیندار ساکن دلا ور گڑھ بنام نتھا سنگھ پسر نند سنگھ قوم بنجارا ساکن کشن گڑھ شمالی

مدعی — مدعا علیہ

دعوے دلا پانے مبلغ ؏ للعہ روپیہ کلدار اصل وسود بروئے تمسک

مقدمہ مندرجہ صدر میں مدعا علیہ پر تعمیل سمن ہر چند کرائی گئی۔ مگر اس پر تعمیل اس
وقت نہیں ہوئی۔ در خواست مدعی و بیان حلفی محکمہ ہذا میں پیش ہونے پر معلوم
ہوا کہ مدعا علیہ پر معمولی طریق سے تعمیل سمن ہونی مشکل ہے بذریعہ اشتہار تعمیل
کرائی جاوے۔ لہذا بذریعہ اشتہار ہذا مدعا علیہ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مورخہ
۲۵ر اپریل ۱۹۳۹ء بوقت ۱۰ بجے دن اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہو کر پیروی
مقدمہ کرو۔ بصورت عدم حاضری تمہارے کارروائی ضابطہ عمل میں آوے گی
آج بتاریخ ۲ر اپریل ۱۹۳۹ء کو ہمارے دستخط اور مہر عدالت سے جاری

(مہر عدالت) دستخط سب جج مالیر کوٹلہ

نیشنل لیبارٹیریز لاہور کے تحفہ جات
مونا سنو
پسندیدۂ بادشاہ سے کر کے خانماں گدا گر تک
خوبصورتی کا خواہشمند ہے
اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر
قسم کے داغ دور ہو جائیں گے اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئیگا ایک دفعہ ضرور استعمال کریں
ہر اچھے
دوکاندار سے
طلب کر سکتے ہیں
کاکل سنبل کے ساتھ قدرت کا بے بہا تحفہ
لمبے بال عورتوں کی خوبصورتی کو دوبالا کریں گے
مونا ہیر آئل کے استعمال سے بال ناگن کی طرح سیاہ ریشم کی طرح ملائم گھٹنوں تک لمبے اور چمکدار نکل آئیں گے
زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں ایک دفعہ استعمال کر کے ہماری
محنت کی داد دیں
جملہ تحفہ جات
کو منگا کر ضرور استعمال کریں۔ تمام تحفہ جات
کو ہمہ صفت موصوف پائیں گے
سول ایجنٹ
مونا کولڈ کریم
اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں
جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جاتے ہیں۔
بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انار کلی۔ لاہور

سسر کا احسان
میرے سسر نے میرے خاوند

برتھ کنٹرول
امورل
(ساختہ جرمنی)
ربڑ کا استعمال نقصان رساں ہے۔ اس لئے ڈاکٹر اور گورنمنٹ کے ہسپتال آج کل سب ضرورت مندوں کو امورل گولیوں کو مقامی طور پر استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مگر وہ عورتیں جو کثرت اولاد سے نالاں ہوں۔ یہ مانع حمل گولیاں ضرور استعمال کریں۔
کسی قسم کی تکلیف اور بیماری کا خدشہ نہیں۔ قیمت فی شیشی ۱۸ گولی صرف دو روپے
بندر کے غدود
کیسانوا کریم
(ساختہ جرمنی)
یہ خوشبودار اور مقوی کریم جس میں دنیا کی سب سے مقوی چیز بندر کے غدود کا جوہر شامل ہے بیرونی استعمال کے لئے بے نظیر محرک ہے زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔ آزمائش شرط ہے سب کیساں پوری ہو جائیں گی۔ فی ٹیوب جو تیس یا چالیس مالشوں کو کافی ہے۔ صرف دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ مدن ٹریڈنگ کمپنی ہیرا منڈی۔ لاہور

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — نمبر ۴

تصاویر: ۱۔ ماں اور بچہ ۲۔ ندی کنارے ۳۔ نسیمِ شمال

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اندرونِ ہند پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کرشن بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزم ادب

سالنامہ کے انعامات میں سے منفرد گولڈ میڈل پچھلے ماہ بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اور وہ حسب اعلان جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی خدمت میں اُن کے مضمون "گار ذنرغہ" ندان کے اردو شعرا" پیش کر دیا گیا۔ ہم اپنی طرف سے اور ناظرین ادبی دنیا کی جانب سے جناب شاکر کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ سالنامہ کے دیگر انعامی مضامین کا آخری فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ لیکن واثق امید ہے کہ مئی کے آغاز تک ضرور ہو جائے گا۔ اور مئی کے پرچہ میں انعام حاصل کرنے والے ادبا و شعرا کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے گا۔

مضمون نگار حضرات میں سے ایک خاصی تعداد ایسے اصحاب کی ہوتی ہے جو مضمون بھیج کر اس امر کے متوقع ہوتے ہیں کہ اُن کے مضامین رسالے کے دفتر میں پہنچتے ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں گے۔ ایسے اصحاب کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ ہر اہم رسالہ کے دفتر میں روزانہ مضامین نظم و نثر (نظم نسبتاً زیادہ) کی ایک بڑی تعداد موصول ہوتی ہے اور اس عظیم الشان انبار میں شامل ہو جاتی ہے جو غریب ایڈیٹر کی میز بلکہ روح پر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

ان مضامین میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو رسالہ کے معیار یا پالیسی کے مطابق نہیں ہوتے۔ باقی مضامین میں سے بھی اکثر کانٹ چھانٹ اور ترمیم و تنسیخ کے محتاج ہوتے ہیں۔ بہت کم چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی اصلی صورت میں شائع ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ذمہ دار ادارہ کا تمام وقت اس چھانٹ پھٹک اور تہذیب و ترتیب کی نذر ہو جاتا ہے اور اس اثنا میں جدید مضامین کا سیلاب بدستور امڈا چلا آتا ہے، اور نئے نئے تقاضوں کے ساتھ پرانے شکوے شکایتیں بھی اپنی تیز و تند رو میں بہائے لاتا ہے۔

ایسی حالت میں بے چارے ایڈیٹر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ یا تو مضمون فوراً شائع کر دے یا صاحبِ مضمون سے اس کی نسبت سلسلۂ خط و کتابت جاری کرے سراسر ناانصافی ہے۔ جو مضامین قابلِ اشاعت ہوتے ہیں یا جو مزید غور و خوض کے محتاج ہوتے ہیں۔ اُن کی نسبت مضمون نگار حضرات کو مطلع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مضامین شائع نہیں ہو سکتے اور جن کی واپسی کے لئے مضمون نگار ڈاک کے ٹکٹ بھی ملفوف نہیں کرتے وہ یونہی پڑے رہتے ہیں اور ایک عرصہ کے بعد مجبوراً تلف کر دیئے جاتے ہیں۔ سالنامہ کے سلسلے میں ہمارے پاس ایسے بے شمار مضامین غیر معمولی تعداد میں موصول ہوئے۔ دو ڈھیروں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اگر ان کے مصنفین انہیں واپس منگانا چاہتے ہیں تو ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر منگا لیں۔ ورنہ بدرجۂ آخر آج سے ایک ماہ کے بعد وہ تلف کر دئے جائیں گے اور ہمیں اس کا بہت رنج ہو گا۔

بعض اصحاب مضمون کے نیچے اپنا نام نہیں لکھتے۔ بلکہ علیحدہ خط میں اپنا نام پتہ وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ مضمون کے نیچے صاحبِ مضمون کا نام اور پتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خط مضمون سے جدا ہو کر ضائع ہو جاتا ہے اور مضمون بے نام رہ جاتا ہے۔

گزشتہ سال سے ہمارے ہاں نظمیں اور غزلیں اس کثرت سے موصول ہو رہی ہیں کہ ہم حیران ہیں کہ انہیں کب اور کیونکر شائع کیا جائے۔ مگر سنجیدہ اور پراز معلومات مضامین لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب اپنی قابلیت اور ذہانت مفید اور دلچسپ مضامین لکھنے میں صرف کریں اور اپنی زبان و ادب کی ترقی و وسعت میں اپنا شایانِ شان حصہ لیں۔ شاعری کی عظمت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شاعری چونکہ ایک وہبی اور خداداد جوہر ہے اس لئے اسے صرف انہیں لوگوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے جو طبعاً اور فطرتاً اس کے لئے موزوں ہیں۔ ہر نوجوان کا شاعر بننے کی کوشش کرنا نہ صرف تضیع ہے۔ بلکہ ہمارے ادب کو انحطاط اور زوال کی طرف لئے جاتا ہے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

ہٹلر اور مسولینی ایک جدید روشنی میں

اگر ۲۴ سال کی عمر میں مسولینی اور ہٹلر کی تصاویر کا موازنہ کیا جائے تو ہمیں ایک تو جاذبِ نظر خد و خال اور استوار نقوش کا مالک نظر آئے گا اور دوسرا اس کے مقابلے میں ایک ایسا ناقابل بیان نوجوان ہوگا جو اس عمر میں بھی کسی قسم کی نمایاں خصوصیات نہ رکھتا تھا۔ ہٹلر اپنی نشو و نما کے ابتدائی ایام میں ایک سست الوجود انسان تھا۔ نہ اُسے مطالعے کا شوق تھا اور نہ ہی اس میں ذہانت، قوتِ حیات یا نئے خیالات موجود تھے۔ وہ کبھی کبھی تصویر دار کارڈ بیچ کر تھوڑا بہت کمانے کی کوشش کر لیا کرتا تھا۔

مسولینی اپنی جوانی کے زمانے میں اپنے باپ کی آہنگری کی دکان میں کام کرتا تھا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر سے اپنے لئے کام کاج کر کے کمانا شروع کر دیا تھا۔ اور اس دوران میں وہ مستقل طور پر مطالعے میں بھی مصروف تھا۔ اس کا تمام زمانۂ جوانی ہمیں قوتِ حیات اور امنگوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ چھبیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پیشتر ہی وہ نو بار سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے سلسلے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اور اٹلی کے سب سے بڑے سوشلسٹ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔

مسولینی نے میدانِ جنگ میں بھی کارِ نمایاں کئے لیکن ہٹلر کی زندگی ان کارہائے نمایاں سے یکسر عاری رہی۔ وہ جنگ جویانہ اشغال جو آج جرمنی کی نوجوان نسل کو سکھلائے جا رہے ہیں اُن میں اُس نے خود کبھی حصہ نہ لیا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں اُس کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ وہ ۱۹۲۳ء میں اپنے دوستوں اور حامیوں کو میونخ کے بازاروں میں گولیوں کا نشانہ بنتا چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا اور اب بھی وہ جب کبھی فوجی جلوسوں میں شامل ہوتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ بازاروں میں دو رویہ تین تین قطاریں سپاہیوں کی متعین ہوں۔

جرمنی کے عوام میں ہٹلر کی مقبولیت اور کامیابی کا راز اس کا واحد جوہر خداداد ہے یعنی تقریر کی قابلیت۔ آج تک جرمنی میں ایک زبردست مشہور مقرر نا پید تھا۔ اور ہٹلر جرمنی کے لوگوں پر ایک جادو سا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریروں میں وہ خصوصیت موجود ہے جو ویگنر کی موسیقی میں تھی —— چند مؤثر ٹکڑوں کا تواتر۔ آہیں اور چیخیں اور ان سب سے بڑھ کر دیوتاؤں اور جوانمردوں، خونریزی اور قومیت کا ایک دھندلا اژدہام۔

مسولینی کا آہنیں لہجہ سادہ فقروں کو ایک مردانہ آواز میں ادا کر دیتا ہے۔ ہٹلر جب تقریر کرتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو جوش و خروش کی عصباتی بلندی تک لے جاتا ہے۔ تقریر کرتے ہوئے چبوترے پر سے وہ ایک بٹن دبا کر اپنے آپ پر برقی روشنی پھیلا دیتا ہے اس ساز و سامان کی موجودگی ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی اس عصباتی کیفیت کے لئے کس قدر تیاری کرتا ہے۔ حبشہ کی فتح کے بعد اپنی فاتحانہ تقریر میں مسولینی نے "میں" کا لفظ صرف دو بار استعمال کیا تھا۔ لیکن ہٹلر اپنی تقریر میں صدہا بار اس لفظ کو دہراتا ہے

چونکہ مسولینی کو اپنی ذات پر اعتماد ہے اس لئے وہ اپنے متعلق بہت کم باتیں کرتا ہے۔ لیکن ہٹلر میں خود اعتمادی پختہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے متعلق متواتر ذکر کرتا رہتا ہے۔ ولیم ثانی کی طرح ہٹلر ہمیشہ ایک مضبوط انسان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا باعث اس کی جبلی کمزوری ہے۔ اس حقیقت سے جرمنی کے لوگوں کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے کہ جرمنوں نے دوسری دفعہ اپنی تقدیر کو ایسے درخشاں متواتر بولنے والے، دھمکیاں دینے والے عصبانی شخص کے سپرد کر دیا ہے۔

اس نکتے کے لحاظ سے مسولینی اور ہٹلر کا فرق خاص طور سے نمایاں ہے۔ مسولینی جسمانی لحاظ سے اچھی ساخت کا ہے یعنی ہر طرح سے مردانہ خصائص کا مالک۔ لوگوں کے لئے اچھی مثال قائم کرنے کی غرض سے وہ اپنے ہاتھ میں کدال اٹھا کر عوام کے سامنے مصروف عمل ہونے کو تیار رہو جاتا ہے۔ ۵۳ سال کی عمر میں اس نے ہوابازی کا امتحان پاس کیا ہے۔ لیکن ہٹلر نہ کسی کھیل میں حصہ لیتا ہے، نہ موٹر چلا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور قسم کا جسمانی کام کرتے ہوئے اُسے دیکھا گیا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ پرانے زمانے کے ناٹکوں کی طرح وہ بادشاہ کا پارٹ ادا کرتا جائے اور لوگ اسے دیکھتے رہیں۔

مسولینی نے اپنی قیادت کے زمانے میں اپنے علم و تہذیب کے ذخیرے میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ وہ جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں نہایت روانی سے بول سکتا ہے۔ جب کبھی مسولینی سے مل کر کوئی شخص جدا ہوتا ہے تو اس ملاقات سے مسولینی ہمیشہ فایدہ اٹھاتا ہے۔ اور اپنی معلومات میں کسی نہ کسی بات کا اضافہ کرتا ہے۔ لیکن ہٹلر ملاقات کے تمام عرصے میں خود ہی بولتا رہتا ہے۔ ملاقاتی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ صرف ہٹلر ہی گرجتا ہے، اپنی آنکھوں کو گھماتا ہے میز پر زور زور سے مکے مارتا ہے اور بہت سے فقرے کہہ لینے کے بعد اچانک اپنی ملاقات ختم کر دیتا ہے۔

مسولینی اپنے تمام ماتحتوں سے جو حقیقتاً اس کے سکرٹری ہیں، قابلیت میں برتر ہے۔ لیکن ہٹلر سے اُس کے کئی وزرا زیادہ قابل ہیں۔ صرف پروپیگنڈا کے میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔ مسولینی صرف موسم گرما میں دارالسلطنت سے باہر جاتا ہے اور سماجی تقریبوں میں کبھی حصہ نہیں لیتا اور نہ کبھی لوگوں کو دعوتیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بے حد مصروف انسان ہے۔ لیکن ہٹلر تنہائی سے ڈرتا ہے۔ وہ خاموشی اور سکون سے خائف ہے۔ بلکہ وہ علم سے بھی گریزاں ہے۔ وہ سال کا زیادہ تر حصہ اپنے دیہاتی مکان میں بسر کرتا ہے جو برلن سے بہت دور ہے اور اس کے ملنے والے زیادہ تر سینما کے ایکٹر ہوتے ہیں۔ ایک مشہور سینما ایکٹر نے ایسی ہی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے۔ جب ایک شام ہٹلر کے ہاں بیس کے قریب سینما سٹار جمع تھے۔ ہٹلر سب کی تواضع شراب سے کرتا تھا لیکن خود سادہ پانی پیتا تھا۔ اس شام ہٹلر اپنے ساتھیوں کے سامنے تین گھنٹے تک متواتر تنہا بولتا رہا۔ ان تمام باتوں سے ہٹلر کی اس مایوس اداکارانہ فطرت کا اظہار ہوتا ہے جسے ہمیشہ تماشائیوں اور سامعین کی ضرورت رہتی ہے اور اسی بات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر کے فیصلے اور افعال کیوں اس قدر خطرناک ڈرامائی انداز لئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ اب کیا کہے یا کرے گا اور کہاں جا کر منہ نکالے گا۔

اس موازنے سے دو بے حد مختلف خصوصیات رکھنے والے قائدوں کے کردار نمایاں ہوتے ہیں۔ مسولینی کسی صورت میں بھی یورپ میں جنگ بپا کر کے اٹلی کی سرحدیں وسیع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک مکمل مثالی اطالوی سیاست دان ہے ـــــ بدگمان اور حقیقت پرست۔ وہ انتظار کرنا جانتا ہے اور انتظار کے بعد فاتح کے ساتھ مل جانا لیکن ہٹلر جرمنوں کی برتری کے لئے ہر بات کو بساط پر لگائے بیٹھا ہے۔ اور اس کی ہر کوشش جرمن قوت کی توسیع کی طرف مائل ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ جرمنوں کو حقیقتاً نوآبادیات یا یوکرین کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ اُن کو صرف فتح کی ضرورت ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ ایک بار پھر ۱۸۷۱ء کی طرح ورسیلز کے شیش محل میں فاتحانہ طور پر داخل نہ ہو جائیں۔

ان کا قائد جو ایک جذباتی اداکار ہے۔ انہیں اسی منزل کی جانب لئے جا رہا ہے۔ ایسی ہی امیدوں سے وہ جوانوں میں ایک برقی اثر دوڑا دیتا ہے۔ ہٹلر ولیم ثانی کی طرح جنگ کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے ہولناک نتائج سے خوفزدہ ہو کر اسے آخری لمحوں میں اس سے احتراز کی سر توڑ کوشش کرنی پڑے لیکن مسولینی جو جذباتی نہیں بلکہ ایک عملی سیاست دان ہے ہٹلر کی اس جنگ سے فایدہ اٹھائے گا اور ہٹلر کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ (رایمل لڈوگ)

چین مر نہیں سکتا

اس وقت جبکہ ہر شخص چین کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور جاپان کی چیرہ دستیوں کا تاسف سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ چین کے ماضی سے اس کے مستقبل کا اندازہ لگانا بے جا نہ ہوگا۔

نظامِ تعلیم

بہت سے علما کی رائے میں چینی قوم دنیا کی قدیم ترین قوم ہے۔ کیونکہ زبان کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو چینی زبان ایک چند حرفی لفظوں والی زبان ہے۔ اگرچہ الفاظ انفرادی طور پر مختصر ہیں لیکن زوردار بھی ہیں اور ایک وجہ یہی ہے جس کی بنا پر غیر ممالک کے لوگ اس زبان کا مطالعہ آسانی سے نہیں کر سکتے۔ ان کا طریقۂ تعلیم بہت مشکل ہے۔ ان کے ہاں حروف کوئی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی تحریر اصطلاحی نقوش میں ہوتی ہے۔ یہ اصطلاحی نقوش معانی کے وضعی استعارے ہیں۔ در یہ اس وقت سے موجود ہیں جب دوسری زبانیں شاید نشو و نما کی ابتدائی منزلوں میں ہی تھیں۔ ان اصطلاحی نقوش کا طریقہ تعلیم بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ معانی کا دارو مدار لہجے پر ہوتا ہے اور اس لئے صحیح سماعت کو کام میں لانا پڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں پورے طور پر گوش بر آواز رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی طریقے سے اس زبان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن ہین کے الفاظ میں "چینی زبان کے قواعد کی بنیاد حرکت و سکون پر ہے"۔ اصطلاحی نقوش کے مطالعے اور مخصوص تعلیمی نظام سے حافظے کے اجتماع و تسلسل خیال کی خصوصیات کو مدد ملتی ہے اور بلند ذہانت کے لوگوں میں اختراعی خلاقی اور فن کارانہ اہلیت اور چابک دستی پیدا ہوتی ہے۔ طبقۂ عوام ضرب الامثال کو حافظے میں محفوظ کرتا ہے۔ وہ ضرب الامثال جو زندگی میں ان کی رہنما ہوتی ہیں۔ چین کے طلبا کو اپنے موضوع سے متعلقہ تمام علوم کا بھی مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک مینڈرن یعنی چینی عامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذیل کے علوم کا مطالعہ کرے۔ قانون، فلسفہ، علم ادب، مختلف فنون، تاریخ، منطق اور ملکی تنظیم۔ ایک ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذیل کے علوم کا مطالعہ کرے۔ علم الابدان، علم نباتات، کیمیا، علم الادویہ، علم تشخیص، علم جمادات، اور تقریباً ہر وہ علم جس کا تعلق قدرت سے ہو۔ ذہانت کے لحاظ سے اور ممالک کی بہ نسبت چینیوں کی کھیلیں بھی برتر اور پیچیدہ تر ہیں۔

چین کے اقتصادی ذرائع

دنیا کے بہت سے دولت مند ملک ایسے ہیں جن کی دولت اب باقی نہیں رہی۔ کیونکہ ان میں یورپی اقوام کی زبردستیاں اپنا مہلک کام کر چکی ہیں۔ قدیم روما کی سطوت و دولت کا دارومدار ایشیا، سپین، کارتھیج اور یونان پر تھا۔ سپین نے میکسیکو کی تمام دولت چوس کر جمع کر لی۔ اور افریقہ اور اس کی دولت کے لئے یورپ کی تمام قومیں باہم دست و گریباں ہیں۔ آسٹریلیا کی سرزمین سے انگلستان کا خزانہ بھرا گیا۔ ہندوستان ماضی اور حال میں گوری اقوام کی حرص و آز کا شکار رہا۔ چین کی دولت کا اگرچہ سب کو علم ہے لیکن اس کے باوجود اب تک اسے نسبتاً محفوظ ہی رہنے دیا گیا تھا۔ چین کے کوئلے کے معادن انگلستان کے مقابلے میں بیس گنا بڑے ہیں۔ تانبا، سونا، چاندی، سیسہ، چکنی مٹی، تیل، پارہ اور سنکھیا — یہ سب اشیا چین میں موجود ہیں۔ دریائے امور کی وادی میں سونے کی زرخیز کانیں ہیں۔ مانچوکو سے سونا، لوہا، کوئلہ اور تیل بہ افراط برآمد ہوتا ہے۔ اگر ان کانوں سے کام لیا جائے تو چین کی دولت کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال ہوئے جاپان نے مانچوکو کا علاقہ چین سے چھین لیا اور اب بنگ کے ذریعے اس سے بھی آگے قدم بڑھا رہا ہے۔ جاپان کو اپنے کارخانوں کے لیے ان زمانوں اور خام پیداوار کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا چین بغیر کسی قسم کی جوابی جنگ کے اپنے آپ کو یوں ہی لٹنے دے گا؟ واقعات حاضرہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

پختگیٔ حیات کا اظہار

سخت قوانین کے نفاذ سے چینی قوم کو آج تک خالص اور استوار رکھا گیا ہے۔ یہ قوانین چینیوں کے ہجرت کرنے اور دوسرے ممالک کے مہاجرین کے چین میں بود و باش اختیار کرنے کے خلاف تھے اور اس لئے چین کی قسمت روما کی تقدیر سے مختلف ہے۔ جہاں

غیر ممالک کے غلام افراد نے رومیوں کو اپنے آپ میں جذب کر لیا چین میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت نہ تھی اور ماضی قریب تک ان کیلئے چین میں رہ کر چینیوں کے سامنے عیش و عشرت کی زندگی کی بری مثال پیش کرنا ناممکن تھا اور ان چینیوں کو جو غیر ممالک سے اجنبی عورتوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے چین میں لاتے سزا دینے کے لئے نہایت سخت قوانین مقرر تھے۔

آبا پرستی

اس طریقے سے نسلی آمیزش کا کوئی امکان نہیں رہا۔ چین کی آبادی چالیس کروڑ سے اوپر ہے اور اس گروہ عظیم پر قدیم خیالات اور ضابطوں کے ماتحت حکومت کی جاتی رہی ہے۔ کنفیوشس نے ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کو بنیادی اصول بناتے ہوئے چین کے مذہبی اور سماجی نظام کا نقشہ تیار کیا۔ کنفیوشس کا کہنا ہے کہ "اگر موت کی رسومات کی احتیاط کے ساتھ پابندی کی گئی اور آباؤ اجداد کے حفظ مراتب کا لحاظ رکھا گیا تو اس سے عوام کے ذاتی خصائص محکم تر ہوں گے" یہی چین کے نظم و نسق کا سنگ بنیاد ہے ان کا اعتقاد ہے کہ ان کے مردہ آباؤ اجداد کو اپنی آیندہ نسلوں میں ایک زندہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس لئے ہر تقریب آباؤ اجداد کی الواح مقابر کے روبرو منائی جاتی ہے۔ یہ اجداد پرستی گزشتہ تیس صدیوں سے رائج ہے اور سن عیسوی سے دو ہزار سال قبل بھی اس کا وجود تھا۔ یہی اعتقاد ملکی مذہب کی روح بن چکا ہے اور اس اعتقاد کے رسوخ میں شاہی خاندان کی سرگرمیوں کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ شہنشاہ کے آباؤ اجداد کے لئے مخصوص مندر تعمیر کئے جاتے تھے اور شہنشاہ اپنے آباؤ اجداد کا سلسلہ شانگتی ربرہم یعنی خدا سے ملاتا تھا۔ ایک مندر میں دس نسلوں کی تختیاں موجود ہیں جہاں شانگتی کو اعزازی جگہ دے کر باقی تختیوں کو اس کے دائیں اور بائیں نصب کیا گیا ہے۔

جو شخص اپنے اجداد کی پرستش کرے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیچھے اولاد چھوڑ جانے کی آرزو کرے تاکہ اس کی اولاد اگن ہوتر یا قربانگاہ پر ہمیشہ آگ جلتی رکھے جس سے اس کی اپنی روح نذر و نیاز کے ذریعے سے ہر وقت سرمست اور محفوظ رہے

ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری کے منافی جو تین وجوہات شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت بے اولاد ہونے کو ہے اور چین کے اس مذہبی اور سماجی اصول کی وجہ سے کم عمری کی شادی کو فروغ حاصل ہوا اور ہر خاندان میں افراد کی کثرت نظر آنے لگی۔ موت کے بستر پر ایک چینی کے لئے یہ خیال بے حد تسکین دہ ہوتا ہے کہ آیندہ دنیا میں اس کے متقدین اس کا استقبال نہایت انہماک سے کریں گے۔ کیونکہ ان سب کے اور خود اپنے نام اور یاد کو باقی رکھنے کے لئے وہ اس فانی دنیا میں بے شمار اولاد چھوڑ کر مرتا ہے۔

معابد اتحاد باہمی کا ذریعہ

چینیوں کے خاندانی معابد سے بہت سے مقاصد بیک وقت پورے ہوتے ہیں۔ یہ منادر، معبد، تھیٹر، سکول اور کمرہ مشاورت سب کا کام دیتے ہیں۔ بڑے بڑے وسیع تعلقات کی بنا پر ان منادر سے ملحقہ علاقے سب کی یکساں ملک تصور کئے جاتے ہیں۔ چین میں ایک گاؤں ایسا بھی تھا جس کی آبادی پچیس ہزار تھی اور جس کے تمام باشندے ایک نسل، ایک خاندان اور ایک نام سے متعلق تھے۔ وہ تمام خاندانی مندر میں جمع ہوتے تھے اور قربانگاہ کی خوشبودار بادلوں میں انہیں اپنے ماخذ یا اصل کی یکجہتی کا احساس ہوتا تھا۔ تن آسانی کی زندگی سے وہ سراسر ناواقف تھے اور وہ سب اپنا خون پسینہ ایک کر کے روزی کمانے میں ہی مطمئن تھے۔ ایسے گاؤں کی مثال ایک بڑے درخت کی سی ہے جس کی ہر شاخ اپنی علیحدہ جڑ رکھنے کے باوجود مرکزی تنے سے متعلق ہوتی ہے۔

بقائے نسل کا باعث

چینی لوگ بے مصرف اور جارحانہ جنگوں میں مصروف نہیں رہے۔ انہوں نے اس طرح کی خونریزی میں اپنے ملک کا قیمتی خون ضائع نہیں کیا۔ چین کے کسی جنگ آزمودہ انسان نے نئی بستیوں کو جا کر آباد نہیں کیا اور نہ ہی چین میں کوئی جنگ کے فاتح ہیرو لوٹ کر گھر آئے۔ یوں انہوں نے اپنی زندگی کا عہد شباب ضائع نہیں کیا۔ چین کے جرنیلوں نے کبھی قلعے کا خراج حاصل نہیں کیا

اور یوں وہ بیکاری اور اس کے مضر نتائج سے محفوظ رہے۔

چین کے باشندے آپس میں ایک ایسی زبان کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں جو اس طرح کی خصوصیات کی حامل ہے جو ان کو باقی بنی نوع انسان سے بالکل علٰحدہ رکھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس غیر شخص سے بھی اُن کا تعلق ہوتا ہے یا جو ان کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان خیالات کو جذب کرے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ راسخ تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے بہت جلد غیر ممالک کے فاتحین پر پرانے خیالات اور تمدن کا جادو اپنا قابو جما لیتا ہے اور یہ تمدن ایک ایسا تمدن ہے جس نے اپنی ثقافت میں قوت اور امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ چین کی زندگی اور خیالات میں ایسی خوبی ہے ایسی منطق ہے، ایسا احساس انسانیت ہے کہ یہاں تمام لوگوں پر چھا جاتا ہے جن کا اس سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ چین کے ایک بڑے سیاست دان لی ہونگ چانگ نے جس کی عقل و دانش اور سیاسی تدبر کی یورپ میں دھاک بندھ گئی تھی، ایک بار کہا تھا، کہ تاریخ اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ جو شخص بھی چین میں آیا وہ چینی تھا۔"

فاتحوں کا اٹل انجام

وہ تاتاری جنہوں نے چین کو فتح کر لیا، بہت جلد چین کے رنگ میں ہی رنگے گئے اور ان کی نسلیں اس وقت چین کی خاک پاک کی ہی پرستار ہیں۔ اسی طرح جاپانی بھی جن کے اجداد بھی تاتاریوں کی طرح منگول ہی ہیں، وقت آنے پر مفتوح باشندوں کے تمدن اور خیالات سے مغلوب ہو جائیں گے۔ اگرچہ اس وقت جنوبی چین اور مانچوکو کے علاقوں پر قبضہ کر کے وہ ان علاقوں کی ریل کے سلسلے کے ذریعے سے چین کی خام پیداوار سے فاتحانہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ لیکن انجام کار تمام وہ جاپانی جو چین کی بود و باش اختیار کر لیں گے یقیناً چینی بن جائیں گے۔

نانکن کی مثال سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے چھٹی صدی کے آخر میں نانکن کو زمین کے ساتھ برابر کر دیا گیا تھا۔ بلکہ شہر کی تمام زمین پر ہل چلا دیئے گئے تھے تاکہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ جائے لیکن بہت جلد اس شہر نے از سر نو لوگوں کی معترف نگاہوں کے سامنے اپنا سر اٹھایا۔ لیپن کے باغیوں کے ہاتھوں انیسویں صدی میں نانکن دوبارہ برباد ہوا اور جب ان باغیوں کو شکست ہوئی تو وہ اپنے پیچھے ایک جلتا ہوا شہر جو محض آگ کا ڈھیر تھا چھوڑ گئے۔ لیکن جیسے سمندر آگ میں مر کر آگ ہی سے حیات تازہ لے کر اٹھتا ہے اسی طرح نانکن اُس پہلے شہر کی راکھ میں سے ہی نیا روپ لے کر اٹھا۔ نانکن کی یہ تاریخ جدید چین کی روح کو ایک استعارے میں بیان کرتی ہے ۱۹۱۲ء میں نانکن کو دارالخلافے کی حیثیت سے ترک کر دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں یہ پھر چین کا ممتاز ترین شہر تھا۔ اور قوم پرست چینیوں نے اپنے اس باعث افتخار شہر کو از سر نو دولتمند اور ترقی یافتہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا ان حالات کی موجودگی میں چین کے جان نثار نانکن کو ہمیشہ کے لئے جاپانیوں کے نیچے ہاتھوں میں رہنے دیں گے؟ —— ہرگز نہیں!!

بسنت سہائے

رباعی

اے سانس تری گلاب سے مشکیں تر
اے بوسۂ تر شراب سے نوشیں تر
وہ بادہ جسے لبوں نے کیا ہو جھوٹا
وہ تلخ بھی ہے نبات سے شیریں تر

سعید احمد اعجاز

اقبال سے

اے کہ تری ذات سے قائم ہے ملت کا وقار
اے کہ تجھ سے ملتہب ہے زندگانی کا شرار

اے کہ تری روح میں ہیں جذبِ فطرت کے رموز
اے کہ تیرا دل ہے روشن مثل مہرِ نیم روز

اے کہ تیرا فلسفہ ہے جانِ اسرارِ خودی
اے کہ تیرا نغمہ ہے مضرابِ سازِ زندگی

اے کہ تیری لوحِ دل ہے مہبطِ انوارِ حق
اے کہ تیری روح پر ہیں منکشف اسرارِ حق

اے کہ تیرے شعر میں جاں سوزیٔ پروانہ ہے
اے کہ تو بہبودِ ملت کے لئے دیوانہ ہے

اے کہ تیری رفعتِ تخئیل کا یزداں شکار
اے کہ تیرے دم سے قائم نوعِ انساں کا وقار

اے کہ جدوجہد کے میدان کا غازی ہے تو
اے کہ اپنے وقت کا رومی ہے تو رازی ہے تو

اے سراپا التہاب اے پیکرِ سوز و گداز
اے حریفِ بادۂ سرمست و سرجوشِ حجاز

اے خمِ آشامِ مے پاکیزۂ حبِ وطن
اے شہیدِ خنجرِ اخلاق و تہذیبِ کہن

کس قدر حرماں نصیب اے شاعرِ مشرق ہے تو
قوم ہے باطل پرست اور رہبرِ صادق ہے تو

کچھ ٹھکانا ہے تری محرومیٔ تقدیر کا
تو غلامِ آبادِ ہندوستان میں پیدا ہوا

یعنی تو پیدا ہوا ہوتا اگر افرنگ میں
مشورہ لیتی تجھی سے قوم صلح و جنگ میں

سرزمینِ ہند میں ہے ان دنوں قحط الرجال
قعرِ گمنامی میں ہیں کھوئے ہوئے اہلِ کمال

وقت آئے گا کہ قوم ان کو ابھارے گی کبھی
یعنی تقدیر کے گیسو سنوارے گی کبھی

پھر تجھے اقبال اے سرآمدِ اہلِ کمال
قوم سمجھے گی کہ تو ہے واقعی بھارت کا لال

ناظر

ماں اور بچہ

جہاں گرد طلباء کے گیت

بارھویں صدی کے جہاں گرد اور خانہ بدوش یورپی طلبا کے لاطینی گیت سننے اور سمجھنے سے پہلے بہت ضروری ہے کہ ہم یہ بات معلوم کریں کہ اس زمانے کے یورپ میں زندگی کے مختلف پہلو کس نہج پر تھے۔ یہ طلبا ایک خاص فرقے کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب تک ان کی نفسیات، اُن کی طرزِ بود و باش اور زندگی کی روش کے متعلق چند خاص باتیں پیشِ نظر نہ کر لی جائیں ان کے نغموں سے پورے طور پر لطف اور فایدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ——

جب ہم زمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی ذہنی اور اخلاقی کیفیت کا تصور باندھیں تو چند مقررہ اور معیّن خیالات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت یورپ کی تمام اقوام ایک مجہول ذہنی خوابِ خرگوش میں مبتلا تھیں۔ یونان اور روما کے علوم و فنون رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے کتب خانے بے کار رہ کر کرم خوردہ ہونے کے لئے بھلا دیئے گئے تھے اور ہر قوم کے افراد قیامت کے خوف اور انتظار میں انتہا پسند بن چکے تھے۔ نیکی کی طرف مائل ہوتے ہوئے وہ زندگی کی عام مسرتوں کو بھی گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے اور برائی کی طرف رجوع کرتے ہوئے وہ ایک وحشیانہ اشتیاق کے ساتھ اپنی ہستی کو پست خواہشات اور نفس پرستی کے حوالے کر دیتے تھے۔ آیندہ دنیا اور آیندہ زندگی کے متعلق حد سے زیادہ غور و تفکر نے انہیں اس لائق نہ رہنے دیا تھا کہ وہ اُن باتوں پر قابو پا سکیں جن سے اس دنیا میں اُن کی موجودہ زندگی خوشگوار بن سکے۔ فلسفیوں اور حکماء کے دانش اور تدبّر کی ایسی قلبِ ماہیت ہو چکی تھی کہ ان کے خیالات جہالت کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے اور ایسے بیکار اور لاحاصل مسائل اور موضوع ان کا مشغلہ تھے جن کو حقیقت اور واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مذہبی جنون نے آزاد مطالعے اور مدلّل تجربات کی شمع کو گُل کر دیا تھا۔ تمام سماج دقیانوسی خیالات کے بارِ عظیم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ پیشہ ور مذہبی نمایندے دوزخ کی مکروہ اور گھناؤنی مصیبتوں اور عذاب کے ذکر و بیان سے سامعین کے خیالات کو تلخ بناتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مقدس مقامات کی زیارت کو ہی ذریعۂ نجات تصور کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے دل و دماغ کی قدرتی نشو و نما رُک گئی تھی اور وہ شیطانی قوتوں سے عہد و پیمان باندھے ہوئے، نظم و نسق کے فقدان کی وجہ سے، جادو اور مجنونانہ خواہشات کی طرف مائل ہو کر اوٹ پٹانگ تصورات کی دنیا میں مگن تھے۔ سماج میں عورت کا اصلی درجہ قایم نہ رہا تھا۔ ایک طرف تو لہو و لعب اُسے جنسی جذبات کا آلہ کار سمجھتے تھے۔ اور دوسری طرف اُس کا رتبہ اتنا بلند سمجھا جاتا تھا کہ اُسے ولایت کا رتبہ ایک تقدیس کا ذریعہ اور آخری منزل کہا جاتا تھا۔ عام سوجھ بوجھ، فیصلے کی قوت، حقیقت کو حقیقت سمجھنا، زندگی کے بُرے پہلوؤں سے بچنا اور نیک صورتوں کی طرف مائل ہونا، —— ان تمام باتوں کی زندگی کے ہر شعبے میں کمی تھی۔ ضد اور غلط فہمی کی وجہ سے زندگی کے مناسب مقاصد ان کی نظروں سے دور ہو چکے تھے اور وہ حقایق کی طرف مائل ہونے کی بجائے اپنی قوتوں کو موہوم سایوں کے تعاقب میں ضائع کر رہے تھے اور اس مستقبل کے منتظر تھے جس کے متعلق انہیں کوئی خبر نہ تھی اور اُس حال کو قابو میں کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے جس سے وہ دو چار تھے۔ اس زمانے میں متحدہ یورپ کا سب سے اہم اقدام محاربۂ صلیبی تھا اور یہ ایک فاش غلطی تھی جس سے انجام کار خون خرابے کے سوا اور کچھ نہ حاصل ہو سکا۔

یہ وہ کیفیت ہے جو یورپ وسطیٰ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یقیناً یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ کیونکہ ان کا ماخذ راہبوں کا وہ علم ادب اور تاریخ ہے جس میں احیائے علوم

وفنون کے ردِّ عمل کی وجہ سے مبالغے کی بہت آمیزش ہے۔ اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے میں یورپ کی ذہنی فضا غیر قدرتی طور پر دھندلی ہو رہی تھی جس کی مثال ہمیں روما کے زوالِ سلطنت ور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیانی وقفے میں اور کہیں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود اس زمانے کی کئی باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہم اس عہد کے حق میں بھی زبان کھول سکتے ہیں۔ ابتدائی ازمنہ وسطیٰ نے یقیناً قدیم تہذیب و تمدن کو مٹا دیا لیکن آخری ازمنہ وسطیٰ نے حمقوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس کی ہستی سے قدیم خیالات اور قدامت پرستی کو بنا حاصل رہی۔ لوگوں کے ذہن اور خیال اس بات کے عادی ہو گئے کہ ان تصورات کی خیالی دنیاؤں اور مذہبی عذابوں کے اندیشوں کے ہمدوش رہ سکیں جو حقیقی قابلیتوں کے غلط استعمال کے منت کش تھے۔ چنانچہ جب ہم ان مقررہ خیالات کی موجودگی میں یورپی طلبا کے ان لاطینی گیتوں سے دو چار ہوتے ہیں تو ہمیں بہت حیرانی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمیں ان گیتوں میں زندگی کا ایک بے باک، تازہ و شگفتہ، قدرتی اور آزاد اندازِ نظر معلوم ہوتا ہے اور یہ اندازِ نظر ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ ہم اس زمانے کے متعلق اپنے مقررہ خیالات سے علیحدہ ہو کر منصفانہ رائے زنی کریں۔ ان گیتوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی مردوں اور عورتوں کی طبعی تحریکات اور آرزوئیں ویسی ہی زور دار اور گہری تھیں جیسی کہ یونان اور روما کے زمانے میں یا احیائے علوم و فنون کے بعد۔ ہاں ایک بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ اس زمانے میں ان تحریکاتِ طبعی میں ویسی باقاعدگی اور پختگی نہ تھی۔ ان جہاں گرد اور خانہ بدوش طلبا کی شاعری اس گروہ کی تخلیق تھی جو مذہبی علم کے طالبوں میں ذیلی درجہ رکھتا ہے اس سے روزمرہ کے انسانی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ شاعری ایک عامیانہ رنگ کی حامل نظر آتی ہے۔ اس سے عوام الناس کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس میں کبھی کبھی علم اور مذہب کی گہری جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔

یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں ایک ایسا احیاء وجود میں آیا جس کے لئے ابھی مناسب موقع پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کا مرکز فرانس تھا اور اس کے عروج کا زمانہ بارھویں صدی کا وسطی اور آخری حصہ تھا۔ نیز لوتھر سے دو صدی پہلے انگلستان میں ایسی مذہبی تحریکات ہوئیں جو مشرقی یورپ پر پھیل گئیں۔ طلبا کے ان گیتوں سے جو بارھویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ان دونوں تحریکی کوششوں کا اظہار ہوتا ہے جو لوگوں نے زہد نفس سے رہائی پانے کے بعد کیں۔ ان سے لوگوں کے ان بے روک احساسات کا اظہار ہوتا ہے جن میں ایک ہلکی سی عالمانہ جھلک بھی موجود ہے اور جو تمام ملک میں پھیل چکے تھے۔ ان سے ایک ایسے گروہ کے جذبات کا پتہ چلتا ہے جو اس زمانے میں اپنے خیالات کی وجہ سے یکتا نظر آتا ہے۔ ان سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو زندگی اور نفسی لذتوں سے وہ حظ اندوزی جو زمانۂ احیا کی ایک خصوصیت ہے اور دوسرے روم کی پاپائیت سے جو تخریب پھیلی اس کے خلاف بغاوت۔

اس شاعری کے متعلق ہماری معلومات کے ماخذ دو ہیں۔ ایک نویں صدی کا وہ مسودہ جو بویریا کے بالائی علاقے کی ایک خانقاہ سے برآمد ہوا اور دوسرے وہ مسودہ جو ۱۲۶۴ء سے پیشتر لکھا گیا۔ اور ۱۸۴۷ء میں شائع کیا گیا۔ ان دونوں مسودوں میں بہت سی نظمیں یکساں ہیں لیکن پہلے مسودے میں وہ نظمیں جو احیائے علوم و فنون سے پیشتر لکھی گئیں کثرت سے ہیں اور دوسرے مسودے میں سنجیدہ اور طنزیہ نظمیں زیادہ ہیں۔ ان دونوں مسودوں کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن علما کی مختلف تصانیف و تالیفات سے بھی طالب علموں کی اس شاعری کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ان گیتوں کو پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے مصنفوں کے حالات اور ان کی شاعری کے فنی تجزیہ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

اہلِ روما اپنے علم و ادب کے انتہائی ترقی یافتہ اور معیاری زمانے میں بھی شاعری کے لئے عام طور پر قدرتی اور آسان بحریں اختیار کیا کرتے تھے۔ لیکن مشکل اور مقررہ بحریں رومی علما نے یونانیوں کے تتبع میں اختیار کیں۔ اس سلسلے میں حقیقت کچھ بھی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ جوں جوں پرانے تہذیب و تمدن کو زوال ہوتا گیا، لاطینی نظم نگاری میں مقررہ اور مشکل بحروں کی جگہ موزوں اور لہجے کے لحاظ سے قدرتی اور آسان بحروں نے لے لی۔ کلیساؤں کی مذہبی موسیقی کی وجہ سے نظم نگاری کے نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ قوافی کا رواج جاری ہوا، اور کئی اور اختراعات عمل میں آئیں۔ اس طرح شاعری میں ایک وسیع تنوع پیدا ہو گیا اور نظموں میں شگفتگی، لچک اور زورِ بیان کا رنگ آ گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ دسویں صدی سے پہلے کے زمانے کو علوم و فنون کی کمی اور زوال کی وجہ سے

تاریک زمانہ کہا جاتا ہے لیکن اس عہد میں بھی چند کرنیں اس بے باک اور آزاد نور کی دکھائی دے جاتی ہیں جو گزشتہ صنم پرستی اور شرک کے زمانے کی خصوصیت تھا۔ یا جسے موجودہ زمانے کی صاف گوئی کی ابتدائے بعید کہا جا سکتا ہے۔ ساتویں اور دسویں صدی کی شاعری میں اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے چند مثالیں موجود ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی جب قیامت کے قرب کا دہشت ناک اندیشہ لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا وہ شراب و شعر و نغمہ اور ان سب سے بڑھ کر عورت کو بھولے نہیں تھے۔ ان میں تا حال اس بات کی اہلیت تھی کہ وہ دنیاوی مسرتوں سے حظ اندوز ہو سکیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل کی لاطینی شاعری کی ان مثالوں کے متعلق تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان کے متعلق محض اشارہ کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ بارھویں صدی کے احیائے علوم و فنون اور گزشتہ فنی زوال میں بھی ایک مبہم اور نازک ارتقائی رشتہ ہیں اور یہی سلسلہ آگے چل کر اٹلی کی چودھویں اور پندرھویں صدیوں کی فنی اور علمی بلندی سے جا ملتا ہے۔ اس شاعری کی تین خصوصیتوں کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس شاعری میں قدیم نظم نگاری کی بہ نسبت موسیقی نمایاں طور پر موجود ہے اور اس میں قدیم بحروں کو ان نئے اثرات کے ماتحت زیادہ سریلی یا نغماتی بنا لیا گیا ہے۔ دوسرے عوام کی مذہبی شاعری نے خانقاہوں کی فاضلانہ اور عالمانہ شاعری کو پس پشت ڈال دیا اور تیسری قابل غور خصوصیت یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے تاریک ترین عہد میں بھی لامذہبی اور آزاد خیالی کی رنگ آمیزی، پرانے علم الاصنام کی ہلکی ہلکی خوشبو، جلاوطن دیوتاؤں کی سرگوشیوں کی صدائے بازگشت اور ایسی تمام باتیں جو انسان کو اس دنیاوی زندگی کے عیش و مسرت سے محظوظ ہونے پر اکساتی ہیں، یورپ کے طول و عرض سے کلیتہً معدوم نہیں ہوئی تھیں۔

ایک بات اور، اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگ اپنے شاعرانہ جذبات اور احساسات کو لاطینی زبان میں اس لئے ظاہر کرتے تھے کہ ان کی اپنی زبانیں ابھی اس قابل نہ تھیں کہ وہ نزاکت خیال کے ہر پہلو کا بار سنبھال سکتیں۔

جہاں گرد طلبا کے یہ گیت عالمانہ شاعری کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ انہیں سلاست اور قبول عام کا تمغہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ نغمے ایسے لوگوں کی تخلیق تھے جو متمدن اور مہذب تھے اور کسی نہ کسی قسم کے علم و فنون سے متعلق ۔۔۔ اور لاطینی زبان کے متعلق اُن کا علم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انہیں بغیر مبالغے کے علامہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن یہ جہاں گرد طلبا تھے کون! ان کا سرسری ذکر تو یورپ کے علم ادب اور تواریخ میں بسا اوقات آتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی بیانات نہیں ملتے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ جہاں گرد اور خانہ بدوش سے انسان تھے جو علم کی تلاش میں مختلف ممالکِ یورپ میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ اپنے اپنے وطن سے دور ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بغیر دولت کے بغیر فکر و تردد کے، بے پروا، عشرت پسند، وہ ایک آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ اور منطق یا دینیات کے کسی مسئلے پر بحث کرنے کی بجائے شراب و شعر و نغمہ اور عورت ان کے دلپسند موضوع سخن ہوا کرتے تھے اور اُن کو لیکچر کے کمرے کی بہ نسبت کسی میخانے کی زینت بڑھانا زیادہ مرغوب خاطر تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے مختلف ممالک مختلف علوم کے راہ نما تھے۔ اس لئے ایک طالب علم کے لئے مختلف یونیورسٹیوں کا سفر ایک ناگزیر چیز تھا اور صلیبی جنگوں کے بعد سماج کے ہر حلقے میں ایک بے چینی سی چھا گئی تھی، جس کی وجہ سے ہر طرح کے لوگوں میں جہاں گردی کا ذوق ترقی پا چکا تھا، تیرتھ یاترا کے لئے تجارت کے لئے، محض تجسس اور شوق علم کے لئے، تجارتی لحاظ سے صنعتی پیشوں کو بلندی پر پہنچانے کے لئے یا مختلف فنوں کے محض ذاتی حصول کے لئے اس زمانے میں جہاں گردی کا یہ ذوق جس قدر ترقی حاصل کر چکا تھا اُس کا اندازہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا علماء نے لگایا تھا۔ بارھویں صدی کا ایک راہب لکھتا ہے۔ "ایک عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا کا چکر لگائے اور اس کے تمام شہروں میں پہنچے۔ یہاں تک کہ علم جب حد سے بڑھ جائے تو اُسے دیوانہ کر دے"۔ گویا جس طرح ایشیا میں مہاتما بدھ کے بھکشو تبلیغی مقاصد کو لئے ہوئے تمام کرۂ ارض کی خاک چھانتے پھرتے تھے اُسی طرح یورپ کے یہ طلبا اور سیاح ہر ملک کے کونے کونے میں جا پہنچتے تھے۔ لیکن ان سب میں اُن لوگوں کی ایک علیحدہ جماعت تھی جو علم کی چھان بین کے لئے گھر سے نکلتے تھے۔ لیکن مذہبی فرقوں سے متعلق زاہد سیاحوں سے ان کی ایک جدا اور نمایاں حیثیت تھی۔ کیوں کہ یہ لوگ نہ تو کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے تھے، نہ انہوں نے کوئی حلف اٹھا رکھا تھا اور نہ ہی یہ کسی قسم کے رسم و روایات کے پابند تھے۔ عام شہریوں سے ان کو نفرت تھی اور ان

سے وہ کسی طرح کی راہ ورسم پسند نہیں کرتے تھے۔ سپاہیانہ پیشے کے افراد سے اگرچہ انہیں کوئی خاص مخاصمت ہرگز نہ تھی پھر بھی یہ ان سے اپنے آپ کو بالاتر ضرور خیال کرتے تھے۔ اگرچہ وہ طبعاً اور ضرورتاً آزادمنش تھے۔ پھر بھی ان کی ہمدردی مذہب کے ساتھ تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں جس قسم کے رجحانات زندگی کے ہر پہلو پر طاری وساری تھے۔ ان کے مطابق یہ طلبا بھی خودبخود ایک جماعت یا فرقہ تصور کئے جانے لگے اور ان کی شاعری سے بھی اگر کسی بات کا سب سے واضح اظہار ہوتا ہے تو وہ یہی جماعتی احساس ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں اخوت اور ایک طرح کا بھائی چارہ پیدا ہو گیا تھا۔

یہی وجوہات اور جبلی حاجتیں جن کے باعث وہ مجبوراً ایک بے ساختگی کے ساتھ افراد سے ایک جماعت کی شکل میں منتقل ہو گئے۔ انہیں کی بنا پر ان کے لئے ضروری ہوا کہ اپنا کوئی پیر مقرر کریں۔ لیکن چونکہ ان کا گروہ آزاد خیالات کا حامل تھا۔ اس لئے یہ بات لازمی تھی کہ ان کا سرگروہ یا پیر بھی آزادمنش ہی ہو۔ اس پیر کی حیثیت غالباً وہی تھی جو مغل زنداں میں پیرمغاں کی ہو سکتی ہے۔ اس سرگروہ کو وہ گولیاس کے نام سے موسوم کرتے تھے اور خود اس کے مرید ہونے کے لحاظ سے گولیارڈی کہلاتے تھے۔ گولیاس کا رتبہ باپ اور آقا کے برابر ہوتا تھا اور گولیارڈی یعنی اس کے مرید اس کے خاندان اس کے بال بچوں اور اس کے شاگردوں کا درجہ رکھتے تھے۔

کیا طلبا کے اس فرقے کی نمود کسی شخص گولیاس نامی سے ہوئی یا خودبخود اس فرقے کے صورت اختیار کر جانے کے بعد پیر کے طور پر گولیاس کا وجود ظاہر ہوا۔ اس سوال کا قطعی جواب ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ البتہ ایک بات طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ گولیاس یا گولیارڈی کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ "گولا" ہے۔ جس کے معنی چٹورے، پیٹو اور چٹخارے باز کے ہیں اور اگر اس کا ماخذ دیہاتی زبان کا لفظ "گولیار" قرار دیا جائے تو اس صورت میں اس کے معنی دھوکہ باز کے ہو جائیں گے۔ چٹخارے باز اور دھوکے باز ـــــ بازی کا تعلق ہر صورت میں ان کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ وہ لوگ منچلے تھے اور زندگی کو سنجیدگی کے ساتھ کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بہرحال جہاں گرد طلبا کے لئے اس لفظ کا اطلاق ازمنۂ وسطیٰ میں عام تھا جس کا پتہ مذہبی دستاویزوں سے چلتا ہے

ان طلبا کی شاعری کو ہمیں اس نظر سے دیکھنا ہوگا گویا وہ ایک مخصوص جماعت کا تخلیقی کارنامہ ہے۔ لیکن تفاصیل اور ہر مصنف یا شاعر کے حال کی عدم موجودگی اور نایابی کے باوجود یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہ نغمے بہت سے مختلف شاعروں کا کلام ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت کا بھی مالک تھا۔ اور یہ بات ان گیتوں کو نظر تنقید سے دیکھنے کے بعد نہایت آسانی سے پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔

مذہبی دستاویزوں کے مطالعے سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ عوام کی نگاہوں میں ان طلبا کا وہی درجہ تھا جو مسخروں اور آوارہ گرد بھانڈوں کا۔ کیونکہ آوارہ گرد بھانڈ اور جہاں گرد طلبا ـــــ ان دونوں جماعتوں کا ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی نظام میں یکساں رتبہ تھا۔ دونوں کا کام ان لوگوں کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا تھا جن کا درجہ دنیوی لحاظ سے ان سے بالاتر تھا۔ مستثنیات کے علاوہ دونوں جماعتوں کے افراد کا کوئی مقررہ مسکن و مامن نہیں ہوتا تھا۔

ان تمام نغموں میں شاعر کی شخصیت ہمیشہ روپوش ہو کر معدوم ہو جاتی ہے۔ شاعر کے انفرادی نام کی بجائے صرف انفرادی انداز بیان باقی رہ جاتا ہے۔ اور نظم یا گیت گولیاس یا سرگروہ کی زبان سے ادا ہوتے ہوئے گویا جماعتی احساسات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ مقبول عام ادب کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ فرد، جماعت میں گھل مل جائے۔ کیونکہ وہ جذبات اور خیالات جو مقبول عام شاعری کا موضوع ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ ذاتی ہونے کی بجائے جماعتی ہوتا ہے۔ وہ جذبات ایسے ہوتے ہیں کہ یکساں ہمدردی اور ذہانت کی بنا پر تمام دنیا انہیں محسوس کر کے شاعر کے طرز نگارش کو اپنا سمجھتے ہوئے اختیار کر لیتی ہے اور اس سلسلے میں اگر کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو وہ صرف اتنی کہ ان کی عالمگیر مطابقت میں وقتی اور سماجی صورت حالات ایک معمولی سی خلیج پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے دیہاتی گیتوں سے کسانوں کی زندگی اور شہری زندگی کا تضاد ظاہر ہوتا ہے ویسے ہی طلبا کے ان گیتوں سے بھی آوارہ گردی کی زندگی کے تعصبات اور دیگر خصوصیات منکشف ہیں ان گیتوں میں نغماتی جذبہ صحیح اور سچا ہوتا ہے، احساس کے ساتھ غیر منصفانہ انداز نظر نہیں برتا جاتا، اور ان میں ہر جگہ حقیقت کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں وہ ذاتی اور شخصی پکار معدوم ہوتی ہے جو شاعرانہ تخلیق میں ایک خاص ہمدردی اور گہرائی پیدا کر دیتی

ہے۔ کیونکہ ان نغموں کو تیار کرتے ہوئے ایک شخص ہزارہا انسانوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ دیہاتی گیتوں کی طرح ان نغموں میں عالمگیر احساس کی وجہ سے شخصی خصائص ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ دلچسپی جس کا تعلق مخصوص حالات سے ہوتا ہے ان نغموں کی انسانی طبیعت سے وسیع مطابقت کی بھینٹ ہو جاتی ہے۔ ایسا نغمہ ہر اُس شخص کو اپنا نغمہ معلوم ہوتا ہے جو رنج و اندوہ کی حالت میں ہو یا کسی کو چاہتا ہو یا کسی پر فتح حاصل کر چکا ہو۔ ان نغموں سے سب دنیا کو چھوڑ کر کسی ایک انسان کے غم، محبت اور جیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان میں اُن ان گنت انسانی زندگیوں کے احساسات و تاثرات موجود ہوتے ہیں جو نسلاً در نسلاً مختلف زمانوں میں پھیلی چلی جاتی ہیں۔ ان میں ایسے فرق نہیں جو جو یہ کہنے پر مجبور کر دیں کہ انسانی جذبات کی یکسانی کے باوجود میر، غالب اور داغ کے نغمات محبت ایک نہیں ہیں۔ ان میں مختلف فن کارانہ اثر کم ہوتا ہے اور با یں ہمہ انسانی خصوصیت زیادہ اس قسم کا ہر نغمہ تخلیق کے بعد عوام کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب میں گھومتا پھرتا ہے۔ سینہ بسینہ اور زبان بہ زبان اس نغمے کا سفر جاری رہتا ہے کہیں پہنچ کر وہ خود کو ضائع کر دیتا ہے اور نئے نغمے پیدا کر لیتا ہے کہیں پہلے موجود نغمے کو معدوم کر کے اس کی جگہ خود لے لیتا ہے۔ کبھی اتنے کانٹ چھانٹ کے باعث اصلی ہیئت سے دور کا تعلق بھی نہیں رہتا کبھی اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کی وجہ سے اسے ایک بہتر یا بد تر مگر بہر حال نئی شکل مل جاتی ہے۔ کہیں یہ مختلف مقاصد کو پورا کرنے کے لئے گھٹایا بڑھایا جاتا ہے۔ مقبول عام شاعری کا ہر زمانے اور ہر ملک میں یہی حال ہوتا ہے اور مذکورہ خصوصیات ایسی شاعری میں ہمیشہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ان کے بیان کی ضرورت یہاں اس لئے درپیش آئی کہ طلبا کے ان گیتوں میں یکساں جذبات و احساسات اور خیالات، یکساں انداز نظر اور طرز بیان بلکہ بعض اوقات یکساں مصرعوں پر حیرانی محسوس نہ کی جائے چنانچہ اسی وجہ سے ہم شاعروں کی شخصیت کا مسئلہ بحث سے منسوخ کئے دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مقبول عام ادب اور شاعری میں اس بات کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم ان گیتوں کے مصنفوں کی قومیت کا مسئلہ بھی معرض بحث میں نہیں لاتے۔ کیونکہ اطالیہ، انگلستان فرانس اور جرمنی تمام ملک ان کے مصنفین کا اپنے سے وابستہ ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور اصل بات بھی یہ ہے کہ ان طلبا میں ہر ملک اور قوم کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے قدرتاً ان نغموں کے شاعر بھی یورپ کے ہر ملک اور ہر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور چونکہ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ہمہ گیر زبان لاطینی تھی اس لئے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم یا گیت کون سے ملک یا قوم کے شاعر کی تخلیق تھا۔ البتہ یہاں مشہور انگریزی عالم جے۔ اے۔ سائمنڈز کی رائے بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ یہ نغمے زیادہ تر جنوب مغربی جرمنی اور بویریا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ گیت جو بہاریہ اور عشقیہ ہیں۔ ان کی شدتِ احساس سے ظاہر ہے کہ وہ جرمن رشتے میں منسلک ہیں۔ وہ گیت جن سے انگریزی سیاسی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے۔ انگلستان سے متعلق کہے جا سکتے ہیں۔ وہ گیت جن کو ایک فرانسیسی شاعر سے منسوب تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ گیت جن میں ٹیپ کے مصرعے فرانسیسی ہیں، فرانس سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ گیت جن میں زیتون اور صنوبر کے درختوں کا ذکر ہے انہیں اطالوی شعرا سے نہیں تو اطالوی اثرات اور حالات سے نسبت دی جا سکتی ہے۔

ان گیتوں کی ہیئت اور بیان کے متعلق دو باتیں کہی جا سکتی ہیں پہلی یہ کہ ان میں سے اکثر کی بحریں مذہبی نظموں اور مناجاتوں کے ڈھب پر مقرر کی گئی ہیں۔ اور ان کا انداز بیان مذہبی شاعری کا سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مناجاتوں کے تتبع میں لکھی ہوئی نظمیں اور تضمینیں زیادہ ہیں لیکن ایسی تمام نظمیں طنزیہ یا ہجائیہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو گیت مقبول عام مناجاتوں کے ڈھب پر تیار نہیں کئے گئے وہ نغماتی ضرورت کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں اور ان کی ہیئت کئی بار بہت پیچیدہ سی ہو جاتی ہے۔ اُن کے مصرعوں کی لمبان مختلف اور اُن میں کبھی سادہ اور کبھی دوہرے قوافی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی بغیر قوافی کے بھی کام چلا لیا جاتا ہے۔

ان گیتوں کو موضوع کے لحاظ سے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں ایسی نظمیں ہیں جن کے موضوع ان طلبا کی آوارہ، کھلنڈری اور منچلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہار کے موسم کی باتیں، دیہات کی کھلی فضا کی مسرتیں، عشق و محبت کے مختلف پہلو مختلف قسم کی عورتوں کا ذکر و بیان اور شراب اور قمار بازی۔ یہ تمام چیزیں اس حصے کی زینت ہیں۔ دوسرے حصے میں زیادہ سنجیدہ باتوں کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اس میں سماج پر طنزیہ نظمیں خصوصاً روم کے دربار کی ہجویں، ہر ملک کے مذہبی پیشواؤں کی زندگی پر نقد و نظر، اخلاقی غور و تفکر، اور انسانی زندگی کے اختصار کے متعلق خیال آرائی

موجود ہے۔ ان دونوں حصوں میں پہلا حصہ ایسا ہے جس سے ان شعرا کے متعلق زیادہ شگفتہ اور واضح تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے حصے کی نظمیں عموماً ایسے لہجے کی حامل ہوتی ہیں جس سے اُس زمانے کے راہبوں کی پند و نصائح والی خشک نظم نگاری کا رنگ ظاہر ہے۔ البتہ اس کے مقابلے میں ان سنجیدہ نظموں میں بے باکی اور خلوص نسبتاً زیادہ اور نمایاں تر ہے۔ کیونکہ ان طلبا کی زندگی سماج اور سماجی اصولوں سے علیحدہ اور آزاد تھی۔ اس لئے وہ طنزیہ نظموں اور ہجووں میں زیادہ تلخ طریقے پر وقتی عیوب کا جائزہ لیتے ہیں۔

طلبا کی اس شاعری میں قدرت اور مناظر قدرت کو بہت دخل ہے۔ ان کے نغمات محبت کی فضائے بعید او رماحول ہمیشہ ان جنگلوں اور کھیتوں میں ہوتا ہے جن پر بہار نے اپنا اثر پھیلا رکھا ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہیں، اُن کی ایک کثرت اور بہتات ہے۔ سریلی صداؤں والی ندیاں بہ رہی ہیں۔ لیمو، صنوبر اور زیتون کے پیڑ کھڑے ہیں۔ جن کی ٹہنیوں اور پتوں سے ہوائیں سرسراتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ گلشن ہیں اور بلبلیں، اور نرم و نازک قدموں والے غزال جنگل کی منو سبر پریاں اور بن دیوتا رقصاں ولرزاں سبزہ زاروں پر محو خرام ہیں اور اس منظر میں فانی دوشیزاؤں کے جھرمٹ گیت گاتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں ——— ان مناظر کا بیان اُن کے ذاتی تجربے اور احساس کے جوش و شدت پر مبنی ہوتا ہے۔ اِن سے تر و تازہ اور صحت ور ہوا کی خوشبو آتی ہے۔ ان سے اس مسافرانہ زندگی اور عشرتِ سرِ راہ کی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اُن طلبا کا شعار ہے جن کی عمر ایک قدرتی بہاؤ میں فطرت کے عین مطابق بہی چلی جاتی ہے۔ اس شاعری کو گرہست آشرم کے کسی پہلو سے تعلق نہیں ہے اور دنیوی باتوں کا ذکر اگر کہیں ہے بھی تو اتنا طفلانہ اور نازک اور سادگی سے پُر ہے کہ ہم ان شعرا کی عموبیت پسندی سے درگزر کر جاتے ہیں۔

پریتم اور پریمی برہا کی کٹھن منزلوں کے دُکھ درد سہنے کے بعد آپس میں ملے ہیں، گاؤں کے لوگ رقص کی تقریب میں اکٹھے ہوئے ہیں، پریمی پریتم کو لگاتار دیکھے جارہا ہے، پریمی کو وطن سے دور وطن کی یاد ستاتی ہے۔ طالب علم اور دیہاتی دوشیزہ کا افسانۂ محبت جاری ہے اور یا کبھی کبھی ——— پریمی ہے، غمگین، دکھی اور وہ اس لئے کہ اس کی پریتم نے پریم کے بندھن توڑ کر کسی اور خوش قسمت سے رشتہ جوڑ لیا ہے ——— یہی اداکار ہیں اور ایسی اداکاری جس کا ذکر ان گیتوں میں آتا ہے۔ ہر وہ خصوصیت جو طبع انسانی سے تعلق رکھتی ہے ان گیتوں کے تغزل کی پکار کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس شاعری میں جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ دوستانہ یا جانبازانہ محبت نہیں ہے۔ اخلاقی نظریوں کے تنگ دل حامی اگر ان میں کسی نام نہاد "پاک محبت" کی تلاش کریں تو وہ بیکار ہے۔ ان نظموں میں محبت ایک طبعی تحریک، ایک جبلی حاجت اور ایک نفسی کیفیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس محبت کو ہم بے باک اور آزاد محبت کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان گیتوں سے نظم کے اداکاروں یعنی شاعر اور محبوب یا مرد اور عورت کی سیرتوں یا اخلاقی خصوصیتوں کے متعلق کوئی بات نہیں معلوم نہیں ہوسکتی۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ اس پریم ناٹک کے دو مقررہ کردار ہیں۔ طالب علم شاعر اور کوئی عورت خواہ اس کا نام فلیس ہو یا فلورا، لیڈیہ ہو یا سیلیہ ——— یہ فرق صرف ظاہری ہوگا۔ اس کی سیرت ہر صورت میں یکساں ہوگی۔ محبوب کے نام کے متعلق تو فیصلہ ہوگیا۔ لیکن شاعر ان گیتوں میں ہمیشہ گمنام ہوتا ہے اور پریمی کا نام ہو بھی کیا، سوائے اس کے کہ پریمی! یہی نام کافی ہے اور اس کے علاوہ اُس کے جذبات کی شدت ہی اس کی انفرادیت کی نمایندگی کے لئے کافی ہے بے نوشی اور میخواری کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو گیت ہمارے پیش نظر تھے۔ اُن میں سے صرف ایک ہی لیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ اس میں بہت سی فن کارانہ خوبیاں یکجا ہوگئی ہیں۔

اور اب لیجئے گیت لیکن گیتوں سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ترجمے میں مطالب کی ہمنوائی کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اصل کی روح بھی ضائع ہونے نہ پائے۔ اس لئے اس سلسلے میں یہ احتیاط رکھی گئی ہے کہ مقامی اور ملکی خصوصیات کو مترادف ہندوستانی لباس میں ڈھال لیا ہے۔ مثال کے طور پر ساون، بسنت اور بہار، تینوں الفاظ بہار کے موسم کا اظہار کرتے ہیں یا سرما کو اس کی بیزار کن کیفیات کی وجہ سے خزاں ہی کہا گیا ہے۔ نیز اکثر گیتوں کی سرخیاں خود تجویز کی گئی ہیں۔ چنانچہ پہلے گیت کی سرخی اگرچہ "سُر میلی محبت" ہے لیکن شاعر کو اس سے اپنے عشقیہ جذبات دکھانا مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بہار کے موسم کی جنون انگیزی کو میر تقی کے اِس

شعر کے مطابق پیش کر رہا ہے کہ ؎

دھوم ہے پھر بہار آنے کی،
کچھ کرو فکر مجھ دیوانے کی!

(۱)

شرمیلی محبت

بسنت رُت کی شوبھا دیکھو، پھولی سب پھلواری،
پیارے پیارے دن ہیں سارے، راتیں بھی ہیں پیاری!
سجی ہوئی ہے سندرتا سے موہن دھرتی ساری،
بیت گئیں پت جھڑ کی گھڑیاں، اب ہے سُکھ کی باری!
لیکن پریم کا گھاؤ ہے میرے من میں پریتم پیاری:
رہ رہ کر اک درد ہے اُٹھتا، آنسو بھی ہیں جاری!
کیسے دُکھ سے پیچھا چھوٹے، آئے سکھ کی باری؟
جب تک تو من جانے نہ مجھ سے کیسے مٹے دکھ بھاری؟
دیا کرو، ہاں، دیا کرو، اب آکر مجھے سنبھالو،
اپنے تیکھے، پیارے دل کو میرے دل میں پا لو،
اپنے پریم کے رنگ میں میرے پریم کا رنگ ملا لو؛
پریم پجارن بن کر یوں جیون کے انت کو پا لو!

دوسرا گیت خالص بہاریہ چیز ہے!

(۲)

آمدِ بہار

لو، آگیا ہے لوٹ کے موسم بہار کا،
راحت سے درد مٹ گیا قلبِ فگار کا۔
غمگیں خیال دور ہوئے کھو گئے تمام،؟
احساس اب نہیں ہے کسی اضطرار کا!
زرّیں شعاعِ مہر نے پھیلا دیا ہے نور!
منظر ہرا بھرا ہے ہر اک سبزہ زار کا!
دورِ خزاں کو آج ہوئی ہے شکستِ فاش،
نیزہ لگا ہے دل میں بہاریں سوار کا۔
اب ابرِ غم فضا میں کہیں بھی نہیں رہا۔

ہر دل پہ کیف چھا گیا ہلکے خمار کا!

اور اب ذرا چہل پہل شروع ہوتی ہے، والہانہ سرگرمیوں کا دور جاری ہوتا ہے۔

(۳)

دعوتِ عمل

صحیفوں کو اٹھا ڈالو، تفکّر کو بھلا ڈالو،
کہیں نادانیاں شیریں، جنوں سامانیاں شیریں،
بہار آئی ہے — آئی ہے، مسرت ساتھ لائی ہے!
اب آغازِ جوانی ہے، محبت کی کہانی ہے!
تفکّر کام پیری کا، تفکّر نام پیری کا!
جوانی اور آزادی، سبک بادِ صبا ایسی
جوانی ایک سپنا ہے، یہ بس دو پل کو اپنا ہے!
صحیفوں کو اٹھا دو تم، تفکّر کو بھلا دو تم!
جوانی پھر نہ آئے گی جوانی آہ! فانی ہے!
مسرت منہ چھپائے گی یہ اک شب کی کہانی ہے
جوانی کو نہ یوں کچلو، نہ ان پھولوں کو یوں مسلو،
صحیفوں کو اٹھا دو اب
تفکّر کو بھلا دو اب

اس گیت میں مطالعہ اور کتب بینی سے بیزاری اور طالب علمانہ بے نیازی بھی موجود تھی، اب ہم ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

(۴)

خلوت

چار سو چھائی خزاں، چلتی ہے سرما کی ہوا،
برگِ پژمردہ گرے جاتے ہیں پیڑوں سے تمام!
اب تو خاموشی ہے، خاموش پرندے سارے!
جب تک اس دہر پہ طاری تھا بہاروں کا سماں،
آنکھ: سے واسطے گلزار کھلے تھے ہر سو!
لیکن انسان کے غم کی تو حقیقت ہی نہیں،
اس سے سو درجہ زیادہ ہے پرندوں کا الم،

ان کے دل کو نہ ہوئی، اور نہ ہوگی تسکیں،
میرے دل کا ہے مگر آج جدا ہی عالم۔
ہاں، مرے دل کو کوئی غم ہی نہیں، غم کیوں ہو۔
جب مرے پہلو میں وہ ہستی پُر افسوں ہو۔
آج وہ مان گئی، مان گئی بات مری!
آج تو دن ہے مرا۔ دن ہے مرا۔ رات مری۔
آج تو جیت ہی لی پریم کی بازی میں نے!
آخر کار کیا ہے اُسے راضی میں نے!
اُس کی چتون میں تبسم ہے ہمیشہ قائم!
شوخی و عشوہ گری کام ہے اس کا دائم!
سانس میں کیف ہے، اور آنکھ میں اک نور بھی ہے،
نرم سے سینے میں اس کا دلِ مخمور بھی ہے!
وہ مجھے دیکھتی ہے، دیکھتی جاتی ہے مجھے!
اور ہر لمحے میں دیوانہ بناتی ہے مجھے!
آہ! روکے کوئی۔ روکے کوئی میری مستی!
اس نے تخیل ہی کر ڈالی ہے میری ہستی!
ایک بوسے میں مری روح کا رس چوس لیا!
ایک بوسے میں مجھے بے خود و بے ہوش کیا!
اس سے بڑھ کر ہے بھلا کھیل کوئی من بھاتا؟
دل پہ قابو ہی نہیں، دل ہے یہ نغمہ گاتا
آہ! لو، مان گئی آج وہ باتیں میری!
اب تو دن میرے ہیں۔ دن میرے ہیں، راتیں میری!

جرأت سے کام لیتے ہوئے قدم تو بڑھایا مگر لیکن "ایک بوسے" کے پردے میں ہی بات کو چھپا گئے! اب ہم ان وضیع باتوں کو چھوڑ کر دو لمحوں کے لئے شاعر کی ذہنی اُلجھنوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۵)

محبت کے شبہے

کیا ہے وعدہ جو اس نے، وہ شیریں ہے،
مرے بے چین دل کو وجہِ تسکیں ہے:
اسی وعدے سے دل میں گرمیاں پیدا ہوئی ہیں اک تمنا کی!
امیدیں مجھ سے کہتی ہیں کہ آئے گی،
کرے گی آج وہ اقرار کو پورا ــــ تسلی رکھ!
مگر شک لوٹ آتے ہیں۔
مرے دل کو ستاتے ہیں،
کہ شاید تیری امیدیں نہ بر آئیں،
کوئی بے رحم لمحہ پھول کو دل کے کچل ڈالے!
اچانک ٹوٹ جائے رشتۂ امید ہی سارا!
بس اک ہے، ایک ہے مرکز خیالوں کا،
کہ جیسے اک ستارا ہو فلک پر۔ دور۔ وسعت میں!
ہیں اس کے ہونٹ مدھ والے،
ملائم پھول کی پتی سے، اور میٹھے!
تبسم میرے ہونٹوں پر بھی آتا ہے۔ اسی کی مسکراہٹ سے!
اور اس کی آرزوئے عشق دل میں آگ بھر دیتی ہے اک پل میں!
جب عشق آتشیں سے جامِ دل لبریز ہو جائے،
تو پھر درد و اذیت کی تھکن سے روحِ انسانی،
تنزل پذیر ہوتی ہے!
دلِ عاشق کو مہلک آرزوئے عشق تڑپاتی ہے فرقت میں،
یوں ہی میں بھی شکوکِ تلخ کا مظلوم ہوں ہمدم!
کوئی دکھ اس سے بڑھ کر اس جہاں میں ہو نہیں سکتا!
میں عشقِ بدگماں کے آتشیں طوفاں میں جلتا ہوں۔ جلتا ہوں!
ذرا دیکھو، کہ یوں بیکار بیتے جا رہے ہیں مختصر لمحے!
بس اب ہے اک ذریعہ زندگی کا۔ میں جو پیتا ہوں،
شرابِ آتشیں جامِ محبت سے!

اور اب ایک گیت ایسا جس سے نہ صرف ان طلبا کی مسافرانہ زندگی کی جھلک معلوم ہوتی ہے بلکہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ آزاد بے باک اور لاپروا مفکر شراب اور عورت کے علاوہ مناظرِ قدرت سے حظ اندوز ہونے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔

(۶)

سُونا موسم

چپکے چپکے جنگل،

جن کی ہوائیں اب کب تھر کے اس پنچھی کا راگ،
جو ساون میں کہتا تھا "جاگ، نیند کو تیاگ"
روتے روتے جنگل،
سرو و صنوبر اوندھے رہے ہیں، تھک کر ہیں ہلکان!
پہلی بات مٹی ہے ایسی، گویا ہیں بے جان!
پت جھڑ والے جنگل،
کیسا غم ہے؟ پت جھڑ فانی، ساون ہے کیا دور!
جلد آئے گا پھر وہ سماں بھی، سب ہوں گے مسرور!
خوشیوں والے جنگل!

اور اب ایک مختصر سا نغمہ فرقت کا ہے۔

(۷)

ناکام

"تلخیِ ایام کو نغموں میں کھو دیتا ہوں میں،
درد بڑھتا ہے جو حد سے، تو رو دیتا ہوں میں!
ہنس اپنے آخری لمحوں میں جیسے گائے گیت،
موجِ موسیقی میں یوں غم کو ڈبو دیتا ہوں میں!
میرے چہرے پر نہیں باقی جوانی کی بہار!
اشتیاقِ آرزو سے دل ہے پژمردہ، فگار!
ہر گھڑی رنج و الم بڑھتے ہی جاتے ہیں مرے،
شمع بجھتے ہی فضا ہو جائے گی تاریک و تار!
آہ! لو، مرنے کو ہوں، مرنے کو ہوں ناشاد میں!
ہو گیا برباد میں، لو، ہو چکا برباد میں!
عشق ہے فطرت مری، اتنی ہے مجبوری مجھے،
اُس کی چاہت دل میں ہے جس کو نہیں ہوں یاد میں!

اور اب ذرا نفسیات کی پیچیدگیوں کو نغمے کے رنگوں میں سلجھایا جائے

(۸)

انکارِ محبت

گوری پیت کرے پر بولے "کون آنسو کے موتی رولے؟"
"پیت نہیں ہے میرا کام"

دل کا بھید چھپائے دل میں، جیسے لیلیٰ ہو محمل میں
لیکن انگ انگ یوں بولے "سوئے، پیت کی نیند میں سوئے"
"پی کر مدھ مستی کا جام"

اتنی ضدی اور کٹھور! یوں اٹھلائی جیسے مور!
لیکن دل پی ہو سے خالی! انگ انگ جوں ڈالی ڈالی!
بلتی، جھومتی اور لہراتی! نامعلوم سے نغمے گاتی!
بات کرے تو کھوئی ہوئی سی! آنکھیں جیسے سوئی ہوئی سی
آنکھوں پر حلقے چھائے ہیں پتلی پتلی کالی دھاری!
چاند میں دو داغ ہو، دو نکلے ہیں روپ کی راتیں ہیں اندھیاری!
پیلے پیلے بے رس گال! ہلکی، سوچتی سوچتی چال!
ٹھنڈی آہیں چغلی کھائیں! دل کا سارا بھید بتائیں!
پھولی پھولی سانس ہے کیسی! کیوں دل کی دھڑکن ہے ایسی!
کام دیو! آؤ، آ جاؤ! آؤ، تیر پہ تیر چلاؤ!
پیت کا اُلٹی جال بچھاؤ، ایسی بھڑکتی آگ لگاؤ،
منہ سے بول اٹھے بے چاری
"ہاں، تم جیتے اور میں ہاری!"

اب ذرا ایک ہلکی پھلکی سی سادہ چیز!

(۹)

پریت کا گیت

گاؤ، گاؤ، پریت کے گیت
جن سے من کو ہو آرام!
آج مرے کومل من میں
دُکھ کا نہیں ذرا بھی نام:
خوشی، محبت اور ہنسی،
آج بنے ہیں میرے میت!
آج مرا من شاداں ہے،
گاؤ، گاؤ، پریت کے گیت!
گاؤ، گاؤ پریت کے گیت،
جیون سُکھ ہی سُکھ ہے سارا!
ساون آیا اور چلی۔

من کی ندی پریم کا دھارا!
آخر اس دل کی بر آئی۔
آج ہوئی ہے اپنی جیت!
جیت ہوئی ہے آج ہماری
گاؤ، گاؤ، پیت کے گیت!

اور اب ذرا ان موسم اور محبت کے نغموں سے ہٹ کر "رکھ دیجئے پیمانۂ صہبا مرے آگے"۔ لیکن واضح رہے کہ اس گیت میں (جسے گیت کی بجائے نظم کہنا موزوں تر ہوگا) مقبول عام شاعری کی وہ عمومیت نہیں جو طلبا کے گیتوں کی عام خصوصیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعے اور علم و فن سے شغف کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ایسی تخلیق بھی کر جاتے تھے جسے ہم بہتر شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

(۱۰)

مے خانہ

حیاتِ گرم رو ساکن ہے، ساکن زندگی ساری!
چمکتی ہیں شعاعیں روشنی کی سطحِ مینا پر!
شرابِ آتشیں مینا میں ساکن ہے!
ہیں ساکن دست و بازو مے کے متوالوں کے مستی میں!
پھولوں کا رس نکل کر، چھوڑ کر گہوارۂ طفلی
ہوا ہے منجمد ذہنوں کی لہروں میں!
در و دیوار ساکن ہیں،
ہیں آوارہ ہوائیں ساکن و معدوم سی ہستی!
غم و افکار ساکن ہیں!
نشاط و عیش کی ہستی نہیں باقی!
ہر اک انسان کے جذبے۔
عدم سے جا ملے ہیں چند لمحوں کے لئے اور یوں
فضائے ہاؤ ہو یکسر،
بنی ہے مرمریں منظر،
اکیلا ایک ساغر ساکن عہدِ فراموشی!
شرابِ آتشیں مینا میں ساکن ہے!
حیاتِ گرم رو ساکن ہے، ساکن زندگی ساری!

ایک مکمل تصویر ہے اور شاید شاعر نے مصور کے رنگوں کی بہ نسبت اُسے زیادہ چابکدستی سے الفاظ کے جال میں گرفتار کیا ہے۔

میراجی

کوئل سے

(۱)

دیارِ غم

مغنئ دیارِ غم

کہاں سے پھر ہوئی بلند ترى صدائے دردمند

جمود پاش بے قرار

الم فزا طرب فگار

جگر گداز کیف بار

حسینۂ سیاہ پوش نہ بن حریفِ عقل و ہوش

خموش سازِ غم خموش خموش سوزِ دل فروش

مغنئ دیارِ غم

نہ جان کر نثارِ غم

(۲)

نثارِ غم

نہ جان کر نثارِ غم

گھٹا ہے دیکھ چھا رہی مسرتیں لٹا رہی

جہاں ہے لالہ زار دیکھ

چمن ہے زرنگار دیکھ

ہرا ہے کوہسار دیکھ

نشاط زا بہار ہیں حسین مرغزار ہیں

ہوائے مشکبار ہیں فضائے سحرکار ہیں

نہ جان کر نثارِ غم

نہ ہو عبث شکارِ غم

(۳)

شکارِ غم

نہ ہو عبث شکارِ غم

وفا سراب نازنیں وفا ہے مارِ آستیں

وفا ہے عشق کا گناہ

وفا ہے دردِ بے پناہ

وفا ہے غم وفا ہے آہ

نہ چاہ غم نواز کو نیازمندِ ناز کو

وفا سے حیلہ ساز کو نہ چاہ عشق باز کو

نہ ہو عبث شکارِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

(۴)

بہارِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

نہ کر شکایتِ جہاں یہی ہے رسمِ آسماں

خوشی کا چھیڑ کوئی راگ

ملا نہ جوگ میں بہاگ

تیاگ درد کو تیاگ

نہ کوک بدنصیبِ غم نہ او رہن حبیبِ غم

سنا نہ اے نقیبِ غم فسانۂ مہیبِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

مغنئ دیارِ غم

قیوم نظر

نوائے سرمدی

کیفِ جمال و دید میں عالمِ انتظار دیکھ بزمِ طرب میں گردشِ نرگسِ پُرخمار دیکھ
چشمِ سیاہ کار دیکھ گردشِ روزگار دیکھ کیفِ جمالِ یار میں دردِ فراقِ یار دیکھ
تابِ نظر کی فکر کیا ذوقِ نظر کا ذکر کیا جلوۂ بے قرار دیکھ تابشِ بار بار دیکھ
ابرِ حجابِ ناز میں کوند رہی ہیں بجلیاں تیرے سکونِ دل کی خیر عشوۂ شرمسار دیکھ
لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پر عالمِ عشق بدگماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ
نیند سی آچلی ہے کچھ ہر دلِ بے قرار کو دیکھ یہ رنگِ بے خودی گیسوئے تابدار دیکھ
جس کا پیام زیرِ لب باعثِ کائنات تھا اس کی نظر کی زد پر آج عالمِ اعتبار دیکھ
نام بہار سے خزاں لوٹتی تا بہ کے چمن آج خزاں کے نام سے آتی ہوئی بہار دیکھ
عشق کی پہلی زندگی عشق کے پہلے سوز و درد بھول۔ مگر ندامتِ حسنِ وفا شعار دیکھ
آگئے نگاہِ شوق سے اب تو ہے کاروانِ دل منزلِ یار کے قریب اٹھتا ہوا غبار دیکھ
سازِ نوائے راز ہے معنیٔ رنگ و بوئے گل برقِ جمالِ یار میں سوزِ فراقِ یار دیکھ
دور وہ جلوہ گاہ ہے عالمِ وصل و ہجر سے یا وہ جمالِ دل فروز یا غمِ روزگار دیکھ

رازِ غمِ فراق کا اس سے کھلے گا کیا مگر
دیکھ سکوتِ بے خودی درد بھری پکار دیکھ

فراق گورکھپوری

نہ رہے بانس نہ بجے بنسری

میں نے ایک دلچسپ تمثیل تصنیف کی ہے —— دلچسپ —— آپ بھی سن لیجئے، مجھے یقین ہے کہ آپ دلچسپی اور شوق سے سنیں گے، لیکن سنانے سے پہلے میں چند تشریحات کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ میری تمثیل کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ طول طویل تمثیل مجھے پسند نہیں، اس سے تماشائی اکتا جاتے ہیں، قدیم مصنفین مثلاً شیکسپیئر، گوئٹے، مولیئر، اور کالیداس نے بہت طول طویل تمثیلیں لکھی ہیں، انہوں نے ایک اہم غلطی یہ بھی کی ہے کہ بہت سے اشخاص کو داخل کر دیا ہے جس سے پڑھنے والے کو پریشانی اور الجھن ہوتی ہے۔ اگر پوری توجہ نہ کی جائے تو افراد میں التباس ہو جاتا ہے، اس لئے کہیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ پس میں نے اپنی تمثیل میں صرف تین افراد رکھے ہیں۔

واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے خیال سے ہر باب میں صرف ایک ہی منظر ہے اس لئے صرف تین منظر ہوں گے جو تقریباً تین منٹ تک رہیں گے۔ یہ تین افراد کون ہیں ——؟

پہلا ایک مرد ہے۔ یہ جرمنی، فرانسیسی، روسی، ہندوستانی ہو یا کسی اور ملک کا بھی ہو سکتا ہے کسی قوم یا ملک کی قید نہیں، میرا ڈراما بین الاقوامی ہے یعنی انٹرنیشنل، اس لئے ہر ملک میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے کھیلا جا سکتا ہے، یہ شخص بڑا ہو یا چھوٹا جوان ہو یا بوڑھا امیر ہو یا مفلس، بے ریش و بروت ہو یا لم ڈڑھیا، غرض کہ کوئی بھی ہو —— اس لئے اس کھیل کے واسطے ممثل، یا ایکٹر بہت آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

دوسرا فرد ایک عورت ہے: یہ بھی کسی قوم اور ملک کی ہو۔ انگریزی، اطالوی، یا جاپانی کوئی قید نہیں، یہ بھی شرط نہیں کہ وہ ٹھنگنی ہو یا لم ڈھینگ۔ گوری بھبوکا ہو یا کالی کلوٹی، خوبصورت ہو یا بدہیئت چونکہ صرف ایک عورت اور ایک مرد ہے اس لئے مجھے ان کا نام رکھنے کی بھی ضرورت نہیں، بعض حضرات کو نام مشکل سے یاد رہتے ہیں، اس لئے وہ بہت خوش ہوں گے کہ میری تمثیل میں پہلے باب سے لے کر تیسرے باب تک یاد رکھنے کے لئے ایک نام بھی نہیں، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت کا نام اگر روزی رکھا جائے تو ہر شخص یہ خیال کرے گا کہ یہ منظر انگلستان کا ہے۔ اگر اس کا نام سرسوتی رکھا جائے تو خیال ہو گا یہ ہندو ہے، اور گر کلثوم رکھا جائے تو معلوم ہو گا یہ مسلمان ہے۔ اس لئے بغیر نام ہی کے یہ تمثیل بین الاقوامی رہ سکتی ہے، اور ہر جگہ کھیلنے میں سہولت ہو سکتی ہے ہاں اگر آپ چاہیں تو عورت مرد کا نام میاں بیوی رکھا جا سکتا ہے

اچھا اب تیسرا فرد کون ہے؟ —— یہ ایک جانور ہے، جسے بلی کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہو گا کہ بلی بین الاقوامی جانور ہے۔ ہندوستان کی ہو یا پرتگال کی، مصر کی ہو یا انگلستان کی، آپ اسے سیاہ سفید، صندلی جیسا چاہیں فرض کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں نے واقعات کی ترتیب ہی اس طور پر کی ہے کہ ہر باب میں تینوں اشخاص اسٹیج پر آتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں یہ بات زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی کہ ایک ہی شخص منصہ پر جلوہ ریز ہو اور تنہا تقریر کرنا شروع کر دے جیسے ہیملٹ میں۔ مجھے خود کلامی پسند نہیں ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو تینوں افراد دکھائی دیتے ہیں، مرد، عورت، اور بلی۔ پہلے کون بات کرے گا!۔ پہلے عورت بولے گی لیکن نہایت تہذیب و اخلاق کے ساتھ مثلاً "پیاری بلی" وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ "پیارے شوہر" لیکن یہ طریقہ بین الاقوامی نہیں ہے. اور بہت ممکن ہے شوہر بدمزاج ہو اور ترشروئی سے جواب دے دے کہ "مجھے دق نہ کرو" لیکن اس کا تماشائیوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ پہلے بلی پر ہاتھ پھیرے اور کہے "پیاری بلی"

اب ڈراما شروع ہوگیا۔ اپنی مالکہ کے مخاطب کرنے پر بلی پر فرض ہوگیا کہ وہ جواب دے۔ تمام دنیا کی لغت کی کتابوں میں بلی کے لئے صرف ایک ہی لغت درج ہے یعنی "میاؤں" اس لئے بلی جواب دیتی ہے "میاؤں"۔

اب مرد کے بولنے کی باری ہے۔ اُسے میاؤں کے متعلق کچھ کہنا چاہئے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مرد پر اس میاؤں کا اچھا اثر نہیں ہوا۔ اس لئے وہ کہتا ہے "کیا ملق پھٹ ہے"۔ اس طرح پہلا منظر ختم ہوگیا۔ آپ نے دیکھا کس قدر سادہ اور قدرتی ہے۔ ہر شخص اپنی مخصوص سیرت اور فطرت کے مطابق بات کہتا ہے۔

دوسرا باب شروع ہوا ——

چونکہ پہلا باب عورت نے شروع کیا تھا۔ اس لئے دوسرا باب بلی شروع کرے گی، وہ کیا کہے گی؟ میں نے پہلے تصریح کر دی ہے کہ وہ صرف "میاؤں" ہی کہہ سکتی ہے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ دوسرا باب قدرتی طور پر پہلے کے بعد شروع ہوا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ ہر باب کے درمیان کس قدر زمانہ گزر گیا۔ بہت ممکن ہے چند روز ہوں یا ہفتے یا مہینے۔ یا یہ بھی ممکن ہے ایک دو سال گزر گئے ہوں۔ بہرحال مرد پہلے سے زیادہ بدخلق اور چڑچڑا ہوگیا ہے اور یہ بالکل نفسیاتی چیز ہے۔

"میاؤں" کی تکرار سے بدخلق مرد مشتعل ہو کر کہتا ہے "کیا یہ چپ نہ ہوگی" وہ بلی سے خطاب نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ "تو چپ نہیں ہوگی" بلکہ وہ اپنی بیوی سے خطاب کرتا ہے، گھر میں جب کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو مرد عموماً یہی کرتے ہیں کہ فوراً بیوی کو ملامت کرنے لگیں۔ کیونکہ وہی گھر کی ملکہ اور منتظمہ ہے، اور تمام اندرونی معاملات کی ذمہ دار بیوی جب اس طرح مخاطب کی گئی تو وہ کوشش کرتی ہے کہ گھر میں پھر سکون پیدا ہو جائے، وہ نہایت ملائم اور مناسب الفاظ میں بلی کو فہمائش کرتی ہے کہ "چپ ہو جاؤ" —— دوسرا باب ختم ہوا۔

تیسرا باب شروع ہوا ——

یہ ملحوظ رہے کہ تیسرا باب منطقی طور پر دوسرے کے بعد ہے، مرد اور بھی بوڑھا ہوگیا جس کے باعث اس کا چڑچڑا پن بھی بڑھ گیا۔ ادھر بلی نے تعمیل حکم نہیں کی اور اپنی مکروہ آواز "میاؤں" کا سلسلہ جاری رکھا جسے سن کر مرد زیادہ مشتعل ہوگیا اور سخت لہجہ میں بولا "یہ ایسی ہی بجو ہی ہے جیسی تم"۔ یہ خیال رہے کہ وہ پھر بلی سے مخاطب نہیں ہوتا جو اصل مقصود تھا

ہے بلکہ اپنی بیوی کو اہانت آمیز طریق پر ملامت کرتا ہے، اس کی بیوی اگرچہ حلیم، مہذب، صابر، اور صلح پسند ہے لیکن اس اہانت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے نسوانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے تو آپ واقف ہوں گے کہ عورتیں جب پریشان ہوتی ہیں اور انہیں انتہائی غم و غصہ ہوتا ہے تو وہ اپنے مرنے کی دعا کرنے لگتی ہیں، اور جب اور زیادہ مشتعل ہوتی ہیں تو دوسروں کو بھی کوسنے لگتی ہیں، چنانچہ اس وقت بھی بیوی بلی کو مخاطب کر کے کہتی ہے "خدا کرے تو مر جائے"۔ بلی اس کا جواب میاؤں سے دیتی ہے۔ اب معاملہ نہایت اہم ہو گیا وہ بلی کو خاموش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا گلا گھونٹنے لگتی ہے۔ لیکن میاؤں میاؤں کی رٹ برابر جاری ہے، ادھر عورت کے غضبناک ہاتھ اس کا گلا گھونٹنے میں مصروف۔ نتیجہ میں بلی کے منہ سے صرف ایک بار "میں" نکلتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ اصولاً گلا گھونٹنے کی اس حرکت کا تماشائیوں پر برا اثر ہونا چاہیئے۔ لیکن کیا کیا جائے دلچسپ تمثیل میں واقعات کا بھی مسرت بخش ہونا ضروری ہے۔ آپ دیکھتے ہیں۔ سوائے بلی کے ہر شخص خوش اور مطمئن ہے۔ مرد اس وجہ سے کہ اب بلی کی مشتعل کرنے والی آواز نہ سنے گا، عورت اس وجہ سے کہ اب اس کی اہانت نہ ہو سکے گی، اور تماشائی اس لئے زور و شور سے تالیاں بجا رہے ہیں کہ انہوں نے ایک دلچسپ تمثیل دیکھی اور اس سے راقم الحروف کو بھی مسرت ہے کہ اس نے ایک شاہکار تصنیف کیا

اب میں قارئین کی سہولت کے لئے تمثیل کو یکجا لکھتا ہوں۔

پہلا منظر

عورت۔ پیاری بلی

بلی۔ میاؤں۔

مرد۔ کیا حلق پھٹ ہے — پردہ

دوسرا منظر۔

بلی۔ میاؤں۔

مرد۔ کیا یہ چپ نہ ہو گی (زیادہ سختی سے)

عورت۔ چپ ہو جاؤ (نرمی اور ملائمت سے)

تیسرا منظر — پردہ

مرد۔ یہ ایسی ہی بکواسی ہے جیسی کہ تم ہو (اہانت آمیز طریق پر)

عورت۔ خدا کرے یہ مر جائے (بلی کا گلا گھونٹتی ہے)

بلی۔ میاؤں (بہت زور سے "میں" ہلکی آواز میں اور خاموش ہو جاتی ہے)

(ڈراپ)

زبیر قریشی بھوپالی

رازِ دلگداز

نالہ و شیون کو محرومِ اثر پاتا ہوں میں
اک تصوّر ہے جسے کچھ چارہ گر پاتا ہوں میں

شورشِ غم جب بدلتی ہے تصوّر کا نظام
بیشتر کھوتا ہوں تجھ کو بیشتر پاتا ہوں میں

گرچہ مجھ کو تیرے دامن میں نہیں ملتی پناہ
تجھ کو لیکن زیبِ آغوشِ نظر پاتا ہوں میں

رات ہو، دن ہو، گھٹائیں ہوں خزاں ہو یا بہار
تیری جانب دل کو مصروفِ سفر پاتا ہوں میں

آہ تو اور حلقۂ سود و زیانِ دو جہاں
دو جہاں کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں

مل گیا سب کچھ تیرے الطافِ تکمیل سے
سینکڑوں جلووں کو فرشِ رہگزر پاتا ہوں میں

کاش ان خوابوں کو ہو خوابِ ابد بننا نصیب
آنکھ لگتے ہی تیرے قدموں پہ سر پاتا ہوں میں

تجھ کو مجھ سے سینکڑوں تجھ سا کہاں مجھ کو نصیب
اپنی خوبی کو ترا حسنِ نظر پاتا ہوں میں

احسان دانش

تماشاگاہِ عالم

تیرا جلوہ ڈوبتے سورج میں شرمایا ہوا
تیرا نغمہ موجۂ مضطر میں تھرّایا ہوا

لہلہاتی کھیتیوں میں سرسراتی ہے ہوا
یا زمیں والوں کو سمجھاتی ہے کچھ تیری صدا

بحرِ طوفاں خیز میں اٹھتی ہوئی لہروں کا شور
یا دکھاتا ہے تو اپنی عظمت و قدرت کا زور

اونچے اونچے کوہساروں میں ہیں یہ چشمے رواں
پتھروں سے یا تری رحمت کے ابھرے ہیں نشاں

یہ طلوعِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر
یا دعاؤں کے لئے وا ہیں فلک کے بام و در

یہ دھندلکے سے افق کی دھار پر چھائے ہوئے
یہ لحد کے روزنوں میں پھول مرجھائے ہوئے

جنگ کے میداں میں بسمل کی صدائے درگلو
میکدوں میں مست و بےخود ساقیانِ ماہ رو

منعموں کی عیش گاہوں میں ہر اک شے پر نکھار
مفلسوں کے جسمِ لاغر پر گلیمِ تار تار

ایک جانب شوکت و قوت کی چیرہ دستیاں
ایک جانب رہبرِ مذہب کی ذہنی پستیاں

ایک دل فردوس زارِ زندگی میں شاد ہے
ایک دل محوِ تماشائے عدم آباد ہے

اس قدر ہنگامے اک میرے لئے؟ پروردگار!
کیوں بھٹک جاتا ہے پھر بھی زندگی کا راہوار؟

احمد ندیم قاسمی

منگلیک

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

وقت۔ دوپہر

مقام۔ لاہور۔ شہر کے اندر ایک اونچے سہ منزلہ مکان کی برساتی

افرادِ ڈراما:۔

۱۔ پران ۲۔ حمید۔ دو بیکار گریجوایٹ۔ منڈو۔ نوکر۔

پس منظر۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور حمید جس کی آواز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دم پھول گیا ہے۔ برساتی کے اندر یہ کہتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ "پران؟ . . . کہاں ہو! . . . او پران؟"

پران۔ میں یہاں برساتی میں بیٹھا ہوں، حمید! . . . اندر آجاؤ . . . اس طرف۔

(کرسی گھسیٹ کر بیٹھنے کی آواز آتی ہے، اور پھر ایک لمبی سانس)

حمید۔ اوہ . . . عجیب سیڑھیاں ہیں، تمہارے مکان کی چڑھتے جاؤ، چڑھتے جاؤ، کبھی ختم نہ ہوں . . . یہ تم تین منزل اوپر بیٹھے کیا کر رہے ہو، کوٹھوں پر چڑھنا کہاں کی شرافت ہے؟ مجھ ایسے موٹے آدمی کے لئے اس سے زیادہ اور کیا سزا تجویز کی جاسکتی ہے کہ اُسے تمہارے تین منزلہ مکان کی تنگ اور اندھیری سیڑھیوں پر دن میں ایک دو بار چڑھنے اترنے کو کہا جائے، . . . اچھی شرافت ہے!

پران۔ تو اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھنا بھی گناہ ہے . . سیگرٹ پیو گے!

حمید۔ ذرا دم لے لوں (ایک لمبی سانس لے کر) ایمان سے . . . تمہارے گھر کی سیڑھیاں قطب مینار کے زینہ کی طرح لمبی اور پیچ دار ہیں . . . ایک گلاس پانی کے لئے کہنا۔

پران۔ (ہنس کر) موٹے آدمی کو پسینہ اور غصہ بہت جلد آتا ہے سوڈا منگواؤں! منڈو . . . او منڈو . . . ابے نالائق . . چھت پر آ۔

(دور سے آواز) جی آیا۔

پران۔ اچھا، دیکھ، وہیں سے میری بات سُن لے، ایک کرنکڑ والی دکان سے ایک بوتل سوڈا اور ایک پیسہ کی برف . . سنا تو نے۔

(دور سے آواز) جی ابھی لایا۔

پران۔ اچھا، تو تم کیا کہہ رہے تھے، حمید!

(حمید سیگرٹ سلگاتا ہے۔ دیاسلائی کے جلنے کی آواز)

حمید۔ (سلگاتے ہوئے) ہوں . . . ہوں . . . میں کہہ رہا تھا کہ تیسری چھت پر برساتی میں بیٹھ کر دھوپ تاپنا کہاں کی شرافت ہے؟

پران۔ مگر اس میں حرج ہی کیا ہے!

حمید۔ ہوں . . . اس میں حرج ہی کیا ہے! محلے کی لڑکیوں، بہو بیٹیوں کو پریشان کرتے ہو، اور پھر بھی تمہیں یہ پوچھنے کی جرات ہوتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے: کیا یہ شریفوں کے چلن ہیں! جو بھلے مانس ہوتے ہیں، وہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلے کی تمام عورتیں اطمینان سے چھتوں پر چڑھ کر ایک دوسرے سے بات چیت کرسکیں . . . اور اب تم ہی بتاؤ جب سے تم چھت پر آئے ہو، کیا محلے کی چھتوں پر دو دو فرلانگ تک بھی کوئی عورت نظر آتی ہے، اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو، اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ارے بھائی، کیا تم ہماری معاشرت کی الف، ب، ت، سے بھی واقف نہیں!

پران۔ تو کیا ہماری معاشرت یہی کہتی ہے کہ مرد نیچے بیٹھکوں میں سردی سے ٹھٹھریں، اور عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر ایک دوسرے کو کوسنے دے دے کر سارا محلہ سر پر اٹھالیں اب دیکھو، جب سے میں یہاں بیٹھا ہوں، یہاں کتنا امن ہے . . . سکون . . . سکوت

. . . گہری خاموشی . . . اور دھوپ کتنی خوشگوار
ہے . . . جی چاہتا ہے دن بھر یہیں بیٹھا رہوں۔

حمید۔ اور میرا تو جی چاہتا ہے، تمہارا منہ جھلس دوں . . .
یاد رکھو اگر محلے کی معاشرت کے خلاف تمہارا چلن یہی رہا تو
پھر دو چار روز ہی میں تم پر وہ وہ اتہام تراشے جائیں گے۔ وہ
یہی محلے کی خادمائیں جواب تمہیں کھویا کھویا سا کہتی ہیں! اور یہ بڑی
سعادت مندلڑکیاں کہ گرمیشہ سے کاڑھتی رہتی ہیں، اس
وقت تمہارے برخلاف وہ وہ طوفان برپا کر دیں گی کہ تمہاری
زندگی اجیرن ہو جائے گی، وہ نکلتی ہیں۔ ہاں دیکھو . . .
میری بات مانو، اب بھی وقت ہے، چپکے سے بیٹھک میں
چلے چلو۔

پیران (ہنس کر) بھائی حمید تمہاری باتیں ہمیشہ خوشگوار ہوتی
ہیں . . . خوشگوار اور بے معنی . . . تم یہاں
آکر کیسی پرلطف بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

حمید۔ یہ سب تمہارے محلے کی آب و ہوا کا اثر ہے، کیا تم نے یہاں
ناجائز شراب کشید کرنے کی بھٹی تو نہیں لگا رکھی۔

پیران۔ (ہنستا ہوا) بے شک، بے شک، مگر کاش تم محکمۂ آبکاری
کے انسپکٹر ہی ہوتے، نہ کہ محض ایک بے کار۔

حمید۔ محکمۂ آبکاری نہ سہی تو محکمۂ بے کاری ہی سہی۔ تمہیں ڈھونڈ ہی
لیں گے کہیں نہ کہیں۔

پیران۔ پھر بھی . . . اب کیا کرنے کا ارادہ ہے!

حمید۔ تم اپنی کہو، میں تو آج کل "اسٹرٹیڈ ویکلی" کے معمے حل کرتا
ہوں۔

پیران۔ ارے وہ کب سے!

حمید۔ کوئی ایک ہفتے سے، بات یوں ہوئی کہ گزشتہ اتوار کو انار کلی
کے نکڑ کے قریب۔ نیلے گنبد کی طرف جاتے ہوئے مجھے
یکایک نیر مل گیا۔

پیران۔ کون، اکرام نیر، جو بی اے میں ہمارا ہم جماعت تھا۔

حمید۔ ہاں . . . ہاں . . . وہی بلغم کے چوزے جتنا بلند و
بالا۔ تو وہ مجھے نیلے گنبد کی طرف ایک نئی ڈارک بلیو رنگ کی
کار کے دروازے پر مل گیا، مجھ سے ملتے ہی کہنے لگا ہیلو، لو

حمید، میاں تم اتنے دنوں کہاں رہے؟

پیران۔ تو تم نے اس سے کیا کہا۔

حمید۔ میں نے اس سے کیا کہا! میں اس سے کیا نہ کہہ سکتا تھا!
تم ہی ذرا خیال کرو کہ تمہارا ایک ہم جماعت جسے کالج کی زندگی
میں تم نے "ننھے مینڈک" سے زیادہ اچھا لقب کبھی نہ دیا ہو۔
وہ تمہیں اگر دو برس کے بعد یکایک ایک ڈارک بلیو کار . . .

پیران۔ (قطع کلام کر کے) بس، بس، میں سمجھ گیا (ہنستا ہے)

حمید۔ اچھا تو تم سمجھ گئے کہ میں نے اسے کیا کہا ہوگا۔

پیران۔ (ہنستے ہوئے) ہاں، ہاں، مگر یار یہ تو بتاؤ کہ پھر اس نے کیا کہا؟

حمید۔ وہ کہنے لگا وہ آج کل جبل پور میں اگزکٹو افیسر ہے، کنٹونمنٹ
میں ساڑھے تین سو روپے تنخواہ لیتا ہے اور فرسٹ گریڈ میں
ہے۔ یہاں وہ اور اس کی بیوی کرسمس کے دنوں میں نمائش
دیکھنے آئے ہیں، نمائش کا تو ایک بہانہ ہے، ورنہ میرے خیال
میں وہ تو محض اپنی اور اپنی بیوی اور اپنی ڈارک بلیو کار کی نمائش
کرنے یہاں آیا ہے، خاص کر اپنے دوستوں کو چڑانے کے
لئے، اور . . .

پیران۔ (قطع کلام کر کے) معاف کرنا، کیا تم نے اس کی بیوی دیکھی!

حمید۔ دیکھی! ارے یار اس نے اس وقت تک میری خلاصی نہ
کی جب تک اس نے مجھ سے یہ وعدہ نہ لے لیا کہ میں دوسرے
دن شام کے پانچ بجے فائیو ۵، گاف روڈ پر اس کے ہاں
چائے پیوں گا، نا چار دوسرے دن مجھے اس کے ہاں جانا
پڑا، وہاں پتہ لگا کہ آنجناب نے گاف روڈ والی کوٹھی نئی
نئی لی ہے۔

پیران۔ پھر تو اس نے گن گن کر بدلے لئے ہوں گے۔

حمید۔ کچھ نہ پوچھو، شاید کالج کے دنوں کے زخم اس کے دل میں
ابھی تک تازہ تھے، پہلے تو کہنے لگا بھئی حمید کیا کروں تمہاری
طرح عیش تو نہیں کرتا، مزدور آدمی ہوں، سارا دن دفتر
میں کام کرتا ہوں، پھر دورے پر رہتا ہوں، ساڑھے تین
سو تنخواہ ملتی ہے، امیر طبیعت بیوی ہے، بڑی مشکل سے
گزارا ہوتا ہے، عجیب مصیبت ہے۔

سیڑھیوں پر ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، حمید خاموش

ہو جاتا ہے)

منڈو۔ (پتلی آواز میں) بابو جی، سوڈا، برف نہیں ملی، دکاندار بولا آج کل سردیوں میں کون پاگل برف مانگتا ہے، میں کہا بابو جی برف مانگتے ہیں۔ اس نے نہیں دی، میں نے بہتیرا ۔ ۔ ۔

(حمید زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

پران جاؤ، جاؤ، نیچے کام کرو۔ بے وقوف کہیں کا۔

(سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ ہلکی ہوتی جاتی ہے اور پھر بالکل گم ہو جاتی ہے)

پران۔ ہاں تو پھر اکرام نے تمہیں اپنی بیوی دکھائی ہوگی۔

حمید۔ (توقف کے بعد، گلاس کو میز پر رکھتا ہے) بیوی! ارے میاں اس کمبخت نے تو اپنے گھر کا ایک ایک کونہ مجھے دکھایا یہ سٹڈی روم ہے۔ یہ ڈرائنگ روم ہے۔ یہ ڈائننگ ہال۔ پردے پسند کرو، ولائتی صوفوں پر شاعرانہ مبالغہ آرائی کرو۔ کریسیوں چائنا گھر سے کتے تک، سب کے ساتھ عزت سے پیش آؤ، تصاویر، میزپوش، گلدان، غالیچے، ایک ریڈیو۔ اس کے بعد یہ ہیں بیگم اکرام، مجھ سے اس طرح باتیں کرنے لگیں جیسے میں نے اپنی ساری زندگی کبھی کوئی خوب صورت عورت نہیں دیکھی اور اکرام صاحب پاس کھڑے کھڑے مسکرا رہے تھے، سمجھتے ہوں گے کہ دنیا میں اگر کسی کو حسین بیوی ملی تو صرف انہیں، اور بیچارے دوسرے لوگ تو محض اونٹنیوں سے نکاح کرتے ہیں۔

پران۔ تو۔ پھر!

حمید۔ تو اب میں اُسی دن سے معمّے حل کرتا ہوں!

پران۔ (ہنستے ہوئے) اچھی سزا ملی، تمہیں۔

حمید۔ (جواب میں ہنستے ہوئے) ہاں، پران۔ کچھ عجیب چکر ہے زندگی کا، میں سوچتا ہوں اس ننھے مینڈک کو ملازمت کیسے مل گئی کبھی سوچتا ہوں۔ کمبخت نے کوئی فریب کیا ہوگا۔

پران۔ گوبند کی طرح!

حمید۔ کون گوبند؟

پران۔ ارے وہی تو، موٹے، پھولے ہوئے رخساروں والا جو کالج میں لٹریری کلب کا جونیر وائس پریزیڈنٹ ہوا کرتا تھا۔

حمید۔ ہاں، ہاں یاد آگیا مگر اُس کے متعلق کیا بات ہے!

پران۔ اچھا، تو کیا تمہیں پتہ نہیں، جناب وہ بمبئی گیا کسی فلم کمپنی میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ تھوڑا بہت گا لیتا تھا۔ بس جناب وہاں ایک دو مہینے کی سر توڑ کوششوں کے بعد وہ آخر ایک گھٹیا قسم کی فلم کمپنی میں نوکر رکھ لیا گیا۔ اُس ۔ ۔ ۔ اُس کمپنی کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ ہاں تو وہاں جناب کی ایک فلم ایکٹرس سے شناسائی ہو گئی۔

حمید۔ ارے!

پران۔ آگے تو سنو۔ تو جناب بس ایک دن آپ اُس کے سارے زیورات لے بھاگے ست لڑے ہار اور کنگن اور نفیسیاں اور کڑے اور بازو بند اور گلوبند اور نہ جانے کیا کیا۔

حمید۔ آخر پکڑا گیا!

پران۔ ہاں ناسک میں پکڑے گئے، ۔ ۔ ۔ ڈھائی سال کی سزا بھی ہو گئی۔

حمید۔ ڈھائی سال تو زیادہ نہیں ۔ ۔ ۔ اور پھر زیور بھی بہت ہوں گے۔

پران۔ نہیں، وہ تو سب پیتل کے نکلے، ملمع شدہ ۔ ۔ ۔ بچارا غریب گوبند!

حمید۔ مگر وہ فلم ایکٹرس کیا ہوئی مجھے تو بہت سمجھ دار عورت معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم اُس سے شادی ۔ ۔ ۔

پران۔ (قطع کلام کر کے) شاید تمہارا دل للچا گیا ہے۔ ارے میاں اس کی کئی بار شادی ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے وہ دس مردوں کو طلاق دے چکی ہے۔

حمید۔ یہ گیارھواں کون ہے؟

پران۔ ایک فلمی رسالے کا ایڈیٹر تھا بھلا سا نام ہے، ابو ظفر کہ کیا! ۔ ۔ ۔

حمید۔ فلم ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری واقفیت خوب ہے۔

پران۔ اور کیا اپنا اپنا شوق ہے تمہیں آج کل اسٹرٹیڈ ویکلی کے معمّے حل کرنے کا شوق چرایا ہے، میں فلم ایکٹرسوں کے متعلق حالات جمع کرتا ہوں۔

حمید۔ ابو ظفر! ۔ ۔ ۔ ابو ظفر؟ ۔ ۔ ۔ ارے یہ کہیں وہی ابو ظفر تو نہیں جو چند سال پہلے ہمارے کالج کے رسالے کا ایڈیٹر

تھا اور جس کی ایک آنکھ کانی تھی، اوجوس اوشا رانی پر اپنی آنکھ رکھتا تھا۔

پران۔ کونسی آنکھ: کانی!

حمید۔ (ہنستے ہوئے) نہیں . . . دوسری!

پران۔ پھر اُس کا کیا ہوا۔

حمید۔ کس کا! . . . اُس کی کانی آنکھ کا!

پران۔ نہیں، میرا مطلب ہے، اوشا کا!

حمید وہ، سنا ہے، آکسفورڈ چلی گئی ہے۔ وہاں اُس نے ایک اینگلو انڈین سے شادی کر لی ہے . . . ارے، وہ کیا ہے!

پران۔ کیا ہے! . . . پتنگ؟

حمید۔ نہیں . . . ایک لڑکی

پران۔ آسمان میں اڑتی ہوئی!

حمید۔ (آہستہ سے) نہیں۔ بے وقوف، وہ دیکھو سامنے مکان کی کھڑکی میں

پران۔ (لبوں پر انگلی رکھ کر، ششش۔ ش۔ ش (سرگوشیانہ انداز میں) کرسی ذرا ادھر کھینچ لو (کرسی گھسیٹنے کی ہلکی سی آواز آتی ہے) یوں سامنے بیٹھے رہے تو تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے گی۔

حمید۔ ایمان سے . . . بہت خوبصورت ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا، تمہارے محلے میں خوبصورت عورتیں بھی ہوتی ہیں . . . . بس بالکل مورت معلوم ہوتی ہے، اس سیاہ جیکٹ اور آسمانی دوپٹے میں وہ بالکل پری معلوم ہو رہی ہے۔ پران، یہ ہے کون!

پران۔ یہ کملا ہے!

حمید۔ ششش ش ش، آہستہ کہو۔ مبادا وہ سن پائے۔

پران۔ یہ کملا ہے! . . . میں اس سے بے انداز محبت کرتا ہوں، میں کیا محلے کے سب لڑکے اس سے بے انداز محبت کرتے ہیں۔

حمید۔ اس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک ہے۔ کانوں میں ہلتے ہوئے آویزے کندن کی طرح چمک رہے ہیں۔ صندلی کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں سورج کی شعاعوں کے عکس سے شعلے بن گئی ہیں، ایمان سے . . .

پران۔ آؤ نیچے چلیں، یہاں دھوپ اب تیز ہوگئی ہے۔

حمید۔ دھوپ! یہاں دھوپ کتنی خوشگوار ہے۔ جی چاہتا ہے سارا دن یہیں بیٹھے رہیں۔

پران۔ (جیسے کسی سبق کو دہرا رہا ہو) . . . جو شریف لوگ ہوتے ہیں وہ نیچے بیٹھک میں بیٹھتے ہیں، تاکہ محلے کی عورتیں اطمینان سے چھتوں پر . . .

حمید۔ پران! تمہیں نقل اتارنے کی بہت بری عادت ہے۔

پران۔ (اُسی لہجے میں) تو کیا تم ہماری معاشرت کی الف۔ب۔ت سے بھی واقف نہیں۔

حمید۔ پران!

پران۔ حمید!

(دونوں ہنس پڑتے ہیں)

حمید۔ اوہ، وہ چلی گئی، آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہو گئی اور یہ سب تمہارا قصور ہے، وہ بے چاری سمجھتی ہوگی کہ ہم دونوں شاید اُس پر ہنس رہے تھے۔

پران۔ گھبراؤ نہیں، وہ پھر آئے گی۔

حمید۔ کیوں! کیا اُسے بھی تم سے محبت ہے۔

پران۔ نہیں تو، مگر وہ آج بہت مسرور ہے اور وہ اپنی خوشی کو چھپانا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے دل کی خوشی کو دیکھ لے، اُس کے جاں سوز حسن کا نظارہ کرلے، اس کی دلفریب مسکراہٹ کی بہار لوٹ لے، جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔ بس کوئی پندرہ بیس دن میں۔ کل رات سے ان کے گھر میں ڈھولک بجنی شروع ہوگئی ہے۔ گیت گائے جا رہے ہیں، مٹھائی بانٹی جا رہی ہے، محلے کی خالائیں دن رات شادی کی رسموں پر جھگڑتی رہتی ہیں، محلے کی بہو بیٹیاں مکلف لباس زیب تن کئے، ہنستی ہوئیں ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئیں اٹھلاتی پھرتی ہیں، بے چاری غریب عورتیں، یہی دو چار دن ان کے ہنسنے بولنے کے ہوتے ہیں، انہی دو چار دنوں میں وہ اپنی ہمجولیوں سے اچھی طرح مل سکتی ہیں۔ کوئی شادی، یا پھر کوئی موت . . . ورنہ ان کی تمام زندگی تو بس گھر کے ڈربوں میں بند رہ کر گزر جاتی ہے۔

حمید۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، کوئی کام کی بات کہو . . .

ہاں . . . مگر یہ تو بتاؤ بھائی جان۔ جب تمہیں کملا سے بے انداز محبت تھی تو پھر یہ محبت شادی کا باعث کیوں نہ ہوئی؟

پران۔ شادی! کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو تم بھی بالکل گدھے ہو، ارے یہاں شادی اور چیز ہے، محبت اور چیز ہے، اور پھر ہمارے ہاں تو شادی کے لئے محبت ایک بالکل غیر ضروری امر ہے ہندوستانی معاشرت میں بھائی حمید، محبت ایسی فرسودہ چیز کو کون پوچھتا ہے، یہاں تو یہ پوچھا جاتا ہے کہ لڑکی کا باپ کیا لیتا ہے؟ کتنا امیر ہے؟ جہیز میں کیا دے گا؟ اور کئی درجنوں تکلیف دہ باتیں . . . میں نے کوشش تو بہت کی، لیکن ان باتوں کے چکر میں پڑ کر ہماری محبت کا گلا ہی گھونٹ ڈالا گیا، اور پھر ایک اور بات بھی تھی، میں شاید ان تمام دشواریوں پر قابو پا لیتا، اگر . . .

حمید۔ اگر؟

پران۔ اگر کملا کو مجھ سے محبت ہوتی . . . اگر کملا کسی اور سے محبت نہ کرتی۔

حمید۔ ایمان سے . . . !

پران۔ ہاں . . . کملا کو جگدیش سے محبت ہے، وہ ہمارے محلے ہی میں رہتا ہے اور سچ پوچھو تو وہ ہے بھی اس کی محبت کے لائق، میری طرح نہیں کہ چھچھوندر کی طرح شکل ہو، اور بانس کی طرح قد، وہ میانے قد کا نوجوان ہے، چوڑی چھاتی، گندمی رنگ، خوبصورت آنکھیں، . . . اور کملا تو اسے پوجتی ہے۔ بی اے میں پڑھتا ہے، باپ ریلوے میں نوکر ہے تین سو کے قریب تنخواہ لیتا ہے . . . میں نے کئی بار کملا اور جگدیش کو ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا ہے اور یوں تو یہ قصہ محلے کی سب عورتیں اچھی طرح جانتی ہیں، ایک دفعہ بڑا شور مچا تھا، کملا کے باپ نے جگدیش کے باپ سے ملنا چھوڑ دیا، اور کملا کی ماں اور جگدیش کی ماں ایک دوسرے سے روٹھ گئیں اور بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ محلے کی ایک بوڑھی خالہ نے جگدیش اور کملا کو گھر کی سیڑھیوں پر ہنستے ہوئے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا . . . بوڑھی خالہ نے وہ طوفان بپا کیا . . . وہ طوفان بپا کیا، کہ . . .

حمید۔ اچھا، تو گویا اب کملا اور جگدیش کی شادی ہوگی۔

پران۔ ارے . . . نہیں . . . میاں . . . تم بات بھی تو سنو!

حمید۔ تو کیا کملا . . . ؟

پران۔ (قطع کلام کر کے) ہاں میں کہتا ہوں کہ کملا کی شادی جگدیش سے نہ ہوگی، اس کی شادی کے لئے بہت دیر تک دونوں گھروں میں گفتگو ہوتی رہی، آہستہ آہستہ عورتیں بات پکی کرتی رہیں، اور دونوں گھروں میں پھر سے پرانے اور اچھے تعلقات کا سلسلہ بندھ گیا اور پھر اس بات کا چرچا سب محلے میں ہو گیا بوڑھی خالائیں ناک پہ انگلی رکھ کر بڑے چاؤ سے اس ہونے والے بیاہ کا ذکر کرتی تھیں "موئے آگ لگے اس زمانے کو، نہ شرم نہ حیا . . . جب ہمارا بیاہ ہوا تھا . . ." اور اس قسم کی بہت سی باتیں، اب کملا اور جگدیش بہت خوش تھے چنانچہ کملا اب بہت کم جگدیش کے سامنے آتی تھی اور اگر کبھی جگدیش کو نظر بھی آ جاتی تو مسکرا کر اور بدن چرا کر فوراً وہاں سے بھاگ جاتی۔

حمید۔ ہاں، ہاں پھر کیا ہوا؟

پران۔ سنو تو سہی، اسی دوران میں ایک ایسی بات ہوئی جس نے سب معاملہ چوپٹ کر دیا!

حمید۔ وہ کیا؟

پران۔ جگدیش منگلیک نکلا۔

حمید۔ منگلیک!

پران۔ ہاں، ہاں، منگلیک۔

حمید۔ منگلیک؟ کیسا کسی بیماری کا نام ہے!

پران۔ (ہنستے ہوئے) جوتشیوں اور رمالوں کی اصلاح میں منگلیک اُن لڑکے لڑکیوں کو کہتے ہیں جو منگل کے روز پیدا ہوئے ہوں

حمید۔ تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے، کیا منگل کے روز پیدا ہونا گناہ ہے

پران۔ نہیں، لیکن جب محلے کے بوڑھے جوتشی نے دونوں کی جنم پتریاں دیکھیں تو اس نے سر ہلا کر کہا کہ لڑکا منگلیک ہے اس لئے یہ شادی نہیں ہو سکتی، کیونکہ کملا منگلیک نہ تھی۔

حمید۔ مگر کیا شادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے ہوں؟

پران۔ سب کے لئے تو ضروری نہیں، لیکن جو لڑکا منگلیک ہو، وہ کسی ایسی لڑکی ہی سے شادی کرسکتا ہے جو اس کی طرح منگل کے روز پیدا ہوئی ہو، ورنہ نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگر ایک لڑکی جو خود منگلیک نہیں ایک ایسے مرد سے بیاہ کرتی ہے جو منگلیک ہے تو ایسی صورت میں ان کا بیاہ بہت برے نتائج پیدا کرتا ہے یا تو وہ عورت جلد مر جاتی ہے، یا اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، یا اسے اور کسی طرح کی روحانی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے اور یہی حال اُن مردوں کا ہوتا ہے جو خود منگلیک نہ ہوں اور کسی منگلیک عورت سے بیاہ کریں۔ خود ہمارے خاندان میں ایک ایسا واقعہ ہوچکا ہے۔ میرے ماموں جان نے ایک منگلیک عورت سے بیاہ کر لیا تھا، اور وہ خود منگلیک نہ تھے، شادی کے پورے گیارہ ماہ بعد وہ مر گئے۔

حمید۔ منگل کے روز!

پران۔ نہیں دن تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔

حمید۔ اچھا!

پران۔ ہاں، اس لئے اب جگدیش کی شادی کملا سے نہ ہوگی، کملا کی سگائی اب ایک اور لڑکے سے ہوگئی ہے، نام ہے شیام سندر وہ لائل پور کا رہنے والا ہے، گو شکل و شباہت سے افریقہ کا باشندہ معلوم ہوتا ہے، میں نے اُسے دیکھا ہے، یہاں بی اے میں پڑھتا ہے، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں، باہر نکلے ہوئے کان۔ بالکل بندر معلوم ہوتا ہے ... اور اب جگدیش اور کملا کے گھر والوں کی آپس میں بول چال اور ملاقات بالکل بند ہے، اور

حمید۔ ششش۔ ش، ش ... وہ کھڑکی میں آگئی ہے ... بخدا کس قدر حسین ہے۔ لبوں پر کیسی دلفریب مسکراہٹ ہے۔ ... یہ کھڑکی سے نیچے جھک کر کسے دیکھ رہی ہے۔

پران۔ (آہستہ سے) ٹھہرو میں جھروکے میں سے دیکھتا ہوں ... گلی تو بالکل خالی ہے!

حمید۔ یہ اس کے دائیں بازو میں کیا بندھا ہے؟

پران۔ ... یہ چاندی کے "کلیرے" ہیں، اور جب نوجوان لڑکیوں کی شادی کے دن قریب ہوں تو یہ کلیرے انہیں پہنا دیئے جاتے ہیں

حمید۔ مسکرا رہی ہے ... بیچارا جگدیش!

پران۔ حمید، عورت کی محبت کا اعتبار کیا!

WOMAN! Thy name is Frailty

حمید۔ مسکرا رہی ہے ... بازو میں بندھے ہوئے کلیرے اس کی خفیف سی حرکت سے ہوا میں جھومنے لگتے ہیں۔ اور اُن سے کیسی عجیب میٹھی، سریلی سی آواز پیدا ہو رہی ہے، یہ جھک کر کسے دیکھ رہی ہے۔ پران، ذرا جھروکے میں سے دیکھنا نیچے کون ہے؟

پران۔ ... کوئی نہیں ... گلی تو بالکل خالی ہے۔

حمید۔ (یکایک کرسی سے اچھل کر اونچی آواز میں) میرے خدا ... یہ کیا ہوگیا۔

پران۔ کیا! ...

(نیچے گلی سے آواز جیسے کسی نے اناج کی بوری چھت سے فرش پر پھینک دی ہو، ایک ہیبت ناک چیخ، پران چلا اٹھتا ہے "کملا نے کھڑکی سے چھلانگ ... ہائے ... ہائے ...
پران کرسی پر سے بے تحاشا اٹھ کر جھروکے کی طرف بھاگتا ہے شیشے کا گلاس، گھڑی اور کتابیں زمین پر آرہتی ہیں، ان چیزوں کی مختلف آوازیں، حمید خوف زدہ لہجے میں "میرے اللہ" اور پھر "پران ... جھروکے کی طرف مت جاؤ" نیچے شور بلند ہوتا جاتا ہے چیخیں، عورتوں کے رونے کی آوازیں "پولیس" "پولیس" لوگوں کے ادھر اُدھر دوڑنے کی آوازیں، "کیا ہوا، کیا ہوا" "کملا!" "کملا!!" "کملا!!!" بہت سے قدموں کی چاپ لوگو میں مرگئی، میں مٹ گئی "کیا ہوا" قدموں کی چاپ "آگے سے ہٹ جاؤ" یہ شور دوڑنے کے ختم ہونے تک جاری رہتا ہے اور بتدریج مدھم ہوتا جاتا ہے)

حمید۔ (خوف زدہ لہجہ میں) یہ کیا ہوگیا، پران ... اُف میرا تو کلیجہ منہ کو آرہا ہے ...

پران۔ ظالم کملا ... وہ جگدیش ہے، وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آرہا ہے اُس کے خوبصورت بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ہیں، اس کی

آنکھوں سے آنسو جاری ہیں . . .

حمید۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا . . . پران تم بھی ادھر آجاؤ۔

پران۔ (مسحور اور دردناک آواز میں) . . . جگدیش نے اُسے اپنی گود میں لے لیا ہے . . . کملا کی چھاتی سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں اور گلی کا فرش سرخ ہوتا جا رہا ہے . . . . جگدیش رو رہا ہے . . . سُرخ سُرخ خون میں چاندی کے کلیرے نہا رہے ہیں!

حمید۔ میرے اللہ . . . میرے اللہ . . . پران جھروکے سے ہٹ جاؤ

پران۔ کملا کی آنکھیں جگدیش کے چہرے پر جم گئی ہیں۔ جگدیش پتھر کا بُت بنے گلی کے فرش پر بیٹھا ہے . . . اُن آنکھوں کی چمک کم ہوتی جا رہی ہے۔

حمید۔ پران!

پران۔ کملا کے منہ سے خون اُبل رہا ہے . . . وہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں . . . کیا ان کی حسرت اب تک نہ مٹی! ایک آخری حرکت کے ساتھ کملا کا سر جگدیش کے سینے پر لگ گیا۔ ہائے . . . ہائے . . . ظالم کملا . . . پولیس آ رہی ہے . . .

(پران آہستہ سے جھروکے کی کھڑکی سے ہٹ کر واپس کرسی پر گر جاتا ہے، کھڑکی کے ایک پٹ بند ہونے کی آواز، کرسی پر گرنے کی آواز، نیچے شور . . . .)

حمید۔ (آہستہ، مضطرب لہجہ میں) پران! . . . پران! یہ کیسے ہو گیا . . . ایک چٹکی میں . . . وہ حُسن کی مورت ایک لمحہ میں خاک میں مل گئی . . . وہ ابھی ابھی اس کھڑکی میں کھڑی تھی۔

پران۔ (دردناک لہجہ میں) ہاں!

حمید۔ اُس نے سیاہ رنگ کی ریشمی جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کے سر پر آسمانی رنگ کا دوپٹہ تھا (تیز لہجہ میں) اس کے کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے تھے۔ اس کے بازو پر نقرئی کلیرے بج رہے تھے . . .

پران۔ (اسی دردناک آواز میں) ہاں!

حمید۔ (مضطرب آواز میں) میرے خدا، مگر میں نے خود دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوشی کا نور تھا، اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک، اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ،

پران۔ (آہستہ سے) ہاں، حمید، وہ اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی!

کرشن چندر

رباعی

بیٹھے ہیں سبو، دھوم مچائیں گے آج
پی پی کے اچھالیں گے، لنڈھائیں گے آج
گردوں کو سنبھالے ہوئے مینا ساقی!
ہم شیشہ و پیمانہ لڑائیں گے آج!!

سعید احمد اعجاز

امیری و فقیری

پا سکتا ہے درویش شہنشاہ کا رتبہ — مشکل ہے مگر سطوتِ شاہی میں فقیری

اے کُنجِ گلستاں! تری پُرکیف سحر پر — ڈر ہے کہ نہ چھا جائے کہیں شامِ اسیری

دنیائے حرم سجدۂ بے ذوق سے پامال — پیرانِ کلیسا ہوس آلودۂ پیری

کشکول کو اپنے درِ رحمت کا بھکاری — کرتا نہیں منت کشِ درگاہِ امیری

سرتابقدم آئینہ ہے شاہدِ فطرت — بے عیب کو کیا حاجتِ ملبوسِ حریری

ہیں کیف سے پُر طائرِ آزاد کی تانیں — پھیکا ہے مگر نغمۂ پابندِ اسیری

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی شعاعیں
دیتی ہیں تجھے دہر میں درسِ ہمہ گیری

نسیم

غزل

احساس و امتیاز کی فرصت کہاں سے مجھے
بے کیف و رنگ ہے قدرِ این و آں سے مجھے

یہ دہر اک فریب، عدم اک خیال ہے
حیراں ہوں ہمنشیں کہ ہے رہنا کہاں سے مجھے

مجھ کو تو تھی ازل سے طلب اپنے آپ کی
یہ کیا ہوا! کہ مل گئے دونوں جہاں سے مجھے

بے بال و پر کیا ہوسِ برگ و بار نے
کس کا گلہ؟ قفس ہے مرا آشیاں سے مجھے

ناکامیاب ہے جو یہاں کامیاب ہے
آخر شکستِ دل نے کیا کامراں سے مجھے

خواجہ حمید عرفانی ایم اے

جولی روماں

دو سال کا ذکر ہے بہار کے موسم میں میں بحیرۂ روم کے ساحل پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ خواب آفریں فضا میں گم ہو کر ساحلی سڑک پر سیر کرنے سے بھلا اور کونسی چیز زیادہ فرحت افزا ہو سکتی ہے۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر یا سمندر کے ساحل پر، جہاں دل چاہے سیر کرو تمہیں یوں محسوس ہوگا گویا تم اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہواؤں کے درمیان ایک کیف انگیز دنیا میں پہنچ گئے ہو۔ دو ہی گھنٹوں کی سیر میں تمہارا آوارہ تخیل نہ معلوم کن کن خیالی صحبتوں اور کن کن جذباتی فضاؤں میں تمہیں لے جاتا ہے۔ اس وقت خوشگوار اور لطیف ہوا میں بسی ہوئی ہزاروں خواب آسا، مسرت انگیز امیدیں تمہارے دماغ میں ایک دوسری سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ تم اُن کو لطیف ہوا کے ساتھ اندر کھینچ لیتے ہو اور وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں ایک ایسی مسرت اندوز خواہش پیدا کرتی ہیں جو سیر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے۔ خوش پرواز تخیلات اور پر کھولتے ہیں اور پرندوں کی طرح گیت گاتے ہیں۔

میں ایک لمبی سڑک پر جا رہا تھا، جو سینٹ ریفل سے اٹلی کو جاتی ہے۔ یہ سڑک، سڑک ہی نہیں، بلکہ گوناگوں خوشنما مناظر کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو دنیا کی تمام عشقیہ نظموں کا پس منظر ہو!

ساحلی پہاڑیوں کے درمیان بہنے والی تیز رو ندی کے ایک خم پر چند دیہاتی مکان اچانک میری نظر پڑے۔ تعداد میں چار پانچ سے زیادہ نہیں تھے اور پہاڑی کے دامن میں، سمندر اور صنوبر کے گھنے جنگل کے درمیان واقع تھے۔ یہ جنگل دور دور بڑی وادیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ وادیوں میں کوئی سڑک دکھائی نہیں دیتی تھی اور نہ ان سے باہر نکلنے کا کوئی مستقل راستہ نظر آتا تھا۔

ان مکانات میں سے ایک مکان اتنا دلکش تھا کہ میں حیرت کے عالم میں بت بنا اس کے دروازے کے سامنے کھڑا رہ گیا۔ اُسے گلاب کے پھولوں نے، جو اس کی چھت تک پہنچ رہے تھے، چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پائیں باغیچہ پھولوں کی ایک بساط معلوم ہوتا تھا۔ جس میں رنگ رنگ کے چھوٹے بڑے پھول قدرتی طور پر بے ترتیبی سے ادھر اُدھر اُگے تھے۔ گھاس کے تختے پر بھی پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ چبوترے کی ہر سیڑھی کے دونوں سروں پر گلدستے رکھے تھے۔ کھڑکیوں میں سے اودے اور زرد رنگ کے پھول دیوار پر لٹک رہے تھے۔ پتھر کا جنگلہ جو اس دلکش مکان کے سامنے برآمدے پر نصب تھا، عشق پیچاں کے بڑے بڑے عنابی پھولوں سے، جو خون کے بڑے بڑے قطروں کی مانند معلوم ہوتے تھے۔ لدا پڑا تھا۔

گھر کی پچھلی جانب نارنگی کے درختوں کی دورویہ قطار سے ایک تنگ راستہ بن گیا تھا جو پہاڑی کے دامن تک چلا جاتا تھا۔

مکان کے دروازے پر چھوٹے چھوٹے سنہری حروف میں "آشاں ولا" لکھا تھا۔

میں حیران تھا کہ کون شاعر یا پری یہاں رہتی ہے اور کس تارک الدنیا، خدا دوست انسان نے یہ جگہ دریافت کر کے اس حیرت انگیز مکان کو، جو پھولوں کے تختوں کے درمیان سے ابھی ابھی نمودار ہوا معلوم ہوتا تھا، یہاں کھڑا کر دیا ہے۔

کچھ فاصلے پر ایک مزدور پتھر کوٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے اس دلکش مکان کے مالک کا نام دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا۔ "مادام جولی روماں!"

جولی روماں! بہت عرصہ پہلے، جب میں ابھی بچہ ہی تھا، میں نے اس کے متعلق سنا تھا۔ یہ ایک بڑی مشہور ایکٹرس تھی، ریچل

کی ہمسر!

کوئی عورت بھی جولی روماں سے زیادہ مقبول اور خاص و عام میں محبوب نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے اس کے دل کو مسخر کرنے کے لئے کتنی لڑائیاں اور خودکشیاں ہوا کیں۔ آہ شہر کا شہر اس کی محبت کے افسانوں سے گونج اٹھتا تھا۔ اس کا عاشق زار دسارس اب کس سن کو پہنچ چکا ہوگا۔ ساٹھ، ستر یا بہتر برس! جولی روماں! اس مکان میں، جولی روماں جس کی ہمارا سب سے بڑا شاعر اور سب سے بڑا مغنی پرستش کیا کرتا تھا۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے (اس وقت میں بارہ سال کا تھا) جب وہ ایک مغنی سے دل برداشتہ ہوکر ایک شاعر کے ساتھ جزیرہ سسلی کو نکل بھاگی تھی، اور فرانس بھر میں اضطراب کی ایک بے پناہ لہر دوڑ گئی تھی۔

غائب ہونے سے ایک ہی رات پہلے کا ذکر ہے کہ ایک تھیٹر میں ناظرین نصف گھنٹے تک اس کے حسن ادا کی داد دیتے رہے تھے اور سٹیج پر مکرر مکرر کہہ کر اسے بارہ مرتبہ بلایا گیا پھر وہ ایک تیز رفتار گاڑی میں بیٹھ کر شاعر کے ساتھ کہیں روپوش ہوگئی اور دونوں محبت سے لطف اندوز ہونے کے لئے سمندر کو عبور کرکے قدیم جزیرۂ سسلی میں جا پہنچے۔

ان دونوں کے متعلق یہ افسانہ دور دور مشہور تھا کہ وہ کوہ اٹینا پہ چڑھ کر ایک عظیم البنیت آتش فشاں پہاڑ کے دہانے میں سے، ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے اور رخسارے سے رخسارہ ملائے، نیچے جھانکا کرتے تھے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس میں گرانے کے لئے اس کی آتشیں گہرائیوں کا جائزہ لیا کرتے تھے۔

وہ شاعر اب مرچکا تھا، وہی جس نے کبھی غضب کی جذبات انگیز نظمیں لکھی تھیں جو اتنی معنی خیز تھیں کہ تمام لوگ انہیں پڑھ پڑھ کر حیرت میں رہ جاتے تھے اور اس درجہ بلند تھیں کہ وہ نئے شاعروں کے لئے ایک جدید شاہراہ ثابت ہوئی تھیں،

دوسرے عاشق نے بھی، جسے وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی، اس کے فراق میں اپنی جان دے دی تھی۔ اس نے اپنی محبوبہ کے لئے ایسے دلکش نغمے گائے تھے جو اب تک سب آدمیوں کے دل میں محفوظ تھے ـــــ امید و بیم کے ایسے نغمے جو ان کو دیوانہ بنا کر ان کے دل سینوں سے باہر کھینچ لاتے تھے ـــــ!

اور وہ یہاں موجود تھی، اس دلکش مسکن میں جس کے گرد پھول ہی پھول نظر آتے تھے!

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہ کیا اور مکان کی گھنٹی بجا دی ایک پست قد خادم نے دروازہ کھولا۔ یہ کوئی بڑا ہی غیر معقول سا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ عمر اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ بے ڈول سے تھے۔ میں نے ملاقاتی کارڈ پر بوڑھی رقاصہ کو نیازمندانہ سلام لکھ بھیجا اور اس سے مخلصانہ درخواست کی کہ وہ ملاقات سے مجھے ضرور نوازے! مجھے خیال تھا کہ شاید وہ میرے نام سے واقف ہی ہو اور مجھے اندر آنے کی اجازت دے دے۔

نوجوان خادم کارڈ لے کر چلا گیا پھر نمودار ہوا۔ مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک صاف ستھرے کمرے میں لے گیا جس میں لوئی فلپ کے زمانے کا غیر دلکش اور بھاری بھرکم فرنیچر پڑا تھا۔ سولہ برس کی ایک بڑی پتلی دبلی مگر حسین خادمہ میرے اعزاز میں فرنیچر پر سے گرد صاف کر رہی تھی۔

مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر دونوں خادم غائب ہوگئے۔

کمرے کی ایک دیوار پر تین تصویریں آویزاں تھیں۔ ان میں سے ایک کسی ایکٹرس کی تھی جس نے رقص کا لباس پہن رکھا تھا۔ دوسری ایک شاعر کی تھی، جو لمبا چست فراک کوٹ اور سنجاف والی قمیص زیب تن کئے تھا۔ اور تیسری ایک مطرب کی جو پیانو کے قریب بیٹھا تھا۔ رقاصہ حسن و جمال کا ایک دلکش پیکر تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور اس کے چہرے پر ایک دلفریب تبسم رقص کرتا تھا۔ تصویریں انتہائی سلیقے اور احتیاط سے بنائی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا یہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی جاذبیت کا ساماں مہیا کرتی رہیں گی۔

دروازہ کھلا اور چھوٹے قد کی ایک عورت اندر داخل ہوئی، بوڑھی بے حد بوڑھی، پست قامت گچھے دار سفید بال اور سفید بھویں، وہ سفید رنگ کی ایک سبک رفتار چوہیا معلوم ہوتی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ایک ایسی آواز میں جو اب بھی دلکش اور لرزہ خیز تھی، کہا۔ "آپ کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ ایک نوجوان کے لئے یہ بات کتنی قابلِ تعریف ہے کہ وہ ایک بوڑھی عورت کی یاد کو محو نہ کرے بیٹھ جائیے!"

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں اس کے مکان کو دیکھ کر از خود رفتہ ہوگیا تھا اور مالک کا نام دریافت کرنے کے لئے بے تاب تھا اور کس طرح اس کا نام سن کر مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر وہاں سے

چلا جاؤں۔

اس نے جواب دیا۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے جب ملازم آپ کا ملاقاتی کارڈ میرے پاس لایا تو اس چھوٹے سے فقرے پر، جو آپ نے کارڈ پر مجھے لکھ بھیجا تھا نظر دوڑاتے ہی میں کپکپاسی گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس نے مجھے ایک ایسے پرانے دوست کی آمد سے اطلاع دی ہے جو بیس سال کے عرصے کے بعد آج مجھے ملنے آیا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں میں اب گویا مر ہی چکی ہوں۔ اب کسی شخص کے دل میں میری یاد باقی نہیں رہی، اور اس لمحے سے پہلے کوئی فرد بشر بھی میرا ذکر تک نہیں کرے گا۔ جب میں اپنی آخری نیند سو جاؤں گی۔ البتہ اس کے بعد تمام اخبارات چند روز تک جولی روماں کے متعلق عجیب و غریب داستانوں اور اس کی گزشتہ یادگاروں اور پر جوش تعریفوں سے بھرے نظر آئیں گے۔ بس یہ ہوگا میرا انجام!

یہ کہہ کر وہ ٹھہر گئی۔ پھر بولی۔ "اور اب وہ وقت قریب ہی ہے چند ہی مہینوں، چند ہی دنوں میں اس چھوٹی سی عورت کا پنجر ہی باقی رہ جائے گا"۔

اس نے اپنی تصویر کی طرف آنکھیں اٹھائیں جو اس کی مضحکہ خیز صورت پر اب خندہ زن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس نے دوسری دو نوں تصویروں پر نظر ڈالی —— سحر طراز شاعر اور نغمہ نواز مغنی پر —— جو یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس بوڑھی کھوسٹ سے اب ہمیں کیا سروکار ہے!

مجھے یہ سن کر اتنا شدید رنج پہنچا جس کا میں بیان نہیں کر سکتا مجھے اس ضعیف عورت کی حالت پر رحم آرہا تھا، جو شدید ناتوانی میں بھی گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ایک ناقابل بیان کشمکش میں مصروف تھی۔

اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے مجھے ناس سے مناکو کی طرف جاتی ہوئی خوشنما، تیز رفتار گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں حسین، ہنمول، اور مسرور نوجوان عورتیں اور ہنس مکھ مطمئن آدمی بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ جولی روماں نے میری نگاہ کا تعاقب کیا اور میرے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے رضا جو تبسم کے ساتھ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"آدمی چاہے نہ چاہے مقررہ وقت تک اسے جینا ہی پڑتا ہے۔

میں نے کہا۔ "تمہاری زندگی بھی کتنی شاندار ہوگی!

اس نے ایک گہری آہ کھینچی اور کہنے لگی۔ "ہاں شاندار بھی اور شیریں بھی، یہی وجہ ہے کہ اب مجھے اس کا شدید رنج ہے"۔

میں نے اس کی حالت سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہے اور بڑی احتیاط اور نرمی سے، جیسے میں ایک تکلیف دہ زخم کو چھو رہا تھا۔ میں نے اس سے اس کی زندگی کے متعلق چند سوالات پوچھے۔ اس نے اپنی عظیم الشان کامیابیوں، بے پناہ مسرتوں، اپنے جاں نثار دوستوں اور اپنی ساری فاتحانہ زندگی کے متعلق سب کچھ کہہ دیا۔ میں نے کہا۔

"کیا ہمیشہ تمہاری حقیقی خوشیوں اور مسرتوں کا مرکز تھیٹر رہا؟"

اس نے پر جوش انداز میں کہا۔ "نہیں!

میں مسکرانے لگا۔ اس نے دونوں تصویروں پر ایک تاسف انگیز نگاہ ڈالی اور کہنے لگی۔ "انہی دونوں کی بدولت میں حقیقی مسرت سے ہمکنار ہوتی رہی"۔

میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "ان میں سے کس کی بدولت؟"

اس نے جواب دیا۔ "دونوں ہی کی بدولت۔ کبھی کبھی جب میں گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو تازہ کرتی ہوں تو یہ دونوں مجھے ایک ہی پیکر میں متشکل نظر آتے ہیں۔ باوجودیکہ اب مجھے ایک سے نفرت ہے"۔

تو پھر مادام، تم ان کی ذات کے لئے نہیں بلکہ محبت کی خاطر ان سے محبت کرتی تھیں"۔

"ہوگا"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ایک سادہ، شریف آدمی جو اتنا زیادہ مشہور نہ ہو، جو اپنی تمام زندگی تمہارے لئے وقف کر دے، اور جو اپنا دل، اپنے خیالات، زندگی کا ایک ایک لمحہ، حتیٰ کہ اپنا رواں رواں تم پر قربان کر دے، ان دونوں آدمیوں جیسی یا ان سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا تھا، جن کی صحبت میں رہ کر تم موسیقی اور شاعری جیسی وفادار چیزوں سے آشنا ہوئیں۔

وہ ایک ایسی پر جوش آواز میں بول اٹھی جس میں ابھی تک شباب چٹکیاں لے رہا تھا۔ "نہیں موسیو نہیں۔ کوئی دوسرا آدمی شاید ان سے بہتر محبت کر سکتا مگر ایسی نہیں جیسی ان دونوں نے کی۔ انہوں نے میری خاطر محبت اور موسیقی کے ایسے نغمے گائے جو دنیا میں کوئی دوسرا آدمی نہیں گا سکتا۔ آپ کیا جانیں وہ میرے لئے کس درجہ مسرت کا باعث تھے۔ کیا ان کے سوا کوئی دوسرا آدمی الفاظ کے ذریعے

سے ایسے دل کش نغمے پیدا کر سکتا ہے جیسے وہ پیدا کرتے تھے۔ آہ جب تک ہم آسمان اور زمین بھر کی موسیقی سے جامِ محبت کو نہ بھر دیں، محبت کی تکمیل نہیں ہو سکتی، یہ ابھی کو معلوم تھا کہ کس طرح ایک عورت کو موسیقی اور الفاظ کے ذریعے سے از خود رفتہ بنایا جا سکتا ہے۔

ہماری محبت میں شاید خیالی عنصر، حقیقی عنصر کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھا۔ مگر آپ کو معلوم ہے۔ کہ تخیل آپ کو بادلوں کی بلندی تک اڑا لے جاتا ہے لیکن حقیقت آپ کے پاؤں سطح زمین پر سے اوپر اٹھنے نہیں دیتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ ان دونوں کی بہ نسبت مجھ سے کہیں زیادہ محبت کر سکتے مگر محبت، محبت کی حقیقت کو میں نے انہی کے ذریعے سمجھا اور انہی کے ذریعے سے اسے قابلِ پرستش جانا!

یہ کہہ کر کچھ ایک وہ رونے لگی اور خاموشی سے یاس انگیز آنسو گراتی رہی۔

میں اس اثنا میں بیٹھا کمرے سے باہر کی فضا کا جائزہ لیتا رہا۔ تاکہ اُسے یہ محسوس نہ ہو کہ میں اسے روتا دیکھ رہا ہوں۔ کچھ توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔

"تو سہی آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر آدمیوں کا دل جسم کے ساتھ بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ مگر میرا یہ حال نہیں۔ میرا اگرچہ جسم زندگی کی اسی منزلیں طے کر چکا ہے مگر میرا دل ابھی بیس سال کا ہے۔ اسی کے طفیل میں اپنے پھولوں اور اپنے خوابوں کے درمیان اکیلی ہی زندگی بسر کر رہی ہوں"۔

ہم دونوں پر ایک طویل سکوت طاری ہو گیا۔ بالآخر اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔ "اگر آپ کو معلوم ہو جائے . . . اگر آپ دیکھ لیں کہ خوشگوار موسم میں میں اپنی شامیں کس طرح گزارتی ہوں تو آپ مجھے دیکھ کر نہ جانے کتنا ہنسیں"۔

میں یہ پوچھنے کی بے سود کوشش کرتا رہا کہ وہ شام کا وقت کس خاص انداز میں گزارا کرتی ہے۔ اس نے مجھے کچھ نہ بتایا اور جب میں واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بول اٹھی "بس؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں مانٹ کارل کے مقام پر جا کر کھانا کھاؤں گا۔ وہ میری بات پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بولی "میرے ساتھ کھانا کھانے میں آپ کو کیا تامل ہے؟ اگر آپ میری دعوت قبول کر لیں تو میری خوشی کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے"!

میں نے فوراً اس کی دعوت قبول کر لی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے گھنٹی بجائی اور پست قد خادمہ کو کچھ حکم دینے کے بعد مکان دکھانے کے لئے مجھے باہر لے گئی۔

کھانے کا کمرہ ایک ایسے برآمدے کی طرف کھلتا تھا جس کے سامنے جھاڑیاں اُگی تھیں۔ برآمدے میں سے مجھے نارنگی کے دو رویہ اُگے ہوئے پودوں سے بنا ہوا ایک تنگ راستہ، جو پہاڑی کی طرف چلا جاتا تھا ایک سرے سے دوسرے تک نظر آ رہا تھا۔ پودوں سے گھری ہوئی ایک نیچی نشست گاہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بوڑھی رقاصہ وہاں اکثر بیٹھتی ہو گی۔

ہم باغ میں پھول دیکھنے چلے گئے۔ شام چھا رہی تھی ——— خوشگوار اور پرسکوت شاموں میں سے ایک ایسی شام جو دنیا بھر کی خوشبوؤں کو مہکا سکتی ہے ———!

جب ہم میز پر کھانا کھانے بیٹھے، اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ ہم دیر تک مصروف رہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ میرا دل اس کے لئے کتنی گہری ہمدردی سے لبریز ہے تو ہم دونوں رازدار دوست بن گئے۔ وہ مجھ سے مانوس ہو گئی اور کشادہ دلی سے کہنے لگی۔

"چلئے ذرا چاند کا نظارہ کریں۔ اس نے میری محبوب ترین ستیں دیکھی ہیں، اسی لئے وہ میرے نزدیک ایک قابلِ پرستش چیز ہے۔ کبھی کبھی میں یہ خیال کرتی ہوں کہ وہ واقعات جو مجھ پر گزرے ہیں تمام کے تمام چاند میں محفوظ ہیں اور اسے دیکھتے ہی وہ تازہ ہو جاتے ہیں . . . اور کبھی دھندلکے میں میری آنکھیں کوئی خوب صورت، نہایت خوبصورت نظارا دیکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ کون نظارا ہے؟ آپ میرا تمسخر اڑائیں گے۔ نہیں نہیں، میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ فی الحقیقت مجھ میں اتنی جرأت ہی نہیں!"

میں نے اس سے التجا کی "میں بھی تو دیکھوں وہ کیا نظارا ہے مجھے ضرور بتائیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارا تمسخر نہیں اڑاؤں گا . . . نہیں ہرگز نہیں خدا کے لئے مجھے دکھاؤ"!

وہ ذرا ہچکچائی میں نے اس کے چھوٹے چھوٹے نازک، یخ بستہ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور یکے بعد دیگرے کئی بار انہیں چوما۔ جس طرح کبھی اس کے عشاق انہیں چوما کرتے تھے۔ اس کا دل پسیج گیا اور وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"تو آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ میرا تمسخر نہیں اڑائیں گے؟"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"۔

"تو پھر آئیے"!

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جوں ہی اس کا پست قد خادم جو نوکروں

کے سبز لباس میں نہایت بدوضع معلوم ہوتا تھا، اس کی کرسی پرے ہٹانے آیا۔ اس نے آہستہ سے اس کے کان میں کوئی بات جلدی سے کہی۔ نوکر نے جواب دیا۔ "بہت اچھا، دام"

اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے برآمدے کی طرف لے آئی۔

نارنگیوں کا جھنڈ فی الحقیقت ایک دلکش منظر بنا تھا۔ چودھویں رات کا چاند نکل چکا تھا اور اس کی سفید دھیمی دھیمی روشنی کالے رنگ کی گول گول چوٹیوں کے درمیانی خلا میں سے چھن چھن کر زمین کو منور کر رہی تھی۔

درختوں میں پھول آچکے تھے۔ اور ان کی کیف آگیں خوشبو سے رات مہک اٹھی تھی،

میں چلا اٹھا۔ "آہا محبت کے لئے یہ کتنا اچھا پس منظر ہے۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "خوب خوب ذرا ٹھہریئے!"

اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگی۔ "اور جب میں یہ نظارہ دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی گزشتہ زندگی پر بے حد افسوس ہوتا ہے مگر تم، تم، نئے زمانے کے آدمیوں کو بھلا ان چیزوں سے سروکار، تم سب کے سب سرکاری منڈی کے دلال، تجارت پیشہ اور کاروباری آدمی ہو، تم کو ہم ایسے لوگوں سے بھلا کیا واسطہ؟ آہ محبت بالکل دھوکا ہی دھوکا ہے۔

یکایک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ "دیکھئے ادھر!"

میں وہاں انتہائی مسرت اور انتہائی حیرانی میں بیٹھا رہا۔ دور تنگ راستے کی اُس جانب سے ایک دوسرے کی کمر میں باہیں ڈالے، دو نوجوان پیکر آتے دکھائی دیئے۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دلکش انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے، روشنی کے ان ٹکڑوں کو چیرتے ہوئے، جو سائے میں غائب ہونے سے پہلے ان پر نور کی بارش کر دیتے تھے، ہماری جانب بڑھے چلے آرہے تھے۔ مرد نے گزشتہ صدی کی وضع کا سفید ساٹن کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی ہیٹ شتر مرغ کے پروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ . . . وہ گون زیب تن کئے تھی۔ اور اس کے چمکیلے بال شہزادیوں کے بالوں کی طرح تھے۔ وہ ہم سے کوئی سو گز کے فاصلے پر راستے کے درمیان میں ٹھہر گئے اور ایک پرتکلف انداز میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔

معاً میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ جولی رومان کا پست قد خادم اور خادمہ تھی۔ انہیں دیکھ کر مسرت میری انتڑیوں تک سرایت کر رہی تھی مگر میں نے اپنے آپ کو ہنسی سے باز رکھا۔ میں اس وقت اس آدمی کی طرح اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا جو اپنی ٹانگ کٹ جانے کے وقت، منہ اور جبڑوں کو چیر کر نکلتی ہوئی چیخ کو روک لے۔

دونوں خادم واپس جانے کے لئے مڑے اور آخر کار خواب کی طرح آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ راستے پر اب پھر پہلی سی اداسی چھا گئی۔

میں بھی واپس چلا آیا، دل میں یہ ارادہ کئے ہوئے کہ اس منظر کو جسے دیکھ کر رومان اور خود فریبی کا بھولا بسرا زمانہ اپنی تمام تر پیچی اور چھوٹی سحر انگیزیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور جو اب بھی ایک بوڑھی ایکٹرس کا خون گرما سکتا ہے، پھر کبھی نہیں دیکھوں گا ———!

(موپساں)

طاہر قریشی بی اے

غزل

اسی کا نقش یہ ہستی ہے مٹ گیا ہوں میں
کوئی بتائے کہ اب کس کو دیکھتا ہوں میں

نکل گیا تھا بہت دور اپنی ہستی سے
یہ کس کو ڈھونڈھ رہا تھا کہ مل گیا ہوں میں

وہ جس نے چھوڑ دیا مجھ کو پاس منزل کے
اسی مسافرِ عارف کا نقش پا ہوں میں

تمام عمر ہے اس ذوق بے خودی کے نثار
وہ مل گیا ہے مگر اس کو ڈھونڈتا ہوں میں

دئیے جا گردشِ پیہم نگاہ کو ساقی
کشید ہر دو جہاں آج پی رہا ہوں میں

حرم میں مجھ کو ہے یہ ذوق بندگی تسلیم
بتوں کے باب میں شرمندۂ خدا ہوں میں

اسی کا نام سکوتِ نصیب ہے شاید
ازل کی بزم ہے اور سازِ بے صدا ہوں میں

سمجھ گیا ہے حقیقت مجازِ خود بینی
کہ اس کے شوق میں اپنے کو پوجتا ہوں میں

یقین دل سے ہے اب وہ مجھے کرے گا قبول
لبِ رقیب پہ ہوں شوق کی دعا ہوں میں

سمجھ چکا ہے مسیحا بھی ایک مدت سے
کہ دردِ زیست میں جب سے ہوں مبتلا ہوں میں

یہ کفرِ عشق ہے کیفیؔ کہ عشق ایماں ہے؟
کہ یادِ بت کی ہے اور بندۂ خدا ہوں میں

کیفیؔ چریاکوٹی

ستارہ

ہے گوشِ حسنِ ازل کا تو دُرِّ تابندہ — قبائے عرش کا تو تکمۂ درخشندہ

تو مہر و ماہ کے رشتے سے طفلِ زائیدہ — ترے جمال کی سب کائنات گرویدہ

تو نور ہے کہ جمودِ نگاہِ یزداں ہے — کہ ایک حور سرِ عرش اشک افشاں ہے

تو مسکرایا ہے یا آنکھ ڈبڈبائی ہے؟ — تو شاد ہے کہ تجھے غم سے آشنائی ہے

تو اک تبسمِ لرزاں ہے حور کے لب پر — کہ ملگجا سا ہے اک پھول تربتِ شب پہ

تو آسمان کی پائندہ رفعتوں کا مکیں — بساطِ عرش کی تابندہ محفلوں کا حسیں

تو دور مجھ سے ہے لیکن نگہ سے دور نہیں — میرا خیال تری جلوہ گہ سے دور نہیں

ترے کنار میں شاید یہ کوئی محشر ہے — کہ تیری ہستیِ نازک ہمیشہ مضطر ہے

تو ایک رندِ خراباتِ عرش، جام بدست — فضائے چرخ میں رقصاں ہے مثلِ شاعرِ مست

کوئی یہ کیسے کہے کیا ہے کیا نہیں ہے، تو — خدا نما ہے اگرچہ خدا نہیں ہے تو

عجیب موت ہے تیری عجیب ہستی ہے — عجیب ہوش ہے تیرا عجیب ہستی ہے

عجیب تر یہ کہ شب کو تو سو نہیں سکتا — ق — تو رو تو دے مگر افسوس رو نہیں سکتا

غمِ نہاں تری آنکھوں میں اشک لاتا ہے
مری طرح تو مگر حالِ دل چھپاتا ہے

مسعود شاہد

شکار

مغربی انگلستان کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے سرد ویٹنگ روم میں، دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان کو وہاں بیٹھے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور ابھی کافی عرصہ اور بیٹھنے کا امکان تھا۔ باہر کی سرد فضا میں کہر اور دھند چھا رہی تھی اور ان کی گاڑی کئی گھنٹے لیٹ تھی۔ ویٹنگ روم بہت معمولی طور پر آراستہ تھا جس میں سجاوٹ اور آرام کا نام نہ تھا۔ چھت سے ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا۔ آتشدان کی آگ مدت ہوئی بجھ چکی تھی اور اس کے طاق پر ایک گتے کا ٹکڑا رکھا تھا جس پر دونوں جانب لکھا تھا۔ "سگریٹ پینا منع ہے"۔ کھڑکی کے تم آلودہ شیشوں میں سے آنے والی زرد اور مدھم روشنی بتا رہی تھی کہ باہر پلیٹ فارم پر ایک بتی روشن ہے۔

گھن لگی ہوئی لکڑی کی کرسیوں پہ دونوں مسافر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ ان کی ملاقات ہوئے اتنا ہی عرصہ گزرا تھا جتنا دونوں کو گاڑی کا انتظار کرتے۔ اور اب تک جو مختصر سی گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اس سے تو ان کے اجنبی ہی رہنے کا امکان تھا۔ ایک مسافر جو عمر میں دوسرے سے کم تھا۔ اس اجنبی پن کی تلخی اپنے ساتھی سے بہت زیادہ محسوس کر رہا تھا شاید اس سے بھی زیادہ جتنا کہ اس نے اس کمرے کی بے سروسامانی محسوس کی تھی۔ جس میں اس کو کوئی چیز بھی دلچسپی کی نظر نہ آتی تھی۔ مگر اپنے ساتھی مسافر میں جو اس کے نزدیک انسانیت کا ایک غیر معمولی نمونہ تھا۔ وہ کافی دلچسپی لے رہا تھا اس کا معمولی سے چھوٹا قد سوکھا ہوا پتلا دبلا جسم، لمبا۔ سیاہ رنگ کا کوٹ، کیچڑ سے بھرے ہوئے جوتے، بے رنگ چہرہ، گہرے بھورے رنگ کی جلد، نوکیلی ناک، تنگ دہانہ، رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں، اور چہرے کی گہری شکنیں، کم عمر مسافر کی توجہ اپنے پر سے ہٹنے نہ دیتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس آدمی کی ہر بات نے۔ شانے جھکا کر اور ہاتھ جیب میں ڈال کر بیٹھنے کی طرز نے۔ اس کے غیر معمولی قسم کے، تنگ کنارے والے جھکے ہوئے ہیٹ نے۔ اس کی بے چینی کے احساس نے (جس کی وجہ کرسی کا سخت ہونا نہیں بلکہ کرسی کا کرسی ہونا معلوم ہوتی تھی) ان تمام باتوں نے نوجوان مسافر کی دلچسپی کو بے تابی میں تبدیل کر دیا تھا۔ مگر گفتگو شروع کرنے کی ہزار کوشش پر بھی وہ اپنے ساتھی مسافر کی خاموشی توڑ نہ سکا تھا۔ صرف اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وہ آدمی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا اور کبھی کبھی ذرا سا مسکرا بھی دیتا مگر کسی خاص بات پر نہیں۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامیابی دیکھتے ہوئے پھر کوشش کرنا بیکار سی بات تھی مگر وقت کاٹنے کی کوئی اور صورت بھی تو نہیں تھی۔ آخر نوجوان نے فیصلہ کیا۔ اگر وہ نہیں بولتا تو میں بولوں گا۔ میں اپنی زندگی کا تازہ ترین واقعہ اس کو سناؤں گا۔ وہ واقعہ اتنا غیر معمولی اور دلچسپ ہے کہ اس کو سن کر اس اجنبی کو بھی اپنی کوئی آپ بیتی سنانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اس نے آواز سے کہا۔ "میرے خیال میں آپ نے کہا تھا کہ آپ شکاری ہیں"۔

"جی ہاں میں یہاں شکار کھیلنے ہی آیا ہوں"۔

"پھر آپ نے لارڈ فلیئر کے شکاری کتوں کا ذکر تو سنا ہی ہوگا لارڈ موصوف یہاں سے نزدیک ہی رہتے ہیں"۔

"میں ان کو جانتا ہوں"۔

"میں بھی انہی کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا۔ لارڈ فلیئر میرے چچا ہیں"

اس آدمی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ذرا مسکرایا اور سر کو جنبش دی۔ مگر اس انداز سے گویا کچھ سمجھ ہی نہیں رہا۔

نوجوان کہتا گیا۔ کیا آپ میرے چچا کے متعلق ایک عجیب قصہ سننا پسند کریں گے؟ قصہ نہایت مختصر ہے اور اسے ظہور میں آئے دو ہی روز ہوئے ہیں"۔

"جی ہاں ضرور"

نوجوان نے اپنی کرسی اجنبی کے نزدیک کر لی اور یوں کہنا شروع کیا:۔

"یہ تو شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ لارڈ فلیئر دنیا سے علحدہ ہو کر

زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ہمسایوں سے بھی ان کی ملاقات اگر کبھی ہوتی ہے تو محض اتفاقاً۔ ان کی زندگی کے صرف دو ہی مشاغل ہیں گھوڑے کی سواری اور شکار۔ ان میں ان کا تمام وقت صرف ہوتا ہے۔ انہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی اور چونکہ میں ان کے بھائی کا اکلوتا لڑکا ہوں اس لئے میری پرورش ان کی تمام زمینداری کے وارث کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران میں حالات نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔

شروع شروع میں تو میرے چچا نے جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا اور ایسے رہے گویا جنگ کے واقعات سے انہیں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ مگر جب عوام نے اُن کی اس مردہ دلی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور ان سے اپنا رویہ بدلنے کی درخواست کی تو انہوں نے اپنی غلطی محسوس کر لی اور دوسرے روز ہی لندن اپنے ایجنٹ کو اخبار "ٹائمز" کے پرچے اور ایک بلجین پناہ گیر کی فرمائش لکھ بھیجی۔

وہ بلجین پناہ گیر ایک پچیس سال کی بدصورت اور گونگی لڑکی نکلی جس کی زندگی کا مقصد سوائے زیادہ کھانے اور بہت سونے کے اور کچھ نہ تھا۔ دن کا زیادہ تر حصہ وہ اپنے کمرے میں ایک آرام کرسی پر پریسکاٹ کی کتاب "میکسیکو کی فتح" گھٹنوں پر رکھے بیٹھی رہتی یا تو وہ بہت ہی آہستہ پڑھتی تھی اور یا بالکل پڑھتی ہی نہ تھی کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اس کی پہلی جلد ہی گیارہ برس تک لئے پھرتی رہی۔

لیکن زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے چچا کے دل میں اُس لڑکی کی نسبت ہمدردانہ جذبات بڑی تیزی سے پرورش پانے لگے اور غیر معلوم طور پر ترس کے لحاظ اور لحاظ سے محبت میں تبدیل ہو گئے۔

جنگ کے ختم ہونے پر اس لڑکی کے بلجیم واپس جانے کا کوئی سوال نہ تھا اور اگلے سال ہی ایک دن میں نے سنا کہ میرے چچا نے اُس کو قانوناً اپنا متبنیٰ بنا لیا ہے۔ اور اپنا وصیت نامہ بدل کر اُس کے حق میں کر رہے ہیں۔

ایک تو وراثت سے محروم ہونا اور پھر ایسے انسان کی وجہ سے جس سے مجھے شروع سے ہی نفرت تھی۔ اس واقعہ سے میرے دل پر بڑی ٹھیس لگی۔ مگر وقت گزرنے پر اُس ٹھیس کا درد کم ہو گیا۔ اور میں چچا کے پاس کبھی کبھی آ کر رہنے لگا۔ تین روز ہوئے میں یہاں ایک ہفتہ رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔ میں نے اپنے چچا کو حسب معمول تندرست پایا اور وہ بلجین لڑکی بھی پہلے سے دونی موٹی ہو گئی تھی۔

رات کو کھانا کھاتے وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے چچا کچھ بے چین سے ہیں اور ان کی ہر حرکت سے اُن کے اندرونی انتشار کا پتہ چلتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور جب میں کمرے کا دروازہ بند کر چکا تو وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ہال! میں ایک بہت بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں"

میں نے ہمدردی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کل" میرے چچا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا ایک آسامی جس کی زمینیں شمالی سرحد پر ہیں۔ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کی دو بھیڑیں ضائع ہو گئی ہیں۔ مگر ایک عجیب ذریعے سے۔ اگرچہ اُس کا خیال ہے کہ ان کو کسی جنگلی جانور نے مارا ہے"۔ میرے چچا ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔

"کتے!" میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" میرے چچا نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "اس اسامی نے کتوں کی ماری ہوئی بھیڑیں بہت دفعہ دیکھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کسی کونے میں بری طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پائی جاتی ہیں۔ کتوں کا کام کبھی صفائی کا نہیں ہوتا اور یہ بھیڑیں اس طرح نہیں ماری گئی ہیں۔ میں خود ان کو دیکھنے گیا تھا اُن کے صرف حلق چاک کئے گئے ہیں اور کہیں کوئی زخم یا نشان نہیں ہے۔ پھر دونوں کھلی جگہ میں پائی گئی ہیں۔ کسی کونے میں نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مارنے والا کوئی بھی ہو مگر کتے کی بہ نسبت کہیں زیادہ چالاک اور طاقتور ہے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر کہنے لگے۔ "آج بہت سویرے ایک اور بھیڑ میری اپنی زمینوں پر مری پائی گئی ہے اور بالکل اسی طریقے سے ماری گئی ہے"۔

اس معمے کا کوئی ٹھیک حل میری عقل میں نہ آسکا مگر پھر بھی میں نے کہا "اگر ارد گرد کی جھاڑیوں وغیرہ میں دیکھا جائے تو شاید۔ . . .!"

"ہم سارا جنگل چھان چکے ہیں" چچا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"اور کچھ نہیں پایا؟"

"کچھ نہیں ـــــ سوائے چند نشانات کے"

"نشانات! کس قسم کے؟"

میرے چچا نے اپنا منہ پھیر کر آہستہ سے کہا۔ "کسی آدمی کے پاؤں

ے نشانات"۔

میں نے دیکھا کہ اُن کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی چلی جارہی
تی۔ میں نے دل مضبوط کر کے اُن سے اس ضرورت سے زیادہ پریشانی
سبب دریافت کیا۔ "تین بھیڑیں ماری گئی ہیں" میں نے کہا "کس
ریقے سے اور کس کے ہاتھوں یہ ابھی معلوم نہیں ہوا۔ مگر چند دنوں میں
ی بہ آسانی معلوم ہو جائے گا اور مارنے والے کو پکڑ کر سزا بھی دے
ی جائے گی اور جب تک وہ پکڑا جائے تب تک زیادہ سے زیادہ
ی ہو سکتا ہے کہ دو چار بھیڑیں اور ماری جائیں بس یہی نا! پھر اتنی
یشانی کس بات کی ہے"۔

چچا نے نظر اٹھا کر اس طرح میری طرف دیکھا گویا کچھ کہنا چاہتے
ں اور کہہ نہیں سکتے۔

"بیٹھ جاؤ" آخر انہوں نے کہا۔ "میں تم کو کچھ بتانا چاہتا ہوں"۔

اور جو کچھ انہوں نے مجھے بتایا اُس کا اختصار یہ ہے کہ

تقریباً پچیس برس ہوئے چچا نے ایک نئی خادمہ ملازم رکھی جو
یلز کی رہنے والی تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال۔ قد لمبا اور رنگ سانولہ
تھا۔ اس کی سیرت کے متعلق انہوں نے صرف اتنا ہی مجھے بتایا کہ وہ
دنی غیبی طاقت" رکھتی تھی۔

اُس کے ملازمت میں آنے کے چند ماہ بعد ہی میرے چچا اس میں
چسپی لینے لگے اور اس نے بھی کبھی اس "دلچسپی" پر اعتراض نہیں کیا۔
یک روز اُس نے میرے چچا کو بتایا کہ وہ جلد ہی ایک بچے کی ماں ہونے
لی ہے۔ پہلے تو میرے چچا نے کچھ نہ کہا۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ
ورت اُن سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ اُس سے شادی کر لیں تو وہ
ضب ناک ہو گئے اور اُسے بہت برا بھلا کہا اور حکم دیا کہ بچے کے پیدا
وتے ہی اُن کا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ لیکن خوف زدہ ہونے کی بجائے
عورت ترچھی نظروں سے اُن کی طرف دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ بڑبڑائی
ی۔ اس سے میرے چچا ڈر گئے اور انہوں نے اس کو اپنے قریب آنے
سے بھی روک دیا۔ اس کا سامان مکان کے ایک تنہا اور غیر آباد حصے میں
بھجوا دیا اور اس کی جگہ دوسری خادمہ رکھ لی۔

بچہ پیدا ہوا اور میرے چچا کو بتایا گیا کہ وہ عورت اب چند ہی لمحوں
ی مہمان ہے اور اُن سے ملنے کے لئے بار بار درخواست کر رہی ہے
یرے چچا جو کسی قدر رنجیدہ اور ڈرے ہوئے تھے۔ اس کے کمرے میں
پہنچے۔ (ان پر نظر پڑتے ہی) وہ عورت ان کے چہرے پر آنکھیں
جما کر کچھ کچھ بڑبڑانے لگی۔ گویا اپنی سبق دہرا رہی ہو۔ اس کے بعد
اُس نے بچے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دائی لڑکے کو لے آئی۔

"یہ تمہارا وارث ہے" اُس عورت نے کرخت آواز میں کہا۔
اُس کو کیا کرنا ہوگا۔ یہ میں اسے بتا چکی ہوں۔ یہ اپنی ماں کے لئے
ایک اچھا لڑکا اور اپنے پیدائشی حق کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے گا"۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی اُس کی روح پرواز کر گئی۔

جب میرے چچا وہاں سے جانے لگے تو دائی نے آہستہ سے
اُن کو بچے کے ہاتھ دیکھنے کے لئے کہا۔ بچے کی مٹھیاں کھول کر اُس
نے دکھایا کہ دونوں ہاتھوں میں تیسری انگلی دوسری سے لمبی تھی۔

"اُس کا کیا مطلب؟" میں نے پوچھا "کہ تیسری انگلی دوسری سے
لمبی تھی"؟

"یہ مجھے بہت عرصے کے بعد معلوم ہوا۔ میری لاعلمی دیکھ کر میرے
نوکروں نے بھی کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ لیکن آخر مجھے ایک ڈاکٹر
سے یہ معلوم ہوا جس نے یہ بات گاؤں کی ایک بوڑھی عورت سے سُنی
تھی، کہ جو انسان تیسری انگلی دوسری سے لمبی لے کر پیدا ہوتا ہے وہ
ورولف (Werwolf) ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کا عام خیال ہے"۔

"اور اُس "ورولف" ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے"؟

"ورولف" میرے چچا نے مجھے بتایا۔ "ایک ایسا انسان ہوتا ہے
جو خاص خاص موقعوں پر بھیڑیا بن جاتا ہے یعنی اس کی خواہشات، عادات
یہاں تک کہ حرکات بالکل بھیڑیے کی سی ہو جاتی ہیں"۔

لوگوں کے یقین کے مطابق یہ تبدیلی رات کو ہوتی ہے۔ "ورولف"
انسانوں اور جانوروں کو مار کر اُن کا خون پیتا ہے۔ دسویں صدی سے
لے کر سترھویں صدی تک ایسے ہزاروں واقعات دیکھنے میں آئے
ہیں خاص کر فرانس میں، جن میں بے شمار عورتوں اور مردوں کو قانوناً سزائیں
دی گئیں۔ اُن جرائم کے لئے جو انہوں نے جانوروں کی حیثیت سے کئے
تھے"۔

کچھ رُک کر میرے چچا بولے۔ "جب مجھے لوگوں کے اس یقین کا علم
ہوا تو میں نے لندن میں ایک آدمی کو لکھا جس کو ان چیزوں سے بہت
دلچسپی تھی۔

"اور بچے کا کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

میرے ایک ملازم کی بیوی اس کو اپنے ہمراہ گھر لے گئی۔ وہ لڑکا ان کے ساتھ دس سال تک رہا پھر ایک روز وہاں سے بھاگ گیا اور پھر مجھے اس کی اطلاع صرف کل ہی ملی"۔

چند لمحوں تک ہم دونوں خاموشی سے آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کو دیکھتے رہے۔ میری عقل نے تو گویا بالکل ہی جواب دے دیا تھا۔ اور میں کچھ سہما ہوا سا تھا۔

آپ کے خیال میں آخر میں نے کہا یہ آپ کا لڑکا ورولف ہی ہے جو بھیڑیں مار رہا ہے؟

ہاں وہی بھیڑیں مار رہا ہے اور اس لئے کہ اُسے یا تو اپنی طاقت کا زعم ہے۔ یا تنبیہ کے طور پر یا اس بات سے چڑ کر کہ اُس کا شکار اُس کے ہاتھ نہیں لگا۔

"شکار ہاتھ نہیں لگا" میں نے حیرت سے پوچھا۔

میرے چچا نے بے چینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس کا شکار بھیڑیں نہیں ہے"!

اب پہلی دفعہ میں نے اُس عورت کی بددعا کا "مطلب" سمجھا۔ اصلی "شکار" لارڈ فلیبر کا وارث تھا۔

اپنی محرومی پر مجھے خوشی ہوئی۔

"میں نے جرلین کو دھند چھانے کے بعد باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے" میرے چچا نے میرے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

جرلین اُس ہلجبین لڑکی کا نام تھا!

. . . .

تمام رات میں آنکھیں بند نہ کرسکا۔ اُس قصے نے میرے دل و دماغ کی عجب حالت کردی تھی۔ کھڑکی کے باہر رات کی تاریکی میں۔ زمین پر بچھے ہوئے درختوں کے سوکھے پتوں پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سننے کو میرے کان ہر وقت کھڑے رہتے ایک دفعہ میں نے بھیڑیے کے بولنے کی آواز بھی سُنی۔ مگر وہ خواب میں تھی یا بیداری میں یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن دوسرے روز سویرے ہی میں نے ایک آدمی کو جس کی پوشاک گڈریے کی سی تھی اور جس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔ سڑک پر اوپر کی طرف جاتے دیکھا۔

ناشتہ کے وقت مجھ کو چچا سے معلوم ہوا کہ رات ایک اور بھیڑ ماری گئی ہے۔ انھوں نے کانپتی آواز سے یہ بات کہہ کر ڈری ہوئی نظروں سے جرلین کی طرف دیکھا جو سامنے ہی بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔

ناشتہ کے بعد ہم نے ایک زبردست "تلاش" کی تیاری کی اور تمام دن ہم بیس آدمیوں کو لے کر سارا جنگل چھانتے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جہاں پچھلی رات بھیڑ ماری گئی تھی۔ وہاں ہمارے کتوں کو کچھ بو ملی اور اُس کے پیچھے وہ دو میل تک ہم کو لے گئے مگر آخر ریل کی لائن پر جا کر ایک جگہ وہ بو بھی غائب ہوگئی اور پاؤں کے نشانات کے لئے زمین بے حد سخت تھی۔ آخر میرے چچا بالکل مایوس ہوگئے اور ادھر اندھیرا بھی ہونے لگا تھا اس لئے ہم لوگ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم مکان کی پچھلی سڑک سے جا رہے تھے جس پر آمد و رفت بہت ہی کم ہوتی تھی۔

ابھی اصطبلوں کے بڑے دروازے سے ہم تین سو گز دُور ہوں گے کہ ہمارے گھوڑے چونک کر ایک دم کھڑے ہوگئے۔ میرے چچا کے حلق سے ڈری ہوئی سی چیخ نکل گئی اور اسی وقت داہنے ہاتھ کے درختوں کی دوسری جانب سے کسی جانور کے بولنے کی آواز آئی جو ایک نہایت ڈراؤنے قہقہے کی طرح تھی۔ یہ آواز دو تین بار تیز اور ہلکی ہوئی اور پھر رات کی خاموشی میں غائب ہوگئی۔ ابھی اُس خوفناک قہقہے کی آواز ہمارے کانوں میں گونج ہی رہی تھی کہ درختوں کی اُس جانب سے۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ سخت سڑک پر دو قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی جو آگے کو جا رہی تھی۔ میرے چچا گھوڑے سے کود کر درختوں کے جھنڈ کی طرف جھپٹے اور میں نے اُن کا ساتھ دیا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلی جگہ میں آتے ہی جو چیز ہماری نظر پڑی وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔

جرلین وہ ہلجبین لڑکی۔ ایک سیاہ گٹھڑی کی صورت میں سڑک پڑی تھی ——— اس کا حلق چاک کر دیا گیا تھا۔

. . . .

نوجوان مسافر خاموش ہو کر کرسی پر پیچھے کو جھک گیا۔ اس کمرے کی بے سروسامانی کا جسے اپنے قصے کے دوران میں وہ بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا۔ اُسے پھر احساس ہونے لگا۔

ایک لمبی سانس لے کر مسکراتا ہوا وہ بولا "یہ ایک ناممکن سا قصہ ہے اور میں اس تمام پر یقین کرنے کی امید آپ سے نہیں کرتا اور مجھے تو اس کی سچائی اور بھی ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس ہلجبین لڑکی کی موت سے اب میں ہی لارڈ فلیبر کی تمام زمینداری کا وارث

ہوں"۔

اجنبی ذرا مسکرایا۔ اس کی آنکھیں ذرا چمکیں۔ سیاہ اوورکوٹ سے ڈھکے ہوئے جسم میں اایک قسم کا کھینچاؤ سا ہونے لگا۔ وہ آہستہ سے کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

نوجوان مسافر ایک ڈر سا محسوس کرنے لگا۔ اس اجنبی کی چمکتی ہوئی آنکھیں اس کو خوفناک معلوم ہوئیں۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو گئے اور جسم سے حرکت کرنے کی طاقت تک جاتی رہی۔

اس اجنبی مسافر کی مسکراہٹ اب اور بھی سخت ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ منہ کے ایک کونے سے رال بہنے لگی۔ نہایت آہستہ سے اُس نے ایک ہاتھ اونچا کیا اور سر پر سے ہیٹ اتار دیا۔ اُس وقت نوجوان نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ کی تیسری انگلی دوسری سے لمبی تھی۔

(آزاد ترجمہ)

؟

رباعی

آ نغمۂ مستی کی طرب زاد کریں
آ جورِ خزاں سے دل کو آزاد کریں
گر سیم تمہیں نہیں نہ ہو اٹھ ساقی
اس جام سے سو بہار ایجاد کریں

سعید احمد اعجاز

امجد

سایۂ آفتاب ہے امجد | آپ اپنا حجاب ہے امجد
اس کا سر ہے کسی کے قدموں میں | کیا ہی عالی جناب ہے امجد
کیا جلائے گی اس کو نارِ سقر | شرم سے آب آب ہے امجد
ذرہ ذرہ جہانِ فانی کا ق | آپ اپنا جواب ہے امجد
ایک تم ہی نہیں ہو دنیا میں | یاں ہر اک لاجواب ہے امجد
نہ کرو تم کبھی کسی سے بدی | یہ بڑا ہی ثواب ہے امجد

بہ گیا تھا جو رودِ موسیٰ میں[1]
وہی خانہ خراب ہے امجد

امجد حیدرآبادی

[1] رود موسیٰ، حیدرآباد میں ایک ندی کا نام ہے جس میں ۱۳۲۶ھ میں طغیانی آئی تھی اور اس طغیانی میں امجد صاحب مع اہل و عیال بہہ گئے تھے۔

شاعر

درد کی مٹی سے ہوتی ہے سرشتِ شاعر　　کلفت و رنج و مصیبت ہے نوشتِ شاعر
غم کا اک لحظہ ہے صد عمرِ بہشتِ شاعر　　خون کی بوند سے شاداب ہے کشتِ شاعر

اپنی ہی آگ میں منظور اسے جل جانا ہے
شعلۂ گرمیٔ تاثیر کا پروانہ ہے

کوئی دنیا میں نہیں اس کا سا آزاد منش　　کوہ و صحرا میں پھرا کرتا ہے دیوانہ روش
کھینچتی اپنی طرف اس کو ہے ہر شے کی کشش　　ڈھونڈتا پھرتا ہے ہر چیز میں سامانِ تپش

خار کا چبھنا کبھی اس کو ہنسا دیتا ہے
اور کبھی گل کا تبسم بھی رُلا دیتا ہے

اک تخیل گہِ صد طور ہے فطرت اس کی　　ساغرِ جم ہے مگر چشمِ بصیرت اس کی
ایک ہی شے ہے مجاز اور حقیقت اس کی　　سارے عالم کا خلاصہ ہے طبیعت اس کی

اس میں ہر رنگ سماتا ہے نمایاں ہو کر
شانِ مستور نظر آتی ہے عریاں ہو کر

ایک دل سوختۂ لذتِ نظارہ ہے　　کبھی جنگل میں کبھی دشت میں آوارہ ہے
اہلِ دنیا کی نگاہوں میں تو ناکارہ ہے　　منبعِ درد ہے جذبات کا فوارہ ہے

ایک آئینہ ہے نیرنگیٔ عالم کے لئے
ایک پیمانہ ہے تقسیمِ مَے غم کے لئے

گو بظاہر ہمہ تن طالعِ ناساز ہے یہ　　اور گنبد میں پریشانیٔ آواز ہے یہ
شاہدِ حُسن کا پر زمزمہ پرداز ہے یہ　　ہم نفس تارے کا اور چاند کا ہمساز ہے یہ

مے لذّت سے یہ مدہوش جو ہو جاتا ہے
آپ بھی وادیٔ نظّارہ میں کھو جاتا ہے

ساغرِ فکر سے لیتا ہے وہ مستی اپنی　　سوچ کو جانتا ہے بادہ پرستی اپنی
دور دنیا سے بناتا ہے وہ بستی اپنی　　دل میں کرتا ہے بپا محفلِ ہستی اپنی

عالمِ وجد میں بے ہوش پڑا رہتا ہے
لہجۂ زمزمہ میں کہتا ہے جو کہتا ہے

ساز سے اس کے کبھی زمزمہ خانہ ہے جہاں　　جاوداں ایک مسرّت کا ترانہ ہے جہاں
اور کبھی حیرت و عبرت کا فسانہ ہے جہاں　　زندگی خواب ہے محض ایک بہانہ ہے جہاں

بات میں ذرے سے خورشید بنا دیتا ہے
بات میں خلد کو دوزخ میں جلا دیتا ہے

گو وہ ساحل کی طرح بحرِ جہاں میں ہے خموش　　دور سے بیٹھا ہوا سنتا ہے موجوں کا خروش
دل مگر اس کا ہے سینائے نوا کی آغوش　　گیت اس کے ہیں زمانے کے لئے بانگِ سروش

دل میں کرتا نہیں وہ الفت دنیا پیدا
جام کو توڑتا ہے تا کہ ہو مینا پیدا

روشن الدین تنویر

شفقِ قطبی

کرۂ ارض کے قطبِ شمالی و قطبِ جنوبی کے خصوصاً برفانی علاقہ میں کئی مقامات پر اکثر اوقات ایک نہایت عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مختلف رنگوں کے صاف و شفاف مجموعۂ انوار کی ناگہاں جلوہ نمائی سے آسمان تجلی زار بن جاتا ہے۔ ان برق صفت انوار کا کارواں فلک کی نیلگوں وسعتوں میں حیرت انگیز نظاروں کا مرقع پیش کرتا ہوا اس پار چلا جاتا ہے۔ یہ مجموعۂ انوار یا روشنی کی چھنک ظہور پذیر ہوتے ہی اپنے بوقلموں اور متلون انداز میں نہایت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا شروع کر دیتی ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں رنگ بدلتی، کایا پلٹتی اور نورانی عشوہ طرازی و کرشمہ سازی سے تماشائی کے دلِ ذوقِ آشنا میں ہل چل مچاتی ہوئی ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ اس عجیب و غریب قدرتی روشنی کو منطقہ بارۂ شمالی میں "ارورا بورئیلس" (AuroraBorealis) یعنی "شفق شمالی" اور منطقہ باردہ جنوبی میں "ارورا آسٹریلس" (AuRORA AuSTRALIS) یعنی "شفقِ جنوبی" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اس قسم کی روشنی کے ظہور و نمود کے اسباب ہنوز پردۂ راز میں ہیں، بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اس نوعیت کی روشنی کا قطبِ شمالی و قطبِ جنوبی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کچھ بھی ہو اس حیرت انگیز اور پُر اسرار روشنی نے دنیائے سائنس میں جس خاص ذوقِ تحقیق و تدقیق کی روح پھونک دی ہے وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ منطقہ باردہ میں اس قسم کی "ارورا" یا حیرت انگیز روشنی کا ظہور عام ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کے کسی دوسرے طبقہ میں اس عجیب روشنی کا جلوہ قطعاً ناپید ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمین کے دیگر طبقات میں منطقۂ باردہ کی بہ نسبت یہ روشنی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی تمام طبقات کے بعض مقامات پر اس کا ظہور ایسی تیزی سے ہوتا ہے کہ دور دراز سے بھی اس کی تابانیوں اور ضیا پاشیوں کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ اس قسم کا منظر لمبے وقفوں کے بعد ہی میسر آتا ہے۔ زمین کے کس کس حصہ میں یہ روشنی (شفق) اکثر رونما ہوتی ہے۔ اس کی چھنک کہاں، کتنے عرصے کے بعد اور کس درجہ نور و رونق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان امور کا پتہ بھی عمیق ترین اور باقاعدہ مشاہدات و تجربات سے لگایا گیا ہے۔ منطقۂ حارہ میں اس قسم کی "ارورا" کا نظارہ مفقود ہے۔ منطقہ حارہ سے قطبِ شمالی کی جانب جتنا آگے بڑھا جائے اس "ارورا" یعنی روشنی یا قطبی شفق کا ظہور بتدریج زیادہ ہوتا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص مقام پر مرکوز ہو کر روشنی کی یہ چھٹا اپنے انتہائی جوبن کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ اس خاص مقام کا تذکرہ "ارورل پول" (AuRORAL POLE) یا قطبِ شفقی کا نام دے کر کیا جا سکتا ہے۔

منطقۂ باردہ شمالی کے جن تمام مقامات پر یہ ردائے نور یا روشنی کی چھٹا زیادہ سے زیادہ جوبن دکھاتی ہے اُن کے بیچوں بیچ اگر ایک خط کھینچا جائے تو وہ نوواز یملیا کے تمام شمالی حصہ، شمالی راس، سائبیریا کی شمال مشرقی سرحد، خلیج ہڈسن، لبراڈر سے ہو کر گرین لینڈ اور آئس لینڈ کو ملاتا ہے۔ اس خط کے جنوب و شمال میں اس قسم کی روشنی کا ظہور بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا خط سے معلوم ہو گا کہ "ارورا" یعنی شفقِ قطبی امریکہ کے جس عرض بلد پر جیسی شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں اُسی عرض بلد پر ویسی قوت کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہاں تک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سپین کے جنوبی حصہ میں اوسطاً دس سال میں ایک بار، فرانس میں سال کے اندر پانچ دفعہ، لندن میں چھ بار۔ آئرلینڈ کے شمالی حصہ میں تیس دفعہ امریکہ کے صوبجات متحدہ کے شمالی حصہ میں سال بھر میں اوسطاً پچاس بار۔ کنیڈا میں ایک سال میں اسی بار۔ جزیرہ فیرو، سائبیریا کے شمالی ساحل سمندر، خلیج ہڈسن اور لبراڈر کے جنوبی خطہ میں سال کے اندر سو بار یہ "ارورا" ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خالی آنکھوں کے مشاہدہ سے شفقِ قطبی کے متعلق صرف مندرجہ بالا

اعداد ہی حاصل ہوسکے۔ مسٹر وی۔ایم شلفا کی فلکی مشاہدہ گاہ کے تجربات متعلقہ معرض الوان کی مدد سے اس قسم کی بے شمار اُرورا معلوم کی گئی ہیں جو کہ خالی آنکھوں سے عموماً ناقابلِ مشاہدہ رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خط استوا کے بلند تر مقامات پر اس طرح کی مبہم و مدہم ارورا ممکن طور پر ہمیشہ انسانی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں۔

شفق قطبی ہر جگہ ایک ہی انداز و درجۂ نور میں رونما نہیں ہوتی کبھی وہ مدھم، مضمحل اور پریشان کرنوں کی صورت اختیار کرکے اور کسی جگہ پھر منور انداز و شکل میں نہایت مجلا رنگینیوں کے ساتھ چاروں طرف ضوفشاں ہوتی ہے۔ کہیں وہ آسمان کے صرف ایک حصے کو منور کرتی ہے اور کہیں اس کی جھلک سی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس سارے قطعہ میں اُرورا کی روشنی ہلکی ہلکی چاندنی کی طرح ظاہر ہوتی ہے اور اس پر کہکشاں کا گمان ہوسکتا ہے۔ اس طور کی مدھم اُرورا کی روشنی کا ایک مدت تک غروبِ آفتاب یا طلوعِ آفتاب کی کرنوں کا پرتو سمجھا جانا کوئی عجیب بھول نہیں۔

منور اُرورا یا شفق قطبی کا طغرائے امتیاز خاص کر عوام کی نظروں کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ جھبردار بادل (CIRRUS) کی مانند نہایت لطیف، ماہتاب گوں بکھرے ہوئے روئی کے گالوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ حقیقتاً اس قسم کے بادلوں اور روشنی کے درمیان خطِ امتیاز قایم کرنا بہت عرصے تک مشکل رہا۔ ایک اور قسم کی اُرورا دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ مذکورہ بالا بادلوں کی مانند پنبہ گوں اور جھومردار نہیں ہوتی۔ بلکہ امڈے اور گھرے ہوئے بادلوں کی صورت میں گاہے گاہے ظہور میں آتی ہے۔ اس کی صوری یا ظاہری وطبعی حالت میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی رقبہ میں کمتر ہوکر ناگہاں اس کی نورانی چھٹا کچھ اس طرح چاروں طرف ضیاپاشی ہوتی ہے جیسے سرچ لائٹ کی شعاعیں آسمان سے ٹکرا کر نور برسا رہی ہوں۔

مذکورا بالا اُرورا کے علاوہ ایک اور نوعیت کی اُرورا بعض دفعہ مشاہدہ میں آتی ہے۔ یہ نہ صرف صوری اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے بلکہ چمک، تابش اور طرفہ رنگ آفرینیوں کے لحاظ سے بھی شفق قطبی سے مختلف واقع ہوتی ہے تمام عجیب منظر روشنیوں میں سے اس محراب آسا اُرورا یا شفق قطبی کی داستان نہایت دلچسپ ہے، اس کو بہت مدت تک کراؤن، یا ڈربیری، کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہ تمام اُرورل آرکس (AURORAL ARCS) اکثر کرہ نما یا کبھی بیضوی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اُرورل آرکس، یا محراب آسا شفق ہائے قطبی جن نورانی شعاعوں کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کا رنگ چمکدار ہوتا ہے اور وہ نچلے حصے سے خوب منور، اور بالائی حصے سے بتدریج مدھم و مضمحل سی ہوتی ہوئی آسمان کی گہرائیوں میں کھو جاتی ہیں۔ مختلف نورانی کرنوں سے مزین ایک یا ایک سے زیادہ ہم مرکز نیم دائرے بھی بیچ بیچ میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی آرکس کی روشنی ایک کرن سے دوسری کرن میں اس سرعت کے ساتھ منتقل ہوتی چلی جاتی ہے کہ اس سے رنگوں کا ایک تسلسل بندھ جاتا ہے۔ اس طرح کی اُرورل آرکس، کا صوری منظر برق رفتاری کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے کبھی وہ ایک دم اوپر اٹھتی ہیں اور کبھی نیچے اتر آتی ہیں کبھی ان کا کوئی خاص حصہ کامل طور پر غائب ہو جاتا ہے مگر دوسرے ہی لحہ میں وہ پھر دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ بھی مشاہدہ میں آچکا ہے کہ آرک کا بالائی حصہ قائم رہتا ہے اور نچلا حصہ اس کے گرد طواف کرتا ہے۔ وہ تمام کرنیں جن سے اس قسم کی آرک، یا پرکالہ نور معمور ہوتا ہے۔ عموماً ان کا طول زیادہ نہیں ہوتا۔ تب بھی وہ اچانک طویل سے طویل تر ہو کر اوپر کی طرف اٹھنے لگتی ہیں اور کبھی فرش زمین کے متوازی چلنا شروع کر دیتی ہیں کبھی تمام کرنیں ایک جگہ جمع ہو کر گول کمان کی سی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی ہر ایک کرن کسی ایک نقطہ پر آکر مل جاتی ہے۔ کرنوں کی یہ نقل و حرکت اور سریع الرفتار صوری منظری وطبعی تبدیلی شفق قطبی (ارورا) کی سب سے محیر العقل و قابلِ ذکر خصوصیت ہے جو زمانہ قدیم سے عوام کی نگاہیں اپنی طرف کھینچتی رہی ہے کبھی کبھی یہ نورانی کرنیں صوری طور پر غیر متغیر رہتے ہوئے بھی اوپر نیچے ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ کنیڈا میں اس قسم کی ارورا ماریونٹس (MARIONETTES) یعنی کٹھ پتلی کے نام سے مشہور ہے۔ جزائر شٹلینڈ میں بھی اسی نوعیت کی ناچنے والی نورانی کرنیں مشاہدہ میں آئی ہیں۔ "ارورا بوائیلس" یا شفق شمالی کے حیرت افزا نظاروں کی بدولت بے شمار عجیب وغریب داستانیں بھی زبان زد خلائق ہو چکی ہیں "آسمان پر بہشتی فوجیں جنگجو بر سرِ پیکار ہیں" وغیرہ ——، اس طرح کے بے شمار مافوق العادت افسانے انہیں مناظر سے حاصل کئے گئے ہیں۔

"کراؤن" نامی انوکھی شفق قطبی (ارورا) کا رنگیں منظر از بس حیرت افزا

ہوتا ہے۔ وہ اکثر قطب کے نزدیک واقع بلند عرض بلد پر دیکھی جاتی ہے شفق قطبی کی نورانی کرنیں جب کبھی ذکر کرہ زمین کے مقناطیسی مرکز (Magnetic Zenith) پر آکر ملتی ہیں تو ایک عدیم المثال منظر پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت یہ تمام نورانی کرنیں کبھی خیمہ کی شکل اور کبھی بالاکی صورت میں چمکدار رنگوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہیں۔ ڈریپری اروراکی نورانی کرنوں کا انبوہ زیادہ تر تابناک ہوتا ہے ایک رنگین اور باریک ریشمی کپڑا ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جس طرح لہراتا ہوا ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اس شفق قطبی کی ردائے تجلیات عجیب عجیب رنگوں کے ساتھ وجد آور مناظر کا باب کھولتی ہے۔

شفق قطبی کی کرنوں کا انبوہ جو زیادہ تابناک نہیں ہوتا وہ عموماً زردی مائل مہتابی رنگ اختیار کئے ہوتا ہے۔ ڈریپری کی قسم کی شفق قطبی کا نچلا حصہ منگنی رنگت کے ساتھ تجلی آمیز لال گلابی جھلک پانا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ زردی مائل مہتابی ہوتا ہوا بھی ذرا ذرا سرخ جھلک رکھتا ہے۔ جب تمام ارورا اسی طرح ایک منور پھریرے کی مانند لہراتی ہے تو ایک نہایت جاذب نظر و حیرت فزا جلوہ زار پیدا ہو جاتا ہے۔ کراؤن ارورا سے بھی اسی قسم کی سرخ و سبز رنگین دلفریبیاں رونما ہوتی ہیں۔ نورانی کرنوں کی روانی میں گاہے گاہے عجیب وقفے واقع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بوقلمونی و تلون خیزی بھی غضب کے سین پیش کرتی ہے۔ کرنوں کا کارواں نیچے اترتے وقت جس قدر تابناک رنگ اختیار کرتا ہے اوپر کی جانب مائل سفر ہوتے ہی آہستہ آہستہ اسی قدر مدھم سے مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔

شفق شمالی کی تابانی کا کماحقہ اندازہ لگانا یا درجۂ نور معلوم کرنا آسان نہیں تاہم یہ ایک امر واقع ہے کہ وہ ضیائے مہتاب کی طرح منور نہیں ہوتی یعنی اس کا درجہ نور مہتاب سے کم تر ہوتا ہے۔ شفق شمالی کی روشنی یا تابانی کے متعلق عمیق تحقیق و مشاہدہ کے بعد زمین کے شمال بعید علاقہ کے شاہدین و محققین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ گیس کی روشنی کو جو نسبت بجلی کی روشنی سے ہے وہی نسبت شفق شمالی کو چاندنی سے ہے تاہم شفق قطبی میں عجوبۂ روزگار مناظر پیش کرنے کے جو طبعی لوازم و خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسری روشنی کے حصہ میں نہیں آئے۔

شفق شمالی کی رنگین چھٹا یا الوانی مرقع کا محققانہ مشاہدہ کرکے معلوم کیا گیا ہے کہ اس میں کئی ایک چمکدار دھاریاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دھاری کی خصوصیت دلچسپی سے خالی نہیں۔ سر ولیم ریمزے کی معلوم کردہ کریپٹن نامی ایک لطیف شے (جو فضا میں پائی جاتی ہے) کی رنگین چھٹا میں جو دھاری نظر آتی ہے، شفق شمالی کے معرض الوان کی دھاری کی اس کے ساتھ بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک چمکدار دھاریاں اس کے معرض الوان میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کارش رقمطراز ہے کہ شفق شمالی جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت شیریں صدا بھی پیدا ہوتی ہے بعض اصحاب کی رائے ہے کہ یہ صدا ہوا میں لہراتے ہوئے ریشمی کپڑے کی آواز کی مانند ہوتی ہے۔ تاہم عام تماشائی کے کانوں میں اس قسم کی صدا نہیں آتی۔ شفق شمالی یا ارورا بوائیلس کی روشنی اتنی سرعت کے ساتھ ایک جگہ سے منتقل ہوتی چلی جاتی ہے کہ فرش زمین سے اس کی بلندی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک وسیع رقبے میں جو روشنی ظاہر ہوتی ہے اس کی بلندی زمین سے ساٹھ میل سے بھی زیادہ ہوگی۔ نارویجین جیو فزیکل کمیشن نے آج سے کچھ عرصہ پہلے ایک ہی وقت میں تین مختلف مقامات سے اس طرح کی شفق شمالی کی روشنی کا فوٹو لے کر معلوم کیا تھا کہ ایک ہی روشنی کے تین قطعوں کی بلندی بالترتیب ۸۳ و ۱۱۰ اور ۱۱۳ میل ہے۔ کہیں زمین سے تین سو میل سے بھی زیادہ بلندی پر شفق شمالی کا معرض تصدیق کیا گیا ہے۔ اس قسم کی بلند ارورا اکثر بار یورپ میں وایشیا کے بیشتر مقامات پر، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور نصف کرۂ جنوبی کے بہت سے مقامات پر ایک ساتھ رونما ہوتی ہیں۔ تاہم سطح سمندر کے برابر قطعہ زمین سے کئی سو گز کی بلندی پر اکثر اوقات بہت سی شفق ہائے شمالی ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی بادلوں کے زیریں حصے کو بھی منور کر دیتی ہیں۔ مختلف شفق ہائے شمالی کی بلندیوں میں اس طرح کا فرق دیکھ کر کئی اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں قدرتی مناظر ارورا نام سے منسوب ہونے پر بھی درحقیقت مختلف نوعیت کے ہیں۔ زمین سے زیادہ بلندی پر جو تمام ارورایا شفق ہائے قطبی ظہور پذیر ہوتی دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ زمین کی مقناطیسی کیفیت میں ایک تضاد و مغائرت یا انتشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ سویدائے آفتاب یعنی (Sun Spots) کے اوقاتی تغیر کے ساتھ بھی اس قسم کی بلندترین شفق ہائے قطبی کا تعلق رہتا ہے۔ سائنسدانوں نے دن کے مختلف اوقات میں شفق قطبی کے عجیب تغیر و تبدل و صوری انقلاب کا مشاہدہ

کیا ہے۔ اکثر صبح کے وقت اروراآرکس کا ظہور ہوتا ہے۔ دس بجے سے گیارہ بجے تک حیرت انگیز رنگوں کی ارورا دیکھنے میں آتی ہیں۔ دوپہر کی ڈیڑھ گھڑی میں سرچ لائٹ کی نوعیت کی نورانی چھٹا ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ برقی اسباب ہی اس قسم کی شفق قطبی کے جنم داتا ہیں، بجلی اور مقناطیس کے متعلق مختلف تجربات عمل میں لانے کے بعد سائنسدانوں کا مذکورہ بالا عقیدہ مضبوط ہوتا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی شفق قطبی کے ساتھ آب وہوا کی کیفیت کا بھی خاص تعلق دیکھا گیا ہے۔ غبار، کرہ ہوائی کا دباؤ، کہر، برف وغیرہ کے اثرات بھی اس قسم کی روشنی کے ظہور میں مشاہدہ کئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس سلسلے میں مکمل حقائق معلوم نہیں ہو سکے۔

شفق قطبی کی تخلیق کے اسباب اور اس کی طبعی کیفیات کے متعلق مختلف آرا، وعقائد قرار پا چکے ہیں تاہم برقی واقعات کے ساتھ اس کا جو خاص تعلق ہے اس سلسلے میں سائنسدان متفق الرائے ہیں۔ گیسلر ٹیوب میں لطیف کردہ ہوا میں برقی لہر دوڑانے سے دیکھا گیا ہے۔ کرۂ ارض کے قطبی دامن میں جس قسم کی ارورا یا شفق قطبی ظہور میں آتی ہیں ان سے بھی اسی طرح کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ الیکٹرک فیلڈ رسالف (Electric F) کے اچانک تبدیل ہونے سے اسی قسم کی رنگین دلفریبیاں یا الوانی تلون رونما ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ اس لئے سائنسدانوں نے برقی اسباب سے ہی شفق قطبی کا پیدا ہونا تسلیم کیا ہے۔

سویڈن کے مشہور سائنسدان 'آرہینس' فرماتے ہیں۔ آفتاب سے بڑی سرعت کے ساتھ الیکٹرن خارج ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی زمین کی جانب رواں ہوتی ہے زمین کی عالمگیر قوتِ مقناطیسی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس قسم کے عجیب وغریب مناظر رونما ہوتے ہیں۔ اسباب یا وجوہات کچھ بھی ہوں شفق شمالی واقعی ایک عجوبۂ روزگار ہے اور اقلیم فطرت کے رموز کی محیر العقول داستان کا ایک بابِ درخشاں کھولتی ہے۔

جگن ناتھ شرما

غزل

ابھی تک ہے دھبّہ جبینِ خودی پر
پشیماں ہوں میں سجدۂ بندگی پر
تجھی نے تو برباد مجھ کو کیا ہے
ارے رونے والے مری بے کسی پر
مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر
نمی اس میں اشکوں کی شامل ہے زاہد!
مجھے ناز ہے اپنی تردامنی پر
ابھی مجھ کو پینے کا ہے ہوش ساقی!
یہ اک داغ ہے دامنِ بے خودی پر

گوپال متل

بی اے

حسّیات

ظلمِ پیہم سے مدعا کیا ہے ۔۔۔ میرے دل میں ترے سوا کیا ہے

لطفِ بیداد ناروا کیا ہے ۔۔۔ مصرفِ جانِ بے وفا کیا ہے

قیدِ ہستی کا کچھ سبب نہ کھلا ۔۔۔ مجھ گناہ گار کی خطا کیا ہے

جبکہ تو خود ہے قادرِ مطلق ۔۔۔ میری ہستی سے مدعا کیا ہے

یہ فضائے بسیط کیسی ہے ۔۔۔ ماہ و پرویں ہیں کیا سہا کیا ہے

یہ سکوتِ شب اور یہ تارے ۔۔۔ یہ سحر گاہِ خوش نما کیا ہے

یہ گل و لالہ یہ ہوائے چمن ۔۔۔ یہ تمنائے جاں ربا کیا ہے

لطفِ نظّارہ جب میسر ہے ۔۔۔ یہ غمِ صبر آزما کیا ہے

زندگی جب کہ جاودانی ہے ۔۔۔ موت کیا چیز ہے فنا کیا ہے

اپنے عاشق سے یہ سلوک ہے کیوں ۔۔۔ یہ تماشائے کربلا کیا ہے

کب سے ہوں مائلِ غزل خوانی ۔۔۔ کون سمجھے کہ مدعا کیا ہے

اُن کی باتیں سنی نہ تھیں جب تک ۔۔۔ کس کو معلوم تھا خدا کیا ہے

تم سے ناکامیوں کی داد ملے ۔۔۔ اور عاشق کا مدعا کیا ہے

ہم نہ واعظ کو آج تک سمجھے ۔۔۔ راہزن ہے کہ رہنما کیا ہے

بات کیا بے خودی میں کہہ بیٹھے ۔۔۔ شہر میں ذکر جابجا کیا ہے

خلوتِ دل دکھا نظیرؔ اُنہیں
چاہِ کنعاں ہے کیا حرا کیا ہے

اصغر حسین خاں نظیرؔ

عیدِ فراق

یاد ایامے کہ تھا ہر رنج سے آزاد دل — بسکہ تھا نا محرمِ رسم و رہِ فریادِ دل
جبکہ تیرا حسن تھا اک بے خودی میرے لئے — عشق تھا سرمایۂ دارِ زندگی میرے لئے
رو کشِ فردوس تھا حسنِ شبابِ زندگی — مطربِ عشرت تھا ہر تارِ ربابِ زندگی
زندگی اب میری یکسر شیون و فریاد ہے — عشرت آبادِ تمنا ایک تیری یاد ہے
آہ لیکن یاد تیری بادۂ بے جوش ہے — دم بخود دل ہے زبانِ آرزو خاموش ہے
نالۂ حسرت فغانِ یاس اشکِ بے کسی — ایک وحشت خانۂ ماتم ہے میری عاشقی
داغِ مہجوری شرارِ دامنِ امید ہے — کیا یہی اے سوزِ الفت غمزدوں کی عید ہے
کونسا دل ہے نہیں جس میں خیالِ روئے دوست — کونسا سر ہے نہیں جس میں سرورِ بوئے دوست

"بشکند[۱] دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد"

اے کہ تیرے نور سے روشن تھی الفت کی جبیں — اے کہ ہے تیرے تصور سے مری دنیا حسیں
دیکھتا ہوں پھر شبِ ہجراں میں رنگِ خوابِ شوق — پھر ابھرنا چاہتا ہے جذبۂ بے تابِ شوق
آ کہ پھر صحرائے وحشت میں ہوں آوارہ گزر — آ کہ اب مجبورِ منزل ہے مرا ذوقِ سفر
جادۂ امید کا سنگ و نشاں ملتا نہیں — رہنما تائبؔ کو تجھ سا مہرباں ملتا نہیں
ہے کلی دل کی بہت بیتاب کھلنے کے لئے — اے گلِ باغِ محبت تجھ سے ملنے کے لئے
اٹھ رہا ہے سینۂ مضطر میں اے بیگانہ خو — ایک طوفانِ تمنا ایک حشرِ آرزو
ہو رہی ہے آج شمشیرِ محبت بے نیام — دے رہی ہے امتحانِ شوق کا مجھ کو پیام

عید[۲] قربانست می خواہم کہ قربانت شوم
مثلِ چشمِ گوسفندِ کشتہ حیرانت شوم

(ملک) مراتب علیخاں تائبؔ

۱؎ زیب النساء مخفی کی ایک مشہور غزل کا مطلع۔ ۲؎ سعید خاں دورِ مغلیہ کا ایک بدیہہ گو شاعر تھا۔ عید الضحیٰ کے روز دارا شکوہ نے ایک بکرا ذبح کیا اور اپنے ندیمِ خاص سعید خاں کی طرف دیکھنے لگا۔ سعید خاں نے برجستہ یہ شعر کہا۔

دنیائے ادب

زندہ اور فطری زبان

پہلی کسوٹی - اصولِ ارتقا

زبان کی تعریف: توضیح میں تحقیقات کرنے والوں نے مختلف جوابات پیش کئے ہیں مگر اس کی تعریف بھی شعر کی تعریف کی طرح رنگا رنگ ہوتی گئی ہے۔ کسی نے اسے منوز صنعت الٰہی کہا، کسی نے بلبل ہزار داستان کسی نے طوطی شکر شکن سے تشبیہ دی اور کسی نے اسے قدرت کے راز سربستہ کی کلید کہا۔ مگر اس کی جو تصریح مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنے قواعد اردو کے مقدمے میں کی ہے۔ وہ نہایت جامع اور بہتر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی زندہ اور فطری زبان کی تعریف اس سے زیادہ صاف شاید ہی ہو سکے۔ آپ کے تصریحی الفاظ یہ ہیں:-

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے۔ پتے نکلتے ہیں، شاخیں پھیلتی ہیں، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا درخت تناور بن جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔"

زندہ زبان کی یہ عام تعریف ہے اور اُس کے زندہ ہونے کی کسوٹی بھی۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ زندہ اور فطری زبان میں حسب ذیل خوبیوں یا خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) زبان کی ابتدا صرف و نحو و گریمر سے نہ ہوئی ہو۔

(۲) اس میں قانونِ ارتقا پایا جائے یعنی اپنے جنم سے لے کر آغاز شباب تک تیز رفتار ترقی۔ اور شباب میں کامل جلوہ نمائی ہو۔ پھر رفتار ترقی مستقل ہو جائے اور درخت تناور کی طرح پھل پھول پیدا کر کے اس کے فائدے سے دنیا کو فیض پہنچائے۔

(۳) ماحول کا اثر اس کے نشو و نما میں نمایاں ہو اور اس کا اثر ماحول پر بھی آگے چل کر ظاہر ہو جائے۔

(۴) جس طرح انسان کی کوشش درخت کے مزاج (پھول کی خوشبو اور پھل کے ذائقے) کو تبدیل نہیں کر سکتی، اسی طرح ایک زندہ زبان بھی مسخ نہیں ہو سکتی۔ غیر فطری رجحانات سے وہ بگڑے گی مگر پھر وہ قدرتی رجحانات کی بدولت سنور جائے گی۔

یہی سبب ہے کہ ہر ملک و قوم کی ایک زندہ زبان ہے جو اس کی تہذیب اور تمدن کی ترجمان ہے۔

ہندوستان کی زبان بھی ان تمام درجوں سے گزرتی ہوئی موجودہ صورت کو پہنچی ہے۔ فطری اور غیر فطری رجحانوں نے اُسے اکثر بنایا اور بگاڑا۔ مگر آخر میں بازی فطرت اور قدرت ہی کے ہاتھ رہی اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ مصنوعی تحریکیں وقتی ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے ہی دن چل کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں یا دب جاتی ہیں۔ زبانِ ہند کی تاریخ میں یہ حقیقت بار بار ملتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان جنت نشان کی زبان دیو بانی (زبانِ الٰہی) ویدک تھی۔ اسے ہم زبانِ ہند کا بیج یا چشمۂ زبان کا منبع کہہ سکتے ہیں۔ دانے کا پھوٹنا اور چشمے کا آگے بڑھنا لازمی تھا۔ قانونِ ارتقا کے خلاف پوری طاقت صرف کی گئی کہ زبانِ الٰہی کی شکل نہ بدلے۔ کونپل نہ پھوٹنے پائے ورنہ بڑا غضب ہوگا۔ زبان مسخ ہو کر ناپاک ہو جائے گی۔ مگر برفستان میں جس طرح تخم اپنے تحت خفتہ پر خشک آنسو روتا ہے۔ وہی حال ویدک زبان کا رہا اور وہ برہمنوں کے سینوں میں مدفون یا محفوظ رہی۔ مگر یہ کب تک۔ آخر شمس ارتقا کی کرنیں پہنچ گئیں۔ دانے پھوٹ نکلے۔ آن کی آن میں اُس کی دوسری شکل تھی۔ گویا زبان ویدک نے جون بدلی۔ اس جنم میں اس نے نیا نام پایا۔ ویدک پراکرت، کے نام سے وہ

پکار رہی تھی۔ اس پراکرت کو اگر مجسم شکل تصور کیا جائے تو پالی کو رجو گوتم بدھ۔ بودھ مذہب اور اس عہد کے حالات کی آئینہ دار ہے) اس کا دست راست سمجھنا چاہیئے

اس زبان کو پراکرت کی اور شاخوں کے مقابلے میں زیادہ فروغ ہوا۔ بدھ مذہب کے وسیلے سے اس کے پڑھنے اور جاننے والے کم و بیش شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں میں پائے جانے لگے۔ دوسری پراکرتیں۔ ماگدھی، شورسینی، مراٹھی پنجابی، اودھی، بندیل کھنڈی، بھوج پوری، مقامی حیثیت رکھتی تھیں۔ نہ تو ان کا تعلق ہندوستان کے ہمہ گیر مذہب بدھ سے تھا اور نہ اس جیسی سرپرستی نصیب ہوئی۔ مگر باوجود مذہبی توسط اور بدھ حکمرانوں کے دستگیری و حمایت کے یہ زبان ہندوستان کے لئے زبان عام نہ بن سکی، کیونکہ وہ ایک محدود خطہ کی زبان تھی بدھ مذہب کے زوال کے بعد گپتا خاندان کے عہدِ حکومت میں برہمنوں کو اپنا قدیم مذہب زندہ کرنے کا اچھا موقع ملا۔ انہوں نے قدامت پسندی کی نظر سے جو زبان کی طرف دیکھا تو چونک پڑے۔ یہ زبان کہاں سے کہاں جا پہنچی! چنانچہ قواعد کی زنجیروں سے باندھ کر خوب کاٹ چھانٹ تراش خراش کرکے ایک نئی زبان وضع کی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ زبان کہاں تک فطری ہو سکتی ہے۔ اس کا نام سنسکرت (آراستہ کیا گیا) رکھا گیا۔ کیونکہ ویدک پراکرت کی چھینٹ چھانٹی اور قدیم ویدک کے تو لب پر ڈھالی ہوئی زبان تھی۔ اس زبان میں اعلیٰ پائے کی مہا تصنیفیں وکرم کے درباری شاعروں کے زورِ قلم سے وجود میں آئیں۔ فصاحت اور بلاغت، صنائع و بدائع غرض جہاں تک انسانی کوشش کو دخل ہے اس سے زبان کو موقر اور قابل قدر بنایا گیا۔ شکنتلا کا دمبری، میگھ دوت دنیائے ادب کے خزانوں کے چمکتے ہوئے رتن ہیں اور نظر انصاف ان کی ادبی شان کو ہمیشہ ہمیشہ سراہتی رہے گی۔ مگر جہاں تک زبان کا مسئلہ ہے وہ اس عیب سے پاک نہیں کہ وہ عوام کی تشنگی کو دور نہ کر سکتی تھی۔ عام فہمی سنسکرت میں نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ بول چال کی زبان تھی ہی نہیں۔ یہ محض تصنیفی زبان تھی اور عالموں اور درباریوں کے لئے محدود تھی۔ عورتوں اور بچوں کے لئے اور ان پڑھ طبقے میں یہ زبان مروج نہیں ہوئی اسی لئے کالیداس اپنے ناٹکوں میں عورتوں اور بچوں کا کردار جہاں پیش کرتا ہے۔ پراکرت زبان استعمال کرتا ہے

ملک کی فطری زبان ایک قدرتی چشمے کی طرح آگے بڑھ رہی تھی جس میں ادھر اُدھر سے نالے ندیاں آکر مل رہی تھیں۔ غرض کنار و ساحل سبزہ و گیاہ کو سیراب کرتا ہوا یہ چشمہ ہر ایک کے اجزا اپنے اندر شامل کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اب چشمے نے دریا کا نام پایا یعنی زبانِ ہند نے تیسری جون بدلی۔ اس جنم میں زبانِ ہند کا نام "اپ بھرنش" تھا۔ بار بار کی تبدیلیوں سے قدامت پسندی کی جہات خود بخود ماند اور مدھم پڑنے لگے۔ یہ اپ بھرنش زبان مکان کی تبدیلیوں سے مختلف لباسوں میں نظر آئی۔ ملک کا مرکزی حصہ جس طرح تمدن و آئین و تہذیب و شائستگی میں بڑھا ہوا تھا، اسی طرح وہاں کی اپ بھرنش بھی دوسری اپ بھرنشوں کے مقابلے میں زیادہ صاف تھی (۱) مرکزِ ملک (میرٹھ اور نواح دہلی) (۲) اور برج کے علاقے میں زبان کا رنگ وغیرہ دیدہ زیب تھا۔ دیکھنے والوں نے جو انتخابی نظر ڈالی تو یہ بولیاں کچھ دل کو ایسی بھاگئیں کہ اس کی قسمت کا ستارہ گویا طلوع ہوگیا۔ یہ دیکھنے والے مسلمان تھے جنہوں نے فاتحانہ حیثیت سے ملک پر عمل دخل کیا۔ اور اپنا مرکز بھی اسی حلقے میں رکھا۔

مسلمانوں کا اردو زبان ہند پر ماحول کا سب سے زیادہ اور نمایاں اثر تھا حکومت مرکزی کے انتظام نے دور و نزدیک کو سمیٹ کر ایک کر دیا، دہلی اور آگرہ کی بولیاں گنگا جمنی شان سے مل گئیں۔ جس کے نمونے خسرو کی پہیلیوں اور مکرنیوں میں ملتے ہیں۔ جوہر شناس اور قدرداں مسلم حکمرانوں نے اس جنس لطیف کی قدر کی۔ دور بین خسرو کی دوربینی کو انہوں نے اپنی تائید سے دوسروں کے لئے راستہ کھول دیا۔ حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے انہوں نے تمیز کے لئے اس نئی صورت کو پہنچی ہوئی زبان کا نام ہندی رکھا اور وہ موقر بنا کر ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کی صفت نسبتی سے مخصوص کرتے تھے۔ مثلاً تیغ ہندی، تال ہندی بزم ہندی . . . وغیرہ انشاء نے بھی اس زبان کو ہندی ہی لکھا ہے۔

مسلمانوں کا عہدِ حکومت بھی بہت وسیع تھا۔ تغیر و تبدل تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں ہی کے عہدِ حکومت میں منجملہ دیگر معاشرتی تبدیلیوں کے زبان کی شان بھی بہت کچھ بدلتی اور بنتی گئی۔ عہدِ اکبر میں ہند کی حدیں وسیع ہوئیں، دکن، دہلی و آگرہ سے وابستہ ہوگیا۔ یہ زبان شاہانِ دکن کے درباروں میں بھی جا پہنچی وہاں ہندی کا نام مقامی نسبت سے دکنی ہوگیا۔ ملک الشعراء نصرتی سے لے کر ولی کے زمانے تک دکن میں رہی۔ اور شمالی ہند تو اس کا جنم بھوم ہی تھا۔ دوسری طرف وہ تمدنی سلسلے سے ہاتھ پیر نکالنے لگی اور گجرات جا پہنچی۔ یہاں کے لوگوں نے اسے گجراتی کہہ کر اپنایا۔ نرسی مہتا گجراتی زبان کا شاعر ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ یہاں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شمالی ہند میں دکنی اور میرٹھ کے نواح کی زبان کی مثالیں تو ہر خاص و عام کو ولی اور خسرو کے ناموں سے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ مگر اردو کی گجراتی شکل سے ابھی کم لوگ روشناس ہیں:

ہر دم کرشن کہے تو کرشن ہے تو زباں میری
یہی مطلب خاطر کرتا ہوں خوشامد میں تیری

وہی اور وہ دشکر روز کھلاتا ہوں تجھے
تو بھی ہر روز نہ ہر نام سنا دے مجھے
کھوئی زندگانی ساری ہوئی گناہ معاف تیرا
دیامت بھولے پربھو آخر وقت میرا

(ماخوذ از کبتا کومدی — مجموعہ کا مصنف پنڈت رام نریش ترپاٹھی)

لفظوں کی ترکیبیں اور خود الفاظ اردو روزمرہ کے نمونے پر لائے گئے ہیں ۔

اسی طرح پنجابی میں اسی مرکزی زبان کی شان جھلکتی ہے جو مختلف تغیرات کے بعد آج اردو کہلا رہی ہے ۔ غرض اردو کی اصل صورت نواح دہلی سے اٹھ کر ہندوستان کے جنوبی حصے (دکن) کی زبان پر اور بہمراہ ولی گجرات پہنچنے سے گجراتی پر اپنا نقش ڈال چکی ہے۔ نیز خود اس کے اندر دکنی و گجراتی و پنجابی عنصر بھی شامل ہو چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب عہد محمد شاہ میں شمالی ہند کے نواسیوں نے پھر دہلی کا رُخ کیا اور ان میں ولی بھی تھے تو ان کی زبان اور دہلی کی زبان میں بڑا فرق نظر آیا۔ مرکزی زبان جن ایام میں جنوبی ہند اور مضافات دہلی کا طواف کر رہی تھی، شمالی ہند کے پایہ تخت دہلی میں وہ رُکی نہ بیٹھی تھی۔ قلعہ شاہجہاں آباد نے اس کا پرانا نام ہندی بھلا دیا تھا اور وہ زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہلاتی تھی۔ یہ نام لشکر سے تعلق اور لشکری خلط ملط سے پیدا ہوا تھا اور اب اس میں عام فہمی کی صفت اور بھی ترقی کر چکی تھی۔ چنانچہ ولی نے اپنے دیوان پر نظر ثانی کی۔ جن اشعار میں دکنی کے الفاظ تھے اُن کو دیوان سے خارج کر کے ایک دوسرا دیوان ترتیب دیا۔ اس میں دکنی کے اسی قدر الفاظ تھے جو دہلی کی ترقی یافتہ زبان میں بے جوڑ نہ تھے۔ اس طرح ولی کی خدمت زبان کے سدھارنے اور سنوارنے میں کس قدر قابل قدر رہے۔ اس طور پر اب ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جس کے سمجھنے والے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ لوگ تھے اور اس کے مقابل دوسری زبانیں مقامی حیثیت سے بڑھتی اور ترقی کرتی رہیں۔ مسلمان فرمانرواؤں نے اس وقت کی مقامی زبانوں کے لئے پوری سرپرستی کی کیونکہ اردو نہ تو حکمران قوم کی زبان تھی اور نہ محض مسلمانوں کی۔ اس کے بولنے لکھنے اور پڑھنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ چنانچہ قدما کے تلامذہ کی فہرست میں دیکھئے کہ کس قدر ہندو ہیں ۔

اس وقت غریب اردو کا دامن علمی جواہرات سے خالی تھا۔ بس لے دے کر اس کی جھولی میں یا تو غزلوں کے دیوان تھے یا قصہ کہانیاں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں کی تجارت سارے ہندوستان کا احاطہ کرنے لگی تو انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں نووارد انگریز گماشتوں کی تعلیم کی غرض سے اردو کو نصاب میں داخل کر دیا۔ ایسا کرنے میں انہیں یہ سہولت تھی کہ ملک کے ہر ایک حصہ کی مقامی بولی سیکھنے کے بجائے ایک عام ہندوستانی زبان مل گئی۔ اس لئے انہوں نے اسی کو سیکھا۔ اب اردو کی خوبیوں کو آشکارا ہونے کا یہ اچھا موقع آیا۔ غرض کالج نے باشندگان ہند سے ہندوستانی شکل میں اردو کا تعارف کرایا اور یہ ایسے ہی تسلیم ہوا جیسے ایک مسلمہ صداقت کی دوبارہ تائید ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے باشندوں کی تو یہ زبان ہی ٹھہری غیر ملکیوں نے بھی اسے ہندوستانی سمجھ کر سیکھا۔ کالج کے لئے درسی کتابوں کی جو ہندوستانی زبان (اردو) میں ہوں ضرورت تھی اور تلاش کرنے سے دو ایک سے زیادہ نہ مل سکیں تو کالج کے پرنسپل مسٹر جان گلکرسٹ نے اردو دانوں کو تلاش کیا۔ ملک کے ہر حصے سے اچھے منشی و انشا پرداز کلکتہ میں جمع ہونے لگے۔ میر امن دہلوی۔ بہادر علی حسینی۔ کاظم علی جوان۔ شیر علی افسوس۔ منشی سدا سکھ و بینی نرائن، پنڈت للو لال جی نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ ان تمام مصنفین اور مولفین کے لئے ایک عام ہدایت تھی ۔ وہ یہ کہ عبارت صاف ہو اور دقت آفرینی اور لفظی شکوہ سے احتراز و پرہیز کیا جائے تکلف پسند مصنفین کو سخت دقتیں پیش آئیں مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ چار و ناچار طبیعتوں کو سادگی پر مجبور کیا اور سادہ نگاری کی مثالیں بہت سی نظر آنے لگیں۔ اس عہد کی بعض کتابیں سادہ نگاری سے کوسوں دور ہیں۔ مثلاً پنڈت للو جی لال کی تصنیف پریم ساگر اور خرد افروز دانش، اور اس کے مقابلہ میں منشی سدا سکھ اور میر امن کی تحریروں پر موجودہ عہد کی سادہ نویسی بھی قربان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مسٹر جان گلکرسٹ کو سیرِ تصنیف و تالیف کے جانچ پڑتال کا زیادہ موقع نہ تھا یا یہ حضرات بالطبع پیچیدہ لکھنے اور مسجع نویسی کے عادی ہو چکے تھے۔ اور باوجود کوشش راہ راست یا حد مقررہ تک نہ پہنچ سکے ۔

یہاں تک زبان کے تعمیری پہلو کو آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا مگر تعمیر کے پیچھے پیچھے تخریب کا ڈنڈا بھی چلتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس معاملے میں اور بھی زرخیز ہے۔ یہاں تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب فوراً جلوہ گر ہوتی ہے۔ کانگرس کے جواب میں اینٹی کانگرس، اسکاؤٹنگ کے جواب میں اینٹی اسکاؤٹنگ نمودار ہو چکی ہے چنانچہ ملک کی فطری زبان کے مقابلے میں اسی وقت ایک غیر فطری اور مصنوعی زبان بھی ظہور میں آئی ۔ جب فورٹ ولیم کالج میں اردو دانوں کی قدر ہوئی تو تنگ نظری نے حسد کی آگ کو بھڑکایا اور جس ذہنیت نے ہندوستان کو صدیوں غلام رکھا تھا۔ وہ ایک نیا روپ بھر کر نمایاں ہوئی۔ اردو کے مقابل ایک زبان وضع کی گئی اور

چُن چُن کر مروج فارسی و عربی الفاظ کے بدلے سنسکرت کے غیر مروج الفاظ رکھے گئے اور ذرا بھی نہ سوچا گیا کہ ایک مشترکہ زبان جو ہندو مسلم کی متفقہ کوششوں کا اثر، اتحاد و یک جہتی کی جان اور قومیت و وطنیت کی شان ہے۔ اُس کے گلے پر چھری پھر رہی ہے۔ آزادیٔ ہند کا دشمن درحقیقت اس سے بڑا کوئی نہیں جس نے زبان میں تفریق و تمیز کی۔ ہندی کی پیدائش اس طرح اردو کے مقابل میں ہوئی یہ زبان پہلے بھاشا کہلائی پھر ناگری اور آخر میں ہندی سے موسوم و معروف کی گئی۔ اس لئے اس جذبۂ رشک اور تنگ نظری کے ساتھ ہندی کی تاریخ پیدائش انیسویں صدی کا آغاز ہے۔ فورٹ ولیم کے مصنفین میں سے اکثر اس جذبہ کے شکار تھے۔ ورنہ زبان میں اس قدر چوڑی خلیج حائل نہ ہوتی۔

اس وقت سے اردو ہندی (قدیم ہندی سے میری مراد نہیں ہے وہ تو اردو ہی کا ابتدائی نام تھا) دونوں پر نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اب تک غیر فطری رجحانوں کی کوئی سوسائٹی یا انجمن نہ تھی۔ مروجہ زبان کے خلاف چیخ پکار ہوئی اور پھر اکثریت جب صداقت پر مائل ہوئی تو پرانی لکیر چھوٹ گئی۔ مگر اب حالات کچھ بدل چکے تھے۔ ملک میں ہندی اور اردو کی بحث اس وقت اور زور پکڑ گئی۔ جب انگریز رپورٹروں اور تحقیقاتی کمیشنوں نے فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان بنانے اور ذریعۂ تعلیم تسلیم کرانے کی سفارشیں کیں اردو جب عدالتوں میں اور مدرسوں میں رائج ہو گئی تھی تنگ نظروں کو یہ کھٹکنے لگا۔ عاشق ناشاد کی طرح اپنے ہی گریبانوں پر رشک کرنے لگے۔

اردو یا ہندوستانی کی بنیاد زبانِ عوام پر تھی اس لئے اس کے سمجھنے والے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملکی کی فطری رجحانِ طبع نے تین تحریکیں نمایاں کیں جن سے اردو فرش سے عرش پر جا پہنچی ان تحریکوں میں فرقہ وارانہ تعصب کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے۔ پہلی تحریک جو فورٹ ولیم کالج کے بعد پیدا ہوئی وہ دہلی کالج سے وابستہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں وسیع پیمانے پر کھولا گیا تھا اس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے جاتے تھے اور اس کی تعلیم بھی ترجمے کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ کالج نے بڑا کام کیا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر بتروس اور اسپرنگر اور ان کے لایق پروفیسروں رام چندر اور پیارے لال، مولوی ذکاء اللہ مولانا محمد حسین آزاد کی بدولت اردو علمی زبان بن گئی۔ ہندی کو اس کالج میں رواداری نہ جگہ ملی اور ہر فارسی عربی پڑھنے والے طالب علم کا ہندی سیکھنا و نیز سنسکرت لینے والے طالب علم کا اردو سیکھنا ضروری تھا جس سے ہندی سے کالج کا ایک طالب علم بھی بیگانہ نہ تھا۔ یہ کالج موجودہ تعلیمی مسائل کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہوتا افسوس کہ زمانے نے اس کو حرف غلط کی طرح مٹانا چاہا۔ مگر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کی یاد تازہ کر دی ہے اور انہیں مقبول عام اصولوں پر سب کے لئے یکساں مفید ثابت ہو رہی ہے۔ اس کالج کی برکتیں ہندوستان کو کیا کیا نصیب ہوئیں پوری پوری جب معلوم ہوں گی۔ جب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ کی پوری تصنیف "مرحوم دہلی کالج" کا مطالعہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہندی کے حامیوں نے کیا کیا، اس کی پوری تفصیل اس مضمون سے ہوتی ہے جو ہندی شبد ساگر کے خاص رکن پنڈت رام چندر شکل نے دیباچے میں ہندی ادب کی تاریخ کے عنوان سے لکھا ہے اور جواب علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ہندی گد رشہ کے بکاس (نشوونما) کے سلسلے میں آپ نے ان تمام کوششوں کو سراہا ہے جن کی بدولت ہندی کو اردو کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ حکومت کے سامنے کتنے دفد، کتنے ڈپوٹیشن ناکام رہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ حکومت ہند ہندی کو زبان کا مرتبہ اس لئے نہ دیتی تھی کہ نہ تو وہ عہد حاضر کی زبان تھی۔ اور نہ قرون وسطیٰ ہی میں کبھی بولی جاتی تھی۔ سر چارلس وڈ اور سر چارلس ٹریولین، جنہوں نے سارے ہندوستان کے دیہات اور قصبوں اور شہروں کا دورہ کیا تھا۔ اپنی سرکاری رپورٹوں میں ہندی کو دہقانی بولی اور اردو دکنی یا ریختہ کو ہندوستانی زبان تسلیم کیا تھا۔ ہندی کے ہنگاموں میں شورش اور جذبات دیکھ کر گورنمنٹ نے اُسے اکثر صوبوں میں جگہ دے دی۔ محکمۂ تعلیم کے افسروں اور ڈائرکٹروں نے گورنمنٹ کی اس غلطی کو آشکارا کرنے میں کوئی سنکوچ نہ کیا۔ انہوں نے اپنی سالانہ رپورٹوں اور پرائیویٹ چٹھیوں میں اس پر تاسف کیا۔ مسٹر ہارول ڈائرکٹر صوبہ مغربی و شمالی۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر صوبہ پنجاب، مسٹر کمسن نے اردو کے مقابل ہندی کی ترویج و اشاعت سے نہ صرف اختلاف رائے کا اظہار کیا بلکہ زبان کی اس تفریق سے انہیں کافی صدمہ پہنچا۔ ان مستند شہادتوں کو میں نے ایک دوسری جگہ "مستند شہادتیں" کے عنوان سے جمع کیا ہے۔ یہاں صرف مسٹر ہارول کا خط نقل کرتا ہوں جو انھوں نے موسیو گارساں ڈی تاسے محقق مشرقی زبان کی خدمت میں لکھا تھا:-

"آپ نے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے میں اس سے
بالکل متفق ہوں۔ اردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے۔
اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں میں نے ہر ممکن موقع پر
اردو کی توسیع و ترقی کی حمایت کی ہے اس لئے کہ میں سمجھتا
ہوں کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قومی
زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سے میری مراد اردو زبان ہے
جو خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے۔ اس بارے میں مسٹر مکسن
جو صوبہ مغربی و شمالی کے سررشتہ تعلیم میں سب سے اعلیٰ عہدے پر
ہیں۔ بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں لیکن بدقسمتی سے
ابتدائی مدارس میں یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ اردو یا ہندی میں
سے کسی ایک کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ اکثریت
ہندو طلبا کی ہے اس لئے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے
مسلمان اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو
کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اردو ہندی کی تفریق
قومی نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہے یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر
ہندو بچوں کو اردو سکھائی جاتی۔ بجائے اس کے کہ انہیں اس
بولی میں اظہارِ خیال کی مشق کرائیں جو بالآخر ایک دن اردو کے آگے
سر تسلیم خم کرے گی۔"

(از خطبات گارساں۔ دی تاسی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔
اورنگ آباد دکن)

ہندی کے حامیوں میں اس وقت ایسی ہستیاں کم یاب تھیں جن کی
نگاہ ہندو مسلم آمیز ہندوستانی کلچر پر ہو۔ تنگ نظری نے ان کا مقصد زمانہ
قدیم کی تہذیب کا احیا رکھا۔ اس لئے مروجہ زبان ان کی نظروں میں قابلِ قدر
نہ تھی۔ انہوں نے اس کا روپ تو عہد فورٹ ولیم ہی میں بدلا تھا۔ اب اس کا
ادب بھی ہندوستانی کہہ کر ہندوانی بنا دیا گیا اور ہندی کا ناتا دھرم سے جوڑ کر
علانیہ اس خیال کی اشاعت کرنے لگے۔ اس وقت اس جماعت کا یہ عام مسلک
تھا کہ ہندی نہیں جانتے اُسے ہندو نہیں مانتے۔ معقول پسندوں اور معتدل
راہ اختیار کرنے والوں کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، اس
تحریک سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ خاموش اپنا کام کر رہے تھے۔ رواداری اُن
کا مسلک تھا۔ یہ قضیہ ہندی و اردو لکھتے لکھتے میں اپنے ضمیر کو پراگندہ اور
غیر مطمئن پاتا ہوں مگر حیرت ان لوگوں پر ہے جو اردو کو ہندی کا رجس کی بنا ہی

ہندو نوازی پر پڑی) جواب اور مسلمانی زبان کہہ کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ "ہندی
لٹریچر" مصنفہ ایف اے کے۔ سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

"جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شمالی ہند میں ہندی کی بہت سی
بولیاں بولی جاتی تھیں مگر ان لوگوں میں جو فارسی نہیں جانتے
تھے شستہ گفتگو کا ذریعہ اردو تھا اردو میں بہت سے الفاظ
فارسی عربی سے مستعار لئے گئے تھے جن کا تعلق اسلام سے
تھا اس لئے ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ادبی زبان
کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو۔ اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو لے کر ایک زبان بنائی گئی اور اس میں سے
عربی فارسی کے الفاظ خارج کر کے ان کی بجائے سنسکرت
یا ہندی الاصل الفاظ داخل کئے گئے۔"

راجہ شیو پرشاد صاحب چونکہ محکمہ تعلیم میں ایک عرصے تک رہے۔
انہیں ہندی کے تصنع اور بناوٹ کا کچھ تو بذاتِ خود اندازہ ہوا۔ دوسرے چونکہ
وہ ڈپٹی انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے تعلیمی رپورٹوں اور تجویزوں سے زیادہ باخبر
تھے۔ انہوں نے ہندی میں فارسی عربی لفظوں کو اس قدر جگہ دی کہ سوائے
رسم الخط کے اُن کی تحریریں اور اُس عہد کی اردو اسلوب بیان و ترکیب الفاظ
میں مطلق فرق نہیں معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح ہندی اپنی راہ بھول کر اردو
سے جا ملی۔ مگر راجہ لکشمن سنگھ اور ہریش چندر نے سخت نکتہ چینی کی اور "شدھ ہندی"
یعنی سنسکرت آمیز ہندی کے نمونے بکثرت دے کر ہندی کو اردو سے
بہت دور کر دیا۔

اس عرصے میں اردو ایک رفتار سے برابر آگے بڑھتی رہی۔ یہاں
تک کہ سائنٹفک سوسائٹی ملکی، تمدنی اور خاص کر اقتصادی انجمنوں کو لے کر
وجود میں آئی اور بعد کو علم و اخلاق بھی اس کا اعلیٰ مقصد ہو گیا اس سوسائٹی
کے بانی مبانی سر سید مرحوم تھے جن کی اعتدال پسندی، رواداری اور بے
لاگ کوششوں سے ہندو، مسلمان، عیسائی اُن کے رفیق کار بنے۔ اس
دوسری تحریک نے علم و ادب اور سیاست و اخلاق ہر موضوع پر اپنی
توجہ صرف کی جس کی بدولت اردو علمی حیثیت سے آگے نکل کر سیاست کے
لئے ایک عمدہ زبان بن گئی۔ ہندوستان کے ادب کا رنگ بدلا۔
وسعت پیدا ہوئی اور ایک خاص لیک پر چلنے کی عادت بھی کم ہوئی۔
سوسائٹی کے رسالے تہذیب الاخلاق کا اثر نہ صرف اس سوسائٹی کے
ممبروں پر پڑا بلکہ دوسرے اخبارات اور رسالوں نے بھی وہی راستہ اختیار

کیا رسالوں عام مذاق کی حیثیت سے اس وقت کے ادب میں مسلم ہوئی اور مغربی علوم سے جو وحشت ہمارے سماج کو تھی قدرے کم ہوئی۔ اس طرح سائنٹفک سوسائٹی نے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ اس زبان کے بولنے والے ہندو مسلمانوں میں روشن خیالی، آزادی رائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھنے اور اُسے قبول کرنے کے رجحانات پیدا کئے۔

تیسری تحریک اورنٹیل کالج لاہور سے متعلق ہے اس کالج کا مقصد محض تعلیم و تعلم نہ تھا۔ اس نے ایک صیغۂ تصنیف و تالیف بھی قایم کیا تھا۔ اس کی ابتدا سائنٹفک سوسائٹی کی طرح ایک ایسی انجمن سے ہوئی تھی جو علمی و تاریخی معلومات کو عام کرنا چاہتی تھی۔ اسی کی کوششوں سے یہ کالج قایم ہوا تھا۔ آگے چل کر انجمن کے مقاصد کالج نے اپنے سر لے لئے سائنٹفک سوسائٹی کی طرح اس کے دائرہ عمل میں وسعت و ترقی تو نہ ہوئی مگر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں عربی و فارسی و انگریزی کے ترجموں سے اردو کو بڑھایا ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہمدوش ہوگئی۔ اب وہ موجودہ صورت میں برابر بڑھتی ہوئی بہت آگے نکل چکی ہے۔

اردو کی ترقی اہل ملک کے لئے اسی طرح یکساں مفید تھی، جیسے سورج کی روشنی، ہوا اور پانی مگر جو بیج انیسویں صدی میں بویا گیا تھا۔ اس کی بھی ایک محدود حلقے میں پرورش ہو رہی تھی۔ اردو کی ترقیاں اس جماعت کو کھٹکتی رہیں ناگری پرچار کی ناٹک منڈلیاں، ناگری پرچار کی سبھائیں قایم ہوئیں۔ زور شور سے ہندی پرچار کے لئے اردو کی تخریب شروع ہوگئی۔ کسی نے کہا کچہریوں میں ہندی کو جگہ دلانے سے اس کی ترقی ہوگی۔ کسی نے کہا اردو جب تک رہے گی۔ یہ پنپ نہیں سکتی۔ کسی نے کہا بڑا غضب ہے کہ اردو تو ایسا ریڑھ مار رہی ہے کہ جس کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک صاحب نے تو تقریباً ۴۰ صفحوں کی ایک کتاب لکھی اور رسم الخط پر آ ٹوٹے۔ مثلاً

ریل، ریل اردو میں ایک
ایک بات ہے ٹھیک اور ٹھیک

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس عیب جوئی کو بُرا سمجھا اور ہندی کی سچی خدمت انہیں اردو والوں کی تقلید میں نظر آئی۔ پنڈت مہابیر پرشاد دیدی نے خواجہ الطاف حسین حالی و مولانا نذیر احمد صاحب کی کوششوں کی طرف ہندی کے طرف داروں کو توجہ دلائی اور مقدمہ شعر و شاعری اور آب حیات سے استفادہ کرنے کے لئے ہندی کے والنٹیروں سے اپیل کی اور اپنی تصنیف "رسگیہ رنجن" میں مقدمہ شعر و شاعری کے اکثر حصے ترجمہ کرکے پیش کئے زبان کو عام فہم بنانے کے خیال سے فارسی و عربی سے فیض حاصل کرنے لگے مگر بنیادی مقصد جو بھولتا نظر آیا تو پھر شدھ ہندی نویسی پر مائل ہوگئے اور کہیں اوسط راہ اختیار کی۔ اس طرح اس عہد کی ہندی تحریریں تین قسموں میں رکھی جا سکتی ہیں ہندی سدھار کا مجاہد اعظم یعنی مہابیر پرشاد دیویدی بھی اپنی ہندی تحریر کو اس تقسیم سے نہ بچا سکا یعنی یک رنگی کے بجائے ان کی ہندی بھی ترنگی نظر آنے لگی۔

پہلا رنگ:۔ جس میں ہندی الاصل الفاظ ہوں (مطابق پروگرام) اس کا نام شدھ ہندی رکھا گیا۔

دوسرا رنگ:۔ وہ ہندی جس پر اردو کا سایہ ہے۔ اس کا نام ہوا لشرت ہندی۔

تیسرا رنگ:۔ وہ ہندی جو باوجود کوشش اور طبیعت پر زور ڈالنے کے بھی صاف نہ ہوئی۔ اور اردو سے مشابہ ہے۔

ہندی کو خالص ہندی الاصل بنانے کی کوشش شروع ہی سے ہندی دانوں کے طبقہ میں معرض بحث میں پڑ گئی تھی۔ فارسی عربی لفظوں کا استعمال بول چال میں ہونا ہی تھا۔ قلم اٹھاتے وقت بھی وہ فوراً آ حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے پنڈت بھیم سین نے اس سے بہت پیشتر یہ تجویز پیش کی کہ ایسے لفظوں کو اب ہم لوگ سنسکرت کے ڈھانچے پر ڈھال سکتے ہیں۔ مروّج فارسی و عربی لفظوں کی ایک لمبی فہرست مع اُس کے بدل الفاظ کے پیش کی۔ یہ جدت ہندی والوں کی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنی زبان کو اردو سے کیوں نہیں ملنے دیتے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:۔

۱۔ چشمہ کو جو آنکھوں پر لگایا جاتا ہے اس آنکھ کی نسبت سے چکھا (چکھ آنکھ) کہا جائے۔

۲۔ سفارش کا ترجمہ نہیں قلب ماہیت چھپا شنس سے کیا جائے

۳۔ انتقال کا بدل انت کال یعنی دم آخر ٹھہرایا جائے۔

مگر ہندی کے اس پرجوش حامی کی غیر معمولی اور نرالی سوجھ نہ تو قابل عمل ہو سکی اور نہ قابل قدر متصور ہوئی۔ کیوں؟ اس بارے میں اس وقت کے زبردست یورپین مستشرق کی رائے نقل کرتا ہوں جو نہایت ضبط و تحمل سے ان تماشوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے خطبہ ۲۶ء میں لکھتا ہے:۔

میرے خیال میں اردو کے مقابلے میں ہندی کی جانب توجہ کرنا
ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی جدید یونانی کے بجائے قدیم یونانی کی

طرف توجہ کی جائے تعجب اس بات پہ ہے کہ اردو کی مخالفت بھی ہے اور چراغ علی) اردو کی تصانیف بھی دیوناگری رسم خط میں چھاپی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں دیوان نظیر اور میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دوسری تصانیف جن کی زبان خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ دیوناگری کے رسم خط میں طبع کی جا رہی ہیں۔

. . . . مسٹر جے۔ بیمز نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی میں جو مضمون پڑھا ہے اس میں اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے . . . . موصوف اپنے سات سال کے تجربے کی بنا پر کہتے ہیں کہ اردو ہندوستانی کی مہذب ترین شکل ہے، اس میں ایجاز و فصاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔ موصوف نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دوآب گنگا کے رہنے والوں کی گھٹی میں یہ زبان شامل ہے۔ انہیں اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو سے عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ انگریزی زبان سے لاطینی زبان نکالنے کی کوشش کریں اور چاہیں کہ اس میں صرف سکسن اصل کے الفاظ باقی رہیں ــــ زبانیں اس طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں۔ زندگی کی ضروریات سے ان کی ساخت میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ سیاسی فتوحات تجارتی تعلقات، ادبی اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس میں الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ قابل مضمون نگار نے بڑی خوبی سے یہ بات بتائی ہے کہ جس طرح انگریزی میں المانی اور لاطینی عنصر موجود ہیں۔ اسی طرح اردو میں آریا اور سامی یا اسلامی عنصر موجود ہیں . . . ایم بیمز کا خیال ہے کہ اردو میں عربی فارسی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ وہ مطالب کو بہ نسبت دیسی الفاظ کے زیادہ اچھی طرح واضح کرتے ہیں . . . اگر دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لے کر کام نکل سکتا ہے تو لمبے لمبے غیر مانوس الفاظ تراشنے سے کیا فائدہ بنگالی میں الفاظ تراشنے کا کام ہو رہا ہے لیکن اس سے اس زبان کو کوئی خاص ترقی حاصل نہ ہوئی۔ ہندوستانی (اردو) ہر جگہ بنگالی کے مقابلے میں کامیاب نظر آتی ہے۔"

حقیقت سات پردوں سے آشکار ہو کر رہتی ہے۔ حقیقی اور زندہ زبان کی خوبیوں پر جتنا بھی پردہ ڈالا گیا وہ اور نمایاں ہوتی ہے۔ اس پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ الٹ کر معترض پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ زندہ زبان کا معجزہ ہے یہ ہے چپ کی داد۔

بہاری کا یہ دوہا اس موقع کے حسب حال ہے:۔

سلج موہن موہ کو موں ہی کرت کچھین
کہا کروں الٹو پڑے ٹونے کونے نین

مجہول مجہول

اپنی منقاروں سے خود کستے ہیں پھندا جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

زندہ زبان میں ایک کشش ہوتی ہے جو ذوق و نظر کو خود بخود دعوت دیتی ہے۔ اردو میں وہ کشش موجود ہے جن کی آنکھیں حقیقت کو دیکھ کر بند نہیں ہو جاتیں وہ اس کو اپنی پیاری زبان سمجھ کر اس کی تخریب نہیں کرتے اور اپنی وسعت کے اندر خدمت بھی کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نگاہ محض عیبوں پر پڑتی ہے یا وہ خوبیوں کو پی جاتے ہیں۔ عصبیت نفرت پیدا کر دیتی ہے تب آدمی دوسروں کی تو سنتا نہیں اپنی بے تکی سنائے جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی ہوا کچھ ایسی بگڑ رہی ہے کہ بلا استثناء ہندو مسلمان اس قسم کے مرض میں گرفتار ہیں پھر وہ سچائی کے گھاٹ نہیں لگتے انہیں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھائی دیتا ہے۔ اردو سے نفرت رکھ کر کترائے پھرنے والے بھی اس مرض کے بُری طرح شکار ہیں۔ وہ ایسی عبارت کو جو اردو رسم خط میں ہو ہاتھ نہیں لگاتے بھلا حقیقت سے کیونکر آشنا ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے اردو ادب و لٹریچر کو پڑھا۔ دیکھا اور اس پر غور کیا وہ اس کی سہولت اور سادگی کے مداح ہیں اور زندہ زبان کی اُن خوبیوں سے جس سے وہ زندہ ہے ہندی میں بھی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی اپنی کویتا کومدی کی بھومکا (دیباچہ) میں لکھتے ہیں۔

ہندی بحروں میں اردو کی پیروی کرنے کی صلاح

ہندی کب کو ایسا سوبھاگ نہیں پراپت (حاصل) ہے۔ اس کے سامنے بڑا بندھن ہے چھند (وزن) جیسا ہے اُسے بلا کانٹ چھانٹ کئے ویسا ہی جانا پڑتا ہے اُسے ذرا بھی کانٹ چھانٹ کرنے کا ادھکار نہیں ہے وہ آنند (اول نون مفتوح اور دوسرا ساکن ملفوظ) کو آنند (دوسرا نون غنہ) بھی نہیں کر سکتا اس کے پاس کی زمین بڑی کھاڑ ہے سامنے میں ہو کر اس کا سنکلا

راستہ ہے اردو کویوں نے اس تکلیف کو سمجھا ہے۔ انہوں نے کچھ اونڈ تاریجا تعرف) سے کام لیا ہے . . . (تقطیع میں حروف کے گر جانے پر بلا وجہ ناک بھوں سکیڑنے کے بعد) اب ایسا کرنے کے لئے ہندی سے کچھ کب اردو والوں ہی کا راستہ پکڑنا چاہتے ہیں۔

(ہندی ساہتیہ کا سنجھت الناس)

ہندی نثر میں اردو کے اسلوب بیان اختیار کرنے کی سفارش

"جب ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو ایک کو دوسرے کی بیش بھوشا (بھیس بھاؤ وضع قطع) سے نفرت کیوں ہونی چاہئے۔ پرتیک (ہر ایک) ہندو کو اردو سیکھنی چاہئے اور پرتیک (ہر ایک) مسلمان کو ہندی میری تو دوڑھ دھارنا (اٹل رائے) ہے کہ کوئی بھی سکینت (شخص) اردو جانے بنا ہندی کا سیلیکھک (اچھا انشا پرداز) نہیں ہوسکتا۔ اب تک اردو کی بھاشا شیلی (اسلوب بیان) کئی انشوں میں ہندی سے بڑھ کر ہے۔ اردو میں محاوروں کا جیسا سندر پریوگ (عمدہ استعمال) دیا دہی لیکھک کرسکتے ہیں جو اردو جانتے ہوں"۔ اس لئے ثابت ہوا کہ ہندی اردو کو گلے ملنے کو لپکتی رہی ہے اور ایک ہی دور میں مختلف قسم کی نگارش کے نمونے ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں کچھ ادیب اس قسم کے ہوئے جن کا تعلق اردو ہندی دونوں سے رہا و نیز انگریزی ادب کا پرتو دونوں پر یکساں پڑنے لگا۔ اور ایک زبان عام بنانے کی فکر ہوئی۔ چندر شیکھر گولیری اور مرحوم پریم چند، سدرشن نے ہندی کی قدامت پسندی کی علانیہ عملی مخالفت کی۔ بشن ناتھ ورما اور بالمکند گپت نے بہت کچھ ہندی کو اردو سے ہم آہنگ کر دیا مگر کاشی کی ناگری پرچارنی سبھا کے زاویۂ نگاہ میں کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ "شدھ ہندی نویسی" کا جذبہ طوفانی بن گیا۔ وہ تحریریں لفظوں سے گر گئیں۔ جس میں دوست کے بدلے متر، یا کے بدلے، اتھوا، اگر کی جگہ یدی، لیکن کے بدلے کنتو، گاؤں کے بدلے گرام۔ شہر کے بدلے نگر، کام کے بدلے کاریہ اور بیٹھے کے بدلے مرد کا استعمال نہ ہو۔ ناگری پرچار کے سلسلے میں قدامت پرستی کی خوب خوب اشاعت ہوئی۔ آلو امریکہ سے آکر ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہندی نے اقصائے ہند میں اپنی شاخیں کھول دیں۔ اپنے سٹور اس نے ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کے نام سے اسی طرح اُن دراوڑی حلقوں میں بھی کھولے ہیں جہاں آریائی عنصر سے زیادہ اسلامی تہذیب کے عناصر نے نقش قایم کر دیا ہے۔ کاش کہ ان مجلسوں کا مقصد زندہ زبان کی اشاعت ورواج ہوتا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ اردو ہی اصل ہندی ہے۔ ہندی آگے نکل چکی ہے۔ قدامت پسندی عہد طفولیت کو قایم رکھنے کی مضحکہ انگیز کوشش کر رہی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو کبھی ہندی سے دھرم کا ناتا جوڑتی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو ہندوستانی کے بدلے بھارت ساہتیہ پرشد میں ہندی۔ ہندوستانی کا بے معنی مرکب لفظ وضع کراتی ہے جو بچہ پانچ سال سے بڑھ کر تیس سالہ جوانوں میں داخل ہو چکا ہو نا ممکن ہے کہ اس کا بچپن واپس لایا جائے۔

نوزنامے کی بحر متقارب کی مثنوی کا نام ہندی ہی تھا۔ اردو رسم الخط اور اردو بحر میں لکھا گیا تھا۔ اب بھی ان کی پرانی اردو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ خسرو کے تمام کارنامے جو فارسی زبان میں نہ تھے ہندی ہی سے موسوم ہیں جو اردو کی ابتدائی شکل ہے مصحفی اور انشا نے بھی ہندوستانی زبان کو اکثر ہندی کہا۔ جب ہندی کی مختلف بولیوں میں اس ہندی کو فروغ ہوا اور وہ ممتاز ہوگئی۔ اس وقت اس کا نام بدلا۔ پہلا نام بھی ہماری زبان کا صفاتی تھا۔ ذاتی نہ تھا۔ اور دوسرا نام زبان ریختہ۔ زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد تھا۔ جو مختصر ہوتے ہوتے اردو ہو کر رہ گیا اور آخیر میں ہندوستانی کا نام بھی صفاتی ہی ہے۔ ہماری زبان نے ترقی کی منزلیں قدرت کے اٹل قانون کے مطابق طے کی ہیں۔ ہندی نام اگر ایک مخصوص معنی میں مشہور نہ ہوگیا ہوتا تو یہ لفظ ہندی ہندوستانی سے بہتر زبان ہند پر اشارہ کرتا۔ مگر سب سے عمدہ فیصلہ انڈین نیشنل کانگرس کا تھا کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی خواہ ناگری رسم خط میں ہو یا فارسی خط میں، "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کا کانگرس کے فیصلے کو نہ ماننا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہندی، ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح نہیں اتر سکتی۔ جبھی تو باوجود اس کے جناب مولوی عبدالحق صاحب نے جب پرشد کے اس ریزولیوشن کی ترمیم کی معقول وجہیں پیش کرکے مہاتما گاندھی جی کو ریزولیشن میں زبان ہند کے مجوزہ نام کے نقص بتا کر لاجواب کر دیا تو انصاف کے بجائے انہیں طاقت کو کام میں لانا پڑا اور انہوں نے کہا۔

(۱) کانگرس کے ریزولیوشن میں نے بنائے تھے۔

(۲) میں نے اس کے (ہندی، یعنی ہندوستانی) کے معنی سمجھا دیئے ہیں جو آپ نے ہنس کی تحریروں میں دیکھے۔

(۳) میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔

اور جب اس پر موصوف نے مہاتما جی سے کہا کہ آپ نیشنل کانگرس

ASSOCIATED CEMENT COMPANIES LIMITED

Twenty-two years' manufacturing experience behind the above brands of Cement —

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
ماہنامہ
ادبی دنیا
The Adabi Dunya, Lahore.
ادارۂ تحریر: صلاح الدین احمد بی اے
عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی
PRICE
6 ANNAS.
قیمت چھ آنے

"EFFICIENT MANNER OF PREPARATION"

LT-COL JASPER ROBERT JOLLY TYRRELL
C.I.E., I.M.S. (Rtd.) M.B., B.Ch., S.A., O.L.M

Inspector-General of Hospitals & Member of State Cabinet.

In Charge Medical & Sanitation Department
HOLKAR STATE

says

"I was impressed with the cleanly efficiency of the

TAYYEBI DAWAKHANA"

Government of His Highness the Maharaja Holkar,

Medical Department.

No:- 493 Dated 2nd February 1933

At the request of the Proprietors Mulla Mohammad Hussain and Ghulam Ali. I visited the TAIYABI DAWAKHANA, Indore. This is an old established Institution, where I understand a good deal of work is done. I was shown a large stock of drugs used in UNANI MEDICINES and saw them in the process of manufactures. I was impressed with what I saw of the cleanly efficient manner of preparation of medicines and of the Institution in general.

[signature] Tyrrell
Lt. Col.,
Inspector General of Hospitals
Holkar State, Indore.

Kanungo 23/1/

دنیائے کاروبار

ہندوستان میں سیمنٹ سازی کا فروغ

ہندوستان کی جدید ترین صنعت

پچھلے چند سالوں میں ہندوستان کی جدید ترین صنعت یعنی سیمنٹ سازی نے تھوڑے ہی عرصے میں ترقی کی منازل طے کر کے ہندوستان کی قومی اور اقتصادی خوشحالی میں اس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور اس کی مدد سے دوسری گھریلو صنعتوں کی ترویج و ترقی کے لئے ایسے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ کہ اس نے ہر ایسے روشن خیال انسان کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لی ہے جس کے پیش نظر ملک کی موجودہ مشکلات تھیں اور وہ حیران ہے کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا۔

ہم چاہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سطور کے ذریعے سے نہائت مختصر طور پر ہندوستان میں اس صنعت کی ترویج و ترقی پر کچھ روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ اس صنعت کو منظم کرنے والی جماعت کس طرح ملک و قوم کی خدمات بجا لا رہی ہے۔ اور کس طرح ملک کی ترقی اور دیہات سدھار جیسے اہم امور میں ممد و معاون ہے۔

عام طور پر لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ سیمنٹ قدیم رومیوں کے عہد میں بھی بنایا جاتا تھا۔ اور موجودہ پورٹ لینڈ سیمنٹ کا موجد ایک انگریز معمار جیمز الیسپڈن تھا۔

عوام اس بات کو نہیں جانتے کہ سیمنٹ کوئی نئی ایجاد نہیں ہے۔ اس صنعت کو نہ صرف قدیم رومی ہی جانتے تھے بلکہ قدیم ہندی بھی اس کی ساخت میں ماہر تھے۔ اس کا زندہ ثبوت برطانیہ میں پرانی سڑکیں اور قلعے ہیں۔ اور ہندوستان میں مشہور مصنف وراہ مہیر کی کتاب بریہت سمہتا کا وہ نسخہ ہے۔ جس میں ایک خاص پائدار اور مضبوط مسالہ تیار کرنے کی ترکیب درج ہے۔ کئی صدیوں تک یہ فن لوگوں نے بھلائے رکھا لیکن ایک مشہور انگریز انجینئر جان سمیٹن نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسے پہلے سے کئی گنا بہتر صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے باوجود ہماری تحسین کا صحیح حق دار ایک انگریز معمار جیمز الیسپڈن ہے جس نے پورٹ لینڈ سیمنٹ کو اس کی موجودہ صورت میں ایجاد کیا اور ۱۸۲۵ء میں اس کا پہلا کارخانہ بھی قائم کیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ساؤتھ انڈین انڈسٹریز لمیٹڈ مدراس نے اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۹۰۲ء میں مدراس میں سیمنٹ کا پہلا کارخانہ جاری کیا۔ اس کارخانے کی مشینیں بہت چھوٹی تھیں اور ان کا طریق کار فنی لحاظ سے موجودہ زمانے کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا چنانچہ انہیں خامیوں کی وجہ سے اور غالباً زیادہ لاگت اور حوصلہ افزائی کی کمی نے آخر کار اسے کاروبار بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

چنانچہ صحیح معنوں میں اس صنعت کی بنیاد ۱۹۱۲ء میں رکھی گئی۔ کیونکہ اسی سال انڈین سیمنٹ کمپنی لمیٹڈ رجسٹر کرائی گئی اور اس نے پوربندر میں اپنا کام جاری کیا اس کے بعد آئندہ دو سال کے اندر اندر کٹنی اور بندی کمپنیوں کا اجرا عمل میں آیا۔ شروع شروع میں ان کمپنیوں کا مال بھی نہائت محدود مقدار میں تھا۔ لیکن ابھی انہوں نے کام جاری ہی کیا تھا کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ بدیشی مال آنا بند ہو گیا اور یہ بغیر کسی مقابلے کے تمام ہندوستان کی ضروریات کی واحد اجارہ دار بن گئیں۔ ان کارخانوں کی کامیابی نے قدرتی طور پر ملک کے سرمایہ داروں کی توجہ کو مرکوز کر لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۳ء تک ہندوستان میں ۹ بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔

ہندوستان کی قدامت پسندی

بدقسمتی سے ان صناعوں نے اپنے جوش و خروش اور بڑی بڑی امیدوں میں اس نکتہ کو پس پشت ڈال دیا کہ ہندوستان ایک قدامت پسند ملک ہے۔ اور اپنی

عادات وخصائل رواج اور تعمیر کے طریقوں کے بدلنے میں نہائت سست واقع ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ اول تو یہ ہوا کہ ان کارخانوں نے ضرورت سے زیادہ مال تیار کر ڈالا اور دوسری خرابی یہ ہوئی کہ بہت سے نئے کارخانے انہیں علاقوں میں قائم ہو گئے۔ جہاں پرانے کارخانے کام کر رہے تھے۔ اِن دو امور نے ان کو قدرتی طور پر قیمتوں کے مقابلتاً گھٹانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مال کی نکاسی کے لئے ہر قیمت قبول کر لی۔ اور دُور دراز علاقوں میں مال پہنچانے کے اخراجات قبول کر لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو کارخانوں کا دیوالہ نکل گیا۔ اور باقیوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔

اب سیمنٹ سازوں کو موقعہ کی نزاکت کا احساس ہوا۔ انڈین سیمنٹ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں رکھی گئی اور ان کی کوششیں ایک مناسب قیمت مقرر کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

سیمنٹ سازوں کو اب ہوش آیا اور موقع کی نزاکت کو دیکھ کر وہ متحد ہو گئے اور سرکار سے بدیشی مال کے مقابلے سے تحفظ کی درخواست کی لیکن ٹیرف بورڈ کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ تمام بدنظمی ضرورت سے زیادہ مال کی تیاری کی وجہ سے ہے۔ جسے ناواجب مقابلے نے اور بھی بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سرکار کی طرف سے انہیں کوئی امداد نہ دی گئی۔ ٹیرف بورڈ نے سرکار سے مالی امداد کی سفارش کی لیکن سرکار نے اسے بھی منظور نہ کیا۔ اب کارخانہ داروں کے لئے صرف ایک ہی نجات کا راستہ کھلا تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر وہ اس تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو انہیں متحد ہو کر باہمی تعاون پر کاربند ہونا چاہیئے۔ اس دانشمندانہ فیصلے پر کاربند ہوتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں انڈین سیمنٹ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس ایسوسی ایشن نے نہائت کامیابی کے ساتھ قیمتوں کو ایک اقتصادی سطح پر لانے کی کوشش کی جس نے اس صنعت کو نئے سرے سے زندگی بخشی۔

اس حقیقت کو اب ایک دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ "اشتہار ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے"۔ کنکریٹ ایسوسی ایشن کی بنیاد ۱۹۲۷ء میں رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسرا قدم یوں اُٹھایا گیا کہ ضرورت سے زیادہ مال کی کھپت کے لئے مانگ پیدا کی گئی۔ موجودہ زمانے میں کوئی تجارتی ادارہ خواہ اس کی تنظیم کیسی ہی عظیم الشان ہو اور خواہ اس کی بنیادیں کتنی ہی مضبوط ہوں۔ تجارتی مقابلوں کے موجودہ دور میں اپنی مصنوعات کی اشاعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تجارتی ترقی کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اپنی اشیاء کی غیر معمولی خوبیوں کو ہر وقت عوام کے پیش نظر رکھا جائے۔ اسی اصول کے پیش نظر ۱۹۲۷ء میں کنکریٹ ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی جس کا اولین مقصد یہ تھا کہ پبلک کو سیمنٹ کے استعمال کے مختلف طریقے بتائیں جائیں۔ اور ہر معاملے میں ان کو فنی لحاظ سے مفت مشورہ دیا جائے۔ اس ایسوسی ایشن کا مفید کام بہت جلد پھل لے آیا۔ مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر مفت تقسیم کئے گئے۔ جن میں بتایا گیا کہ عمارتی کام کے لئے سیمنٹ بہترین مصالحہ ہے۔ اور یہ کہ سیمنٹ کو کامیابی کے ساتھ کن کن کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ "انڈین کنکریٹ جرنل" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا گیا جس میں کنکریٹ کی مدد سے تعمیر کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے جو عوام کے لئے اور انجینیروں کے لئے یکساں طور پر مفید تھے۔ یہ تمام کوششیں بارآور ہوئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو سیمنٹ پر اعتماد پیدا ہو گیا اور موجودہ نسل کے دلوں میں سیمنٹ کا سکہ بیٹھ گیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر سیمنٹ کی کھپت بڑھ گئی اور آہستہ آہستہ اس صنعت نے فروغ حاصل کرنا شروع کر دیا۔

شاہراہ ترقی پر ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ کی بنیاد رکھی گئی۔

سیمنٹ کی بڑھتی ہوئی مانگ نے سیمنٹ سازوں کو باہمی تعاون میں ایک دوسرے سے اور قریب کر دیا چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جادۂ ترقی پر ایک اور قدم بڑھایا گیا اور سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ معرض وجود میں آئی۔ اس کمپنی کے ماتحت کارخانوں کے مال کی فروخت کا انتظام مجموعی طور پر کیا جانے لگا اور تمام کمپنیوں کی مال تیار کرنے کی مقدار مقرر کر دی گئی۔ مشترکہ سرمائے سے نشر و اشاعت کا کام بجائے کسی ایک کمپنی کے مخصوص مال کے مجموعی طور پر کیا گیا اور مال کی نکاسی کے لئے بہتر صورت حالات پیدا کی گئی۔ قیمتِ فروخت میں بھی کافی تخفیف کر دی گئی۔

سیمنٹ ایسوسی ایشن سے متحد ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دفاتر کھولے گئے اور ان میں سیمنٹ کنکریٹ کے کام کے ماہر انجینیر مقرر کئے گئے۔

ہر ایک اہم مقام میں سیمنٹ کے تاجر کے پاس مال کا ذخیرہ رکھا گیا تاکہ عوام کو کم یا زیادہ مقدار میں ہر وقت سیمنٹ رعائتی قیمت پر مہیا ہو سکے اور انہی تاجروں کے ذریعے سے پبلک کو ان کی اپنی زبان میں سیمنٹ کو ہزاروں طریقوں پر استعمال کرنے کی ہدایات دیئے جانے کا انتظام کیا گیا۔

تعمیر کے لئے سیمنٹ کا استعمال مسلّمہ طور پر کفائت شعاری کا مترادف ہے۔

متعدد تجربوں کے بعد سیمنٹ کے لئے ایک ایسا پیکنگ تیار کیا گیا۔ جو سیمنٹ کو برسات کے دنوں میں یا دور دراز علاقوں میں بھیجنے یا زیادہ دیر تک ذخیرہ رکھنے پر بھی خراب نہیں ہونے دیتا۔ پیکنگ کا یہ طریقہ نہائت کامیاب رہا اس دانشمندانہ

طریقِ کار اور متواتر و مسلسل اشتہارات کی وجہ سے دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی سیمنٹ آہستہ آہستہ بطور بہترین عمارتی مسالے کے اپنی جگہ بناتا گیا۔ اور اس طرح تعمیر کے جدید طریقے بہتر قسم کی عمارات کے بننے میں ممد و معاون ہوئے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی کو ملک کے طول و عرض میں مال فروخت کرنے میں نمایاں کامیابی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی کمپنی کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ بھی تھی اور وہ یہ کہ محدود مال کی تیاری میں وہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات پر آسانی کے ساتھ قابو نہ پا سکتے تھے۔

اب یہ عقدہ آن پڑا کہ اگر اس صنعت کو اقتصادی طور پر کامیابی کے ساتھ بڑھنا یا کم از کم موجودہ خوشحالی کو قائم رکھنا ہے تو نہ صرف مال کی تقسیم کے سلسلے میں بلکہ ان علاقوں میں جہاں مال کی کھپت دوسرے علاقوں سے زیادہ تھی نئے کارخانوں کے اجرا کے سلسلے میں ایک نئے انتظام کا جاری کرنا لابدی تھا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی کمپنی بنائی گئی جسے یہ کام تفویض ہوا کہ وہ سیمنٹ کے تمام کاروبار کو از سرِ نو منظم کرے۔ نہ صرف فروخت اور فروخت کی قیمت کے تقرر میں بلکہ سیمنٹ کی تحدید۔ تنظیم اور نئے کارخانوں کے لگانے کے ضمن میں بھی جہاں اور جب بھی ان کی ضرورت پڑے اور پھر ساتھ ہی اس کا اہم ترین فرض اقتصادی طور پر مناسب تقسیم بھی ہو۔

اس مرکزی کمپنی کے وجود سے ایک اور فائدہ بھی پیشِ نظر تھا۔ مثلاً کوئلے اور تھیلوں وغیرہ کی تھوک خرید پر رعائت۔ اب مقررہ مقدار میں مال تیار کرنے کا طریقہ بھی منسوخ کیا جا سکتا تھا۔ اور جن علاقوں میں لاگت زیادہ تھی ان علاقوں کے کارخانوں سے پورا کام لیا جا سکتا تھا اور جن علاقوں میں لاگت کم تھی وہاں کے کارخانوں کے مال کی مقدار محدود کی جا سکتی تھی۔

ہندوستان کے صنعتی بادشاہ مسٹر ایف۔ ای ڈنشا کی دُور رس نگاہیں اس تجویز کی خوبیوں کو بھانپ گئیں اور انہوں نے اس پر صاد کر دیا۔

اس تجویز کے فوائد اور آئندہ کامیابی کے امکانات اس قدر زیادہ اور یقینی تھے کہ مسٹر ڈنشا مرحوم نے اسے بہت سراہا۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۶ء میں ایسوشی ایٹڈ سیمنٹ کمپنیز آف انڈیا لمیٹڈ کے نام سے یہ کمپنی بھی معرضِ وجود میں آئی۔

اب بمبئی اور مدراس میں کنکریٹ سکول قائم کئے گئے ہیں جہاں ملک کے مختلف حصوں کے نوجوانوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

نئے انتظامات کے ماتحت نشر و اشاعت کے کام پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اخبارات کے ذریعے سے اشتہارات دینے کے علاوہ اس موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے جاتے ہیں۔ "انڈین کنکریٹ جرنل" میں مفید اور مفصل مضامین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بمبئی اور مدراس میں کنکریٹ سکول قائم کئے گئے ہیں۔ جہاں ملک کے ہر حصہ سے نوجوان آ کر مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انہیں کنکریٹ ملانے اور اس کے استعمال کرنے کے مختلف طریقوں کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ طریق عمل ملک کے لئے اور اس صنعت کے لئے نہائت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

طلبا زیادہ تر سب اوورسیر اور مستریوں کی جماعت سے ہیں۔ یہ سکول سیمنٹ کے استعمال کرنے کے مختلف طریقوں سے عوام کو آگاہ کرنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ یہ سکول خاص طور پر اس لئے کھولے گئے تھے کہ نوجوانوں کو عملی طور پر ان طریقوں سے آگاہ کریں جن کا ذکر ایسوسی ایشن کے شائع کردہ رسالوں میں درج ہے۔ طلبا عام طور پر سب اوورسیر اور مستریوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی تعلیم تعمیر کے تمام ابتدائی اصولوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً فرش بنانا۔ پلستر کرنا۔ رنگین سیمنٹ کا کام وغیرہ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بنانا۔ مثلاً انگیٹھیاں، چھجے۔ گلدان وغیرہ چنانچہ اسی قسم کے اور سکول تمام بڑے بڑے شہروں میں کھولے جائیں گے۔ یہ سکول ملک کے مختلف کالجوں اور انجینیری کے سکولوں کے لئے ایک آخری درسگاہ کا کام دیں گے۔ اور اگرچہ ان کا مقصد اولین ادنیٰ جماعتوں کو کام سے آگاہ کرنا ہوگا لیکن ان کے اسباق نوجوان انجینیروں کے لئے بھی کافی اہم اور ضروری ہوں گے تاکہ انہیں اپنے پیشے کے ابتدائی ایام میں دماغ کے علاوہ ہاتھ سے کام کرنا بھی آ جائے۔

سیمنٹ کا استعمال عملی طور پر دکھانے کے لئے لاریاں جگہ جگہ دَورہ کرتی رہتی ہیں۔

سیمنٹ کے استعمال کو مشتہر کرنے کے لئے ایک اور طریقہ نہائت کامیابی کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ لاریوں کی ایک خاص تعداد تمام اوزار اور مسالوں سے لدی ہوئیں اپنے اپنے مقررہ علاقوں میں دورہ کرتی رہتی ہیں۔ جن کے ساتھ کنکریٹ کے کام کے ماہر لوگوں کو عملی طور پر روزمرہ کی استعمال کی اشیاء بنا بنا کر دکھاتے ہیں کہ کس آسانی سے اور کتنی سستی اور مضبوط اشیا سیمنٹ سے تیار ہو سکتی ہیں۔ اور وہ بتاتے ہیں کہ تمام تعمیری کاموں کے لئے سیمنٹ کا استعمال کتنا مفید اور کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ یہ لوگ دہقانوں کے گھروں میں پہنچ کر انہیں بتاتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے سیمنٹ کا استعمال ان کے لئے کتنا مفید اور ضروری ہے جس کے ذریعے سے نہ صرف ان کے گھروں میں صفائی حفظانِ صحت کا موجب ہوگی بلکہ ان کا گاؤں خوبصورتی اور صفائی کا مرقع پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ سفری نمائندہ مقامی

تاجر کو سیمنٹ کے جدید ترین استعمال کے طریقے بتاتا ہے۔ اور اس سے مقامی ضروریات کا اندازہ لیتا ہے۔ اسی طرح وہ مقامی میونسپل۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے افسروں سے ملتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ کس طرح ہر قسم کی تعمیر میں خواہ وہ سکول ہو۔ نالی ہو۔ لیمپ کا کھمبا ہو یا پل یا سڑک ہو سیمنٹ کی مدد سے نہ صرف کم خرچ رہتا ہے۔ بلکہ زیادہ پائیدار اور دیدہ زیب نظر آتا ہے۔ سیمنٹ کی تشہیر کا یہ طریقہ ایک پنتھ اور دو کاج کے مترادف ہے۔ یعنی ایک طرف تو عوام کو سیمنٹ کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتا کر مانگ پیدا کی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف پبلک کے لئے زیادہ پائیدار اور مضبوط تعمیر کا سامان کم خرچ پر بہم پہنچایا جاتا ہے۔

سیمنٹ کے کارخانوں میں قریباً دس ہزار آدمی کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سن کے کارخانوں کو فروغ دیتے ہیں اور ریلوے کی گراں بہا آمدنی میں یہ صنعت بہت حد تک ممد و معاون ہے۔

عام طور پر اس بات کا علم نہیں ہے۔ کہ سیمنٹ سازی ملک کی خوشحالی میں کتنا حصہ لے رہی ہے۔ یہ صنعت نہ صرف اپنے کارخانوں میں قریباً دس ہزار آدمیوں کی روزی کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ بلکہ ہندوستانی کوئلہ کی کثیر مقدار میں کھپت کر رہی ہے۔ قریباً ساڑھے تین لاکھ ٹن کوئلہ ہر سال سیمنٹ کے کارخانوں میں خرچ ہوتا ہے۔ سن کی صنعت بھی کافی حد تک مستفید ہو رہی ہے۔ کیونکہ ایک کروڑ اسی لاکھ سن کے تھیلے سیمنٹ کے لئے ہر سال استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریلوے کی کرائے کی آمد ہے جس میں کوئلے، تھیلوں اور سیمنٹ کے کرایوں سے بیش بہا رقوم ادا کی جاتی ہیں۔ قریباً دس لاکھ ٹن سیمنٹ سالانہ ریلوے کے ذریعے سے منتقل کیا جاتا ہے۔

صرف سیمنٹ سازی ہی ایک ایسی صنعت ہے۔ جس کے ذریعے سے قومی خوشحالی کی چاروں اہم تجاویز پر عمل ہو سکتا ہے۔

سیمنٹ سازی اس لحاظ سے بھی کافی اہمیت رکھتی ہے کہ یہی ایک صنعت ہے جو قومی خوشحالی کی چاروں تجاویز پر حاوی ہے۔ یعنی دیہات سدھار۔ گھریلو صنعتوں کی ترویج۔ انسداد بیکاری اور مزدور طبقہ کے لئے مناسب مکانات کی تعمیر۔

دیہات سدھار کے سلسلے میں سب سے بڑی ضروریات یہی ہیں۔ کہ پختہ سڑکیں بنائی جائیں۔ کنوؤں کی منڈیریں اور ڈھکنے چشموں کو گندگی سے بچانے کے لئے بند۔ پانی پینے کے حوض اور کھاد کے گڑھے عمدہ طور پر تعمیر کئے جائیں۔ ان تمام ضروریات کے لئے سیمنٹ کا استعمال نہائت مفید ہے۔

سیمنٹ کے ذریعے گھریلو صنعتیں فروغ پا سکتی ہیں اور دیہات کے غریب اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

سیمنٹ کی انگیٹھیاں۔ چولہے اور گلدان وغیرہ بنانے کے چھوٹے چھوٹے کارخانے جاری کئے جا سکتے ہیں۔

وسیع پیمانے پر سیمنٹ کا استعمال کرنے سے مثلاً سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر میں خواہ وہ پبلک کے لئے ہوں یا ذاتی ملکیت ہوں۔ ہزار ہا مزدوروں اور فن کاروں کو روزگار مل سکتا ہے۔ اور اس طرح بے روزگاری کا سدباب ہو سکتا ہے۔ دیہات میں غربا بہتر قسم کے مکانات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جو آگ۔ نمی اور کیڑے مکوڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہوں۔ زیادہ پائیدار ہوں اور موسمی تغیرات کے نقصانات سے مامون رکھ سکیں۔

سیمنٹ کنکریٹ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوہے کے ساتھ بغیر اسے زنگ آلود کرنے کے جوڑا جا سکتا ہے۔

سیمنٹ کی تعمیر مضبوطی میں پہاڑ کی طرح سخت اور وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہونے والی ہوتی ہے اور بخلاف چونے کے۔ لوہے کے ساتھ مل کر قائم رہتی ہے۔ بغیر اسے زنگ آلود کئے انہیں اوصاف کی وجہ سے سیمنٹ کو تعمیر کا بہترین مسالہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کنکریٹ کو ہر مطلوبہ شکل دی جا سکتی ہے۔ سطح پر ہر قسم کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ اور جب یہ سخت ہو جاتا ہے۔ تو ہمیشہ کے لئے اپنی وضع اور رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ان تمام اوصاف نے سیمنٹ کی اہمیت کو ہر قسم کی تعمیر کے لئے بطور بنیادی مسالہ کے اہم تر کر دیا ہے۔

یہ صنعت ہر قدم پر ترقی کر رہی ہے اور اس کا مستقبل نہائت شاندار نظر آ رہا ہے۔

ان کے حقائق کی موجودگی میں کسے انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ایک ایسی صنعت جو ہر قدم پر رو بہ ترقی ہے۔ اور جس کے انتظام کی باگ ڈور ایسے دانشمند منتظمین کے ہاتھوں میں ہے۔ اور جو قوم کی سرپرستی کی صحیح طور پر حقدار ہے۔ اس کا مستقبل نہائت شاندار ہوگا؟

فہرست مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — نمبر ۵

تصویر:- ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

BANISH UGLY SUPERFLUOUS HAIR
جلد کو خراب سیاہ اور بدنما کر دینے والی ریلکی اور خراب چیزیں مت خریدئیے اپنے زیادہ بالوں کو دور کرنے کے لئے
بادشاہی سوپ اور پاوڈر
استعمال کیجیے جس سے آپ کی جلد قدرتی حالت میں نرم صاف اور ملائم رہے گی ۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

بزمِ ادب

علامہ اقبال مرحوم

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد
(غالب)

۲۱ راپریل ۳۹ء کو ساڑھے پانچ بجے صبح لاہور میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی صحت گزشتہ چار سال سے خراب چلی آ رہی تھی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر رحمن (بھوپال) اور حکیم نابینا صاحب (دہلی) کے علاج سے کافی فائدہ ہوا لیکن مرض کا کلیتہً ازالہ نہ ہو سکا۔ ان کی طبیعت میں آہستہ آہستہ ضعف بڑھتا گیا یہاں تک کہ موت سے چند ماہ پہلے وہ بالکل صاحبِ فراش ہو گئے تھے۔ لاہور میں حکیم قرشی صاحب کے علاوہ بہترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ محض اس غرض سے قائم کیا گیا کہ وہ مرحوم کا طبی معائنہ کر کے شافی اور موثر علاج تجویز کرے لیکن عوارض میں اس قدر پیچیدگی پیدا ہو چکی تھی کہ یہ تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں۔ امراض کے ہجوم اور جسمانی نقاہت کی شدت کے باوجود مرحوم کے دل و دماغ کی غیر معمولی طاقتیں آخری وقت تک اپنا کام کرتی رہیں۔ وفات سے پندرہ منٹ پہلے انہوں نے اپنے تیمارداروں میں راجہ حسن اختر کو مخاطب کر کے یہ رباعی پڑھی:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور پھر نہایت اطمینان سے فرمایا "میں مسلمان ہوں۔ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ میں خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"۔ راجہ حسن اختر حکیم صاحب کو بلانے چلے گئے اور مرحوم کا دیرینہ وفادار خادم علی بخش ان کے پاؤں دبا رہا تھا کہ یکایک دل میں درد اٹھا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی روز شام کے پانچ بجے جنازہ اٹھا جس میں گورنمنٹ پنجاب اور ہائی کورٹ کے اعلیٰ اراکین کے علاوہ پچیس ہزار انسانوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت شرکت کی اور غروبِ آفتاب کے بعد علم و ادب کا یہ نادر الوجود پیکر شاہی مسجد کے سبزہ زار میں پیوندِ خاک کر دیا گیا۔

اقبال کے علمی و ادبی کمالات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ وہ یقیناً اس دور میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ شاعری کے علاوہ وہ فلسفہ مذہب اور سیاستِ اسلامی کا ایک زبردست امام تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ زندگی کے خارجی حالات میں اس وقت تک انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک نفس کے اندر انقلاب پیدا نہ ہو۔ اس کی شاعری سراسر اس انقلاب کی مبلغ اور آئینہ دار ہے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی موجودہ بیداری اقبال کی تعلیم کی مرہونِ منت ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا جہاں بیسیوں مرصع اور پرجوش تقریریں ناکام رہیں۔ وہاں اقبال کی ایک نظم اپنا کام کر جاتی ہے۔ اقبال نے یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی سرنگونی کو نہایت بے تابی سے محسوس کیا تھا وہ زندگی بھر اپنے ہم وطنوں کو خودداری، آزادی اور بیداری کا درس دیتا رہا۔ وہ مغرب و مشرق کی موجودہ کشمکش میں مشرق کی سرفرازی و سربلندی کا آرزومند تھا۔ ہندوستان میں مغربیت کی آمد کے ساتھ جو الحاد کے آثار پیدا ہو رہے تھے اقبال نے مردانہ وار اُن کا مقابلہ کیا اور آج مغرب زدہ ہندوستانی اگر مذہب کی طرف واپس آ رہے ہیں تو یہ بھی اقبال کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اقبال نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہمیں جگایا اور آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دکھا کر ہمارے پژمردہ اعصاب میں حیاتِ تازہ کی ایک لہر پیدا کر دی۔ یورپ نے اقبال کو ہمیشہ اپنا مدِ مقابل اور حریف تصور کیا اور یہی وجہ تھی کہ مغربی طاقتوں نے جو ایشیا کی ذلت و پستی سے فائدہ اٹھانے کی عادی ہو چکی ہیں اقبال ایسے انقلاب انگیز اور آتش نفس شاعر کی قدر دانی میں بخل کیا۔ علم و فضل کے اس بلندترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود اقبال ایک فقیر منش اور درویش صفت انسان تھا۔ اس کے مکان کے دروازے غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل انسان کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ تبختر اور نخوت کے نام سے ناواقف تھا۔ روزمرہ زندگی اور عام طرزِ بود و ماند میں وہ ایک بالکل معمولی انسان معلوم ہوتا تھا اور اس کی عظمت کا یہی راز ہے کہ اس کے سامنے شاہ و گدا سب برابر

تھے۔ اقبال مشرق و مغرب کی تعلیم کا جامع تھا۔ اُس کا وجود دنیا میں ہندوستان کی علمی فضیلت و برتری کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ افسوس کہ اجل کے وقت ناشناس وار نے ہم سے ایک ایسا جوہرِ قابل چھین لیا جس کی نظیر کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کی اردو شاعری پر اقبال کے اثرات اس قدر نمایاں ہیں کہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبرِ سخن تھا۔ اردو کی موجودہ شاعری خیال اور زبان کے اعتبار سے سراسر اقبال کی شرمندۂ احسان ہے "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" کی اشاعت سے شعری دنیا میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اس کے حیرت انگیز نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مرحوم کے غیر مطبوعہ اردو اور فارسی کلام کا آخری مجموعہ "ارمغانِ حجاز" کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔ عنقریب شائع ہو جائے گا۔ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور بدنصیب ہندوستان کو نعم البدل عطا کرے۔

آہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

علامہ اقبال کی وفات سے ہمارے دل و دماغ کو جو صدمہ پہنچا ہے اُس کے زخم سے ابھی خون کی تراوش جاری تھی کہ ہندوستان کے ایک اور فاضل اجل مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی رحلت کی خبر نے ہمیں حواس باختہ کر دیا۔ اخبارات سے اب تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ مولانا نے ۱۰ رمئی کی صبح کو جوالاپور میں جہاں وہ بغرضِ علاج تشریف فرما تھے، انتقال فرمایا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے اور اُن کے غمزدہ دوستوں، نیازمندوں، اور عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔

مولانا اکبر شاہ خاں صاحب اس بدبخت ملک کے اُن معدودے چند اشخاص میں تھے جنہوں نے حُبِ جاہ، حُبِ دنیا اور حُبِ زر سے قطعاً بے نیاز ہو کر اپنی تمام زندگی انتہائی بے نفسی و بے غرضی سے علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی ترغیب بھی انہیں ایک لمحہ کے لئے اس جادۂ مستقیم سے منحرف نہ کر سکی جسے وہ بطیبِ خاطر اختیار کر چکے تھے۔ وہ حیرت انگیز پامردی اور مستقل مزاجی سے عمر بھر حق و صداقت کی اُس راہ پر گامزن رہے جو حق پرست و حق آگاہ لوگوں کا حصہ ہے۔ مولانا کی سب سے زیادہ شہرت ایک مورخ کی حیثیت سے تھی اور یقیناً وہ تاریخ دانی میں ایک اجتہادی حیثیت کے مالک تھے۔ اُن کی بالغ نظری، اُن کے تبحر اور اُن کی صداقت پسندی نے انہیں ہندوستان کے اسلامی دور کا سب سے قابلِ اعتبار مورخ بنا دیا تھا۔ ان کی تصانیف اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہ ہندوستان اور ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کی خدمت ایک مورخ کی حیثیت سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے موجودہ مناقشات کی تہ میں غلط تاریخی روایات کام کر رہی ہیں۔ وہ آئینہ حقیقت نما کے ذریعے سے ہمارے شاندار ماضی کی صحیح تصویر دکھا کر ان غلط تاریخی روایات کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر دورِ رفتہ کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں تو ہمارا حال اور مستقبل بے حد خوشگوار بن جائے گا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے صبح و شام محنت کی اور یہی مقصد تھا جو وہ بلاتصنع لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے لاکھوں روپیہ پیدا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیوی تموّل کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا اور خاموش علمی زندگی کے سامنے دولت کے بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیا۔ مولانا اردو کے ایک زبردست انشا پرداز اور ادیب تھے۔ وہ تاریخی حقائق و واقعات کو ایسے شگفتہ انداز میں بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والا اُن کے اسلوبِ بیان سے مسحور ہو ہو جاتا تھا۔ باتیں کرتے وقت ان کی زبان کی روانی اور ان کے موزوں و مرصع الفاظ کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بے تکلف گفتگو بھی ادبی تحریر سے کم دلآویز نہیں ہوتی۔

مولانائے مرحوم اور علامہ اقبال کے درمیان نہایت مخلصانہ دوستانہ تعلقات قایم تھے اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو محبت و اخوت سے لبریز خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ یہ کس قدر دردناک اتفاق ہے کہ یہ دونوں عظیم المرتبت ہستیاں ایک مہینے کے اندر اندر دنیا سے اٹھ گئیں۔ راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں گزشتہ اٹھارہ برس سے نیاز حاصل تھا اور اس عرصے میں خلوص و نیازمندی کے یہ مراسم ترقی کر کے ایسے تعلقِ خاطر کی صورت اختیار کر گئے تھے جسے روحانی یگانگت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اُن کی موت سے راقم الحروف کو ذاتی طور پر اس قدر شدید اور المناک صدمہ پہنچا ہے کہ اُس کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔ ان کی موت ایک ایسے عزیز۔ مخلص، بے ریا، ہمدرد اور قابلِ اعتماد دوست کی موت ہے جس کی نظیر موجودہ زمانے میں ملنا ممکن نہیں۔ آہ

روز و شب رویا کئے شام و سحر رویا کئے
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

"ع"

آئینۂ عالم

بحرالکاہل کا سیاسی مدوجزر

سالانہ مصنوعی جنگ کے موقعے پر دنیا کے سب سے بڑے سمندر میں دنیا کا سب سے بڑا جنگی بیڑہ اس ہفتے حرکت کرے گا۔ وقت کے لحاظ سے اس مصنوعی جنگ کی کارروائی چھ ہفتوں پر محیط ہوگی اور فاصلے کے لحاظ سے مغربی ساحل سے لے کر جزیرہ ویک تک، اور الاسکا اور الیوشین سے لے کر خطِ استوا اور اس کے پار تک۔ یہ جنگی بیڑہ امریکہ کی بحری طاقت کا مظہر ہوگا۔

کئی سال سے امریکہ کی بحری قوت کا رخ مغربی جانب رہا ہے۔ اور ایک مدت سے اس کے جنگی کھیلوں کا مرکز بحرالکاہل ہے جو سیاسی نقطۂ نظر سے ایک اہم سمندر ہے۔ بحرالکاہل تقدیر کے مختلف امکانات کا حامل ہے۔ اس کی وسعت فتح کے ناقابل ہے۔ اس کے اطراف و جوانب پر کسی ایک حکومت کا جنگی بیڑہ نہیں چھا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود گزشتہ برسوں میں اس کے ساحلوں کے گرداگرد اور اس کے ان جزائر کے قرب و جوار میں جو سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں، باہم مخالف مقاصد کی ایک دوسرے سے الجھی ہوئی پیچیدہ راہیں اہلِ سیاست و تدبر کی نظروں میں روشن ہوئی ہیں۔

تجارتی شاہراہوں کی سرگرمیاں بھی اس سمندر کے آرپار پھیلی ہوئی ہیں۔ مغرب کی سمت سے ریشم افیم اور چاول آتے ہیں اور مشرقی سمت سے اوزار مشینیں اور ہتھیار اور بارود وغیرہ جاتے ہیں لیکن اس وقت لوگوں کی نگاہیں تجارتی کارگزاریوں کی بجائے جنگی جہازوں پر ہیں۔ دنیا کی عظیم ترین بساط پر مختلف قومیں برتری حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ امریکن بیڑے کے جنگی کھیلوں کا علاقہ جنوب اور مغرب کی طرف گزشتہ زمانے کی بہ نسبت زیادہ فاصلے تک پھیلتا جائے گا۔ لیکن بحرالکاہل کی سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے امریکہ کی یہ کارگزاری اس بڑے تماشے کے مقابلے میں بہت کم درجہ رکھتی ہے جسے گویا جنگ کی آزمائشی تیاری سمجھنا چاہئے۔

گزشتہ چند سال کے عرصے میں بحرالکاہل میں جو سیاسی چالیں اور ان کی مدافعانہ ربک تمام ظاہر ہوئی۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ کسی بڑے طاقتور اور کینہ ور دیوتا کی کارفرمائیاں تھیں بے رحم تقدیر اس سمندر کی سطح پر ایک خاص نقشہ بنانے میں مصروف ہے۔ اس کی نال سے ایسے ان گنت ڈورے لٹک رہے ہیں۔ جن کے تانے بانے میں کسی روز بہت سی قوموں کا برا یا اچھا انجام منسلک ہوگا۔ کسی کا انجام ریشم کی طرح ملائم اور درخشاں اور کسی کا سوت کی طرح معمولی۔ تقدیر کے یہ ڈورے بحرالکاہل کے اندر باہر ادھر ادھر گرداگرد اور آرپار، ہر طرف بنتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی ڈورا چین کے خون میں سرخ ہے۔ تو کوئی جزائر شرق الہند کے نیل سے سیاہ اور کسی کا سلسلہ آسٹریلیا کے روشن نیلے آسمان تک جا پہنچا ہے اور کئی اور ــ بے شمار ڈورے ادھر ادھر لٹک رہے ہیں ــــــ تقدیر اپنا یہ تانا بانا بہت عرصے سے تیار کر رہی ہے۔ لیکن یہ کبھی مکمل نہ ہو سکے گا اور اس کا نامکمل رہنا ہی ضروری بھی ہے۔ لیکن ہم ماضی قریب پر نظر ڈالنے سے موجودہ صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں اور شاید ہمیں اس جائزے کے دوران میں مستقبل قریب کی چند باتوں کی جھلک بھی دکھائی دے جائے۔

اگر ہم بحرالکاہل کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اس کی وسعت اور عظمت کا اندازہ ہوسکے گا نو ہزار میل لمبائی، سی آٹل سے یوکوہامہ تک چار ہزار دو سو میل کے پھیلاؤ میں نیلگوں پانی کا جلال چار بڑے اعظموں اور خشکی کے دو عظیم ٹکڑوں سے اتنے بڑے سمندر پر قابو نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کے جیتنے کا ذریعہ صرف وہ لاتعداد جزیرے ہیں جو اس کے چھ کروڑ اسی لاکھ مربع میل رقبہ پر جابجا بکھرے ہوئے ہیں یہی ایک ذریعہ ماضی میں تھا، یہی اب ہے۔ اور یہی آیندہ بھی ہوگا۔

حال کی طرح ماضی میں بھی یہی جزائر اس سمندر کے طوفانی خروش میں بنیادی پتھروں کی حیثیت رکھتے تھے سمندر کے ابتدائی سراغرساں، بادبانی جہاز کا مشہور سردار ملاح، کیپٹن کگ اور اپنے سیدھے سادے مضبوط بجروں میں پولی نیسیہ کے ملاح۔ یہ سب اور ان کے بعد بحرِ جنوبی کے تاجران جزیروں کو اس طرح استعمال کرتے رہے جس طرح صحرا میں نخلستانوں سے فایدہ اٹھایا جاتا ہے ان کی پرسکون خالی جھیلوں کی تلاش میں، اور ان کے مونگے کے ختم نہ ہونے والے ساحلوں تک اپنے پانی اور خوراک کے سفری ذخیروں کو مکمل کرنے کے لئے ملاحوں کو تازہ دم ہونے کا موقعہ دینے کے لئے اور شاید کبھی کبھی اپنے جہازوں کی مرمت کے لئے اور جب جہاز رانی میں بھاپ نے بادبان کی جگہہ لے لی تو ان میں سے کئی جزیرے ایندھن کا مرکز بن گئے۔ آج بھی کئی جزیرے اسی مقصد کے لئے مستعمل ہیں۔ ان میں بہت سے جزیرے حقیقی یا امکانی طور پر بحری یا ہوائی مرکز یا اسٹیشن ہیں جن سے جنگی بیڑوں کی حرکات کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔

بحرالکاہل کے چند علاقوں میں خصوصاً جنوبی اور مغربی حصوں میں یہ جزیرے اس انداز سے واقع ہیں کہ ان سے ایک سمندری کہکشاں سی بن جاتی ہے۔ لیکن اس وسیع طبقے میں جو Midway اور الیوشین اور جاپان اور شمالی امریکہ کے مغربی ساحل کے درمیان واقع ہے سطح سمندر کے نیچے چھپی ہوئی مونگے کی چٹانوں سے ٹکرا کر کوئی کف انگیز موج پیدا نہیں ہوتی۔ اس راستے کے سفر میں متواتر کئی دن تک بحرِ نیلگوں کا جلال ہی نظروں کو مرعوب کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے یا سمندری پرندوں کی تند و تیز چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ یا سمندر کا مسلسل خروش نگاہوں میں سماتا ہے۔

اس بڑے علاقے کے بہت سے حصے پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برتری منقوش ہے کیونکہ اس کے قبضے میں ہوائی کے خوبصورت سلسلۂ جزائر ہیں۔ نیز الیوشین اور مغربی ساحل کے محاذ بھی اس کے ماتحت ہیں۔

اس کے مقابلے میں جاپان کی سلطنت سہالن کی کہردں والی، منجمد ویرانیوں سے شروع ہوکر جنوب میں خط استوا تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ مغربی بحرالکاہل میں سب سے بڑی طاقت ہے اور اس کے معاون کرائل سے فارموسا تک پھیلے ہوئے چودہ سو جزیرے اور مونگے کی گیارہ سو چٹانیں ہیں جو ایشیائی براعظم سے انتیس سو میل کے فاصلے میں ایک مضبوط بند کی طرح منتشر ہیں۔

مختلف طاقتوں کی سیاسی بساط پر جنوبی بحرالکاہل کی اہمیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اس میں زیادہ تر آسٹریلیا اور بحرِ جنوبی کے برطانوی جزائر کا اقتدار قائم ہے۔

اس شاندار کھیل میں جس کا دارومدار لاٹھی اور بھینس کے مقولے پر ہے۔ جاپان دراز دستیاں کررہا ہے۔

شمال مغربی بحرالکاہل میں جاپان کی جیت کی ناقابل تسلیم حیثیت کو ۱۹۲۲ء کے معاہدۂ واشنگٹن سے اور مدد ملی۔ اس معاہدے نے دنیا کی بحری طاقتوں کی باہمی نسبت کو اس درجے پر لاکھڑا کیا کہ دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں (ریاستہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ) کے لئے شمالی مغربی بحرالکاہل میں مناسب مستقروں کے بغیر اپنی قوت کو بڑھانا ناممکن ہوگیا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کی رو سے (اس کے دوران میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک) کسی نئے مستقر کا قیام یا موجودہ آسانیوں کو مضبوط کرنا بھی ممنوع تھا۔ البتہ جاپان یا ایشیائی سواحل کے جاپانی مستقر اس عہد نامے سے مستثنےٰ تھے۔ اس وقت سے اب تک جاپان نے کون کون سی شاطرانہ چالیں چلی ہیں؟

ایشیا میں جاپانی حکومت کی فراخی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ اس کشادگی سے بحرالکاہل کی بساط پر جو اثرات

ہوئے یا ہو سکتے ہیں وہ اس قدر عام نہیں ہیں۔ کوریا اور جزیرہ نما کوان
تنگ پر قبضے کی وجہ سے معاہدۂ واشنگٹن کے وقت بھی جاپان کو
فوقیت حاصل تھی۔ بحیرۂ جاپان میں اس کا اقتدار تھا اور آبنائے سوشیما
اس کے ہاتھوں میں تھی۔ مانچوکو پر جاپانی قبضے سے نہ صرف جاپان کے
تیل اور دیگر خام مواد کے ذخائر میں اضافہ ہوا۔ بلکہ اس سے روس
کے اُس خنجر کے کند ہو جانے سے جس کا مقصد جاپان کے قلب
کی گہرائیوں میں اتر جانا تھا۔ جاپان کو زیادہ اقتدار حاصل ہو گیا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ جاپان
دراز دستیاں کر رہا ہے اور ہم بحر الکاہل اور اس کی حدود پر واقع
ساحلوں کے نقشے کا مطالعہ کرنے سے اُن تمام شاطرانہ چالوں پر غور
کر سکتے ہیں جن سے گزشتہ دس سال کے عرصے میں تاریخ عالم
میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

دنیا کے سب سے بڑے سمندر کی بساط پر تین مختلف قومیں
—— ریاستہائے متحدہ امریکہ، جاپان اور روس —— اپنے جہازوں
اور طیاروں کے مہرے بڑھاتی رہیں۔ اور نئے محاذ، نئے مرکز اور
نئے بنیادی پتھر قائم کرتی رہیں اور تینوں —— برطانیہ، فرانس
اور نیدرلینڈز اول اول تو چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں لیکن کچھ
عرصے سے انہوں نے بھی اس بڑی بازی کی کشمکش میں شدت سے حصہ
لینا شروع کر دیا ہے۔ اب سنئے ان چالوں اور مدافعانہ اقدامات کا
بیان جنہیں ارتقائی منازل ایک نامعلوم انجام کی طرف لئے جا رہی ہیں۔

چال

مختلف بازی گروں کی شعبدہ بازی سے چین کے قدیم
مانچو تخت پر ایک ایسا شہنشاہ براجمان ہوتا ہے جو محض ایک کٹھ پتلی
کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بازی گر ٹوکیو کے ہیں۔ جاپان کی کوان تونگ
فوج کا صدر مقام ہسی کنگ قرار پاتا ہے اور یہ فوج خینگان کے مقام
پر قلعہ بندی کرتی ہے۔ اس کی قوت ترقی کرتی اور پھیلتی ہے اور یہ آمور
کی سمت بڑھتی ہوئی مغرب کی طرف منگولیا تک جا پہنچتی ہے۔ خیال
کیا جاتا ہے کہ اس وقت جاپان کی پانچ لاکھ فوج جو بہترین دستوں
پر مشتمل ہے مانچوکو میں موجود ہے۔ اور مانچوکو کی لاکھ سے ڈیڑھ
لاکھ تک کی دیسی فوج اس کے علاوہ ہے۔ تمام سرزمین پر ہوائی میدان
پھیلے ہوئے ہیں۔ جنوب کی مانچورین ریلوے سیاسی نقطۂ نظر سے
اہم شاخیں کھولتی ہے۔ ولاڈی واسٹک کے نزدیک راشین کے
مقام پر ایک بحری مستقر قائم کیا جاتا ہے اور اس کے قریب ہی سے
شین اور یوکی کے مقامات پر بحری مرکز تعمیر کئے جاتے ہیں۔ جاپانی
سمندر پر اب پہلے سے بھی زیادہ یقینی طور پر جاپان کا اقتدار ہے۔
اور مشرق کے ساتھ روس کے ذرائع گفت و شنید کے اطراف پر
بھی جاپان موجود ہے۔

مدافعانہ اقدام

روس کی مشرق بعید کی فوج ہتھوڑے اور درانتی کا سرخ جھنڈا
لہرا رہی ہے۔ اس کا صدر مقام خبرانسک ہے اور اس کی قوت تین لاکھ
افراد سے زاید ہے۔ سرحدی محافظ اور گن بوٹ دریائے آمور
پر گشت کر رہے ہیں۔ مانچوکو کی سرحد پر جابجا مورچے اور ہوائی مرکز
قائم ہیں۔ کسانوں کی کمک جو ابھی تک بھیڑ کی کھال کی فوجی وردی پہنتی
ہے۔ امدادی علاقوں میں مجتمع ہے۔ ٹرانس سائبیرین ریلوے شاخیں
قائم کر رہی ہے۔ ایک شاخ جھیل بیکال کے شمال کی طرف سے خم
کھاتی ہوئی جاتی ہے اور یہ شاخ جاپانیوں کے آیندہ جارحانہ اقدام
سے محفوظ رہے گی۔ برف توڑ جہاز برفانی سلوں کو چیرتے ہوئے
بحر منجمد شمالی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس طرح روس اور مشرق کے
درمیان آمد و رفت کا ایک نیا راستہ قائم ہو گیا ہے۔ روس کے عظیم الشان
جنگی طیارے اپنی ہلاکت خیز پروازوں سے بحیرۂ جاپان کو عبور کرتے ہوئے
جاپان کی سرحد تک پہنچ سکتے ہیں اور ایسے بے شمار جہاز سائبیریا کے
نئے تعمیر شدہ ہوائی مرکزوں میں ہر وقت عمل کے لئے تیار رہیں۔
کوموسمسک (جو دریائے آمور کے کنارے واقع ہے) اور نکولیوسک
(جو بحیرۂ اوکٹسک کے کنارے واقع ہے) کے مقامات پر جہاز سازی
کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ مشرق سے جہازوں کے ٹکڑے چھکڑوں
پر لاد کر ولاڈی واسٹک کی بندرگاہ تک لائے جاتے ہیں اور یہاں
سے بحر منجمد میں اتارے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کے علاقے
گویا فوجی کیمپ ہیں۔

ولاڈی واسٹک کے مخصوص مقامات پر توپیں چمکتی ہوئی دکھائی
دیتی ہیں اور ملک کے اندرونی حصوں یعنی صحرائے گوبی میں منگول قوم
کے تربیت یافتہ گھوڑ سوار جنہیں روسی فن جنگ کی تربیت دی گئی ہے
سرحد پر گشت کرتے ہیں۔ اس طرح اُولان بیٹر ماسکو کے نزدیک

ہو گیا ہے اور روسی طاقت جاپانی مانچوکوا کے دونوں پہلوؤں پر مستحکم ہو گئی ہے۔

چال

ایک جاپانی نو آبادی دیوؤں کے اردگرد قایم ہو رہی ہے۔ جاپان کے پست قد باشندے امریکی فلپائن جزائر میں بھنگ کی تجارت پر قبضہ جما رہے ہیں۔ فارموسا کا جنوبی حصہ جو مینیلا سے صرف پانچ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ سلطنت جاپان کے لئے اس سرحد پر ایک مضبوط قلعے کا کام دیتا ہے جس کا بحری محاذ باکو کے مقام پر ہے۔ جہاں پر جاپانی ہوائی مرکز ہے اور جاپانی افواج کی چھاؤنی ہے۔ یہ علاقہ اصلی جاپان کے ساتھ راکش کی لڑی کے ذریعے سے ملحق ہے اور اس کا محاذ امامے اوشیمہ کے مقام پر ہے۔ جس کی قلعہ بندی اچھی طرح سے کی گئی ہے اور جو شمالی بحیرۂ چین کی حفاظت کرتا ہے۔ جاپان نے انجمن جمعیتہ الاقوام کی پروا نہ کرتے ہوئے بحرالکاہل کے بہت سے منفعت بخش جزائر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ جاپان نے میرینا کے علاقے، مارشل اور کیرولین کے جزائر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ جزائر نہ صرف تجارتی نقطۂ نگاہ سے ہی مفید ہیں بلکہ قدرتی ہوائی مرکز بھی ہیں جاپان کے بحری انجنیران لاتعداد جزائر کے راستوں میں جو مونگے کی چٹانیں آتی ہیں ان کی پیمایش کر رہے ہیں اور اپنے جہازوں کے لئے راستے تلاش کر رہے ہیں نیز جہاز سازی کے کارخانے قائم کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ ہوائی بندر تعمیر کر رہے ہیں۔ جہازران اور طیارچی ان جزائر کو بحری اور ہوائی راستوں کے ذریعے سے آپس میں ملا رہے ہیں۔ ان جزائر میں سے مشہور جزیرے یہ ہیں۔ سیپان، یاپ، پناپ، اور ٹرک جزائر کا گروہ، اور پالاؤ جو نیدرلینڈ کے جزائر شرق الہند سے چار سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن فلپائن سے اس سے کچھ زیادہ فاصلے پر ہے اور جزیرہ جلوت جو سلطنت جاپان کا مشرق کی طرف مضبوط ترین قلعہ ہے۔

مدافعانہ اقدام

فضا میں اپنے طیاروں کو لئے ہوئے اور سطح سمندر پر آبی جہازوں کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا بیڑا مغرب کی طرف بلکہ اس سے بھی آگے اپنے جنگی کھیلوں میں حصہ لیتے ہوئے بڑھ رہا ہے۔ سمندری پرندے طیاروں کی آواز سے ڈر کر اپنے گھونسلوں سے اڑتے ہیں اور مشرقی سورج کی چندھیا دینے والی روشنی میں گردش کرتے ہیں۔ یہ پرندے مڈوے کے صحرائی علاقے سے اور فرانسیسی فرائی گیٹ کی مونگے کی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے، بیکر سے، اور کنگ مین ریف سے اڑتے ہیں۔ ساٹھ چھوٹے ہوائی میدان فلپائن جزائر کے آرپار قایم کئے گئے ہیں۔ اور ان کی حد بٹن تک ہے۔ بٹن کا مقام جاپانی فارموسا سے شمال کی طرف ایک سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کے جنوب کی طرف بورنیو ہے۔ فلپائن کے لوگ اپنی آزادی کو نزدیک دیکھ کر جنرل ڈگلس میک آرتھر کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ اپنی فوجی طاقت کو منظم کر رہے ہیں۔ نہر پانامہ کے سروں پر جو امریکہ کا اہم بحری راستہ ہے، امریکن فوجیں ہر وقت متعین رہتی ہیں پیشتر سے زیادہ قلعہ بندیاں کی جا رہی ہیں۔ اور غیر ملکی جاسوسوں کی پوری پوری نگرانی کی جاتی ہے۔

چال۔

جاپانی ملاح بحیرہ اوکٹسک میں مچھلیاں پکڑنے کی خاطر اپنے جال ڈالتے ہیں لیکن ان کی یہ تجارتی کارگزاریاں الیوشین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کاواساکی بندرگاہیں نئے جہاز تیار ہو رہے ہیں۔ یہ جہاز سان پیٹرو اور سینٹی یو کے درمیان گشت لگاتے رہتے ہیں اور جاپان کے لئے ایندھن کا ذخیرہ جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ جنگ میں کام آئے۔ جاپانی بحری بیڑہ اپنی نقلی جنگ کا مظاہرہ شمال میں کوہائل سے آگے تک کرتا ہے

مدافعانہ اقدام

روس نے بحر منجمد شمالی میں دو نئی بندرگاہیں — ایان اور اوکٹسک — تیار کی ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے الیوشین میں ایک موسمی رصد گاہ قایم کی ہے اور پاس کے سمندروں کی بحری پیمائش بھی شروع کر دی ہے۔ یوں اس سیاسی کھیل کی رفتار تیز تر ہوئی جا رہی ہے ۱۹۳۶ء کے اختتام سے ڈرامے میں ایک شدت پیدا ہو رہی ہے۔ بحری پابندیوں کے متعلق معاہدے ختم ہو گئے ہیں۔ بحرالکاہل میں قلعہ بندیاں کرنے پر جو پابندیاں عاید کی گئی تھیں وہ اٹھالی گئی ہیں۔ اور جاپان نے ۱۹۳۷ء کے دوران سے ایک عظیم الشان فتح کی طرف قدم بڑھا دیا ہے۔

چال۔

پیکن کے نزدیک جو قدیم خاندانوں کا دار الخلافہ تھا اور جو قدیم شاندار روایات کا حامل تھا، ایک نئے اقدام کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اقدام بھی خوفناک جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جاپان نے پیکن پر قبضہ کر لیا ہے اور تمان شین پر بھی قابو پا لیا ہے اور شانسی کی لوہے کی کانوں کو بھی اپنے ماتحت کر لیا ہے اور اپنا اقتدار نانکو کے درے اور کالگان تک بڑھا لیا ہے۔ منگولیا کے میدان کا راستہ بھی جاپان کی زیر نگرانی ہے اور یوں روس کے مقابلے پر جاپان نے اپنی حفاظت کر لی ہے۔ جنوب میں شنگھائی کے علاقے پر بھی جاپانی پرچم لہرا رہا ہے۔ ان فتوحات کے باوجود جاپان کی کوششیں مزید علاقوں کے لئے پوری قوت سے جاری ہیں۔ جاپانی جہاز چین کے ساحل پر ڈٹے ہوئے ہیں اور فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مفاد کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جاپان نے برطانوی ہانگ کانگ پر بھی ہاتھ بڑھانے شروع کر دئے ہیں۔ جاپانی فتح کی وجہ سے اب چین کے زرخیز علاقوں میں دوسری اقوام کے لوگ جا کر فایدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

مدافعانہ اقدامات۔

۱۔ برطانیہ۔

ہانگ کانگ کی شاہی نوآبادی کی بلند پہاڑیوں پر نئے مورچے قایم ہو رہے ہیں۔ سراوک کے ربڑ کے جنگلوں میں اور شمالی بورنیو کے کھیتوں میں نئے ہوائی میدان بنائے جا رہے ہیں۔ سنگاپور کے مشہور بین الاقوامی بحری مرکز کو ان پیش آنے والے خطرات کے پیش نظر زیادہ مستحکم کر دیا گیا ہے۔ پینانگ کے مقام پر توپخانے قایم کئے گئے ہیں اور بارکیں بنائی جانے لگی ہیں۔ برطانیہ نے بحیرۂ چین کی جنوبی شاہ راہ کو بند کر دیا ہے۔ اسی سلسلے میں برطانیہ نے آسٹریلیا کی حفاظت کے لئے ڈارون کی بندرگاہ کو بھی زیادہ مضبوط کر لیا ہے۔ آسٹریلیا روز بروز امریکہ سے بحری اور ہوائی جہاز خرید رہا ہے۔ برطانوی کولمبیا میں وین کوور کی حفاظت کے لئے ہوائی حملوں کی مدافعت میں نیا توپ خانہ حاصل کیا گیا ہے۔ بحر الکاہل میں برطانوی وقار کے برقرار رکھنے کے لئے اسکمالٹ کے مقام پر قلعہ بنایا گیا ہے۔

۲۔ فرانس۔

فرانس کے نئے جہاز مشرقی سمندروں میں موجود ہیں۔ دوہرے انجنوں والی بم بار کشتیاں فرانسیسی ہند چینی میں کامرانہ خلیج کے اندر ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ اس فرانسیسی نوآبادی کی فوجی طاقت پچیس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن دیسی فوج اس میں شامل نہیں۔ فرانس کی بحری کوششیں تیناآن کے مقابل جاری ہیں اور سیگون میں قلعہ بندیاں ہو رہی ہیں۔

۳۔ نیدرلینڈز

نیوگنی کے ساحل پر آبدوز جہازوں اور بحری ہوائی جہازوں کے مرکز قایم کئے گئے ہیں۔ نیدرلینڈز کے بورنیو کے تیل کے چشمے جن پر جاپان کی حریصانہ نگاہیں ہیں۔ ان کی حفاظت کا سامان مکمل کر لیا گیا ہے۔ امریکہ سے مارٹن بمبار جہاز اور جرمنی سے ڈورنیئر ہوائی جہاز خریدے گئے اور یہ جہاز ملکا اور بحیرۂ باندہ کی حفاظت کے لئے پرواز کرتے رہتے ہیں۔ نیدرلینڈز میں مختلف قسم کے نئے جہاز تعمیر کئے جا رہے ہیں اور یوں نیدرلینڈز والے اپنے مشرقی مقبوضات کی حفاظت کے لئے ہر طرح سے مستعد ہیں۔

۴۔ روس۔

روس چین کی خاموش مدد کر رہا ہے۔ روسی ہوائی جہاز سن کیانگ کے اوپر سے ایک طویل راستہ طے کرتے ہوئے چیانگ کیشک کی مدد کے لئے پہنچتے ہیں جو جاپان کے پنجے سے اپنے ملک کو بچانے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے۔

۵۔ ریاست ہائے متحدہ (امریکہ)

امریکہ کی متحدہ ریاستوں نے سیاسی لحاظ سے ایک اہم راستہ تعمیر کیا ہے جو درۂ کول کو عبور کرتا ہوا گزرتا ہے۔ اسی قسم کے اور اہم راستے جزیرۂ ہوائی کے اناناس کے کھیتوں پر سے گزرتے ہوئے مقرر کئے گئے ہیں۔ سولہ انچ کے دہانے والی توپیں بحر الکاہل کی حفاظت کے لئے متعین ہیں۔ ہاوے اور دیک کی مونگے کی چٹانیں بارود سے اڑائی جا رہی ہیں۔ سمندری راستے گہرے کئے جا رہے ہیں۔ گام کے مقام پر گشت کرنے والے جہازوں کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور مرکز الاسکا میں ستکا کے مقام پر قایم کیا گیا ہے۔ کوڈیک کو محاذ کی حیثیت دی جانے والی ہے۔ الیوشین کے چٹانوں والے علاقے میں زیادہ سے زیادہ جہاز مجتمع کئے جا رہے ہیں۔ خطِ استوا کے زیریں جزائر تک طیاروں کی پرواز جاری ہے یہاں تک کہ نئے ہوا کے

جزیرے تک ان کارفرمایوں کے اثرات پہنچ رہے ہیں۔ مصنوعی جنگ کے کھیلوں کے سلسلے میں امریکن بیڑہ مغرب ہی کا رُخ کرتا جا رہا ہے۔ اس وقت تمام چالیں پردہ راز میں رکھی جا رہی ہیں۔ جاپانی جہازوں کے کارخانوں کا راز پوشیدہ ہے " برطانیہ کو ٹوکیو کے جہازوں کا خدشہ تین بڑے جنگی جہاز جاپان میں " ——— ایسی سرخیاں اخباروں میں روزانہ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن کوئی غیرملکی شخص حقیقت حال سے واقف نہیں ہو سکتا۔ سیام کا ڈکٹیٹر کرنل پھیا یا کھوان جاپانیوں کی مدد سے اپنی فوجی طاقت کو منظم کر رہا ہے اور جاپانی مزدور کرا کے علاقے میں کسی پُراسرار کام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سیام کے آر پار ایک نہر کے تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور یہ نہر جاپان کے لئے سنگاپور تک پہنچنے میں آسانی پیدا کر دے گی۔

امریکہ والے بھی اپنی چالوں کو خفیہ رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مصنوعی جنگ کے دوران میں بیڑے کے ساتھ کسی بھی نامہ نگار کو جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ الاسکا اور دوسرے جزائر میں ایسی باتیں رونما ہو رہی ہیں جو سیاسی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ امریکی کانگرس سے ایک عظیم الشان بحری پروگرام کے منظور کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بحرالکاہل کے ساحل پر فوجی طاقت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

لیکن ابھی یہ کھیل پورا نہیں ہوا۔ ادھورا ہی ہے۔ سب سے پہلے چین پر جاپانی حملے ہی کو لو۔ یہ بھی تا دمِ تحریر نامکمل ہے۔ جاپان کی طاقت مغربی بحرالکاہل میں ہنوز مسلم ہے۔ جنوب میں فارموسا سے لے کر شمال میں ہاکوڈیٹ تک جاپان کی طاقت پہلے سے زیادہ مضبوط ہے۔ لیکن اس سمت میں جاپان کا اقتدار اور جاپانی فتوحات کا امکان رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہالینڈ، انگلستان اور فرانس جنوب کی طرف جاپان کے راستے میں حائل ہیں۔ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر امریکہ والے بھی ہوائی اور الیوشین کی طرف سے بحرالکاہل میں اپنا اقتدار بڑھا رہے ہیں۔ " انکل شام " کا سایہ مغربی بحرالکاہل اور ایشیا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ روس کے فوجی طاقت اس محاذ پر مضبوطی سے متعین ہے۔ اگرچہ وہ فی الحال اپنے آپ کو روکے ہوئے ہے۔

یہ کھیل یا سیاسی ناٹک اس طور پر جاری ہے۔ چالیں چلی جا رہی ہیں اور ان کے مدافعانہ اقدامات کا بندوبست بھی مکمل ہو رہا ہے۔ یہ کھیل طرح طرح کی مشکلات اور خطروں کی وجہ سے غیریقینی سا ہے۔ اگر کسی ملک کی طرف سے ایک بھی غلط قدم اٹھا لیا گیا تو اُس سے بہت سے غیرمتوقع امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن فی الحال تمام سیاسی چالباز اس کوشش میں ہیں کہ پرامن طریق سے اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ مگر آخری فیصلہ قسمت کی اُسی دیوی کے ہاتھوں میں ہے جس نے سیاسی بساط پر مختلف ڈورے لٹکا رکھے ہیں۔

بسنت سہائے

رباعی

ہے یار سے آج رات پہلو آباد
وقف ہے غلام بخت سے خانہ زاد
ہے ہم کو کل عجیب تر سے سی
یارب یہ شب لیلہ تا ابد زندہ باد

سعید احمد اعجاز

چار یاری

ہوٹل میں تقریباً ہر روز شام کے کھانے کے بعد ایک لمبی نشست ہوتی تھی۔ بعض لوگ کھانا کھا کر یوں ہی تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے تھے۔ کبھی کبھی سامنے کالج کے ہوسٹل سے طلبہ دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ صرف چائے پیتے یا ہماری باتیں سنتے تھے۔ اس بات کا احساس کہ وہ اپنے ہم عمر و مکتب ساتھیوں کی گفتگو میں نہیں بلکہ جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں کی مجلس میں شریک ہیں ان کے اندر ایک خاص قسم کی برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ شام کی یہ محفل ہوٹل کی معاشرتی زندگی کا ایک ایسا نمایاں اور دلآویز پہلو بن گیا تھا کہ اس کی ہنگامہ خیز رونق ہمارے لئے کھانے سے زیادہ ضروری تھی۔ ڈاکٹر یزدانی جنھیں نامعلوم طریقے سے اس مجلس کی غیر رسمی صدارت کے فرائض حاصل ہو چکے تھے ایک طبیب تھے جو بیک وقت یونانی اور ہومیوپیتھک طریقِ علاج کے ماہر تصور کئے جاتے تھے ہر چند کہ اُن کی شفا بخشیوں کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ شاید ہزاروں میں سے دو آدمی بمشکل اُن سے صحت یاب ہوتے ہوں گے۔ ڈاکٹر یزدانی مستقل طور پر ہوٹل میں مقیم تھے اور اُن کا مطب شہر کے اس حصے میں واقع تھا جہاں دھوبی، مزدور، چمار اور شاگرد پیشہ لوگوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طبقے کے لوگ خوش عقیدہ ہونے کے علاوہ اپنے معالج کے احکام کی تعمیل اُسی وفاداری سے کرتے ہیں جس سے ایک مرید اپنے مرشد ہدایت کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اگرچہ انہیں اپنی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بظاہر وہ یہی کہتے سنے جاتے تھے "میں طب جیسے شریف اور معزز فن کو دکانداری بنانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ غریبوں کی خدمت کروں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنا مطب بھی ایسی جگہ کھول رکھا ہے جہاں مجھے تنگدست محتاج اور مفلوک الحال لوگوں کی خدمت کے موقعے زیادہ ملتے ہیں۔ امرا اگر بیمار پڑیں تو انہیں روپیہ پانی کی طرح بہانے میں کیا دریغ ہو سکتا ہے لیکن غریبوں کی خدمت ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اپنا نفس مار چکا ہو"۔

جمال اسعد جو یار لوگوں میں صرف جمالی کے نام سے مشہور تھے ہوٹل کی ایک اور نمایاں شخصیت تھے۔ یہ گریجوایٹ تھے اور بننے ٹھنے رہنے اور خوش پوشی میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ اِن کا مستقل قیام بھی ہوٹل میں تھا۔ یہ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تھے اور انگریزی لکھنے اور بولنے میں انہیں بہت ملکہ حاصل تھا۔ جمالی کا قد لمبا اور رنگ سانولا تھا لیکن کپڑے پہننے کا انہیں ایسا سلیقہ تھا کہ لباس کی سج دھج سے اُن کی رنگت بھی نکھر جاتی تھی بلکہ بعض دفعہ تو ہم کہہ اٹھتے تھے کہ "اگر جمالی کے ہاں صباحت زیادہ ہوتی تو شاید اس کی جامہ زیبی کم ہو جاتی"۔ جمالی اچھا بذلہ سنج اور خوش گفتار شخص تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کی خوش کلامی اُس کے روزگار میں اُس کی مدد نہ کرتی تھی۔ اپنے پیشے کے اعتبار سے وہ چنداں کامیاب نہ تھا۔ جب کہیں چار آدمی جمع ہوتے وہ بیمے کے فوائد اور اپنی کمپنی کی عظمت و وسعت کے قصے لے بیٹھتا تھا۔ ہم ہمیشہ اس سے کہتے تھے کہ "کونین کی گولی کو شکر میں لپیٹ کر دینے سے اُس کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ تم بھی حرفِ مطلب زبان پر لانے سے پہلے میٹھی میٹھی باتوں کا جال پھیلا لیا کرو"۔ لیکن وہ اس بارے میں ہم سے اختلاف رائے رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کاروباری معاملات میں ہمیشہ صاف سیدھی اور دو ٹوک بات ہونی چاہیئے۔ جمالی گاہے گاہے شام کو مے و مینا کا شغل بھی کرتا تھا اور جب وہ عالمِ کیف میں لہک لہک کر باتیں کرتا تو اس کی طبیعت کی شگفتگی اور زبان کی روانی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

اس مجلس کے ایک اور رکن حضرت رسوا تھے۔ ان کا پورا نام مشتاق علی رسوا تھا اور اردو کے ایک روزنامہ اخبار کے عملۂ ادارت میں منسلک تھے۔ انہوں نے رہائش کا انتظام کہیں باہر کر رکھا تھا۔

اور کھانا دونوں وقت ہوٹل میں کھاتے تھے۔ یہ تھے تو پنجاب کے ایک دور افتادہ گوشے کے باشندے لیکن اتفاق سے انہیں کہیں دو سال لکھنؤ کے مضافات میں بسر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اب وہ اپنے لب و لہجہ میں نہایت کوشش سے لکھنوی رنگ پیدا کرتے تھے اور پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لہجے پر اکثر ناک بھوں چڑھاتے رہتے تھے۔ ان کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا اور اپنا کلام ہمیشہ ترنم سے پڑھ کر سناتے تھے۔ انہیں عموماً حلق کی خرابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے جب بھی اُن سے کلام سنانے کی فرمائش ہوتی تھی وہ اپنے حلق کی خراش کا ذکر چھیڑ کر معذوری کا اظہار کر دیتے تھے۔ رسوا دوہرے بدن کے اچھے مضبوط آدمی تھے۔ کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور شیروانی ان کا لباس تھا۔ سر پر کبھی کبھار ٹوپی پہنتے تھے اور شیروانی کے اوپر کے بٹن اکثر کھلے رکھتے تھے۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر جب ان کی باتیں شروع ہوتیں تو کسی دوسرے آدمی کا بولنا محال ہو جاتا تھا۔ دن بھر کی خبریں سناتے ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے اور ساتھ ہی ساتھ بیرونِ ہند کے واقعات کا بھی جائزہ لیتے جاتے تھے۔ انہیں تنخواہ بہت بے قاعدگی سے ملتی تھی اس لئے صحافت کے پیشے کو اکثر صلواتیں سنایا کرتے تھے لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ اخبار نویسی شراب، افیم اور چانڈو کی طرح ایک نشہ ہے جس کی عادت پڑ جائے تو ترک کرنا مشکل ہو جاتا ہے حال ہی میں اُن کے خیالات پر اشتراکیت کا رنگ چڑھ رہا تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اخبار کی ساری آمدنی اخبار کے مالک اپنے صرف میں لے آتے تھے اور کارکنوں کو فاقہ کرنا پڑتا تھا۔

ایک اور صاحب بدر الحسن تھے۔ یہ ایک مقامی اسکول میں مدرس تھے اور مڈل کی جماعتوں کو پڑھاتے تھے وہ ہمیشہ اپنے ہیڈ ماسٹر کی شکایت کرتے تھے اور زمانے کی قدر ناشناسی کا شکوہ بھی اُن کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ انہیں اپنی قابلیت کا بہت زعم تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ اسکول کی انتظامیہ انجمن کے اراکین جاہل ہیں اور لائق آدمیوں کی قدر کرنا نہیں جانتے ان کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر کافی تھا لیکن درس و تدریس کے بے کیف مشاغل کی وجہ سے اُس پر یبوست کی ایک تہ سی جم گئی تھی جس سے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص خشک مزاج ہے۔ جب کبھی ہنسی مخول کی باتیں شروع ہوتیں تو بدر الحسن کی فطری ظرافت کا جوہر چمک اٹھتا تھا اور وہ بڑھ بڑھ کر ایسے لطائف بیان کرتے کہ مجلس میں قہقہے بلند ہونا شروع ہو جاتے۔

ہر روز اِدھر شام کا کھانا ختم ہوا اور اُدھر، گرمی ہو تو صحن میں اور سردی ہو تو آتش دان کے قریب، ہم نے کرسیاں بچھالیں اور ایک ایک کر کے یارانِ سرِپل آ کر جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر یزدانی طب کی عظمت کا راگ الاپ رہے ہیں اور اپنی حذاقت کے افسانے سنا رہے ہیں۔ شہر میں اگر کوئی وبائی مرض پھیل رہا ہے تو اُس کے اسباب اور اُس کے بچنے کی تدبیریں بتا رہے ہیں۔ کبھی کسی مریض کا قصہ لے بیٹھتے ہیں۔ تو سر اونچا کر کے اور گردن ہلا ہلا کر اپنی تشخیص اور معالجات کی کامیابی کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ گویا مسیحائے زماں آپ ہی ہیں۔ اس دوران میں جمالی پکار اٹھتا ہے "سبحان اللہ، آپ تو جالینوسِ وقت اور افلاطونِ دہر ہیں۔ میں حیران ہوں کہ حکومت نے اب تک آپ کی قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا اور آپ کو حاذق الملک کا خطاب کیوں نہیں عطا ہوا۔ سچ ہے دنیا میں جوہرِ قابل کی قدر نہیں ہوتی۔ یزدانی صاحب۔ آپ دل میلا نہ کیجئے۔ آفتاب کب تک بادلوں کے نیچے چھپا رہے گا۔ اس کی روشنی ایک نہ ایک دن عالم کو منور کر کے رہے گی"۔ پھر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے ہماری طرف دیکھ کر جمالی کہتا "دوستو۔ کیا بتاؤں۔ آج کل طب کا پیشہ کس خراب ہو چکا ہے۔ بدنام کنندۂ نکونامے چند کی قسم کے ڈاکٹروں نے اس معزز فن کو بے حد ذلیل کر رکھا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہماری کمپنی میں ایک فرضی شخص کا پچیس ہزار روپے میں بیمہ کرایا گیا اور کچھ عرصے کے بعد اُس شخص کی موت کی اطلاع دے کر کمپنی سے یہ رقم وصول کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مشہور ڈاکٹر بھی اس سازش میں شریک تھا۔ کمپنی کے افسروں کو کسی طرح اس فرضی کارروائی کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ تفتیش کے بعد مقدمہ عدالت کے سپرد ہوا تو ملزموں کو تین تین سال قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ ڈاکٹر بھی بڑے گھر جا پہنچا ہے۔ یوں تو خدا کسی پر بُرا وقت نہ لائے۔ لیکن یزدانی صاحب، آپ ذرا احتیاط کیا کیجئے گا۔"

اتنے میں رسوا پان چباتے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھانس کر کہتے "ارے بھئی جمالی یہ بیمے کا سارا کاروبار ہی فریب۔ آج کل جسے دیکھو بیمہ کمپنی بنائے بیٹھا ہے۔ سب سرمایہ داری کے ہتھکنڈے ہیں۔ یہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر جو اشتراکیت کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ بڑی بڑی بیمہ کمپنیوں کے مالک ہی تو ہیں۔ ہزاروں

روپیہ ماہوار وصول کرتے ہیں۔ کمپنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ روپیہ غریبوں کا ہضم
ہوتا ہے اور لوٹ مار کرنے والے ڈائرکٹر صاف بچ نکلتے ہیں۔ اس
زمانے میں مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرنے والے اداروں کا بنیادی
اصول ہی یہ ہے کہ تمام دنیا کو لوٹو اور چند آدمی مل کر کھاؤ۔ میں تو تم سے
یہ کہوں گا کہ اس کام کو چھوڑ دو۔ تم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ ماشاءاللہ
اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر تمہیں قدرت ہے۔ کیوں نہیں اپنی
قابلیت کے شایانِ شان کوئی معزز اور آزاد روزگار اختیار کرتے۔
صحافت کی اگرچہ ہندوستان میں اتنی قدر و منزلت تو نہیں جتنی انگلستان
میں ہے لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی اس پیشے کا وقار اور زور
باقی سب پیشوں سے زیادہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تم اس طرف
آجاؤ تو بہت کامیاب ثابت ہوگے، اور پھر اصل چیز تو عزت ہے۔
روپیہ عزت کے مقابلے میں کیا چیز ہے۔ ایک اخبار نویس کی طاقت کے
سامنے بادشاہوں کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔

بدرالحسن جو اپنے شاگردوں کی کاپیاں اصلاح کے لئے ہوٹل ہی
میں لے آیا کرتے تھے ایک طرف اپنے کام میں مصروف ہیں۔ سب
کچھ سن رہے ہیں لیکن انجان بنے بیٹھے ہیں۔ پھر یکایک سر اٹھاتے اور
ہنس کر کہتے ہیں" رسوا صاحب، آپ پھر وہی صحافت کا قصہ لے بیٹھے۔
میری رائے تو یہ ہے کہ جس کو بھوکوں مرنا ہو وہ اخبار نویس بن جائے
جس کو گھر پھونک تماشا دیکھنا ہو وہ اخبار نویس بن جائے اور جس
غریب کو جورو کا زیور بیچ کر سوفی صدی خسارے کے سودے میں
روپیہ لگانا ہو وہ بھی اخبار نویس بن جائے۔ آخر صحافت میں رکھا کیا
ہے۔ اپنی دکان چمکانے کے لئے ہندو مسلمان میں فساد کون کراتا ہے؟
اخبارات۔ آزادی کی تانیں اڑا اڑا کر درپردہ حکام کی چوکھٹ پر سجدے
کون کرتا ہے؟ اخبارات۔ عوام کو ایثار اور اشتراکیت کی تعلیم دے دے
کر مزدوروں کا خون کون چوستا ہے؟ اخبارات۔ آپ اپنی مثال لے
لیجئے۔ آپ کو صحافت سے کیا فائدہ پہنچا۔ الو کی طرح رات کو جاگتے اور
دن کو سونے سے صحت آپ کی خراب ہو رہی ہے۔ تنخواہ کبھی وقت پر
آپ کو نہیں ملی۔ تنگ دستی اور مالک کی ناروا سختیوں کا رونا ہر وقت آپ
روتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ دوسروں کو یہ تنور جھونکنے کی دعوت
کیوں دے دیتے ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر زندگی علم کی نشر و اشاعت
میں گزر جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ مقصد حیات پورا ہو گیا۔ جو شخص جہالت
کی تاریکی رفع کرنے کے لئے علم کا چراغ روشن کرتا ہے اور نوع انسان
کو ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے لئے علم کی مشعل بلند کرتا ہے۔
وہی سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ یہ مقدس اور اہم ترین فرض
صرف مدرس ادا کر سکتا ہے۔ ایک مدرس ہمیشہ جوان رہتا ہے۔
اس کا دماغ کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا۔ اس کے جذبات خوش رنگ
و خوشبودار پھولوں کی طرح ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔"

سلسلۂ کلام جاری ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص پکار اٹھتا ہے۔
"بدر صاحب کیا خوب! مولانا غنیمت ایسے ہی مدارس کے متعلق تو
فرما گئے ہیں۔

بامیدِ تماشائے نگارے ÷ نمودم جانبِ مکتب گزارے
برآمد بر درِ مکتب خروشم ÷ کہ من سیپارۂ دل می فروشم

مجلس کی فضا ایک دم قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے۔ ہوٹل کا مہتمم
جو برابر کے کمرے میں بیٹھا دن بھر کی آمد و خرچ کا حساب کر رہا ہے۔
چونک کر دروازے سے جھانکتا ہے اور زیرِ خند ہو کر پھر اپنے کام میں
مصروف ہو جاتا ہے۔

چند روز سے ہم ایک نووارد کو ہوٹل میں دیکھ رہے تھے جو
دونوں وقت یہاں کھانا کھاتا تھا۔ یہ شخص وضع قطع سے بہت بڑا رئیس
معلوم ہوتا تھا۔ قد و قامت اور وجاہت میں بھی بہت نمایاں تھا۔ چہرے
سے ذکاوت کے آثار ٹپکتے تھے۔ لباس بہت شاندار اور قیمتی تھا۔
ایک ملازم مودبانہ طریقے سے ہر وقت اس کے ہمراہ رہتا تھا۔ ہوٹل میں
اس کے لئے کھانا خاص تکلف سے تیار کیا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی
باتوں سے ہم اتنا معلوم کر سکے کہ یہ کسی ریاست کا معزز عہدیدار ہے جو
سرکاری کام کے لئے یہاں آیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر یزدانی کی اس سے علیک
سلیک شروع ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر یزدانی مسلسل دو دن ہماری
محفل سے غیر حاضر رہے۔ جب تیسرے روز وہ آئے تو بہت خوش
خوش دکھائی دیتے تھے۔ غیر حاضری کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کچھ
بہانہ سا بنا کر ٹال دیا۔ اب جالی، رسوا اور بدر تینوں یکے بعد دیگرے
غائب رہنے لگے۔ شام کی مجلس بہت بے رونق ہو گئی تھی۔ چند روز
تو یہ حالت رہی کہ ہوٹل میں بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب دوبارہ
گہما گہمی شروع ہوئی تو ارکان محفل میں پہلی سی دلچسپی اور فراغت نظر نہ آتی
تھی۔ رسوا کو تو اکثر یہ کہتے سنا گیا تھا" لاہور میں رہنے کو میرا اب جی نہیں

چاہتا۔ مجھے تو جب کہیں باہر جانے کا موقع ملا۔ میں فوراً چلا جاؤں گا۔"

ڈاکٹر یزدانی شک و شبہ سے رسوا کی طرف دیکھتے اور کہتے "ہاں بھائی سچ ہے۔ لاہور کی آب و ہوا واقعی اچھی نہیں۔ یہاں کی فضا ہی ایسی ہے کہ کوئی شخص تندرست نہیں رہ سکتا۔ ایک لائق سے لائق طبیب یہاں بے بس ہو جاتا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اپنا مطب کسی اور شہر میں لے جاؤں۔"

جمالی اور بدر چپ رہتے اور کبھی کبھی یوں ہی بات کرنے کی خاطر کہہ دیتے تھے "آب و دانہ کا اختیار ہے۔ دیکھئے قسمت میں کس جگہ کا پانی لکھا ہے۔"

پندرہ بیس دن گزر گئے تو سب دوستوں میں گھبراہٹ اور اضطراب کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے لیکن کوئی شخص اس گھبراہٹ کا اظہار اپنی زبان سے نہ کرتا تھا۔ ایک دن علی الصبح ڈاکٹر یزدانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے "مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔"

یزدانی نے کہا "آپ کو یاد ہو گا پچھلے دنوں ریاست چاگام کے ایک افسر یہاں آئے تھے۔ میرے سامنے اُن کا ایک معاملہ طے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ مہاراجہ ہومیوپیتھک علاج کے بہت معتقد ہیں اس لئے انہیں ریاست کے لئے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر درکار ہے۔ مجھ کو انہوں نے منتخب کیا تھا اور تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ مجھ سے ایک درخواست لکھا کر وہ اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ باقاعدہ تقرر سے پہلے والیٔ ریاست کی رسمی منظوری درکار ہے۔ درخواست کے ساتھ مجھ سے انہوں نے ایک سو روپیہ بھی وصول کیا تھا۔ کہتے تھے کہ محض ضابطے کی پابندی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے اور اس بات کا انہوں نے یقین دلایا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر مجھے ریاست میں طلب کر لیا جائے گا۔ آج تین ہفتے گزر چکے ہیں وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔"

ڈاکٹر یزدانی نے بات ختم ہی کی تھی کہ بدرالحسن آ گئے اور انہوں نے اپنے متعلق من و عن وہی قصہ سنایا جو یزدانی سنا چکے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ بدرالحسن سے ریاست کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کا وعدہ کیا گیا تھا جس کی تنخواہ دو سو روپیہ تھی۔ اِن سے بھی درخواست کے ساتھ سو روپیہ وصول کیا گیا تھا میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ تمام کارروائی فریب تھی۔ وہ شخص کوئی ٹھگ تھا کسی ریاست کا گماشتہ و ماشتہ نہیں تھا۔ ہمیں دریافت کرنا چاہئے کہ ہمارے دوستوں میں اور تو کسی سے یہ فریب نہیں ہوا۔"

شام کو رسوا نے غمگین سی صورت بنا کر بتایا کہ اس سے ریاست کے پبلسٹی افسر کے عہدے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی درخواست کے ہمراہ سو روپیہ دے چکا تھا۔ یہی حشر جمالی کا ہوا۔ اُس کو حکم دیا گیا تھا کہ ریاست میں عنقریب ایک بیمہ کمپنی قائم ہونے والی ہے جس کا اُسے مینیجر بنایا جائے گا۔

اس واقعے کے بعد کئی روز تک اس بات پر سرگرمی سے بحث ہوتی رہی کہ پولیس میں اطلاع کی جائے یا نہ کی جائے۔ آخر کثرتِ آراء سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کو دبا دینا ہی بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُلٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔

عاشق حسین بٹالوی

قطعہ

خوفِ غضب و مے سرکشی کی بہ س
اس دو گونہ عذاب نے نہ مارا
رخ دو رُوں میں بیچ جنس مشتعد
ساقی سے حجاب نے نہ مارا

رضا ہمدانی

حسن نظر

دل کو رہینِ بادۂ غم کر رہا ہوں میں
اک خوگرِ ستم پہ کرم کر رہا ہوں میں

افسانۂ حیات رقم کر رہا ہوں میں
تکمیلِ داستانِ الم کر رہا ہوں میں

رکھیں نہ باز دیر نشینی سے مجھ کو دوست
اس رنگ میں طوافِ حرم کر رہا ہوں میں

پابندِ رسمِ عشق کی مجبوریاں نہ پوچھ
خود کو حریفِ دستِ کرم کر رہا ہوں میں

کھویا گیا ہوں دشتِ محبت میں اس طرح
ہستی پر اعتبارِ عدم کر رہا ہوں میں

اے مرگِ ناگہاں تری غیرت کو کیا ہوا
کیوں انتظارِ تیغِ ستم کر رہا ہوں میں

ہوتا ہے حشر دیکھئے ہنگامِ نزع کیا
امید و یاس دونوں بہم کر رہا ہوں میں

گو اے نظرؔ سرشت میں ہندی نژاد ہوں
پابندئ مذاقِ عجم کر رہا ہوں میں

قیوّم نظر

اعجازِ بیان

شرما کے آپ خونِ تمنا نہ کیجئے
اب آیئے بھی وعدۂ فردا نہ کیجئے

میں بھی گلو تو رکھتا ہوں اس کو نوازیئے
یہ التفات جانبِ مینا نہ کیجئے

میرے بھی لب ہیں صوتِ بیا غزو شرر خیز
چکھ لیجئے تو خواہشِ صہبا نہ کیجئے

مجروحِ زخمہ کیجئے میرا ربابِ دل
خوں نکلے جائے نغمہ تو پروا نہ کیجئے

کر لینے دیجئے مجھے آغوشِ شوق وا
بندِ نقابِ حُسن ابھی وا نہ کیجئے

رکھیئے نہ نرم ہات مرے بازوؤں پہ آپ
پھر مردہ آرزوؤں کو زندہ نہ کیجئے

لگ جائے اپنی ہی نہ کہیں آپ کو نظر
ہے ڈر کی بات آئنہ دیکھا نہ کیجئے

بیگانہ وار آ کے چلے جایئے یونہی
کچھ التفات حال پہ اصلا نہ کیجئے

اعجازؔ نامرادیِ دل دے رہی ہے درس
مر جایئے، پر اُن کی تمنا نہ کیجئے

سعید احمد اعجازؔ

عصرِ عبّاسی اوّل کی شاعری

(بلحاظ تاریخ ادب خلافت عباسیہ کے طویل زمانہ کو چار دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔۔۔ اس میں سے پہلے دور کی شاعری کا مختصر حال یہاں پیش کیا جاتا ہے)

روایت شاعری اس دور کو اور دوروں پر ایک امتیازی حیثیت اس لئے حاصل ہے کہ اس میں چند ایسی مشہور و معروف ذہین ہستیاں پیدا ہوئیں جن کی زندگی کا مقصد جاہلیت اور اس کے بعد کے جتنے اشعار مل سکیں انہیں یاد کر کے ان کی صحیح روایت کرنا اور ہزارہا شاعروں کے سوانح حیات بیان کرنا تھا۔ انہیں کے کارناموں کی وجہ سے آج قدیم عربی شاعری کا سرمایہ ہمیں اپنی اصلی حالت میں مل سکتا ہے۔

ابتدائے اسلام میں قرآن مجید کے معانی و تفسیر کے سلسلہ میں یوں بھی قدیم عربی شاعری سے کام لیا جاتا تھا اور دوسرے شاعری کے جوازات و استناد کے لئے اس کی قدر و قیمت میں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر "روایت شعری" نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی۔ سینکڑوں راوی پیدا ہو گئے لیکن ان تمام کو وہ تاریخی اہمیت حاصل نہ ہو سکی جتنی کہ ان میں سے بعض کو ہوئی جن کے حالات ہم ابھی پیش کریں گے۔

معانی و تفسیر کے بعد نحو، بلاغت، امثال و اقوال اور عام ضروریات کے لئے بھی قدیم عربی شاعری کے ذخیرہ کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی جانب پہلا قدم عصر عباسی ہی میں اٹھایا گیا گو اس کے کچھ عرصہ کے بعد اسے باقاعدہ طور پر ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اس دور کے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عرب کے سب سے مشہور راویوں میں پہلا نام "حماد الراویہ" کا آتا ہے اس کے بعد ابو عمرو بن العلاء، خلف الاحمر، اور المفضل الضبی وغیرہ ہیں۔ ان کے حالات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

حمّاد الرّاوِیہ

المتوفی ۱۵۶ھ

اس کا نام حماد بن میسرہ ہے۔ قبیلۂ بکر بن وائل سے اس کا تعلق تھا۔ کوفہ میں پیدا ہوا اور اس کی ابتدائی زندگی ڈاکوؤں اور قزاقوں میں نہایت بری حالت میں بسر ہوئی۔ ایک رات اس نے کسی شخص کے ہاں سرقہ کیا جس میں سامان کے علاوہ اسے چند کاغذات ملے جن پر انصار کے اشعار درج تھے۔ اسے یہ اشعار بہت پسند آئے اور انہیں اس نے حفظ کیا۔ اسی دن سے اس نے تہیہ کر لیا کہ ادب و شاعری کا جتنا سرمایہ اسے مل سکے وہ اس کا حافظ بن جائے۔ چنانچہ اس نے اتنا کچھ یاد کیا کہ اسے اوروں پر ممتاز کرنے کے لئے "راویہ" لقب دیا گیا (جس کے معنی ہیں بہت زیادہ روایت کرنے والا مبالغہ کا صیغہ ہے)

غضب کا حافظہ پایا تھا۔ ایام عرب اور ہزارہا شاعروں کے سوانح حیات کے علاوہ اسے لاکھوں اشعار نوک زبان تھے۔ بنو امیہ کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ خلفاء بنی امیہ صحیح روایت حاصل کرنے میں اکثر اسی سے مدد لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن یزید نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کیوں "راویہ" کہلانے کا مستحق ہے اس نے جواب دیا "میں ان سب شاعروں کی روایت کر سکتا ہوں جنہیں آپ جانتے ہیں اور ان سب کی بھی جن کا ذکر آپ کے سننے میں آیا ہے اور ان تمام کی بھی جن کے متعلق آپ نے کسی سے کبھی کچھ نہیں سنا۔۔۔ اور ہزاروں اشعار میں فوراً تمیز کر کے یہ دکھلا سکتا ہوں کہ قدیم شعراء کا کلام کونسا ہے اور جدید شعراء کا کونسا" اسے حروف تہجی میں سے ہر حرف کی ردیف کے سو سو قصائد

صرف جاہلیت کے یاد تھے ان کے علاوہ متفرق اشعار، قطعات اور اسلامی شاعری کا سرمایہ الگ ہے۔ خلیفہ ولید بن یزید نے ایک مرتبہ اس کا امتحان لیا اس نے بغیر کسی وقفہ کے دو ہزار نو سو قصاید جاہلیت کے سنائے ولید نے تھک کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور انعام میں ایک لاکھ درہم عنایت کئے۔

حماد بنو امیہ کے بعد بنو عباس کے درباروں میں شریک رہا۔ منصور مہدی وغیرہ نے اس کی بڑی قدر کی۔ اس نے ایک ایک قصیدے کی روایت پر ان سے لاکھ لاکھ درہم و دینار وصول کئے۔ اگرچہ مفضل الضبی بھی خلفائے عباسیہ کے درباروں میں بڑا رسوخ رکھتا تھا لیکن صحت روایت کے لئے حماد کا قول مستند سمجھا جاتا تھا۔

حماد ہی وہ راوی ہے جس نے سبع المعلقات اور دوسرے مشہور قصاید جاہلیت کی صحیح روایت کر کے انہیں ادب عربی میں حیات ابدی بخشی۔ اسی کی بدولت آج قدیم عربی شاعری کی روح صدیوں کے بعد بھی اسی ولولہ اور جوش کے ساتھ اہل عرب کے دل و دماغ پر اپنا اثر جمائے ہوئے ہے۔

المفضّل الضبی

المتوفی ۱۶۸ھ

المفضل محمد بن الضبی کوفہ کے مشاہیر میں سے ہے ابو زید انصاری جو روایت اور حفظ ادب میں کافی شہرت رکھتا ہے، اسی کا شاگرد تھا۔ عباسیین کے خلیفہ مہدی نے اسے اپنے پاس رکھا تھا اور اسی کے ایماء پر اس نے مختلف شعرا کے کلام سے منتخبات جمع کئے تھے جس کا نام "المفضلیات" رکھا۔ مفضل بھی اپنے عہد میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ لیکن اسے وہ نام آوری حاصل نہ ہو سکی جو حماد کے حصہ میں آئی۔

خلف الاحمر

المتوفی ۱۸۰ھ

اس کا نام خلف بن حیان ہے۔ ابو بردہ کے غلاموں میں سے تھا اس کا وطن فرغانہ ہے لیکن اسے ادب عربی اور اس کی قدیم شاعری سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے اپنی ساری زندگی اشعار کے حفظ کرنے اور ان کی روایت کرنے میں صرف کی۔

خلف الاحمر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ خود اشعار لکھ کر قدماء کے قصاید میں شامل کر دیتا تھا۔ اس خوبی سے کہ کوئی انہیں تمیز نہ کر سکے۔ اصمعی جیسا ماہر اس کا شاگرد تھا۔ حماد کی طرح قدیم و جدید اشعار کی تمیز کرنے میں اسے بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ حماد کے زمانے میں یہ چندے بصرہ میں رہا تھا اور اس کی روایتوں کو سن چکا تھا۔

محمد بن سلّام

المتوفی ۲۳۲ھ

ابو عبداللہ محمد بن سلام اس کا نام ہے اور یہ "الجُمحی" کی نسبت سے مشہور ہے بصرہ کا رہنے والا تھا۔ یہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے جاہلیت اور اسلام کے شعرا کو علحدہ علحدہ طبقوں میں شمار کر کے ان کے حالات اور ان کا کلام علحدہ علحدہ جمع کیا۔ اس کی تقلید اس کے بعد بے شمار لوگوں نے کی۔ اس میں شک نہیں انہوں نے اس میں بے حد ترقی کی لیکن طبقات شاعری کو تمیز کرنے کا اقدام اسی نے کیا۔ جاہلیین کے طبقۂ شعرا کا اس نے ایک مجموعہ اور طبقۂ شعرا اسلام کا اس نے ایک علحدہ مجموعہ تیار کیا۔ اس کے علاوہ اسے نقد شعر اور نحو میں بھی کافی دخل تھا۔

ابن ابی الخطاب

صاحب "جمهرة اشعار العرب"

ابو زید محمد بن ابی الخطاب قریش کا ایک نام آور شخص ہے۔ اس کی زندگی کے متعلق بہت ہی کم حالات مل سکے ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں گزرا ہے۔ اس کی وسعت نظر اور کمال تنقید کا اندازہ اس کی لازوال کتاب "جمهرة اشعار العرب" کے دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

قدیم شاعری پر جتنی مستند اور محققانہ کتب آج تک لکھی گئی ہیں ان میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس نے شعرا کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تنقیدی روشنی میں مقابلہ و موازنہ بھی کیا ہے۔ لغت قرآن مجید اور شاعروں کے حالات اور کلام اس کی اس بے مثل کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ شاعری کے قدیم سرمائے کے جمع کرنے میں اس کتاب نے بڑی مدد کی ہے۔

ان کے علاوہ متعدد مشاہیر گزرے ہیں جن میں ابوعمرو الشیبانی المتوفی ۲۰۶ھ کا نام خاص طور پر لئے جانے کے قابل ہے۔ اس نے بھی روایت شعری اور ایام عرب کے جمع کرنے میں اپنی کئی تالیفات کے ذریعے مدد کی ہے۔

شاعری میں انقلاب ملک کی سیاست میں اتنی اہم تبدیلی اور حکومت کی کایا پلٹ کا اثر اس دور کی شاعری پر بے حد ہوا۔ کہاں وہ بادیہ نشین عرب کا تخیل کہ جس کے پیش نظر کھلا ہوا میدان، وسیع صحرا یا چراگاہیں —— چھوٹی سی کٹیا یا معمولی سا خیمہ جس کا ہمدرد رفیق سوائے اونٹنی یا گھوڑے کے اور کوئی نہیں۔ اوپر آسمان نیچے زمین لڑائیوں کا خوف، انتقام کا جوش، سادہ محبت کی خلش ہیہم اور تحفظ عزت و وقار کا سوال بس جس کے کل محرکات شاعری یہی کچھ ہوں اور کہاں ایک امیر کی فکر رسا کہ جس کے تخیلات کی آمد بھی فردوس بریں ہی سے ہوتی تھی۔

شاعر کیا کہے! امیر جیسا کہ ابھی ہم نے کہا ہے جس کی خدمت کے لئے گلستان فارس کی حسین و دلکش تیتریاں موجود ہوں —— عالیشان محلات، جن کی آرائش اور حسن بندی اور دلفریب حوضوں اور چشموں پر پھولوں پھلوں سے لدے پھندے درختوں کی بہار دیدہ زیب ہو جن حسین و خوش الحان طیور کو دیکھنے کی تمنا میں بدوی اپنی زندگی گزار تا ہو ان کی کثرت یہاں "بُرے داغی" کی محرک!! دیبا و حریر جن کے قدموں تلے روندے جانے کو باعث افتخار جانیں۔ سونے چاندی کے برتن جن کی غذا مہیا کرنے پر فخر کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب جن کے فلک رس تخیل کو کائنات کے تمام تعلقات سے بیگانہ کر دے —— بھلا اس کی شاعری اور اس کے محرکات پر کیا بحث کی جائے!!!

لوازمات عیش و عشرت کی کثرت، عام معیار زندگی کی بلندی، مذہبی آزادی، معاشرتی بکھیڑوں سے نجات اور دوسروں کے خیالات و تہذیب کے اثرات نے عربی شاعری کی کائنات ہی بدل دی۔ اس نئی شاعری میں معانی میں جدت پیدا کرنے کی طرف عام رجحان پایا جاتا ہے اور وسعت خیال ان لوازمات کا لازمی نتیجہ تھا۔

حصول دولت و جاہ کے لئے پہلے تو مدح کی کثرت ہوئی اور پھر مدح میں مبالغہ کو اس کی آخری منازل تک پہنچا یا گیا۔ شراب کی تعریف میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا اور پہلی مرتبہ عربی شاعری کے کان مدح کی ایک نئی صنف سے آشنا ہوئے وہ "غلمان کی تعریف و توصیف" ہے۔ قدیم الخیال شعرا اور عوام اسے کتنا ہی باعث ذلت و رذالت سمجھا کئے مگر زمانے نے انہیں یہ دن بھی دکھا دیا!!

مذاحیہ اشعار اور ظرافت نگاری پر خاص توجہ کی جانے لگی اور اس کے ساتھ ہی باغوں اور پھولوں پھلوں کی توصیف میں بھی خوب گل کھلائے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ عرب کی قدیم سادہ نگاری، اصلیت اور جوش تینوں بڑی حد تک اس شاعری سے معدوم ہو گئے۔ مگر انقلاب زمانے کے لحاظ سے یہ ادبی انقلابات بھی ناگزیر تھے اس وقت کے شاعر، بادشاہ، امرا اور عوام سبھی اس نہج کو پسند کرتے تھے اس لئے قدیم شاعری اور اس جدید شاعری میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔

اسی پس منظر کے ساتھ ہم اس عہد کے بعض جلیل القدر شعراء کے حالات پیش کرتے ہیں۔

بشار بن برد

المتوفی ۱۶۷ھ

بشار فارسی الاصل تھا جس کے آباؤ اجداد طخارستان کے رہنے والے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ اس کا باپ عرصہ تک رہا۔ یہیں کسی عورت سے اس نے شادی کی اور اسی کے بطن سے بصرہ میں بشار پیدا ہوا۔ یہ پیدائش ہی سے بصارت سے محروم تھا۔ اس کے گالوں اور آنکھوں پر سُرخ خوفناک نشانات تھے۔ بینائی سے محروم ہو کر اس نے قدرت سے اور قوتیں پائیں جن میں اس کا غیر معمولی حافظہ اور قوت تخیل ہے۔

دنیا کے مشہور عدیم البصر شاعروں میں بشار بھی ایک درجہ رکھتا ہے جس طرح یونانی ادب میں ہومر اور انگریزی ادب میں ملٹن وغیرہ کی عزت کی جاتی ہے وہی عزت ادب عربی میں بشار اور ابوالعلا المعری کو حاصل ہے۔

فطری شاعر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ دس سال کی عمر سے اس نے شعر کہنا شروع کیا اور بالکل قلیل عرصے میں اس عہد کے ہر شاعر کو نیچا دکھا دیا —— چنانچہ اپنے زمانے میں بغداد کے تمام شاعروں کا یہی امام مانا جاتا تھا۔

منصور کے زمانے میں یہ بغداد آیا۔ اس نے اپنے بچپن میں جریر و فرزدق کے مقابلوں کا مشاہدہ کیا۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ اس نے جریر کی ہجو کہی۔ جریر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "یہ ابھی بچہ ہے"۔۔۔ بشار کو بڑی تمنا تھی کہ جریر بھی اس کی ہجو کرتا۔ آخر عمر تک یہی کہتا رہا کہ "اگر جریر میری ہجو کرتا تو مجھ سے بڑا شاعر سارے ملک میں کوئی نہ رہتا" لیکن جریر و فرزدق کے بعد اس کی شاعری کے مہرِ نیم روز کو آسمان شہرت پر جلوہ گر ہوتے دیر نہیں لگی۔

چونکہ بشار نے بنی عقیل کے بدویوں میں پرورش پائی تھی اور فصیح و بلیغ عربی کہنے والوں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اسی لئے اس کے تمام اشعار رکاکت نحوی غلطیوں اور روزمرہ کی لغزشوں سے مبرا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہران لغت اور نحویین نے اسے بھی ان آخری شعرا میں شامل کیا ہے جن کے اشعار بطور اسناد و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ رتبہ عربی شاعری اور ادب میں اچھے اچھوں کو نہیں ملا۔

جدت پسندی، نزاکت تخئیل، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور بلاغت معانی اس کی شاعری کے اجزائے اعظم ہیں۔ وہ نہایت پرگو شاعر تھا۔ اس نے متفرق ابیات قطعات وغیرہ کو چھوڑ کر صرف طویل قصائد بارہ ہزار کہے جن کے متعلق خود کہا کرتا "میرے ہر قصیدے سے صرف ایک عمدہ شعر بھی چن لو تو بارہ ہزار شعر ہوتے ہیں" لیکن یہ سب تلف ہو گئے! جاہلیت اور اسلام ۔۔۔ دونوں زمانوں میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تین شاعروں میں یہ بھی شامل ہے اور وہ تین ہیں، ابوالعتاہیہ، بشار اور السید الحمیری۔

اس کے اپنے زمانے میں اس کا کلام بہت زیادہ مقبول عوام ہوا۔ ہر مجلس اور ہر سوسائٹی میں اس کے تذکرے ہوتے۔ ملک کا ہر مشہور مغنی محفلوں میں اس کا کلام سناتا اور ہر حسین مطربہ مجلسوں میں اس کے اشعار سے اہل محفل کو وجد میں لاتی۔ جس طرح امرء القیس متقدمین کا امام مانا جاتا تھا۔ اسی طرح بشار اور ابو نواس بھی محدثین کے امام مانے گئے۔

اس نے ابتداً انصارِ علی کی حمایت کی پھر صرف عباسیین ہی کی مدح میں عمر گزارنے لگا۔ ہزارہا درہم و دینار اسے عباسیوں کے دربار سے ملے۔ خالد بن برمک کی تعریف میں ایک قصیدہ کہنے پر خالد نے پانچ ہزار درہم اسے انعام میں دیئے۔

مختلف اصناف سخن میں بشار نے طبع آزمائی کی ہے لیکن قصاید و نسیب میں یہ سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ فلسفہ کے اثرات بھی اس کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ عورتیں اس کی شاعری پر فدا ہوتی تھیں کیونکہ نسیب میں عورتوں کی فطری خصوصیات کی جس انوکھے اور دل نشیں انداز میں یہ مصوری کرتا تھا وہ اپنی آپ نظیر ہے مالک بن دینار کہتا ہے کہ "اس شہر کے لوگوں کو فسق و فجور کی دعوت دینے میں اس اندھے ملحد کے اشعار سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے"!

اس کی مخرب اخلاق شاعری سے تنگ آکر لوگوں نے خلیفہ مہدی سے اس کی شکایت کی مہدی نے حکماً اس کی بے راہ روی کی روک تھام کی۔ بشار نے پہلے مہدی کی مدح کی لیکن اس نے کچھ التفات نہ کیا پھر اس نے ان اشعار میں اس کی ہجو کہی:۔

بنی اُمیّة هبّوا طَالَ نومُکم ۔ إنّ الخلیفةَ یعقوب بن داوُد
ضاعَتْ خلافتکم یاقوم فالتمسُوا خلیفةَ اللهِ بین الزّقِّ والعود

مطلب:۔ اے بنی امیہ کے لوگو! خواب غفلت سے چونکو کیونکہ اب اصل خلیفہ یعقوب بن داؤد ہے (یہ مہدی کا وزیر اعظم تھا) تمہاری خلافت گم ہو چکی ہے ۔۔۔ اور اگر اپنے خلیفہ کو ڈھونڈنا چاہو تو شراب کے خم اور چنگ و رباب کے درمیان تلاش کر سکتے ہو!!

اس پر مہدی نے غضب آلود ہو کر شہر کے کوتوال کو حکم دیا کہ بشار کو کوڑوں سے پٹوایا جائے ۔۔۔ کوتوال نے اتنا پیٹا کہ بشار اسی صدمہ سے ہلاک ہو گیا۔ خلیفہ کے خوف سے عوام نے بشار کی قدر و منزلت میں کمی کی اسی وجہ سے اس کا نام پیچھے پڑ گیا اور اس کا بہت سا کلام یونہی ضائع ہو گیا۔

اَلسّیدالحمیری

المتوفی سنہ ۱۷۳ھ

حمیری بصرہ میں پیدا ہوا۔ بلند پایہ فطری شاعر تھا اور اس کے ساتھ ہی بہترین مقرر بھی۔ عہد عباسی کے تین پرگو شعرا میں اس کا نام بھی شامل ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ اس نے ڈھائی ہزار کے قریب قصائد لکھے جس میں اب بہت کم کلام دستیاب ہوتا ہے۔

چونکہ یہ شیعہ تھا اور شعرائے انصارِ علی میں شامل تھا۔ اسی لئے اوروں کی طرح اس نے بھی صحابہ کرام کو سب و شتم کرنے میں کمی نہیں کی

جس کے باعث ہمیشہ کے لئے کنج خمول میں پڑ گیا۔ ورنہ اس کا رنگ ایسا نہ
تھا جسے آسانی سے فراموش کر دیا جائے۔

اس کے الفاظ شاندار اور شیریں ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے کا
یہ سحر بیاں مقرر سمجھا جاتا تھا۔ اہل محفل کو اپنا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل
تھا۔ لوگ یہ چاہتے تھے کہ جو وقت اپنی باتیں کرنے کا ہو وہ بھی اسی
کو دے دیں کہ زیادہ دیر تک اس کی شیریں بیانی سے لطف اٹھایا جائے
بشار اس کو بہت بڑا شاعر خیال کرتا تھا۔ یہ نہایت منہ پھٹ اور بے
باک شخص تھا۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے اس کے پاس ایک
نہایت قیمتی تحفہ روانہ کیا لیکن اس نے اسے لینے سے انکار کیا اور
واپس کر دیا۔

ابونواس

۱۴۵ھ تا ۱۹۹ھ

ابونواس حسن بن ہانی ۱۴۵ھ ہجری میں خلیفہ ابوجعفر المنصور کے
عہد میں اہواز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ دمشق کا رہنے والا تھا جو
بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کی فوج میں ملازم تھا اور جس نے
اہواز کی ایک عورت سے شادی کر لی اور یہیں ابونواس پیدا ہوا۔ اس
کا ایک اور بھائی ابومعاذ نامی تھا۔ ابونواس ابھی دو سال کا تھا کہ اس کے
باپ نے بصرہ کی سکونت اختیار کر لی اسی لئے اس کی نشو و نما بصرہ کے
علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔

باپ کے انتقال پر اس کی ماں نے ایک عطر فروش کے پاس اسے
نوکر رکھا دیا۔ گو اس پیشے سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن چند دن مجبوراً
وہاں رہا۔ شعر و سخن سے اسے فطری لگاؤ تھا۔ شاعری کی ہر محفل میں شریک
رہتا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے شہر کے تمام شعرا سے اس نے
جان پہچان پیدا کر لی۔

اس زمانے میں والبہ بن حباب نامی ایک اوسط درجہ کا شاعر
کوفہ سے اہواز آیا کرتا تھا۔ اس نے ابونواس کی طبیعت سے اس کے
رجحان کا اندازہ لگا لیا۔ اسی کی ہمت افزائی اور دعوت پر اس نے اہواز
کو خیر باد کہا اور پہلے کوفہ اور بعد میں بغداد کا رخ کیا۔ والبہ بن حباب
کی ایک جماعت تھی جس میں اکثر شاعر تھے۔ یہ سب روزانہ ایک جگہ
جمع ہوتے اور شغل ناؤنوش کے علاوہ سخن سنجی بھی کیا کرتے۔ یہیں ابونواس
نے شاعری کے متعلق بہت کچھ اور تباہی اخلاق کے متعلق سب کچھ
سیکھ لیا۔

والبہ بن حباب کی جماعت میں رہ کر ظرافت، شاعری، ہجو نگاری
اور آوارہ گردی میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بعض علمائے لغت
و نحو سے بھی استفادہ کیا۔ ابوزید انصاری سے اس نے لغت کے متعلق اور
سیبویہ کی "کتاب" سے اس نے نحو کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔
یہی وجہ ہے اس کا کلام ہر قسم کے عیوب سے بالکل مبرا ہے۔

جاحظ اس کے متعلق رقمطراز ہے "ہمارا نحو سب سے عمدہ فصیح
اور غلطیوں سے مبرا اشعار رکھتا ہے"۔ معمر بن المثنیٰ کا خیال ہے "محدثین
میں ابونواس کی شخصیت متقدمین میں امرءالقیس کی شخصیت کے ہم پلہ
ہے۔"

ابن السکیت کا قول ہے "اگر تم قابل وثوق شعرا کی روایت کرنا
چاہو تو جاہلیین سے امرءالقیس اور اعشیٰ کو، اسلامی شعرا سے جریر و فرزدق
کو اور محدثین سے ابونواس کو لو۔ بس!" اور خود ابونواس نے اپنے متعلق ایک
مرتبہ کہا "میں اس وقت تک شعر نہیں کہتا جب تک کہ اپنے الفاظ کے
متعلق صرف جاہلیت کی ساٹھ عورتوں سے، جن میں خنساء اور لیلیٰ بھی
ہیں۔ ثبوت حاصل نہ کر لوں --- اب مردوں کے اشعار کا خود ہی اندازہ
کر لو!"

یقیناً ادب میں اس شاعر کا پایہ بے حد بلند ہے!!!

متقدمین کے طرز بیان اور اسلوب شاعری میں اس نے ایک
انقلاب پیدا کر دیا۔ حقیقتاً شاعری کے قالب میں وہ ایک نئی روح پھونکنے
والا تھا۔ مے لالہ گوں کی توصیف میں اس نے وسعت پیدا کی اور عربی
شاعری میں سب سے پہلے اسی نے تنسیب و تشبیب نگاری میں مونث
کے علاوہ "مذکر" کو بھی داخل کیا۔

ہم عصروں میں ممتاز درجہ حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد خلیفہ
ہارون الرشید کی مدح کر کے اس نے دربار خلافت میں اپنی جگہ پیدا
کر لی۔ اس کے بعد کچھ زمانے تک امین کے ندماء میں شامل رہا۔ اسی کے
حکم سے کچھ دن کے لئے قید کیا گیا جہاں سے رہائی پانے کے تھوڑے
ہی دن کے بعد ۱۹۹ھ میں اس کا انتقال بغداد میں ہوا۔

بشار کی طرح اس کے اشعار بھی مقبول عوام و خواص تھے۔ اس
کے اشعار میں ایک لوچ اور دلکشی ہے۔ معاملات کی سچی تصویر کھینچنے

میں اسے عجیب ملکہ حاصل تھا فحش گوئی اور ہزلیات میں بھی یہ پیچھے نہیں
رہا مدح اس نے بہت کم کی ہے۔ جاحظ بشار اور ابونواس کے متعلق
کہا کرتا تھا:

بشار وابونواس معناهما واحد والعدة اثنان

یعنی بشار اور ابونواس کے معنی ایک ہی ہیں اگرچہ گنتی میں
یہ دو ہیں۔

اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک رات میں قصیدہ کہہ ڈالتا پھر
چند دن اس کی تنقیح و ترتیب میں صرف کرتا۔ اکثر اشعار کانٹ چھانٹ
دیتا یہی وجہ ہے کہ اس کے قصاید عموماً اوروں کی طرح طویل ہونے کی
بجائے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

ابوالعتاہیہ

۱۳۰ھ تا ۲۱۱ھ

اس بے مثال شاعر کا نام اسمٰعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان
کنیت ابو اسحاق اور لقب ابوالعتاہیہ ہے۔ حجاز کے ایک معمولی
قصبہ عین التمر میں پیدا ہوا اور کوفہ میں پرورش پائی کوزہ گری اس کا
آبائی پیشہ تھا۔ یہ بھی بچپن سے اسی میں مشغول رہا۔ ہانڈی برتن بناتا اور
اپنی پیٹھ پر لاد کر انہیں کوفہ کی گلیوں میں بیچتا پھرتا۔

شعر و سخن اس زمانے میں اتنی عام چیز تھی کہ بچے، بڑے،
بوڑھے غرض سبھی اس کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے۔ ابوالعتاہیہ کی یہ کیفیت
تھی کہ جہاں شاعری کے متعلق کوئی بحث چھڑی فوراً وہاں جا پہنچتا اور
خود بھی شریک ہو جاتا۔ مشاعروں میں حصہ لیتا غرض اپنے فرصت کے
لمحات یہ اسی مشغلہ میں گزارتا۔

اس کی شاعری کی شہرت بھی عجیب طور پر ہوئی۔ ایک دن یہ برتن
لے کر بازار سے گزر رہا تھا دیکھا کہ چند لڑکے شعر و سخن پر بحث کرنے میں
مصروف ہیں خود بھی جا پہنچا اور ان میں شریک ہونا چاہا۔ انہوں نے
پہلے تو اس کا مضحکہ اڑایا پھر یہ شرط بدھی کہ وقت مقررہ کے اندر ابوالعتاہیہ
کے ایک مصرعے پر وہ سب مل کر مصرعے لگائیں گے شکست کھانے
والے فریق کے ذمے دس درہم کی ادائیگی بھی طے پائی۔ لڑکے ہار گئے
ابوالعتاہیہ نے اسی ردیف اور قافیہ میں ارتجالاً چند بہترین اشعار کہے
جو بہت تھوڑے عرصہ میں کوفہ کے ہر شخص کی زبان پر جاری ہو گئے۔

جب اس کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی تو لوگ اس کے
اشعار سننے کی خاطر اس کے پاس جمع ہوتے اور اس سے سن کر انہیں
اس کے گھر کے قریب پڑی ہوئی ٹھیکریوں اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں پر
لکھ کر لے جاتے ہزارہا شعر کہہ دینا اس کے نزدیک معمولی بات تھی۔
خود کہا کرتا تھا کہ "اگر میں چاہوں تو عمر تمام اشعار ہی میں بات چیت کیا کروں"
واقعہ بھی یہی تھا کہ گفتگو میں اکثر اس کی زبان سے اشعار نکل جاتے لیکن
لوگ اسے نثر ہی سمجھتے۔

خلافت مہدی کے ابتدائی زمانے میں اس نے بغداد کا رُخ
کیا اور اس کی مدح کر کے اس کے متوسلین میں شامل ہو گیا۔ مہدی
کے بعد ہادی کے پاس بھی اس نے بہت رسوخ حاصل کیا۔ ہادی
نے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کے بعد اس نے
رشید کے زمانے میں انتہائی عروج حاصل کیا۔

رشید اس کا بے حد شیدا تھا۔ سفر و حضر میں ابوالعتاہیہ کا اس کے
قریب موجود رہنا لازمات سے تھا۔ اس نے اس کے لئے پچاس ہزار درہم
سالانہ کا ایک گرانقدر وظیفہ بھی مقرر کیا تھا۔ یہ وظیفہ ان انعامات
وعطایا کے علاوہ تھا جو عیش و مسرت کے مواقع پر قصاید اور نظموں
کے ذریعے خلیفہ و امرا کو خوش کرنے میں ملا کرتے۔ ابوالعتاہیہ اب عمر
کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ اسی لئے تقدس و زہد اختیار کرنے کے
خیال سے اس نے ایک مرتبہ شعر کہنا بالکل ترک کر دیا۔ رشید نے اسے
شعر کہنے پر مجبور کیا۔ جب بالکل ہی نہ مانا تو خلیفہ کے حکم سے اس کو
ساٹھ کوڑے لگائے گئے تب کہیں جا کر اس نے شعر کہنے کا وعدہ
کیا۔

رشید کے بعد اس نے مامون کا بھی کچھ زمانہ دیکھا اور اس کے عہد
میں ۲۱۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مہدی کے زمانے میں اس نے عتبہ نامی اس کی ایک کنیز سے
عشق بازی بھی کی۔ عتبہ سے اس کی پروا نہ کی۔ غزلیات اور تشبیب میں
متعدد جگہ اس نے عتبہ کے حسن جہاں سوز کا تذکرہ کیا ہے۔ مہدی کے
حکم سے اس نے عتبہ سے تشبیب کرنا ترک کیا آخری عمر میں یہ بالکل
مذہبی آدمی بن کر رہ گیا تھا۔

ابوالعتاہیہ سوداوی مزاج کا تھا۔ منکرین وقت میں اس کا نام بھی
آسکتا ہے۔ ابتدائی عمر میں دین کے معاملے میں بڑا متذبذب تھا کبھی مستقل

ارادہ اور عزم کا مالک نہ بن سکا گو حقائق اسلام نے آخری عمر میں اپنے گہرے نقوش اس کے قلب پر مرتسم کر دیئے۔

اس کا کلام لطف معانی، سہل الفاظ، سلاست، نرمی اور روانی سے مملو ہے۔ اس کی شاعری میں ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں وزن سے گرے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں چنانچہ اس کے متعلق اصمعی کی رائے ہے کہ "اس کا کلام سلاطین کے محلات کی طرح ہے کہ جن میں ہیرے جواہرات، سونا، چاندی، اینٹ پتھر، مٹی ـــــ غرض سبھی کچھ رہتے ہیں"

ہمعصر شعرا کی صف اول میں آنے کا بڑا سبب اس کے سہل ممتنع اشعار ہیں۔ پند و نصائح کی بھی کثیر مثالیں اس کے کلام سے مل سکتی ہیں۔ اب بھی اس کے چار ہزار سے زاید قصاید موجود ہیں۔ عبداللہ بن معن کے سوا اس نے کسی کی ہجو نہ کی۔

شعر گوئی میں اس نے کسی اسلوب کی تقلید نہ کی۔ بڑا جدت پسند شاعر تھا اور ساتھ ہی پُرگو بھی اُس نے اسلوب شاعری میں بے انتہا وسعت پیدا کی اور اپنے ایک خاص انداز کی بنا پر سخن سنجی میں وہ ایک انقلاب کا پیغمبر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مسلم بن الولید

المتوفی ۲۰۸ھ

مسلم بن ولید انصاری تھا۔ یہ زبردست مدح نگار تھا اور آج اپنی مدح نگاری کے باعث ہی مشہور ہے۔ اس نے یزید بن مزید، داؤد بن یزید مہلبی، خاندان برامکہ کے متعدد افراد اور ان کے سیکرٹری محمد بن منصور کی مدح کرنے ہی میں اپنا سارا زور قلم صرف کیا ہے۔

مامون نے اسے جرجان کا گورنر بنا دیا تھا ـــــ اور یہیں اس کا خاتمہ ہوا۔ اس کی شاعری میں حسن و عشق کی جلوہ گری اپنے پورے شباب پر ہے۔ نزاکت، رقت اور رلوچ کے اعتبار سے اس کا درجہ بلند ہے۔ مسلم کو اس کے عہد میں عموماً "صریع الغوانی" کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کے معنی ہیں "مریض مہ وشاں"

ابو تمام

۱۸۸ھ تا ۲۳۱ھ

اس کا نام حبیب بن اوس ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا۔ دمشق کے ایک قصبہ جاسم میں یہ پیدا ہوا۔ پہلے دمشق آیا اور صغیر سنی ہی میں مصر جا پہنچا۔ یہاں یہ جامع عمرو میں لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ یہیں ادیبوں اور عالموں کی صحبت میں رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔

ابو تمام فطری شاعر تھا۔ خدا نے اسے غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر حافظہ کا مالک بنایا تھا۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ علو خیالی اور جدت پسندی کے باعث بہت جلد عوام میں مقبول ہو گیا۔ اس کی شہرت تھوڑے ہی دنوں میں بغداد تک پہنچ گئی جہاں خلیفہ احمد بن المعتصم نے اسے بلا کر اپنے حلقۂ شعرا میں شامل کر لیا۔

یہیں سے ابو تمام کی شخصیت کو چار چاند لگ جائے۔ اس نے مدح گوئی اور قصیدہ نگاری میں خوب خوب کمالات دکھلائے اور اپنی زندگی بھر اپنے آگے کسی شاعر کا رنگ جمنے نہ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ حصول مال و دولت و عز و جاہ میں کوئی اس کی ہمسری نہ کر سکتا تھا۔ احمد بن المعتصم نے اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر موصل کے کسی علاقہ کی گورنری اسے عطا کی۔ یہاں دو سال بھی رہنے نہ پایا تھا کہ علم و ادب کا یہ گنجینہ عین جوانی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ابو تمام حسین و جمیل آدمی تھا۔ شیریں بیانی اور دلچسپ انداز گفتگو کے باعث وہ سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عمدہ شاعر ہونے کے علاوہ وہ زبردست راوی تھا۔ روایت شعری اور تالیفات کے میدان میں ابو تمام کی شخصیت آج بھی فقید النظیر مانی جاتی ہے۔

اگر ابو تمام سا شخص عربی نظم کے اس مایہ ناز سرمایہ کو جمع کرنے اور اسے بذریعہ تحریر محفوظ کرنے میں کوئی توجہ نہ برتتا تو ہم تک آج عربی کے اس عظیم ترین خزانہ سے بہت ہی کم حصہ آتا۔ شاعری سے قطع نظر اس کا یہی کارنامہ جسے ہم "حماسہ" اور "فحول الشعرا" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں اتنا اہم اور عظیم بالشان ہے کہ اس کے نام کو حیات ابدی کا جامہ پہنا سکے۔

ابو تمام کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اپنے غیر معمولی حافظہ کے بھروسہ پر اس نے "حماسہ" کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کو قطعات، قصائد اور متفرق ابیات کے چودہ ہزار اُرجوزے یعنی طویل قصائد حفظ تھے "حماسہ" "وحشیات" اور "فحول الشعرا" اس کی مشہور تالیفات صرف اس کے حافظہ اور عظیم الشان دماغی قوی کے نتائج ہیں۔

ابوتمام ایک بڑا مفکر فلسفی اور حکیم بھی تھا چنانچہ کہا گیا ہے کہ "متنبی اور ابوتمام حکیم تھے اور شاعر صرف بحتری" ــــ بدیہہ گوئی اور ارتجال میں بھی وہ کافی شہرت رکھتا تھا ــــ انہیں خوبیوں کی وجہ سے وہ مولدین کے طبقۂ ثانی کا امام مانا جاتا ہے !!

اس کی جوانا مرگی کے متعلق ابویوسف فلسفی کی پیشگوئی بالکل صحیح ہوئی جو احمد بن المعتصم کے سامنے اس کے ارتجال کو سن کر اس نے کی تھی کہ "یہ غیر معمولی شخص زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا"

یہ تو چند مشہور شعرا کا ذکر تھا۔ سچ پوچھئے تو سینکڑوں شعرا اس زمانے میں ایسے تھے جو اپنے وقت کے اساتذہ تسلیم کئے جاتے تھے خلفا و امرا کی نوازشات سے یہ سبھی بہرہ مند ہوتے اور نہایت عیش کی زندگی گزارتے۔ سماج کی درستی اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں جتنا ان شعرا نے حصہ لیا اتنا کسی اور ملک میں مصلحین نے بھی نہ لیا ہوگا۔ اب ہم ان بے شمار شعرا میں سے صرف چند کے نام پیش کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

دعبل الخزاعی متوفی ۲۴۶ھ اس عہد کا بڑا مشہور ہجو نگار گزرا ہے۔ اس نے عوام سے لے کر خلفا تک سب کی ہجو کر ڈالی خلفائے عباسیہ جن کے رعب و داب سے زمین اور آسمان کانپتے تھے ان کی ہجو کرنے میں بھی اس نے کمی نہ کی۔ مامون، امین، معتصم ابراہیم بن مہدی ــــ غرض اس نے سب کی ہجو کی ــــ اور اس عہد کے ادب نواز خلفا کو دیکھئے کہ ان بدزبان شاعروں سے بازپرس تک نہ کرتے۔

ابو دلامہ متوفی ۱۶۱ھ اپنی مدح نگاری اور ظرافت کے باعث بے حد مشہور رہے۔ خلفاء کے پاس یہ اکثر خوش مذاقی کے باعث انعام و اکرام حاصل کیا کرتا تھا۔

حماد عجرد متوفی ۱۶۱ھ بھی ابو دلامہ کی طرح نہایت ظریف اور مسخرہ تھا۔ یہ حماد الراویہ کی جماعت کا ایک رکن بھی تھا۔ بشار اور حماد عجرد کے درمیان عرصہ تک ہجو نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔

مروان بن ابی حفصہ متوفی ۱۹۱ھ بھی ایک عمدہ شاعر تھا۔ خلفاء عباسیہ کے متوسلین میں یہ بھی شامل تھا۔ مہدی نے اس کے ایک قصیدہ پر ایک لاکھ درہم عطا کئے تھے۔ متعدد بار اس نے ایسے ہی عطایا حاصل کئے۔ ہارون الرشید نے اپنی تعریف میں کہے ہوئے ایک قصیدہ کے ہر شعر پر اسے ایک ہزار درہم انعام دئیے تھے۔ اتنی کثیر دولت کے باوجود یہ بڑا بخیل تھا۔

سلم الخاسر متوفی ۱۹۶ھ منصور النمری، علی بن الجہم، حسین بن الضحاک متوفی ۲۴۹ھ بھی بہت مشہور شعرا گزرے ہیں۔

آل برامکہ کی سرپرستی میں پھولنے پھلنے والے شعرا میں ابان بن عبدالحمید، ابن مناذر (۱۹۶ھ)، الرقاشی (۲۰۰ھ) اور اشجع السلمی بہت اہم ہیں۔

شیعہ شعرا میں دیک الجن متوفی ۲۳۵ھ کا نام خاص طور پر لئے جانے کے قابل ہے مرثیہ نگاری اور اہل بیت کی مدح میں ہی اس نے اپنی زندگی گزار دی۔

دیگر شعرا میں مطیع بن الاحنف، محمد بن بشیر الریاشی، کلثوم بن عمرو العتابی اور ربیعۃ الرقی کے نام بہت ممتاز ہیں۔

سید ابوالفضل

قطعہ

محبت بے نیازِ آن و این ہے
محبت چشمۂ صدق و یقیں ہے
محبت ہے سکوں بخشِ دل و جاں
محبت حاصلِ دنیا و دیں ہے

جلال الدین اکبر

راحت کدہ

ایک خواب

سلام اے ساحرِ سحرِ حلال! اے خوابِ جاں پرور
ہزاروں ہوش اور بیداریاں قرباں ہیں تجھ پر

مری تاریکیٔ شب کو درخشاں کر دیا تو نے
دلِ برباد کو رشکِ گلستاں کر دیا تو نے

کچھ ایسا سحر میرے جسم اور جاں پر کیا تو نے
مجھے اک وادیٔ پرنور میں پہنچا دیا تو نے

وہ وادی جس میں نغمے پھوٹتے ہیں پھول بن بن کر
وہ وادی جس میں خوشبو تیرتی پھرتی ہے نغموں پر

جہاں پاکیزگی چھائی ہوئی ہے لالہ زاروں پر
جہاں تقدیس نغمے گا رہی ہے آبشاروں پر

جہاں ہر سو چھلکتی ہے شرابِ مشک بو گویا
جہاں موجِ صبا ہے کاروانِ رنگ و بو گویا

جہاں کا ذرّہ ذرّہ اخترِ تاباں سے تاباں تر
جہاں کا قطرہ قطرہ گوہرِ غلطاں سے غلطاں تر

جہاں لہرا رہے ہیں سرمدی نغمے ہواؤں میں
محبت بیخودی میں رقص فرما ہے فضاؤں میں

جہاں کا جلوہ جلوہ حسن کی کرنوں سے تاباں ہے
جہاں کا نغمہ نغمہ عشق کی مستی سے رقصاں ہے

جہاں معصومیت ہے حسن میں تقدیس الفت میں
جہاں ہر چیز ہے ڈوبی ہوئی نورِ محبت میں

جہاں پر حسن بھی اک عشق کی تصویر ہے گویا
جہاں پر عشق بھی اک حسن کی تفسیر ہے گویا

مری "راحت" ہے میں ہوں اور اک دنیائے نورانی
جمال و عشق پر چھایا ہوا ہے رنگ یزدانی!

آثر صہبائی

طلسم مجاز

(۱)

یہی نگاہ یہی "ساز باز" رہنے دے
مرے لئے تو "در فتنہ باز" رہنے دے
"بصیرتوں" سے مجھے بے نیاز رہنے دے
حقیقت اپنی "بہ حد مجاز" رہنے دے
مری نگاہ کو "نظارہ باز" رہنے دے

(۲)

جو عشق و حسن میں ہے امتیاز رہنے دے
یہی "مشاہدہ" اے دل نواز رہنے دے
بڑھائے جا یوں ہی کیف نظر بڑھائے جا
تو حلقہ ہائے "نگاہ ہوس پرست" میں آ
تصورات "دل پاکباز" رہنے دے

(۳)

رہین "حسرت راز و نیاز" رہنے دے
انہیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں "ناکام"
متاع بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام
مرے لیے "ہوس" سوز و ساز رہنے دے

(۴)

مری نگاہ کا دامن دراز رہنے دے
"معاملہ" کی خوشی کو تو راز رہنے دے
ترے خیال سے لے جاؤں میں اگر "بازی"
گناہ میرے لئے کیوں ہو "نظر بازی"
کچھ اور دن ابھی حکم جواز رہنے دے

(۵)

فروغ دیدۂ آئینہ ساز رہنے دے
وہ اپنا جلوۂ بینش گداز رہنے دے
خدا گواہ نہ تھا میں تو سائل دیدار
بنا دیا تری شوخی نے مائل دیدار
مجھے قریب "حریم مجاز" رہنے دے

علی منظور حیدرآبادی

بیاہ کا منتر

(۱)

۱۲ کارتک ـــــ تُلسی بیاہ کا تہوار تھا۔ اُسی دن نندہ اور وجے کا بیاہ ہوا۔

نندہ کے چہرے کی سپیدی اور سرخی کسی رنگریز کے ناتجربہ کار شاگرد کے سُرخ رنگے ہوئے کپڑے کی مانند تھی اور وہ کسی مستور جذبے سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اگر اس خود فراموشی میں صرف اُسے اتنا سا خیال رہتا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیئے تو وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک مسلسل نظر سے جیوارام پروہت کی آٹے سے کھینچی ہوئی لکیروں یا خوبصورت وجے کے گورے گورے پاؤں کی طرف نہ دیکھتی اور نہ ہی وہ پھیریاں لیتے ہوئے قدرے سیدھی کھڑی ہو جاتی۔ کیونکہ قد میں وہ کچھ لمبی تھی اور سیدھی کھڑی ہونے سے وہ اپنے شوہر کے شانے سے بھی سر نکالتی تھی۔ بیاہ سے چند روز پہلے اُس کی ماں نے اُسے پھیری کے موقع پر جھک کر چلنے کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر نندہ تو یہ بھی بھول چکی تھی کہ بیاہ کے وقت اور بیاہ کے بعد جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے اُسے اپنے شوہر سے نیچا ہو کر رہنا پڑے گا۔

وجے کی حرکات بہت حد تک اُس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں اس کی بے تاب اُمنگیں آنکھوں کے راستے سے نہایت آوارگی کے ساتھ نکل نکل کر نندہ کی گوری گوری کلائیوں اور جسم سے جس کا چھریرا پن سات پردوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بے محابا لپٹ رہی تھیں کبھی کبھی وجے کسی گہرے خیال کے زیر اثر آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے مستقبل کی تمام مسترتیں سمٹ کر اس موجودہ لمحے میں مرکوز ہو رہی ہوں۔ اور جیوارام پروہت ان تمام جذبات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پنڈت جیوارام کے سامنے آج یہ تیسرا جوڑا تھا جسے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر رہا تھا۔ جیوارام نے بیاہ کا ساتواں منتر پڑھا ـــــ منتر پڑھتے وقت اُسے ذہن استعمال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ بچپن میں ہی جب روی شنکر چٹوپادھیائے نے اُسے منتر پڑھائے تو اُس نے سب کچھ صحیح طور پر ایسا رٹ لیا تھا کہ تلفظ درست کرنے، لہجہ سلجھانے، آواز کو اونچا نیچا کرنے اور سُر بدلنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ یوں بھی یہ فن اسے ورثے میں ملا تھا۔ وہ ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی مانند باقاعدہ طور پر اور معیّن جگہ پر ـــــ یعنی منگل، سنیچر، گنیش سے منسوب خشک آٹے کے خانوں میں پیسے رکھواتا یا سیندور اور چاول پھینکواتا اور ایسا کرنے میں اس سے بھول چوک کبھی نہ ہوتی۔

جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں، ایسی صحت سے وہ تمام ضروری رسوم سرانجام دیتے ہوئے تخیّل میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ اُس دن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک اونچی پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت جھیل ـــــ اس میں تیرتے ہوئے بجرے اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے جن میں وہ لوگ ایسی مسرّت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور اس سے پرے امرا کے محل جن میں وہ اپنے زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک کمزور سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا اور ترئی کی دلکش آواز اُس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آ رہی ہے۔

. . . اور پھر جیوارام نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اب اُس نے دل میں کہا۔ "ان ہاتھوں سے سینکڑوں بیاہ رچے۔ ان ہاتھوں نے سینکڑوں گھر آباد کیے۔ کئی غمزدوں کا ایک ایک لمحہ انبساط و نشاط میں سمو دیا۔ مگر

میں خود ویسے کا ویسا کنوارا، خانہ برباد اور تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس ناگ پھنی اور کنول کی مانند جو پانی میں اُگتے ہیں۔ مگر پانی سے آلودہ نہیں ہوتے۔ . . . !

اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ بیاہ کا آخری منتر ــــ منگل اشٹکا پڑھ رہا ہے اور پھر اشٹکا کا بھی آخری لفظ۔

"ساودہان!" اس نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

ساودہان کے لفظ کے ساتھ بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے مبارک باد کی آوازیں آنے لگیں اور اس شور و غوغا نے جیوارام کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا۔

"ساودہان" ــــ جیوارام نے ایک دفعہ پھر کہا اور . . . .

تیسرا بیاہ پڑھنے کے بعد جیوارام پنڈت کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ آمدنی کا لالچ کم ہی اُسے اتنی محنت پر مجبور کیا کرتا تھا۔ جیوارام نے اپنی بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے نیچے بھاری بھاری تھیلے سے ــــ خرابی جگر کی علامت ــــ زیادہ بھاری اور سیاہ دکھائی دینے لگے۔ تھیلوں کو سکیڑ کر جیوارام نے ایک جمائی لی۔ نندہ کو منہ بسورتے دیکھا کیونکہ وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی تھی اور وجے کو مسکراتے ہوئے کیونکہ عنقریب وہ شادی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے والا تھا۔ کئی جمائیوں کے درمیان پروہت نے نہایت اختصار سے نندہ اور وجے کو خاوند اور بیوی کے جداگانہ فرائض سے آشنا کیا۔ اُس کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ وہ آگ، پانی، ہوا، زمین اور آسمان کی گواہی میں ایک کئے جاتے ہیں۔ نندہ کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحاظ سے شوہر سے کم رتبہ رکھتی ہے (اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ شوہر سے سر نکالتی تھی ــــ) وجے سے کہا گیا کہ اُسے چاہیئے کہ وہ نندہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے۔ پھر جیوارام نے وجے کو خاص طور پر برہمن، استری اور گائے کی حفاظت کرنے کی تلقین کی۔ شوراتری کی کتھا کا ایک حصہ سناتے ہوئے جیوارام نے کہا۔

. . . وجے تم بھی پنڈت ہو۔ تم تو خود جانتے ہو گے شکاری جو تیر مارنا چاہتا تھا اُسے جانوروں نے اپدیش دیا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے
۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن کو مارنے کے
۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے ایک استری کو مارنے کے
۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہے ایک (حاملہ) استری کو مارنے کے
۱۰ حاملہ استریوں کا مارنا برابر ہے ایک گائے مارنے کے . . . !

(۲)

اپنا کام نپٹانے کے بعد جیوارام نے وہاں سے ٹلنا چاہا۔ کس لئے؟ پھر تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار ہونے کے لئے، ویسا ہی برباد، کنوارا اور اچھوتا رہنے کے لئے جیسے سخت بارش کے بعد ناگ پھنی اور کنول بن بھیگے سر اٹھائیں۔ اتنے بیاہ اس کے ہاتھوں سے ہوئے۔ بیاہوں کی اس موسلا دھار بارش میں بھی وہ ناگ پھنی کی مانند . . . .

اس وقت جیوارام کے تصور میں ننھو کا بھول نہ سکنے والا چہرہ وجے کی اوباش و آوارہ نگاہیں اور کانوں میں براتیوں کا شور و غوغا، گانے اور ہنسی مذاق کی آوازیں تھیں۔ اس کی جذباتی طبیعت درحقیقت اُسے وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ طبیعت کیسی تھی؟ ــــ بات یہ تھی کہ سخت جذباتی ہونے کی وجہ سے وہ باجے، ڈھولک، گانے، مذاق اور چٹکیوں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ خصوصاً بیاہ کے گیت سن کر تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا اور اپنے شدید کنوارے پن میں اُسے یہ محسوس ہونے لگ جاتا۔ کہ وہ اس تمام شور و غوغا، راگ رنگ، باتوں اور قہقہوں کشمکش میں ایک ادنیٰ، بے توقیر اور فالتو فالتو سی شخصیت ہے۔ اُس کا یہ وہم دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ منگل اشٹکا پڑھنے اور ساودھان کہہ چکنے کے بعد وہ فوراً ایک کونے کی طرف سرکنا شروع کر دیتا۔ جوں جوں دلہن والے اور براتی اس کی فوری کنارہ کشی دیکھتے توں توں اُسے بیٹھنے کے لئے جگہ دیتے۔ نہایت تکریم سے بلاتے۔ مگر جس قدر کوئی اصرار کرتا جیوارام کو اسی قدر زیادہ اذیت ہوتی۔

یہ تھی اس کی طبیعت کی "ترکیب نحوی"!

اس کی غیر مردانہ اور نسوانی یا شاید بے حد جذباتی اور جوشیلی طبیعت کے باعث بیاہ کے موقعوں کی غیر معمولی باتیں۔ مثلاً دلہن کے چہرے کا حیا سے رنگ بدلنا۔ نوشہ کی دزدیدہ نگاہیں، رخصت ہوتے وقت دلہن کا رونا، راگ رنگ، ہنسی اور قہقہے اس کے دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتے اور اس جوش سے خون اس کی مردہ رگوں میں دوڑنے لگتا۔

ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا

تھا۔ شروع سال میں باتوں باتوں میں جیوارام نے مجھے بتایا کہ اُس سال
چیت کی پورنماشی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے
گا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورنماشی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان
جی پیدا ہوئے تھے اور اس دن سے چالیس برس پہلے جیوارام کی پیدائش
بھی انہی ستاروں کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند
تھا اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی اور جوش بھی تھا یعنی وہ ایک جگہ
جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔ فقط ایک بات تھی۔ جو ہنومان جی میں نہ تھی اور
وہ جیوارام میں تھی اور وہ جیوارام کا سنتر میلاپن اور غیر ضروری حجاب تھا۔
ہو سکتا ہے کہ ہنومان جی کی پیدائش اور پنڈت جیوارام کی پیدائش میں
کچھ وقت کا فرق پڑ گیا ہو اور جیوارام دوسری راس میں داخل ہو کر
ہنومان جی سے تفرّق پیدا کر چکا ہو اور کسی کمزور ستارے نے ہنومان
جی کی سی بے باکی اور جرأت کو سنتر میلے پن اور مجہولی میں بدل دیا ہو۔ بہرحال
وہ اُس وجہ سے بھی سنتر میلا تھا کہ برسوں سے اکیلا رہتا آیا تھا۔ عمر کے
چالیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے وہ اس خوفناک طور پر کنوارا تھا کہ
اگر بیمار پڑ جاتے تو کوئی اُسے پانی کو بھی نہ پوچھے ——— بس یہ تھی اُس کی
طبیعت کی ترکیب نحوی!

چونکہ عورتوں کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے وہ اُن سے
کچھ کچھ ڈرتا بھی تھا۔ وہ صرف یہی جانتا تھا۔ کہ دنیا میں بہت سے جھگڑوں
کی ابتدا عورت سے ہوا کرتی ہے۔ اس بات کا بھی اُسے علم تھا کہ عورت
کی طبیعت (اُس کی اپنی طبیعت کی مانند) جذباتی ہوتی ہے اور مبہم اور سنتر میلی
——— نا معلوم کس وقت کوئی بات اُسے بُری لگ جائے حالانکہ اس میں
ذرّہ بھر شک نہیں کہ جیوارام بری بات کے معیار سے ناواقف تھا بیسیوں
بار اس نے جی کڑا کر کے ایسی باتیں جو اس نے پہلے دل میں بری محسوس کیں
کہہ دیں۔ مگر کسی عورت نے برا نہ مانا اور اب تو اس کی ہمت بڑھتی جاتی تھی۔

بیس برس سے چالیس برس کی عمر کے درمیان اُسے خیال آیا کہ وہ
برہمچریہ آشرم سے گرہست آشرم میں داخل ہو جائے۔ مگر برہمچاری پنڈت
کا درجہ سماج میں کتنا اونچا ہوتا ہے۔ اس کا اُسے غرور تھا محض انگشت
نمائی کے خوف سے اُس نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ حتیٰ کہ چالیس برس
کی عمر کو پہنچنے تک یہ خیال بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ کئی تخیل انگیز بیاہوں نے
اُس کی ہٹ پہ کاری ضرب لگائی تھی اور رفتہ رفتہ اُس کے یہ ذہن نشین ہو گیا۔
کہ چلتی پھرتی دنیا میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ
چھوڑ کر انگشت نمائی کے لئے وقت نکالے۔ ایسا خیال کرنا تو اپنے ہی
من کی مایا ہے۔ . .

گرہست کے قضیوں کا رونا اگرچہ کھلنا کے متعدد گرہستیوں سے
انفرادی طور پر سنتے سنتے اس کے کان پک چکے تھے۔ پھر بھی کسی ہونہار
بیاہ کے اختتام پر ایک وقفۂ حیرت میں ڈوبے رہنے کے بعد جیوارام
منہ سے انگلی نکال کر سر کو ایک جھٹکا دیتا جیسے کسی وکیل کو اپنے موکل کے
بیان میں کوئی ایسا موافق نکتہ دکھائی دے۔ جس پر تمام کا تمام مقدمہ
گھوم جائے۔ وہ مشکوک انداز سے کہتا۔

"یہاں ——— یہ بات۔ بھئی آخر کچھ تو ہے جو رونے پیٹنے
کے باوجود لوگ خوش رہتے ہیں۔ اس کشمکش اور بے قراری میں بھی
کچھ نہ کچھ لطف ضرور ہے . . . !"

مگر جب جیوارام کے کان میں یہ الفاظ پڑتے کہ جیوارام چالیس
برس کا ہو چکا ہے اور اُس نے ابھی استری کا منہ تک نہیں دیکھا تو
جیوارام کو اپنی فوقیت اور فضیلت میں شک نہ رہتا۔ ایسی بات سن
کر جیوارام کے خوش آیند تخیل کی بنائی ہوئی بیاہ کی حسین عمارت ملیہ
میٹ نیچے آ رہتی اور اسے از سرِ نو اور زیادہ وسیع اور شاندار بنانے
کے لئے ایک ہوش ربا بیاہ اور اس کی تمام رونق ازدواجی رشتوں
میں منسلک ہونے والے لڑکی اور لڑکے کی غائبانہ کشش، اُن کے
والدین کی خوشی، ہنسی راگ رنگ، اور ہنگامہ ہاؤ ہو کی ضرورت ہوتی
اور نندہ اور دیجے کا بیاہ پڑھ چکنے کے بعد ایک ایسی تعمیر کے
کنگرے جیوارام کے تخیل میں آسمان سے باتیں کر رہے تھے!

(۳)

چند دنوں کے بعد اوباش دیجے جو کھلنا میں ہی رہتا تھا اور دور
نزدیک سے جیوارام کا رشتہ دار بھی تھا آیا۔ اُس کی آنکھوں کے سرخ
ڈوروں سے زیادہ پھول رہے تھے اور اُن سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے
جیسے اُس کے اندر کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ ہاں! شباب کی بھٹی تھی نا وہ۔
وہ ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام۔

دیجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا لیتے ہوئے جیوارام سے کہا۔

کہو ——— دادا (بھائی) ——— اتنے اداس کیوں ہو؟

جیوارام نے اپنی افسردگی کو چھپا لیا۔ بولا۔

بھئی کل سے بیمار ہوں۔ بہت لاچار ہوں . . . . بھائی

کو خط لکھنا ہے۔ بھاوج کو یہاں بھیج دے۔ مجھے تو یہاں پانی دینے والا بھی کوئی نہیں"۔

"ارے بھاوج!۔۔۔ ایک ہی کہی تم نے ۔ ۔ ۔ دھانوں کے دن ہیں۔ آج کل چھٹائی میں سر دھنتی ہوگی۔ جھیٹو کی کمائی انہیں تک تو محدود ہے اور آج کل تو بھاؤ پھلانگتا ہوا اوپر جا رہا ہے۔ ایک پانی برس گیا تو اُن کے کوڑی دام نہیں۔۔۔"

دوسرے نیل رتن آتا دکھائی دیا۔ نیل رتن مجسم شیطان تھا۔ وہ ہمیشہ بے وجہ ہنستا تھا۔ بے موقع ہنسی مذاق کیا کرتا۔ جب لوگ ہنستے تو وہ روتا۔ جب لوگ روتے تو وہ ہنستا۔ یہ تعریف اولیاء کی ہوتی ہے مگر وہ ولی بھی نہیں تھا اور یہی بات خطرناک تھی۔

نیل رتن سے ذکر کیا گیا تو وہ بولا۔

ٹھیک ہے بھاوج کو غرض پڑی ہے کہ تمہارے ہاں آئے ۔ ۔ ۔ اُس کے تین بچے ہیں، تینوں کمسن، تینوں لڑکیاں۔ جن کا تن ڈھانپنے ہی آدھا دن گزر جاتا ہے ۔۔۔ بھلا آئے تو ایک ایک کٹوری سے کم دودھ کسی کو کیا دوگے ۔ ۔ ۔ کیا کہتے ہو سیر؟ ۔ ۔ ۔ ایں! ۔ ۔ ۔ میں کہتا ہوں دو اڑھائی سیر سے کم نہ لگے گا۔ ذرہ حساب تو لگاؤ ۔ ۔ ۔ اور کپڑے کی قسم کا خرچ آ پڑے گا۔ یوں دب گے جیسے چرخا بل کے نیچے دبا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ "

پھر اس بات کا رُخ خود بخود پلٹ گیا۔ نیل رتن بولا۔

"کیوں وجے۔۔۔ بیاہ کیسا رہا۔ بیوی تو اچھی ہے نا"

جیوا رام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی۔ نندہ تو یوں بھی دیوی ہے ۔ ۔ ۔ نری دیوی۔ وہ جہاں بھی جاتی گھر کو سورگ بنا دیتی"۔

"ٹھیک کہتے ہو دادا" وجے نے کنوئیں کی جگتی کا سہارا ہٹاتے ہوئے کہا۔ گرہست تو سچ مچ سورگ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ کیا بتاؤں۔ نندہ تو سچ مچ نندہ ہی ہے ۔ ۔ ۔ میں نے پچھلے جنم میں کوئی اچھے کرم کئے ہوں گے۔ جو مجھے نندہ ملی ۔ ۔ ۔ ایشور کرے میرے ایسا سکھ ہر ایک کو نصیب ہو"۔

اس کے بعد وجے نے اپنے آپ بتایا کہ نندہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتی۔ جب تک اُسے نہ کھلا لے۔ وہ کہیں باہر چلا جائے تو تمام دن انتظار ہوا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ دیر لگا کر آئے تو اُسے روتا ہوا پاتا ہے۔ شکوے ہوتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اُس کے پاؤں دباتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ شاید یہ خوش ہونے کی بات تھی۔ اسی لئے نیل رتن نے افسردہ سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

"۔ ۔ ۔ ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا جی۔۔۔ چند روز۔۔۔ ذرا ایک دو برس گزرنے دو ۔ ۔ ۔ ۔ ایک آدھ بچہ ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا یہ گرہست کس بھاؤ پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کدھر جاتے ہیں وہ چوچلے۔۔۔"

"خیر کچھ بھی ہو" جیوا رام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "جس گھر میں نندہ سی بیوی چلی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ گھر تو ۔ ۔ ۔ ۔"

نامعلوم جیوا رام کو کیا ہوگا۔ فوراً ہی مغموم سامنہ بناتے ہوئے اُس نے کہا۔

"وہ زندگی ہماری طرح تو نہیں۔۔۔ کہ بیمار پڑ گئے تو کوئی پانی کو بھی نہ پوچھے۔ بھاوج کو لکھیں تو وہ دھانوں یا بچوں کی وجہ سے نہ آئے۔ اور اگر آئے تو دو اڑھائی سیر دودھ وغیرہ۔۔۔ یہی اندازہ تھا نا رتن۔۔۔"

وجے اور نیل رتن نے شدید طور پر جیوا رام پنڈت کی مصیبت کو محسوس کیا۔ نیل رتن نے ایک خاص انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے بولا۔

"دادا۔۔۔ تم جانتے ہو۔۔۔ میں کس لئے تمہارے پاس آیا ہوں"

"نہیں۔۔۔ میں کیا جانوں"

"میں تم سے منگل اشٹک سیکھنے آیا ہوں۔ باقی کے سات منتر تو مجھے آتے ہیں منگل اشٹک پڑھتے وقت کچھ روانی نہیں پاتا ہوں"۔

"تم بھی پروہتوں کا کام کرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا کام چھوڑ دیا تم نے"۔

"تمہیں سکھا دینے میں تامل ہی کیا ہے۔ ایک خاص بیاہ پر ضرورت ہے ۔ ۔ ۔"

پھر جیوا رام کے قریب آتے ہوئے وجے نے کہا۔

"دادا۔ بات یہ ہے۔ ہمارے محلے ایک لڑکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نہایت سندر۔ ذرا چنچل ہے ۔ ۔ ۔ تمہاری طرح۔۔۔ عورتیں ہوتی ہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ تمہارا اُس سے بیاہ ہو جائے۔ بیاہ میں ہی پڑھ دوں اور زیادہ لاگ لپیٹ اور شور نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ہمت کی ضرورت ہے۔ چھوڑو اس برہمچریہ کی ہٹ کو ۔ ۔ ۔ ۔ گرہست میں تمہیں بہت سکھ ملے گا۔۔۔ تمہاری حالت کا اندازہ میں نے اُسی دن لگا لیا تھا۔ جب تم میرا بیاہ پڑھ رہے تھے۔۔۔"

وجے اور نیل رتن جیوا رام کے اثبات و نفی کا انتظار کرنے لگے۔

چند لمحات کے لئے خاموشی رہی۔

جیوارام کا جواب خاموشی تھا جس کا مطلب تھا نیم رضامندی
نیل رتن نے چہکتے سے کہا۔

"واہ واہ — اچھی بات ہے۔ وجے پنڈت ہی ہے نا۔ وہ منگل اشٹکا ڈشٹکا پڑھ دے گا۔ بہت شور مچائے بغیر بیاہ ہو جائے گا۔ سکھی رہو گے۔ تم جانو تمہارا کام . . . . ہم بھلے کی کہتے ہیں — دن مت دیکھو۔ ۲۵ کاتک۔ بدھ وار۔ شبھ لگن۔ شبھ مہورت۔ بس منگل اشٹکا اور رسا وہاں —"

ناگ پھنی اور کنول کو اپنی پتیاں جھکتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ جیوارام کی ذہنی تعمیر کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے کرتے بالکل آسمان سے جا ملے!

(۴)

جیوارام پروہت کے بیاہ کے لئے بہت ٹھاٹھ باٹھ کیا گیا۔ باجے بھی بجے ڈھولک بھی۔ مذاق بھی ہوئے اور قہقہے بھی بلند ہوئے اور جیوارام کا دل بھی دھڑکا — لیکن بہت زور زور سے۔ فقط اتنی کسر تھی کہ چھاتی کی دیواریں نہ ہوتیں تو کبھی کا اچک کر باہر آ رہتا۔

وجے نے دیکھا۔ پنڈت جیوارام کی نظریں بھی آوارہ ہو چکی تھیں اور مچل مچل کر اپنی ہونے والی بیوی کی گوری گوری کلائی پر چمکتی ہوئی چوڑیوں اور جسم کا جس کا چھریرا پن مہین کپڑوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جائزہ لے رہی تھیں۔ اُس کی زوجہ بھی نندہ کی طرح لمبی تھی اور اپنے شوہر سے سر نکالتی تھی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی۔

وجے نے رسمیہ طور پر عہد کے لئے جیوارام کا ہاتھ اس کی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر گیلا آٹا رکھا اور رسا تواں منتر پڑھ دیا۔ چاروں طرف سے چاول وجے کے آگے گرنے لگے۔

وجے ایک استادانہ طرز سے پیسے منگل سنیچر گنیش وغیرہ کے خانوں میں رکھوا رہا تھا۔ کانپتے ہوئے جیوارام نے اشارہ سے وجے کو بلایا۔ منتر گنگناتے ہوئے وجے نے اپنا کان جیوارام کے منہ کے پاس کر دیا۔ جیوارام نے کہا۔

"بھیا — میرا دل بہت دھڑک رہا ہے . . . . میں کانپ رہا ہوں۔ دیکھتے نہیں مجھے سردی سی لگ رہی ہے۔ نیل رتن سے کہنا مجھے ذرا تھامے رکھے!"

وجے برابر منتر گنگناتا گیا۔ وجے کا ایک اور ساتھی بولا۔

"واہ واہ — نیل رتن بالکل سٹھ گیا ہے . . . . تم جانتے ہو۔ کھلنا سے بہت دور تو نہیں۔ آتا ہی ہوگا"

"وجے — ٹھہرو" جیوارام نے آہستہ سے کہا "منگل اشٹکا ابھی نہ پڑھو۔ مجھے سوچ لینے دو۔ میری عمر چالیس برس کی ہے اور میں برہمچاری پنڈت ہوں . . . ."

وجے نے دیکھا جیوارام سچ مچ بیاہ کے لئے بہت مضطر تھا۔ اس کے گلے میں خشکی پیدا ہو رہی تھی۔ لب سوکھ گئے تھے جن پر جیوارام دیوانہ وار زبان پھیر رہا تھا۔

وجے نے آہستہ سے مگر ایک حقارت آمیز آواز سے جیوارام سے کہا۔

"چھی چھی — تمہارے ایسے کمزور آدمیوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں واہ واہ — دنیا ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا کرتی ہے"

جیوارام کے بس کی بات ہوتی تو وہ منگل اشٹکا کا جاپ ہونے سے پہلے ہی اپنے پاک برہمچریہ کو گرہست کی آلودگیوں سے بچانے نکلتا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اُس کی ہونے والی بیوی نے بہت زور سے دبا رکھا تھا۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ وہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں . . . . شاید شرارت کے طور پر — چنچل تھی نا — جوانی تھی نا — عورت!

پھر جیوارام منگل اشٹکا کے جلدی جلدی پڑھے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وہ جلد ہی اُس ذہنی کوفت سے نجات حاصل کرے اور اپنی ہونے والی بیوی کا چہرہ دیکھے۔ اس کے تخیل کی مشین چلنے لگی پھر اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دلفریب پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اس کو ایک خوبصورت نیلی جھیل — اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آ رہے تھے جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے۔ جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور ان سے پرے امرا کے محل جن میں وہ زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک بودے سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترہی پھونک رہا تھا اور

ترنی کی دلکش آواز اس بات کی یاد دلا رہی تھی جسے نسل انسان ازل سے بھولتی چلی آرہی ہے . . . .

—— فقط اب وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے بازو میں بازو ڈالے محو نظارہ تھی۔

پانی میں ناگ پھنی اور کنول تر بتر ہو رہے تھے۔

یکایک منگل اشٹکا نے اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کتنا خوبصورت پُرمعنی منتر ہمارے بزرگوں نے . . . .

ساودھان کی آواز آئی اور لوگوں نے مبارک باد دی۔

وجے نے اپدیش دیا۔ بالکل جیوارام کی طرح —— وجے نے آخر میں کہا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے

۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن کو مارنے کے ——

پاس ہی ایک شرارتی لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

ایک من برابر ہے چالیس سیر کے۔

ایک سیر برابر ہے سولہ چھٹانک کے ——

اور وجے نے گھورتے ہوئے کہا "شت . شت"

. . . .

شام کو حجلۂ عروسی میں جیوارام نے اپنی دلہن کو گٹھڑی بنے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا۔

جیوارام کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اپنی بیوی کا منہ دیکھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

"شاید یہ حرکت اُسے بُری لگے —— جیوارام نے دل میں کہا عورت ہے نا . . . ."

جیوارام نے جتنی دفعہ کوشش کی۔ اتنی دفعہ ہی ناکام رہا۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے کمرے میں اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ اسے واہمہ گردانتے ہوئے جیوارام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر روک لیا۔

"تمہارے ایسی کمزور طبیعت والے آدمی کو تو دنیا آڑے ہاتھوں لیتی ہے . . . . چھی چھی ——" وجے کے الفاظ جیوارام کے کانوں میں گونجنے لگے۔

جیوارام نے جب نہایت ہمت سے کام لے کر آناً فاناً دلہن کا منہ بے نقاب کیا تو دلہن دیوانی ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ جیوارام کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیاہا ہوتے ہوئے بھی وہ کنوارا تھا۔ یا کنوارا ہوتے ہوئے وہ رنڈوا تھا یا . . . .

—— دور چارپائی پر دلہن کی بجائے نہایت قیمتی کپڑوں میں ملبوس نیل رتن تالیاں بجا رہا تھا اور باہر سے منگل اشٹکا کے اونچے اونچے جاپ کے درمیان بے تحاشا قہقہے بلند ہو رہے تھے!!

راجندر سنگھ بیدی

محبت

محبت کے ترانے گونجتے ہیں کوہساروں میں
محبت کی تجلی سے فضا پرنور رہتی ہے
محبت پھول کی خاموشیوں میں مسکراتی ہے
محبت چاندنی راتوں میں سایوں سے لپٹتی ہے
محبت طفلکِ بے نوش کی معصوم باتوں میں
محبت کو جمالِ شعر کا ملبوس کہتے ہیں
محبت میں خدا کے نور کی تصویر رقصاں ہے
محبت کو جہاں کی نعمتوں سے بے نیازی ہے
محبت ملگجی چادر میں خوش ہو ہو کے سوتی ہے
محبت جھونپڑوں میں کیف سے مخمور رہتی ہے
محبت کھیلتی ہے نوجوانوں کی جوانی سے
محبت خون کی سرخی سے گلگونہ بناتی ہے
محبت برق کا دامن بھی بڑھ کر تھام لیتی ہے
محبت وقت کی تعزیر سے آزاد رہتی ہے
محبت نے بشر کی بے خودی کو زندگی بخشی
محبت عقل کے ایوان کو مسمار کرتی ہے
محبت حسن والوں کو سراپا ناز کرتی ہے
محبت سا حسیں کوئی ترانہ ہو نہیں سکتا

محبت نغمہ زن ہے وادیوں میں آبشاروں میں
محبت کے تعطر سے صبا معمور رہتی ہے
محبت بادلوں کے بھیس میں آنسو بہاتی ہے
محبت پردۂ ظلمت میں تاروں سے چمکتی ہے
محبت شاہدِ بے درد کی رنگین گھاتوں میں
محبت کو ادب کی بزم کا فانوس کہتے ہیں
محبت کا وجود انساں کی ہستی پہ احساں ہے
محبت کے لئے پامال رہنا سرفرازی ہے
محبت مخملیں قالین کو اشکوں سے دھوتی ہے
محبت اونچے اونچے مندروں سے دور رہتی ہے
محبت پرورش پاتی ہے تلواروں کے پانی سے
محبت خندہ پیشانی سے جاں پر کھیل جاتی ہے
محبت کشتیٔ جاں موت کے دھارے پہ کھیتی ہے
محبت رنج کی پابندیوں میں شاد رہتی ہے
محبت کو فریبِ آرزو نے تازگی بخشی
محبت دین کی تقدیس سے انکار کرتی ہے
محبت اہلِ دل کو آشنائے راز کرتی ہے
محبت سا کوئی رنگیں فسانہ ہو نہیں سکتا

محبت نے جہاں کی آنکھ میں بیگانگی بھر دی
محبت نے سرِ انساں میں دیوانگی بھر دی

پرشوتم لال ضیا

بربط نواز

(عالمِ انتظار میں)

جان ہے اضطراب میں روح نہیں قرار میں — بیٹھی ہوئی ہوں دیر سے عالمِ انتظار میں

فرطِ الم میں انگلیاں چلتی ہیں کب ستار پر — یورشِ فوجِ غم ہے اب میرے دلِ فگار پر

تو نے مجھے بھلا دیا تجھ کو بھلاؤں کس طرح — دل میں وفا کا نقش ہے اس کو مٹاؤں کس طرح

رنج فریبِ شوق ہے عالمِ بیم و یاس ہے — پھر بھی مقامِ شکر ہے عہدِ وفا کا پاس ہے

آپ سے جاؤں کس طرح آپ میں آؤں کس طرح — آگ سی ہے لگی ہوئی اس کو بجھاؤں کس طرح

آ کہ سناؤں پھر تجھے نغمۂ جاں نواز میں — آ کہ جہاں میں چھیڑ دوں عشق کا ایک ساز میں

محفلِ سوز و ساز میں آ کہ تجھے بٹھاؤں پھر — بادۂ عشقِ غم ربا آ کہ تجھے پلاؤں پھر

آ کہ کروں میں پھر تجھے محوِ سرورِ بےخودی — آ کہ بتاؤں پھر تجھے راہ نشاط و عیش کی

آ کہ میں اپنی تان سے وجد میں لاؤں پھر تجھے — آ کہ میں اپنے پریم کا گیت سناؤں پھر تجھے

آ کہ تجھے پیام دوں عشقِ وفا سرشت کا — آ کہ دکھاؤں در تجھے جلوہ گہِ بہشت کا

آ کہ گزر رہا ہے اب عہدِ شباب ہجر میں
آ کہ سکوں کی نیند بھی ہو گئی خواب ہجر میں

روشن نکودری
ایم۔ ایس۔ سی

امریکہ کا ملک الشعرا

والٹ وٹمن

جب امریکہ کے شاعر والٹ وٹمن نے ۱۸۵۵ء میں اپنا مجموعۂ کلام، جس کا نام اس نے "گھاس کی پتیاں" رکھا، اپنے ہاتھوں سے چھاپ کر شائع کیا تو بحر اوقیانوس کے دونوں پہلوؤں پر ـــــ امریکہ اور انگلستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ پرانی ادبی اور اخلاقی روایات کے پابندوں نے برانگیختہ ہو کر شاعر اور اس کے دیوان کو ملعون کیا اور بوسٹن میں اس کتاب کو جس کے لئے آیندہ زمانہ میں سرمایہ علم و ادب سمجھا جانا مقدر ہو چکا تھا۔ ضبط قرار دیا گیا۔

یہ نظموں کا مجموعہ انگریزی زبان کے علم ادب اور خصوصاً شاعری میں ایک ممتاز تحریکی حیثیت رکھتا ہے اور وٹمن کے تخریبی اور تعمیری نقادوں کے دونوں فرقوں نے اپنی مختلف راؤں اور دلیل و برہان سے موضوع اور زبان کے لحاظ سے اس کی اہمیت کو واضح تر کر دیا۔ مرزا غالب کے مختصر اردو دیوان کی طرح اس مختصر مجموعے نے جو بعد میں رفتارِ زمانہ اور شاعر کے تخیلی ارتقا کے ساتھ ساتھ ضخیم تر ہوتا گیا) فنی اور موضوعی لحاظ سے شاعری کے نئے اصول اور ضابطے اہلِ ذوق کے پیش نظر کئے۔ انگلستان کو زبان و بیان کی جدت پر اعتراض تھے لیکن امریکہ والوں کی روایتی ذہنیت کو زبان و بیان کی بہ نسبت موضوع کے اچھوتے اور بے باک ہونے سے زیادہ دھچکہ لگا۔ اس کتاب کی اشاعت سے پیشتر شاعر کو عوام سے بالاتر ہستی، ایک لطیف اور روحانی کیفیات کا نغمہ سرا سمجھا جاتا تھا لیکن والٹ وٹمن لوگوں کی نگاہوں میں اچانک ایک ایسے شخص کی صورت میں نمودار ہوا جو ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عامی ہونے پر بھی فخر کرتا تھا اور اپنے اس اعتقاد یا نظریے میں اس قدر ثابت قدم تھا کہ اس میں اس طبقہ عوام کی خصوصیات زیادہ شدید نظر آ رہی تھیں جو محض اپنی طبعی تحریکات کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ہی ہر دو جہاں کا ماحصل سمجھتا ہے۔ جس طرح بڑھئی، معمار، ماہی گیر یا دوسرے مزدوری پیشہ انسان اپنی صاف اور سادہ بولی میں اعضائے جسمانی، بچے پیدا کرنے، اور دوسری روزمرہ کی باتوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، یہ شاعر بھی اسی طرح باتیں کرتا تھا اور اپنی اُن باتوں کو ایک خاص فلسفیانہ انداز میں ڈھالنے کے بعد شاعری کہتا تھا۔ اس شاعر کے اعتقاد میں عمومیت ہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ لیکن اس کے باوجود اپنے مہذب اور ذہنی طور پر ترقی یافتہ قارئین کے سامنے اپنے فصیح، بلیغ اور عجیب الہیئت کلام کے ذریعے سے روحانیت اور جسمانیت کو یک جا کر کے پیش کرتا تھا۔ گویا روح اور پسینے میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ اپنے خیالات کو تمام امریکہ کی مکمل زندگی، جمہوریت اور مذہبی اعتقادات کا نمایندہ سمجھتا تھا لیکن تفصیلات کی طرف رجوع کئے بغیر پہلے ہمیں وٹمن کے سوانح حیات کا ایک مختصر سا خاکہ نظروں کے سامنے رکھ لینا چاہئے تاکہ اُس کی شخصیت سے واقفیت ہونے کے بعد ہم اس کی شاعری اور فلسفے یا پیغام کے متعلق کچھ کہہ سکیں۔

والٹ وٹمن امریکہ کے لونگ آئیلینڈ میں ویسٹ ہلز کے مقام پر ۳۱ مئی ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ اور دادا پردادا سب کسان تھے جو سترھویں صدی کے اوائل میں کونیکٹی کٹ کے علاقے میں یورپ سے آ کر آباد ہوئے۔ وہ لوگ نسلی لحاظ سے یورپین انگریزوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں سے احتیاط اور رجز اسی کی خصوصیات وٹمن کے

حصے میں آئیں اور انہیں سے اُسے زندگی کے متعلق بلند اور افضل انداز نظر ورثے میں ملا جو اس کی شاعری کا ایک خاصہ ہے اور اس کے کلام کو ایک روحانی جلا دے دیتا ہے۔ اس کی ماں کا نام لوئیزا فان ویلسیر تھا اور وہ ویلش اور ڈچ نسل سے تھی۔ روایات کے مطابق وہ ایک غیر معمولی عورت تھی تقریباً غیر تعلیم یافتہ لیکن ایک ایسی پر زور شخصیت کی مالک جس کے خصائص بیٹے میں پورے طور پر ظاہر ہوئے۔ گیارہ برس کی عمر میں وٹمن ابتدائی تعلیم کے عین بعد ایک وکیل کے دفتر میں معمولی کاموں کی بجا آوری کے لئے ملازم ہو گیا اور اس کے بعد ہی اس نے ایک اخبار کے دفتر میں طباعت کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ سترھویں سال میں وہ ملازمت حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے والدین کے پاس دیہات میں چلا گیا۔ پانچ سال تک وہیں رہا۔ اس عرصے میں وہ کبھی تو معلمی کا کام کرتا رہا۔ اور کبھی ایک اخبار کے لئے طابع اور مدیر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ بائیس سال کی عمر میں وٹمن نیویارک کو لوٹا۔ یہاں اُس نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور سات سال تک مختلف اخباروں میں کام کرتا رہا۔ نیز سیاسیات میں حصہ لیتا رہا۔ ان سات برس میں اُسے بہت سا تجربہ حاصل ہو گیا۔ نیویارک کے عظیم الشان شہر نے اپنے بازاروں، تھیٹروں، راگ گھروں، اور ساز بینوں کے ذریعے سے نوجوان وٹمن کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کر دیا اور وہ جذبات کی گہرائیوں کے اس سے پوری طرح واقف ہو گیا۔ نیویارک سے وہ ۱۸۴۸ء میں نیو اورلینز گیا تاکہ ایک اخبار کی ادارت کا بار اپنے ذمے لے۔ اس اخبار کے مالک نے اس سے پیشتر ہی معاہدہ کر لیا تھا۔ وٹمن اس نئے مقام پر صرف تین ماہ تک رہا۔ اس قیام کے اختصار اور وہاں سے اچانک روانگی نے وٹمن کے سوانح نگاروں کو خیال انگیزی کے لئے موقعہ دیا ہے۔ لیکن آج تک اصل بات کی تہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کیا ان تین مہینوں میں شاعر کا تعلق کسی ایسی عورت سے ہو گیا جو سماجی لحاظ سے برتر تھی؛ اور جس کے بطن سے شاعر کی اولاد پیدا ہوئی لیکن قانون اور مذہب کی رو سے وہ اکٹھے نہ ہو سکے؟ یہ اس راز کا ایک ممکن حل ہے۔ جنوب کے وسیع علاقوں کی طرف نیو اورلینز کو جاتے ہوئے اُس نے چند ایسے اشعار لکھے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ شمال کے آدمی کو اس طرف رُخ کرتے ہوئے محتاط رہنا چاہئے کیونکہ جنوب کی عیش افزا نازکی اور نور شیرینی میں اس کے لئے خطرات پنہاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وٹمن کے یہ خطرات بے بنیاد نہ تھے۔ کیونکہ اگرچہ اس جگہ اس کا قیام نہایت مختصر رہا پھر بھی اُسے وہاں ایک ایسا تجربہ حاصل ہوا جس نے اس کی تمام زندگی پر ایک گہرا اثر کیا۔ اگرچہ اس تجربے کی اصل نوعیت نامعلوم اور مبہم سی ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اس جگہ اس کا تعلق کسی ایسی عورت سے ہو گیا جس کا سماجی درجہ اس کی اپنی حیثیت سے بلند تر تھا۔ نیز وہ وٹمن کے ایک بلکہ ایک سے زیادہ بچوں کی ماں بنی۔ شادی نہ ہو سکی۔ اور اس پہلو کے متعلق وٹمن کی انتہا سے زیادہ خاموشی اور باوجودیکہ اسے اپنے متعلق کسی بات کے بھی چھپانے کی عادت نہ تھی، تجاہل عارفانہ کہی جا سکتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ اس عورت کے مفاد کی خاطر یا اس کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے یا اس کے خاندان کے دباؤ کی وجہ سے نہ صرف شادی نہ ہو سکی بلکہ وٹمن سا صاف گو اور بے باک شخص بھی تمام معاملے کو ایک گہرے پردہ راز میں رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ بہر حال یہ بات یقینی جاننا چاہئے کہ ۱۸۴۸ء میں نیو اورلینز میں وٹمن کو شدید احساسات محبت کا ایک تجربہ ہوا اور صورت حالات کی مجبوری سے اُسے اپنی محبوبہ سے جدا ہونا پڑا اور اس مجبوری کو وٹمن نے اپنی "زندگی کا المناک افسانہ" کہا ہے۔ وٹمن نے تمام عمر شادی نہیں کی اور اس کی وجہ بھی یہی افسانوی ناکامی قرار دی جا سکتی ہے۔

ہیولاک ایلس کے خیال میں "وٹمن نے ایک نادر ترین امتیاز حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ اُسے اپنی زندگی ہی میں دنیا کے عظیم ترین اخلاقی معلموں ——— حضرت عیسیٰؑ اور سقراط کے پہلو بہ پہلو جگہ ملی ہے" لیکن اس امتیاز کے حصول کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہے ان کی نشوونما کیونکر ہوئی، اس کے مطالعہ کے لئے ہمیں وٹمن کی زندگی کی فضائے بعید کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ عرصے کے لئے صرف اپنی ذہنی اور جسمانی قابلیتوں پر گذارا کرنے کو علیحدہ کر دیا جائے تاکہ وہ قدرت کی تنہائیوں میں رہ کر اپنے نفس کے ساتھ ہم آہنگ تعلقات پیدا کرے اور اُسے خود اعتمادی کے امکانات کا مکمل احساس ہو جائے کیونکہ جس مرد یا عورت کو ایسا تجربہ حاصل نہ ہو سکے گا اس کے لئے دنیا میں بہت سے راز سربستہ رہیں گے۔ اور اُسے بہت سی فالتو مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑے گا تیس سال کی عمر تک وٹمن نے دنیا کی ماہیت کو معلوم کرنے کی جستجو جاری رکھی۔ کیونکہ اس سے بہتر طریقہ تعلیم اُس کے

لئے اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ استغنا، اخذ و قبولیت اُس کی فطرت میں بچپن تھی اور اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں اُس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ اُس نے یکے بعد دیگرے معلم، طابع، اخبار نویس، گورنمنٹ کلرک اور ان سب سے بڑھ کر آوارہ گردی کا پیشہ اختیار کیا۔ نیو یارک میں وہ براڈوے اور فلٹن فیری کے علاقوں میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ بسوں اور موٹر لاریوں کے ڈرائیوروں سے گفتگو کرتا اور کارخانہ داروں اور مزدوروں سے تبادلۂ خیالات کرتا رہتا۔ اس زمانے میں اس کی جسمانی صحت مکمل تھی۔ گزارے کے لئے آمدنی کافی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور رذیل سے رذیل انسان کے ساتھ بھی وہ برابر کا ہو کر بات کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی کی ندی کا پانی دونوں کناروں سے پیا اور رفتہ رفتہ جب ایک نئی شخصیت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں تو چھتیس سال کی عمر میں ۱۸۵۵ء میں ایک چھوٹی سی کتاب اپنے ہاتھوں سے چھاپ کر شائع کی اور اس کے سرورق پر ایک غیر معمولی، عجیب اور سادہ سی سرخی چسپاں کر دی ——————
"گھاس کی پتیاں"۔

۱۸۶۰ء میں امریکہ کی خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس تین سال کے زمانۂ جنگ میں تقریباً ایک لاکھ زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال میں حصّہ لیا۔ اور یوں ایک وسیع پیمانے پر انسانی دکھ درد سے گہری واقفیت حاصل کی۔ اس زمانے سے وٹمن کے دل میں ہر انسانی بات کے متعلق ایک گہری نزاکت احساس اور ایک بلند رحم و ہمدردی کا جذبہ ہمیشہ کے لئے پیدا ہو گیا۔ ۱۸۷۳ء میں وٹمن کے بائیں پہلو پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس مرض میں وہ تین سال تک مبتلا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ صحت عود کر آئی۔ اس نے یہ فالج کا سارا زمانہ زیادہ تر ٹہلنے یا کھلی فضا میں عریاں رہنے میں صرف کیا اور اس کا خیال ہے کہ اس کی صحت کی بحالی کی یہ ایک زبردست وجہ تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے "جس مرد یا عورت نے مناظر قدرت کے ماحول میں عریاں رہ کر حرکت کرنے کے آزاد کیف و بہجت کا احساس کبھی نہیں کیا، اُسے معلوم ہی نہیں کہ پاکیزگی، اعتقاد، آرٹ، یا صحت کی حقیقت کیا ہے"۔

اب ہم والٹ وٹمن کی شاعری اور اعتقاد کے نظریوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

انیسویں صدی میں سیاسیات اور سائنس میں جو ترقیاں ہوئیں۔ انہیں نے شاعر کے ذہن میں "فرد" کے لئے احساس تفاخر پیدا کیا اور اس تعلیم کا پرچار کرنے پر آمادہ کر دیا کہ گوشت اور پوست شیریں ترین حقائق ہیں۔ ارتقا کے اصول میں شخصیت کے موضوع کو سائنس ہی نے زور دار کیا۔ وٹمن نے جو کچھ دیکھا اور سنا، اُسے نغموں میں سُنا دیا اور اس طبقۂ عوام کو، جن کا نمایندہ اور معترف وٹمن بنتا تھا، یہ نغمے اس لئے عجیب معلوم ہوئے کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ اپنی عامیانہ اوسط قابلیت سے خیالات اور اعتقادات کے روایتی بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنی حقیقت کو کسی دوسرے کے مُنہ سے سن کر سمجھ سکے۔ وٹمن کی یہ جمہوریت پسندی عموماً عجیب جنسی راستوں سے ہوتی ہوئی ظاہر ہوتی ہے مثلاً

اے رام جنی!

دل جمعی سے، بے خوف و خطر سکھ چین سے رہ تو پاس مرے،
میں شاعر ہوں،
آزاد خیال اور آوارہ فطرت کی طرح،
اور زور آور قدرت کی طرح!
جب تک سورج اپنی کرنوں سے تیرے بوسے لیتا ہے،
میں بھی تیرے بوسے لوں گا!
جب تک پانی دھرتی پر رہ کر تیری پیاس بجھائیں گے،
میں تیری پیاس بجھاؤں گا!
جب تک پتے ہل ہل کے ہوا سے جسم ترا سہلائیں گے،
میں جسم ترا سہلاؤں گا!
یہ تیری نفرت انگیز اور ذلت سے بھری جو حالت ہے،
مجھ کو اس سے نفرت ہی نہیں!
مجھ کو تیرے، تجھ کو میرے پہلو میں نہ دیکھے کوئی، مجھے یہ سوچ نہیں!
میں مرد ہوں اور تو عورت ہے،
دونوں کو بنایا قدرت نے!
دونوں نے خدا کا نام لیا،
دونوں جزو ہیں شہریت کے!
ہاں، اے وہ کلی! جو وقت سے پہلے شگفتہ ہے
میں تجھ سے وقت مقرر کر کے کہتا ہوں،
آ، ہم تم باتوں باتوں میں کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں!
کچھ پھولوں سے،

کچھ رنگ برنگے، ہلکے ڈھیلے، اور باریک لباسوں سے.
جا اپنا جسم سجنے کی تیاری کر!
اور ایسی بن،
میں فطرت کی تکمیل کروں،
جا، آج ذرا، دل گرمانے والے اور من موہن سنگاروں کو اپنا
کرلے۔
اور میرے پہلو میں آجا، جب میں آؤں!
ہاں، اس لمحے تک معنی خیز نگاہوں سے میں تجھ کو اشارے
کرتا ہوں!

یہ جمہوریت اور اخوت کی انتہا ہے اور اس کے اظہار کے لئے شاعر نے سراسر انفرادی اور غیر معمولی اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند لمحوں کے لئے پرانی روایات کے بار کو اپنے کندھوں سے اتار دیں۔ اسی طرح مردوں کے شہری اور قومی یا ملکی تعلق کو پختہ بنیادوں پر قایم کرنے کے لئے وٹمن جو صورت اختیار کرتا ہے۔ وہ بھی پرانے اخلاقی معیاروں کے لحاظ سے قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے۔ لیکن ذیل کی نظم میں اس جمہوری تعلق کے علاوہ شاعر کا مقصد نوجوانی کی امنگوں اور اولوالعزمی سے لبریز زمانے کی کیفیات کا بیان بھی ہے۔

ہم دو لڑکے

ہر دم ساتھ اکٹھے رہتے،
ہم دونوں آپس میں لپٹتے۔
نئے نئے رستوں پر چلتے، پورب پچھم آتے جاتے،
اپنے بازوؤں کو پھیلاتے،
مٹھیاں بھینچتے، کھسکتے جاتے، زور اور بل سے لطف اٹھاتے،
خوف و خطر کو دل میں نہ لاتے، عیش مناتے، سیریں کرتے،
کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، ہنستے گاتے، گلے لگاتے،
روٹھتے منتے، چومتے جاتے،
رسم و رواج کو دل سے بھلاتے، اپنی من مانی ہی کرتے!
موجوں میں ناؤ کو بہاتے، دریاؤں کے پار اترتے،
گاؤں میں دہشت پھیلاتے، کنجوسوں کا دل دہلاتے،
ڈاکو بن کر لوٹتے جاتے!
قانونوں کی ہنسی اڑاتے، فوجوں کو خاطر میں نہ لاتے،
ہر اک بستی ہر اک صحرا، درہم و برہم کرتے جاتے،
ہر لمحے، ہر وقت ہمیشہ، یونہی چلتے پھرتے پھرتے،
اپنے کھیل کو پورا کرتے!

وٹمن اپنی شاعری میں دو طرح کی محبت کے گن گاتا ہے۔
اول عورت کے لئے مرد کی "گہری" محبت جس میں مرد کو اپنی تقدیر کا ہمنوا بنانے کے لئے ایک رفیقِ حیات حاصل ہوتا ہے اور جو ہمیں انجام کار اپنی اولاد کے ذریعے سے ابدی ہونے کا موقعہ دیتی ہے
دوم، مرد کے لئے مرد کی "رفیقانہ" محبت۔ جو زندگی میں ایک غیر مرئی قوت کے طور پر موجود رہتی ہے اور اسے اظہار کے طور پر اخوت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس مردانہ محبت کی مثال اوپر کی نظم تھی لیکن عورت کی محبت والی مثال سے پہلے جسم اور اس کی کارفرمائی کے بارے میں شاعر کے اندازِ نظر سے آگاہی ضروری ہے۔ وٹمن کے خیال میں جسم ایک پاکیزہ اور متبرک چیز ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے روح بلکہ اپنی نظم "میں برقی جسم کے نغمے سناؤں گا" میں وہ کہتا ہے کہ "اگر جسم ہی روح نہیں، تو پھر روح کیا ہے؟" یعنی کچھ بھی نہیں۔
وٹمن کے لئے ہر معمولی سے معمولی چیز بھی زبردست اہمیت رکھتی ہے جوانی اور بڑھاپا اس کے لئے یکساں طور پر کیف و انبساط سے لبریز ہے

چولی اور دامن کا ساتھ!

(۱)
اے عمرِ جوانی! وہ لمحے، عیش و عشرت کے، چاہت کے!
ہاں وہ لمحے زیب و زینت کے، نشوں والی طاقت کے!
جیسے دن ہو ہنستے چمکتے سورج والا، کاموں والا!
ہر دم نئی امنگیں ہی لاتا ہو جس کا اجیالا!

(۲)
وقتِ پیری، کچھ لمحے سکھ چین، فراغت، فرصت کے،
کچھ لمحے روحانی خوشی کے، نیکی کے اور عظمت کے!
جیسے رات ستاروں کو اپنے نازک پہلو میں لئے،
راحت، تسکین لاتی ہو کچھ ہلکی گہری نیندوں سے!

اس کے علاوہ اس کے لئے ہر بات، ہر جنسی بات کار آمد اور

مفید ہے۔ اور اس لئے دل پسند۔ چنانچہ ذیل کی نظم میں وہ صاف طور
پر جدید نفسیات کے اس نظریے کو ثابت کر رہا ہے کہ ہر انسانی تحریک
اور عمل کی بنیاد جنس کا جذبہ ہے۔

رِستے، نکلتے، بہتے قطرو!

رِستے، نکلتے بہتے قطرو!
میرے پیارے، اچھے قطرو!
میری لال اور نیلی رگوں سے رِستے قطرو!
دھیرے دھیرے نکلتے قطرو!
اِن زخموں سے جن کے رستے کھلے ہوئے ہیں،
رِستے جاؤ، رِستے نکلتے قطرو!
اِن زخموں سے؛ زخم کہ جو بندیخانے ہیں۔
بہتے جاؤ، نکلتے جاؤ، ان ہونٹوں سے، پیشانی سے، اس چہرے سے!
اور سینے سے!
ایسی تہوں سے جن میں کبھی میں پوشیدہ تھا!
بہتے جاؤ، ہاں اے سرخ لہو کے قطرو!
بھر دو، بھر دو ہر صفحے کو، ان گیتوں کو جو میں گاؤں،
ان لفظوں کو جو میں بولوں!
خونیں قطرو!
ان سب کو اپنی عنابی حرارت سے آگاہ بنا دو — اور چمکا دو!
ہاں ہاں، ان سب کو تم بھر دو، نم والے، شرماتے قطرو!
ہاں، چمکو اس ہر شے میں جو میں نے لکھی ہے، یا میں
لکھوں گا!
ہاں ہاں بھڑکو، اپنی شعاعوں میں ہی میری ہر اک شے کو ظاہر کر دو،
اے شرماتے، لجاتے قطرو!

اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف جسم کا گوشت بلکہ رگوں میں دوڑتا
ہوا لہو بھی شاعر کے خیال میں ایک عظیم الشان اور قابلِ تعریف شے ہے
اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ہمیں گھن آئے یا جو ہمیں ناپسند ہو۔
عورت کی ہستی کو وٹمن ایک تخیلی رنگ دے دیتا ہے۔ لیکن
اس کے باوجود اس تعلق کی انتہا و فطری اور روزمرّہ کی سماجی زندگی کو
ہی سمجھتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جسم اور روح کے متعلق وٹمن کے خیالات
کس قدر ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

اے اجنبی!

اے اجنبی!
تجھ کو نہیں اس کی خبر،
دیکھا تجھے کن آرزوؤں سے ابھی،
بیشک وہی ہے تو
مجھے
تھی جس کی اب تک جستجو؛
یہ بات ایسی ہے کہ جیسے خواب ہو!
ہمراز عشرت ہو کے تیرے ساتھ ہی،
میں نے گزاری ہے کہیں،
کچھ زندگی؛
اس راہ کے ہلکے تعلق سے ترے
ہر بات یاد آئی مجھے؛
دل گرم اور چاہت بھرے،
پاک اور سجے سنورے ہوئے،
یوں آج رستے میں ملے!
ہاں، عالمِ طفلی مرا
یک جا بسر ہوتا رہا!
میں نے گزاری زندگی،
ہمراز عشرت ہو کے تیرے ساتھ ہی،
اور ایک جا بیتی تھیں گھڑیاں رات کی —
تیرا بدن تیرا نہیں، میرا بھی ہے،
میرا بدن میرا نہیں تیرا بھی ہے،
تجھ سے مجھے حاصل ہوئی،
آنکھوں کی، چہرے کی خوشی!
مجھ سے تجھے حاصل ہوئی،
ہاتھوں کی، سینے کی خوشی!
میں تجھ سے محوِ گفتگو
ہوں گا نہیں!
تیرا تصور آئے گا۔

راتوں کو، یا دن کو کبھی،
اور تیری یادیں لائے گا!
اب رات تکتا ہے مجھے۔
لیکن ہے اس دن کا یقیں،
دل کے قریں،
جب پھر سے ہم مل جائیں گے،
اے اجنبی!

جنون و مسرت کا ایک لمحہ

اک لمحہ جس میں جنون و مسرت میرے ہیں!
آشفتہ خیالی، و رہم و برہم بے باکی!
ہاں مت روکو، مت روکو، مجھے کیوں روکتے ہو؟
یہ کیا شے ہے جو مجھ کو یوں آزادی دے کر طوفانوں میں چھپ جاتی ہے نگاہوں سے؟
برق و باراں میں، ہواؤں میں یہ میری آہیں اور چیخیں کیا کہتی ہیں!
مجذوبانہ مدہوشی میں یوں ہونا، جیسے کوئی نہ ہوگا دنیا میں!
اک وحشی اور گداز اذیت، درد و کرب کی کیفیت!
(میرے بچو! اے دولھا اور دولھن! سن لو، یہ باتیں کام آجائیں گی،
ہاں، خود کو ترے بس میں دینا (کیا اس سے غرض تو جو بھی ہو!)
اور اپنے بس میں کرنا تجھے ہر شے کو بھلا کر یادوں سے!
اے شوخ نسائی پتلی سی! جنت میں پھر سے پہنچ جانا!
ہاں، جب سینے سے سینہ ملے،
اک عزم راسخ دل میں لئے،
ہونٹوں سے ہونٹ ملادینا!
اے بھول بھلیاں! پہیلی سی!
اے دوہری نہری گرہ جیسی!
اے پیچ! اے عقدے! اے الجھن!
اور گہری، اندھیری جھیلوں سی خاموشی بھی!
تجھ کو، ہاں تجھ کو نگاہوں سے چھلنی کرنا!
اور تیری چمکتی، چندھیاتی کرنوں سے نگاہوں کو بھرنا!
اور آہ! وسیع فضاؤں میں اڑتے رہنا!
اور تازہ ہوا سے سانسوں کا نغمہ کہنا۔

اور پہیلی، پرانی رسموں کے بندھن کی عقدہ کشائی بھی!
اور قدرت کی سب سے اچھی خوبی کو اپنا بنا لینا!
اور اپنے خیالوں سے جو تسکین دور تھی، اس کو پالینا۔
اور جو رکاوٹ باتوں پہ تھی، بوجھ نہ پھر اس کا سہنا!
آہ! خودی میں شاکر رہنا، خود میں تسکیں سے ملنا!
یہ کیا شے ہے! یہ کیا شے ہے؟ جو میری سمجھ سے باہر ہے؟
جیسے اک عالم رویا ہو یا وجد کا گہرا حلقہ ہو!
آزادی میں چلنا پھرنا!
آزادی میں ہنسنا گانا!
آزادی میں چاہت کرنا!
آزادی، بے پروائی سے خطروں والے کاموں کو ہاتھوں میں لینا!
اپنی متوالی روح کو پہلو میں لے کر چاہت کی بلندی پہ جانا!
اک لمحے کی تکمیل سے اور آزادی سے آیندہ کے سامان کرنا!
اور کھو جانا ہی لکھا ہو تو پھر کھو جانا۔
لیکن آہ! وہ لمحہ، جس میں جنون و مسرت میرے ہوں!!

ان مختلف نظریوں اور خیالوں کے علاوہ وٹمن کا ایک محبوب موضوع سمندر بھی ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ سمندر میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور قدرت کی عظمت کا موثر اظہار ہوتا ہے اس سلسلے میں صرف ایک نظم پیش کریں گے۔

اے سمندر!

سمندر! اے سمندر! اپنی گمبھیر اور گھمنڈی سی صداؤں میں۔
ترے ہر دم انوکھے اور بے حد مختلف یہ مشورے
جب ذہن میں لیتا ہوا۔
تیرے تھپیڑوں سے شکستہ ساحلوں پر میں گزرتا ہوں۔
تری باتیں سمجھتا ہوں!
اور ان پر غور کرتا ہوں!
یہ غصے میں کف انگیزی،
سفید اور ڈھیلے ڈھالے دامنوں میں دوڑتے آتے ہیں ہر لمحے
یہ دیوانے ہجوم، اک منزل مقصود کی جانب!
ترا چہرہ جو سورج کی شعاعوں سے چمکتا، مسکراتا ہے!

تری چین جبیں اور تیرے ان بے باک طوفانوں کی جمعیت!
تری خود رائی، تیرا عزم راسخ، تیری خودبینی!
پھر اس عظمت کے ہوتے بھی ترے بے انتہا آنسو،
جو اس وسعت میں ابدیت نہ ہونے پر بہاتا ہے!
یہ تیری کشمکش، یہ لغزشیں اور شکستیں بھی،
یہی ہیں جو تری عظمت بڑھاتی ہیں!
یہ تنہائی، یہ تیری بے کسی، یہ سعی لاحاصل،
کہ جویا ہے کسی شے کا مگر وہ شے نہیں ملتی!
تری پھیلی ہوئی یکساں سی تند و تیز سرجوشی،
یہ ہے آواز آزادی کے اک محبوس شیدائی!
کہ جیسے ایک سیارے کی مانند اک بڑا سا دل،
اسی ساحل کی ترچھی اور ظالم سی چٹانوں میں ہی اپنا سر ٹپکتا ہو۔
تری پھولی ہوئی سانسیں!
تری اینٹھی ہوئی موجیں!
یہ تیرے دل کی دھڑکن اور تری موجوں کی ساحل سے ہم آغوشی!
یہ ناگوں جیسی پھنکاریں!
بلند اور وحشیانہ قہقہوں کا ایک تواتر۔
دور سے آہستہ آہستہ چلی آتی یہ شیروں سی گرج تیری!
اس اونچے آسمان کے بہرے کانوں کی طرف جاتی ہوئی!
اور پھر اچانک راہ میں رکتی ہوئی! ـــــ یا لوٹ ہی آتی!
یہ سب کی خامشی میں مشورے تیرے!
زمیں کے دل کے خوابوں کی یہ تعبیریں!
یہ تیری روح کی گہرائیوں میں سے نکلتا جو سنائی دے رہا ہے ایک افسانہ،
یہ ہے اک کائناتی اور عالمگیر جذبے کا اک افسانہ، جو اپنے ہمنوا کو تو سناتا ہے!

موت کا موضوع بھی وٹمن کا ایک عام خیال ہے، کیونکہ وہ موت کو بنفسہٖ شاندار اور انسانیت کی تکمیل نیز ایک نئی زندگی کی ابتدا تصور کرتا ہے لیکن اس موضوع کے متعلق اس کی نظمیں بہت لمبی ہیں اور یہاں بیان کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ہم ایک الوداعی نظم پر سلسلۂ تحریر ختم کرتے ہیں۔ لیکن ایک ضروری بات باقی ہے اور وہ یہ کہ وٹمن کی شاعری انگریزی شاعری کے مقررہ اصولوں کے فنی پہلو سے بہت دور تھی۔ قافیے کا توذکر ہی فالتو بات ہے۔ اُس کی آزاد نظم بھی صرف ایک موزوں روانی پر مبنی تھی۔ اور اُس میں بھی بسا اوقات خالص نثر کے ٹکڑے آجاتے تھے۔ میں نے ترجموں میں بھی اسی طرح کے شاعرانہ فنی اصول جائز رکھے ہیں۔ کیونکہ اصل مقصد وٹمن کے خیالات اور اندازِ بیان کا احساس دلانا ہے۔ یہ معذرت اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ اردو شاعری میں آزاد نظم ہی ابھی ذرا ڈرتے ڈرتے جائز سمجھی جاتی ہے بلکہ اکثر ملعون قرار دی جاتی ہے اور وٹمن کی نثر نما نظم کو تو آسانی سے نظم و نثر دونوں صنفوں سے خارج سمجھا جاسکتا ہے۔

الوداع اے طائرِ خیال!

الوداع! ہاں الوداع اے طائرِ خیال!
الوداع اے یارِ غار!
الوداع محبوبِ من
جا رہا ہوں میں، نہیں معلوم لیکن کس جگہ۔
اور یہ خوبی ہے اس تقدیر کی؟
اور دیکھوں گا تجھے میں پھر کبھی!
اس لئے اب
الوداع! ہاں! اے طائرِ خیال!
اور لو آخر کے لمحے آگئے،
ڈالنے دو مجھ کو ماضی پر نظر!
اب مرے رقصاں، ولرزاں قلب کی رفتار دھیمی پڑ گئی!
آگیا ہے اب نکاس!
اور خاموشی اندھیری رات کی!
دیکھنا اب ہوگا یوں،
ایک پل میں دل کی لرزش تھم گئی!
دہر میں تو اور میں
اک زمانہ ساتھ تھے!
مل کے دیکھے ہم نے لمحے عیش کے!
خوب تھے، وہ سارے لمحے خوب تھے!
اور اب آئی جدائی، اس لئے

الوداع! ہاں الوداع اے طائرِ خیال!
لیکن اتنی جلد بازی کیوں کروں!
دہر میں تو اور میں
اک زمانہ ساتھ تھے!
ساتھ ہی جیتے رہے اور ساتھ ہی سوتے رہے!
اس قدر مل کر کہ گویا ایک تھے!
اور اگر مر جائیں گے تو مل کے دونوں جائیں گے
رہیں گے ایک ہی!
ہاں کہیں بھی جائیں ہم جائیں گے دونوں ساتھ ہی!
جو بھی ہو!
دور رہ کر تجربہ حاصل ہو کچھ!
ہاں سبق حاصل ہوں کچھ ہم کو نئے
شاید ایسے تو مجھے اکسا رہا ہو گیت گانے کے لئے!
شاید ایسے تو ہی عقدہ ہائے فانی توڑ دے۔
اس لئے
آخری اب الوداع!
الوداع! ہاں الوداع! اے طائرِ خیال!

میراجی

رباعی

ٹھنڈا سا کیا ہم نے بھپکا کیا کیا!
دوشیزہ کو کیا کیا کیا کیا!
چولے سے نرالے ساقی
کی شوخ سے بہت دختر رز کا
شیشے میں اسے آج اتارا کیا!

سید احمد اعجاز

شاعر کا خواب

خموشی کی روپہلی اوس میں بھیگی ہوئی فطرت
چراغِ صبحگاہی رات کے جاگے ہوئے تارے
سکوں کی گود میں سوئے ہوئے خوابوں کے نظارے
کلی کے سینہ میں انگڑائیاں لیتی ہوئی نکہت

شعاعوں کے سفینے چاندنی کا بحرِ بے پایاں
دیارِ کہکشاں کے نور میں ڈوبے ہوئے جلوے
سنہری بربطِ ناہید کے جادو اثر نغمے
شباب و شعر کے منظر، بہار و حسن کے طوفاں

تبسم پھول کا پاکیزگی حوروں کے سینوں کی
کلی کے دل کی دھڑکن دلکشی رنگیں جمالوں کی
فرشتوں کا تقدس سادگی فردوس والوں کی
جوانی ماہ پاروں کی، ادا زہرہ جبینوں کی

یہ ملتے ہیں تو اک خواب جواں بنتا ہے شاعر کا
یہی ذرے ہیں وہ جن سے جہاں بنتا ہے شاعر کا

تابش صدیقی

آہ اقبال!

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید (اقبال)

کوئی اقبال کا ثانی جہاں میں پس از عمرِ دراز آئے نہ آئے
حقیقت آشنائے عشق و مستی پھر اے بزمِ مجاز آئے نہ آئے
شکستہ تار ہیں سازِ خودی کے وہ صوتِ دلنواز آئے نہ آئے
ہوا خاموش وہ دانائے راز اب کوئی دانائے راز آئے نہ آئے
فقیری میں بھی شانِ بادشاہی پھر ایسا بے نیاز آئے نہ آئے

گیا وہ چارہ سازِ دردِ ملّت!
کوئی اب چارہ ساز آئے نہ آئے

حفیظ ہوشیارپوری

ماتم اقبال

اقبال کی موت پر بپا ماتم ہے
اے اہلِ سخن! بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں
رضوانِ ریاضِ شعر کا ماتم ہے!

چمن را گلفشاں کردی و رفتی
وطن را گلستاں کردی و رفتی!
ز طبعِ خود کہ بود ابرِ بقا بار
سخن را جاوداں کردی و رفتی!

دہرِ فانی سے ہو گیا رخصت
وہ دلِ اہلِ ہند کا محبوب!
وائے افسوس ہو گیا بے وقت
شعر و حکمت کا آفتاب غروب!

ما کہ بودیم بدورِ اقبال
شاد بودیم کہ ہم عصرِ وے ایم!
ساقی از بزم برفت و ماندیم
وائے فریاد کہ بے جام و مے ایم!

تلوک چند محروم

آہ وحید العصر!

ے ظالم! یہ طرز وحشتناک کس قدر نطق سے نزرِ بیباک غم اقبال ہمکنار ہے آج یوں دلِ قوم بےقرار ہے آج

تی کا بھی تجھ کو پاس نہیں دوست اور دوست کے لئے سفاک خوف ادبار ہو گیا طاری ناموافق جو روزگار ہے آج

ےبیک تو نے کہہ دیا یہ کیا ہو گئی سلب قوتِ ادراک اثر اقبال کا تھا عالمگیر دیکھئے جس کو اشکبار ہے آج

ھا اقبال نے بھی رختِ سفر! اف یہ انجام گردشِ افلاک لٹنے والوں کو کیا خبر اس کی ملک کتنا جگر فگار ہے آج

ٹھہر جا ٹھہر جا سنبھلنے دے
ہم نے کی ہے زیارتِ اقبال

کچھ خیالات کو بدلنے دے
ہم کو ہے رنج رحلتِ اقبال

ب ہوئی ہو گی رحلتِ ہومر اس کے ہمعصر ہوں گے سب مضطر کیوں نہ ہو ایسے باخدا کا غم علم سے جن کے ہو وفا کا علم

ے علمِ وفاتِ کالیداس کیا تڑپتے نہ ہونگے اہلِ نظر اس کے چہرہ پہ اتقیا کا نور اس کے سینے میں اصفیا کا علم

ے دن فرطِ غم میں سب انگریز کہہ رہے ہوں گے آہ شکسپیر سب اسے مانتے تھے علامہ واہ اقبال باصفا کا علم

تقالِ فردوسی ہو گی اس وقت کتنی رنج اثر نہیں واقف خدانما سے ہم ہے اسی اک خودی نما کا علم

آج ہم کو کسی کا رنج نہیں
تھے کبھی ہم بھی بدحواسوں میں

ان کے رتبے فقط ہیں ذہن نشیں
اب ہیں شامل خودی شناسوں میں

سبق آموز ہمگناں اقبال دین فطرت کا ترجمان اقبال
امتزاجِ سیاست و مذہب جانتا تھا اصول داں اقبال
سب تھے جس کے خیال سے لرزاں کر چکا طے وہ ہفت خواں اقبال
کوئی اقبال پر کرے کیوں رشک یہ مقلد کہاں، کہاں اقبال

ہے عیاں شانِ اجتہاد اس کی
کام کرتی ہے دل میں یاد اس کی

نظم کی حد میں شاہ خود مختار نثر دیکھو تو منعمِ دربار
اس کے ذوقِ ادب پہ حُسن فدا اس کے حُسن بیاں پہ ذوق نثار
دلکشا اس کی جانفزا باتیں حرزِ جاں اس کے دلنشیں اشعار
مل گیا اس سے فلسفہ کو عروج بڑھ گیا اس سے شاعری کا وقار

اپنا رہبر ہم اس کو مانتے ہیں
شاعر اعظم اس کو جانتے ہیں

رابطہ اس کو خاص عام کے ساتھ تھا مگر خاص اہتمام کے ساتھ
حضرت اور مدظلہ العالی سب ہی لکھتے تھے اس کے نام کے ساتھ
مرجع خاص و عام تھا اقبال اپنے جوش آفریں پیام کے ساتھ
خدمتِ قوم کر کے دنیا میں چل دیا آخر احترام کے ساتھ

خوش نصیب ایسے کم ہوئے پیدا
قوم کی قوم اس پہ تھی شیدا

مٹ گیا اپنی قوم پر آخر اٹھ گیا چھوڑ کر اثر آخر
قوم کے درد سے تڑپتا تھا سو گیا جاگ جاگ کر آخر
کر گیا ہم کو باخبر لیکن ہو گیا ہم سے بے خبر آخر
لطف ختم رسل کے دامن میں چھپ گیا یہ پیامبر آخر

اپنا قومی پیامبر، نہ رہا
قوم تھی جس سے معتبر نہ رہا

علی منظور حیدرآبادی

زود پشیماں

رادھا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ــــ "لیلا! تم سمجھتی ہو کہ میں خوش قسمت ہوں ــــ واگر میں سکھی ہوتی تو تمہارا اندازہ غلط نہ ہوتا . . . ."

لیلا نے بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "رادھا! دنیا کے دیکھنے میں تو تمہیں کوئی دکھ نہیں ہے۔ تمہارے پتی تندرست و توانا۔ ہنس مکھ۔ سندر۔ سوت پیار کرنے والی۔ دھن دولت تمہارے چرنوں کی داس۔ تمہارے آنے والے سندر سلونے کی منوہر تصویر کچھ دنوں میں تمہاری گود میں ہوگی۔ جس کے لئے بابو کرشن کانت کی دنیا سونی تھی۔ جس کے بغیر تمہارے سسر کا گھر اندھیر تھا۔ ایشور کی کرپا سے اب وہی چاند تمہاری گود میں کھیلے گا۔ رادھا! تم کیوں دکھی رہتی ہو؟ تمہیں تو اس وقت اور بھی خوش رہنا چاہئے نہیں تو ہونے والے بچے پر کتنا برا اثر پڑے گا!"

رادھا اسی طرح آنسو بہاتی رہی۔ لیلا نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا ــــ "واہ ری پگلی سنوں بھی کیا دکھ ہے؟"

"دکھ سن کر کیا کرو گی لیلا رانی! دنیا کے دیکھنے کو ہمیں ہر طرح کا سکھ ہے۔ لیکن میرا دل دکھ درد کی جس آگ میں جل رہا ہے اسے کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ کسی دن تم سن لوگی کہ مجھے کیا دکھ ہے۔ اب جاؤ لیلا۔ بہن آتی ہوں گی۔ وہ بھی آتے ہوں گے۔"

لیلا چلی گئی۔ رادھا نے آنسو پونچھے اور منہ صاف کر کے چپ چاپ کچھ سوچنے لگی۔

. . . .

رادھا بابو کرشن کانت کی دوسری بیوی تھی۔ غریب ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی اور اس کے ماں باپ اگر غریب نہ ہوتے تو اپنی پیاری بیٹی کو سوت پر بیاہ دینا کیونکر گوارا کرتے؟ شادی ہونے سے پہلے رادھا کی ماں نے مخالفت کی تھی۔ کوئی ماں کتنی ہی غریب اور مصیبت کی ماری ہو اپنی آنکھوں کی پتلی کو سوت پر دینا ہرگز گوارا نہیں کر سکتی۔ لیکن شوہر نے بار بار سمجھایا کہ سوت اپنی رضامندی سے دوسری شادی کرنے کی اجازت دے رہی ہے۔ وہ جس مقصد سے شادی ہو رہی ہے۔ اگر پرماتما نے پورا کر دیا تو پھر تب رادھا ہی راج رانی ہوگی۔ تم نہیں سمجھتیں دوسری استری زیادہ پیاری ہوتی ہے۔"

بے چاری رادھا کی ماں سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور بھولی رادھا کرشن کانت بابو سے بیاہ دی گئی۔

کرشن کانت بابو نے شادی کرنے کو کر لی لیکن وہ خوشی اور امنگ جو پریما کو پیار کرنے میں تھی۔ رادھا کی چاہت میں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ پریما سے چودہ پندرہ برس کا ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی پریم ڈوریوں بندھے تھے۔ پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے

کرشن کانت پریما کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتے تھے اور اس کے روپ کنول پر تن من نچھاور کرتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ پریما کے دل پر بجلیاں گر رہیں۔ لیکن نصیب کے لکھے کو کسی طرح ٹال نہ سکے۔ ایک ایک کر کے پندرہ برس گزر گئے۔ امیدوں کی پھلواری سوکھی جا رہی تھی۔ آس ٹوٹی جا رہی تھی۔ لیکن آرزوؤں کی موہنی مورت نظر نہ آئی۔ پریما کی گود سونی ہی رہی۔

دھیرے دھیرے پریما کو بھی محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل ایک لال کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اس کی امیدوں پر پانی پھر رہا ہے لیکن وہ بے بس تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اس راہ میں پتی تک کو کسی دوسری استری کو سونپ دینے کا تہیہ کر لیا۔

کرشن کانت کے باپ بڑے زمیندار اور پرانے رئیس تھے۔ دھن، دولت اور عزت کے لحاظ سے دور دور تک ان کا نام تھا۔ کرشن کانت ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بابو کملا کانت نے دنیا دیکھی تھی۔ انہوں نے گھر کی اس اداسی کو دور کرنے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں پر پانی کی طرح روپیہ بہا کر تھک چکے تھے۔ دوا دارو جوگ ٹوٹکے سب بے سود ثابت ہو چکے تھے۔ پرمدا کی گود بھرنی تھی نہ بھری۔

کرشن کانت کی بوڑھی ماں پوتے کی آرزو ہی سے چل بسیں۔ باپ بھی چل چلاؤ کے لئے کمر باندھے بیٹھے تھے۔ ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ ان کے پرانے دوست منوہر سنگھ آ گئے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہونے کے بعد کرشن کانت کی بے اولادی کی بات چلی۔ منوہر نے کہا ——"بھائی ایک دو نہیں، پورے چند رہ برس ہو گئے۔ اب کیا اولاد ہوگی۔ نہ جانے آپ کی سمجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تو بار بار کہتا ہوں کرشن کانت کی دوسری شادی کر ڈالئے۔ ایک نہیں تو دوسری سے تو اولاد ہوگی۔"

"کیا کہوں منوہر، بہو کا منہ دیکھ کر چپ رہ جاتا ہوں۔ کرشن کانت اسے جتنا چاہتے ہیں میں جانتا ہوں۔ کیا کروں۔ ایک بے قصور ابلا کی چھاتی پر کیسے مونگ دلوں؟"

"چھاتی پر مونگ دلنے کی کوئی بات نہیں۔ اسے سمجھاؤ۔ وہ ایسی ناسمجھ نہیں ہے۔ اگر ایسا کر دیا تو تمہاری نسل کا نام و نشان مٹ جائے گا اور اس دھن دولت سے دوسرے موج اڑائیں گے۔"

منوہر تو چلے گئے۔ لیکن کملا کانت کے دل پر ایک چرکا لگا گئے۔

. . . .

پرمدا سندری تھی۔ پتی کو جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ کرشن کانت بھی اس پر دل و جان نچھاور کرتے تھے۔ جب پتی پتنی نے سنا کہ پتا جی دوسرا بیاہ کرنے کے لئے زور دے رہے ہیں تو دونوں کے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ کرشن کانت نے اس رائے کی سخت مخالفت کی۔ لیکن ان کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور وہ کسی طرح باپ کے اٹل فیصلے کو بدل نہ سکے۔ کملا کانت پوتے کی صورت دیکھنے کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ انھوں نے اس پاگل پن میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ کرشن کانت! اگر تم شادی نہ کرو گے تو میں کچھ کھا کر اپنی جان دے دوں گا۔ پھر میرے بعد جو جی میں آئے کرنا۔

کرشن کانت باپ کے فرمانبردار بیٹے ہونے کے ساتھ ہی دل کے کچے تھے۔ باپ کی اس دھمکی سے دل پر پتھر رکھ کر شادی کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔

پرمدا کے دل پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ کچھ وہی جانتی تھی۔ لیکن پتی کے سکھ میں سکھی رہنا وہ اپنا دھرم سمجھتی تھی اور پھر بوڑھے سسر کا خیال۔ اس نے ذرا اف نہ کی اور اندر ہی اندر کلیجہ مسوس کر کرشن کانت کی دوسری شادی کی رائے پر اظہار رضامندی کر دیا۔

پرمدا چالاک عورت تھی۔ اس نے سوچا کہ پتی دیوتا ابھی تو مجھے اتنا چاہتے ہیں۔ لیکن نئی دلہن کا منہ دیکھنے کے بعد میری صورت سے بیزار ہو جائیں گے اور اگر میری بدقسمتی سے اس کے لڑکا ہو گیا تب تو کوئی میری بات بھی نہ پوچھے گا۔ یہ سب سوچ کر اس نے منہ بنا کر اپنے سسر سے کہا ——"بابا! چاہے دوسری بہو گھر میں آئے اور پرماتما کریں۔ سب کی آس مراد پوری ہو۔ میں تو آپ کی داسی ہوں اور آپ کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی ہوں۔ ہاں جس طرح اب تک آپ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے چلے آئے ہیں۔ آگے چل کر بھی مجھ پر نگاہ رکھیں۔"

پرمدا نے کچھ اس طرح منہ بنا کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر سسر سے ساری باتیں کہیں کہ ان کا جی بھر آیا اور انھوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ——"بیٹی پرمدا! تم اپنا دل چھوٹا نہ کرنا۔ آنے والی بہو تمہاری داسی بن کر رہے گی اور زیادہ اطمینان چاہو تو گاؤں علاقے تمہارے ہی نام لکھ دوں۔"

کملا کانت نے سوچا کہ آخر اس بے چاری کا دل تو ٹوٹ ہی رہا ہے۔ گاؤں علاقے اس کے نام لکھ دینے سے اس کی تسلی بھی ہو جائے گی اور یہ سب کچھ رہے گا کرشن کانت ہی کا۔ کیونکہ یہ اسے چھوڑ کر کہیں جانے سے رہی۔ یہ سوچ کر کملا کانت نے سب کچھ پرمدا کے نام لکھ دیا۔

. . . .

کرشن کانت کی شادی ہو گئی۔ پرمدا کے دل میں چاہے جو کچھ ہو لیکن اس نے اپنے ظاہری برتاؤ میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ شادی کے تمام کاموں کو اس نے خوشی سے کرتی تھی جیسے اس کے کسی بہت ہی

قریبی عزیز کی شادی ہو۔ دیکھنے والے پرمدا کے اس تیاگ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

رادھا رانی بہو بن کر آگئی ——

رادھا خوبصورت نہیں تھی۔ یہ اس کی انتہائی بدقسمتی تھی۔ ایک تو غریب کی لڑکی۔ دوسرے رنگ روپ سے تہی دامن۔ پرمدا گوری تھی رادھا سانولی۔

کہنے کو تو رادھا کالی تھی۔ لیکن اگر کوئی اسے بدصورت کہے تو انصاف کی بات نہ تھی۔ اس کے کالے پن میں بھی ایک روپ تھا۔ اس کی موہنی صورت دیکھنے والوں کو موہ لیتی تھی۔ لیکن سانولی رادھا پر حسن کے انتہا پسند پجاری کرشن کانت نہ ریجھ سکے۔

پہلی ہی ملاقات میں کرشن کانت نے رادھا کی امنگوں اور آرزوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے بات ہی بات میں ساری باتیں کھول دیں کہ وہ اپنی دل کی رانی پرمدا کو بنا چکے ہیں۔ اگر کوئی اس میں حصہ دار بننا چاہے تو یہ بالکل ان ہونی بات ہے۔

رادھا اپنی قسمت کو رو چکی اور اس کی آنکھوں نے آغاز ہی میں انجام دیکھ لیا۔ اس نے روتے روتے کہا —— "پران ناتھ! میں حصے دار نہیں ہوں۔ میں تو آپ کی اور بہن جی کی داسی بن کر رہوں گی آپ مجھے دیا کر کے لائے ہیں۔ یہی میرے لئے بڑے بھاگ کی بات ہے آپ اطمینان رکھیں میں بہن جی کے پریم کی راہ کا روڑا نہ بنوں گی۔"

کچھ دن اسی طرح بیتے۔ پرمدا نے کبھی پتی کو منع نہ کیا کہ رادھا کو نہ چاہے۔ پرمدا کچھ اس طرح بے پروا تھی جیسے اس کے لئے رادھا گھر میں تھی ہی نہیں۔

گرہستی کی باگ ڈور پرمدا کے ہاتھ میں تھی۔ رادھا اسے اپنی ساس کے برابر سمجھتی تھی۔ اس نے کبھی بھی پرمدا سے رشک و حسد کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں اداس اور دکھی رہتی تھی۔ پرمدا کرشن کانت کے دل کی رانی تھی اور رادھا بھکارن ——!

رادھا اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ اس کی صورت پر ہر وقت اداسی برسا کرتی۔ وہ امنگ جو نئی دلہن کی نئی عمر میں ہوتی ہے۔ رادھا کے دل میں پیدا ہی نہ ہوئی۔ کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی۔ رادھا یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پرمدا کو چاہنا کم کر دیں۔ لیکن اس کے متعلق بھی تو ان کا کچھ فرض ہے۔

کرشن کانت پرمدا کے مقابلے میں رادھا سے نام کے لئے بھی محبت کرتے تو اس کے دل پر اتنی چوٹ نہ لگتی۔ رادھا اپنے گھر میں اس طرح رہتی جیسے چور رہو۔ اگر رادھا رنگ روپ کی مالک ہوتی تو کرشن کانت کبھی نہ کبھی ضرور اس کی طرف مائل ہوتے۔ لیکن حسن کی دولت سے محروم ہونے کے باعث یہ پتی کے دل کی رانی نہ بن سکی۔

معمولی معمولی باتوں میں اسے معلوم ہوتا کہ گھر میں اس کا کوئی وزن کوئی گنتی نہیں ہے۔ سسر جی بھی جو اتنے حوصلے سے بیاہ لائے تھے اس کی خبر نہ لیتے۔ بات تک نہ پوچھتے۔

پرمدا رادھا کے سامنے ہی خوب ہنس ہنس کر پتی سے باتیں کرتی گھر کے سارے کام اسی کے صلاح و مشورہ سے ہوتے۔ رادھا اس طرح چپ رہتی جیسے پرمدا کی مہربانی سے جی رہی ہو۔ اس کا پتی پر وہ اختیار نہ تھا جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے۔

ایک دن وہ باتوں ہی باتوں میں شوہر کے دلی جذبات کی انتہائی تہہ کو پہنچ گئی۔ جاڑے کی شام تھی۔ کرشن کانت اور پرمدا پلنگ پر تاش کھیل رہے تھے۔ بجلی کی تیز روشنی میں کرشن کانت نے دیکھا کہ پرمدا کچھ اداس سی ہے۔ یہ دیکھتے ہی بے چین ہو گئے کہ آج ہنس مکھ پرمدا اداس کیوں ہے؟ انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو پیار سے تھپکتے ہوئے پوچھا —— "پرمدا! آج تم سست سی کیوں ہو؟ کیا بات ہے! اس نے کچھ کہا تو نہیں —— ؟"

"نہیں اس نے آج تو مجھے کچھ نہیں کہا لیکن کبھی کہے گی ہی۔ آج نہ سہی کل سہی۔ آخر ہے تو سوت ہی . . . !"

"میں نے تو اسے سر نہیں چڑھایا تم خود دیکھتی ہو کہ میں اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ اگر وہ تم سے کچھ کہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کی خبر لوں"۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم تو ناحق پریشان ہوتے ہو۔ اس کی کیا مجال ہے جو تمہیں مجھ سے الگ کرے!"

"پھر کیا بات ہے —— ؟"

"پرماتما کی دیا سے اس کی گود بھرنے والی ہے۔ اب گھر بھر اسی کا منہ چومے گا۔ دیکھنا دادا جی بھی اسی کے ہو کر رہیں گے۔ پھر تو تمہارے درشن بھی سپنا ہو جائیں گے۔ تب یہ ابھاگنی کیا کرے گی . . . ؟"

اوہو پرمدا! تم اسی لئے اداس ہو؟ تمہارا کدھر خیال ہے کہنے کو

بچہ رادھا ہی کی گود سے جنم لے گا لیکن سچ میں اس کی ماں تو تم ہوگی۔ پرمدا! میں تمہارے تیاگ کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔"

"ٹھیک تو ہے۔" وہ بولی "مجھے کاہے کو بچہ دینے لگی!"

"اس کی کیا مجال ہے جو تمہیں بچے سے انکار کرے۔ باپ تو میں ہوں۔ کیا ماں ہی بچے کی حقدار ہے! پرمدا تم فکر نہ کرو رادھا کبھی تمہارے دل کو جیت نہیں سکتی۔"

رادھا پاس ہی کے کمرے میں تھی۔ دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کی دیوار حائل تھی۔ رادھا ساری باتیں سن رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ آہ بچے پر اس کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ پتی دیو اسے اتنا پرایا سمجھتے ہیں! اس کا نرم و نازک نسوانی دل بے اختیار رو اٹھا۔ کیا عورتیں اسی لئے اولادوں پر اپنی جان دیتی ہیں؟ محل اٹاری ہی سے اسے سارے سکھ مل جائیں گے؟ اگر پتی پریم نہ کرے تو سب بے کار ہے۔ رادھا کو اپنا چاندی سونے کے گہنوں سے لدا ہوا جسم مٹی کی ڈھیری معلوم ہو رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ہنسی ہو رہی ہے اور جگمگ دمکتے گہنے کپڑے اس کی بدحالی پر طنز کی ہنسی ہنس رہے ہوں۔

اسے اپنے ماں باپ پر غصہ آیا کہ کیوں دھن دولت دیکھ کر گر پڑے۔ وہ سوکھی روٹی کھا لیتی پر اپنے پریتم کی سیوا تو کر پاتی۔ اپنے دلی جذبات کے پھول تو اپنے پران ناتھ کے چرنوں پر نچھاور کر سکتی۔ اسے اپنی زندگی بوجھ معلوم ہوتی۔

پہلے تو رادھا پرمدا کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی بھی تھی لیکن جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ پتی اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں تو وہ ان کی ہوا سے بھی بچنے لگی کہ کہیں اس سے ان کے غم و غصہ میں اور بھی اضافہ نہ ہو۔ رادھا اب تک پرمدا کے تلخ برتاؤ تو سہتی رہی۔ لیکن جب سے معلوم ہو گیا کہ پتی کے نزدیک بھی وہ اتنی حقیر ہے تو اس کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ لیکن غریب کر ہی کیا سکتی تھی! آنسوؤں کو پی پی کر زندگی کے دن بسر کرنے لگی۔

اس دن ضبط کرتے کرتے بھی وہ اپنی بال سکھی بیلا سے اپنا کچھ دکھڑا کہہ بیٹھی۔ پھر بھی پچھتائی کہ کہیں سوت یا پتی کو معلوم ہو گیا تو کہیں کی نہ رہے گی۔

. . . .

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا۔ جب کرشن کانت کی شاخ تمنا میں پھل آیا اور رادھا کے چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ گھر میں مسرت و شادمانی کے نقارے بجنے لگے۔ کملا کانت کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ گھر میں سب کی زبان پر "بچہ" تھا۔ لیکن غریب رادھا کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سب بچے ہی کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔ رادھا بیٹے کی صورت دیکھ کر باغ باغ تو ہوئی لیکن ساتھ ہی اپنی بدحالی پر اسے رونا بھی آیا کہ دنیا کتنی خود غرض ہے کہ اس کی کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔

زچہ خانے کا معقول بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے رادھا بیمار ہو گئی۔ اس کی تو کسے پروا تھی۔ ہاں بچے کے خیال سے لوگ گھبرا اٹھے اور ایک اچھی سی تجربہ کار نرس بچے کے لئے مقرر کر دی گئی۔ اور سخت تاکید کر دی گئی کہ بیمار رادھا بچے کو ہرگز نہ چھوئے۔

اس طرح بدنصیب رادھا اپنے دل کے ٹکڑے اور آنکھ کی ٹھنڈک سے بھی محروم کر دی گئی۔ نرس اور پرمدا کی نگرانی میں بچہ پلنے اور پروان چڑھنے لگا۔

اب رادھا کی زندگی اور بھی اجیرن ہو گئی جس سکھ کے تصور سے وہ جیتی تھی وہ بھی آ کر چھن گیا۔ آہ اسے یہ بھی اختیار نہ تھا کہ وہ اپنے لال کو جی بھر کے پیار کر سکے۔ کرشن کانت اور پرمدا کو اعتبار ہی نہ ہوتا کہ وہ بچے کو اچھی طرح رکھ سکے گی۔ پرمدا کہتی وہ الھڑ ہے بچہ بیمار ہو جائے گا۔ اسے سردی لگ جائے گی۔ گویا پرمدا بچے کی ماں تھی اور بدنصیب رادھا دائی —— اکرشن کانت نے سچ مچ اپنی بات پوری کر دی۔

ایک روز بچے کو بخار آیا۔ سارا گھر بے چین ہو گیا۔ جھاڑ پھونک دوا دارو ہونے لگی۔ پرمدا اور کرشن کانت ایک دم گھبرا اٹھے۔ رات دن آنکھوں میں کٹنے لگے۔

جب دوسروں کا یہ حال تھا تو بھلا رادھا کی ممتا کس طرح مانتی! وہ تو ماں تھی۔ بے چاری پلنگ کے پاس جاتی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر لوٹ آتی۔ اس نے کتنے دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانیں لیکن اس کی درد بھری التجاؤں پر بھی ان کے دل نہ پسیجے۔

بچے کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ کتنے ڈاکٹر، کتنے حکیم وید آئے۔ لیکن خدا کی مرضی کے آگے کسی کی پیش نہ گئی اور جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ بچہ سب کی آرزوؤں پر پانی پھیر کر چل بسا ——!

رادھا اپنے لال کو گنوا بیٹھی وہ جس لال کے لئے اس گھر میں آئی تھی۔ وہ بھی نہ رہا۔ اب اس کا رہا سہا رابطہ بھی جاتا رہا۔ اب گھر میں اس کی بات کون پوچھے گا . . . . .!

بچے کے نہ رہنے سے گھر بھر میں اداسی برسنے لگی۔ کملا کانت کو پوتے کے صدمے نے چارپائی پر ڈال دیا۔ کرشن کانت کی آنکھوں میں بھی دنیا اندھیر ہو گئی۔ پرمدا بے دکھ درد سے ماں بنی بیٹھی تھی۔ اس نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پھر ممتا کی ماری بدنصیب رادھا کا کیا پوچھنا! اس کے لئے تو یوں ہی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ بچے کے مرنے کے بعد خود بھی موت کی گھڑیاں گننے لگی۔

. . . .

رادھا کی صحت دنوں دن خراب ہوتی گئی۔ لوگ اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ شوہر کی بے اعتنائی اور بچے کے صدمے نے اس کے دل کو چھلنی کر دیا تھا۔ آخر غریب کو دق نے آدبایا۔

جو کرشن کانت پرمدا کے سر دکھنے سے بے چین ہو جاتے تھے۔ رادھا کی اس مہلک بیماری کا حال سن کر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کبھی کبھی پرمدا کے کہنے سے دیکھ آتے تھے۔ پرمدا کو بھی اب رادھا کی حالت پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ سوچتی اگر پتی اس کے ساتھ اتنی بے پروائی نہ برتتے تو وہ اتنی جلدی نہ مرجھاتی۔ لیکن اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت! اب تو بیچاری کچھ دنوں کی مہمان ہے۔

. . . .

آج رادھا کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس پر رہ رہ کر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ منہ سے برابر خون جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کی رات نہ کٹے گی۔

آج کرشن کانت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ان کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا۔ انہیں رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ رادھا کی یہ حالت انہیں کی بے پروائی اور بے التفاتی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اگر وہ رادھا کے دل اور اس کی امنگوں کو پامال نہ کرتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

جو رادھا ان کی نگاہوں میں بد صورت تھی جس سے وہ نفرت کرتے تھے۔ آج اسی کے سرہانے بیٹھ کر سر جھکائے ہوئے تاسف و ندامت کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

رادھا برابر مدہوشی میں چیخ رہی ہے ـــ "ہائے مجھے کہاں لئے جاتے ہو . . . ؟ اچھا چلو . . . . مجھے یہیں کون سا سکھ ہے؟ . . . ہائے میری آنکھوں کا تارہ چلا گیا . . . . اور وہ . . . وہ تو مجھ سے نفرت ہی کرتے ہیں۔ آہ انہیں اپنا نہ سکی . . . اور کیسے اپناتی . . . ؟ اپنے ہوتے تب نہ . . . ."

رادھا کی آواز کرشن کانت کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو رہی تھی۔ ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ رادھا کراہ اٹھی ـــ بڑے زور سے منہ سے خون آیا۔ اس کا جی بیٹھ رہا تھا جو رادھا صبح سے بے ہوش سی تھی۔ اس وقت ہوش میں آکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور یکایک بول اٹھی ـــ "سوامی جی وہ کہاں ہیں . . . ؟ ذرا بلا دو۔ کیا زندگی کی آخری گھڑیاں بھی ان کے درشنوں کو ترستی رہ جائیں گی . . . ؟"

کرشن کانت تو پاس ہی بیٹھے تھے۔ فوراً سامنے آکر رادھا کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگے ـــ "رادھا! میں تو تمہارے پاس ہی ہوں۔ کیا کہتی ہو میری رادھا!"
ان کی آنکھوں سے اپنے آپ آنسو نکل پڑے۔

رادھا کراہ کر بولی ـــ "اتنا سکھ ہے پران ناتھ . . . ! آخری وقت اتنا سکھ . . . میرے لئے رو رہے ہیں! ہائے اب تک تو مجھے مرنے میں سکھ تھا۔ پر اب دکھ ہو رہا ہے۔ اب تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ہائے اس جیون میں آپ کو کچھ سکھ نہ دے سکی۔ میرے سوامی . . . چرنوں کی دھول . . . ." اس کے آگے رادھا نہ بول سکی ہچکیاں آنے لگیں۔

ایک گھنٹے بعد رادھا کرشن کانت کی گود میں سر رکھ کر اور سو بھاگیہ سیندور پہن کر چل بسی ـــ اور اس کی زندگی کی کومل کلی اپنی بہار دکھانے سے پہلے ہی مرجھا گئی ـــ!

پرمدا اور کرشن کانت ایک ساتھ رو پڑے . . .

(گجراتی)

آسی رام نگری

غزل

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے — کہیں یہ قیس صحرا لیلیٰ محمل نہ بن جائے

ہے روشن بزمِ دشمن کی طرح میرا دلِ سوزاں — وفا ناآشنا! یہ بھی تری محفل نہ بن جائے

نہ دیکھ اے قاتل اپنے زخمیوں کا رقصِ بے تابی — ترا تارِ نظر تارِ رگِ بسمل نہ بن جائے

حذر اے قاصدِ راہِ طلب اس شوقِ بے حد سے — یہ حُسنِ راہِ منزل ہی کہیں منزل نہ بن جائے

نہ کر اے دوست اپنی آرزو کے ذوق کو ارزاں — غمِ الفت غمِ ایام کا حاصل نہ بن جائے

وہ آئی شاہدِ مقصود کی منزل ادب اے دل — خیالِ غیر بھی نظارہ حائل نہ بن جائے

گھری ہے کشتیِ امید پھر گردابِ حسرت میں — یہ طوفانِ ہلاکت بحرِ بے ساحل نہ بن جائے

یہی ہیں کاہشیں گر زخم ہائے شوق کی تائب
مجھے ڈر ہے کہ ہر داغِ تمنا دل نہ بن جائے

(ملک) مراتب علی تائب

موٹر کار

کتنی ہلکی کس قدر خاموش کیسی تیز رو
میری موٹر کار ہے یا ہے طلسمِ عصرِ نو

کتنی آتش زیرِ پا ہے کس قدر طرّار ہے
بوئے گل ہے جوئے شیریں ہے صبا رفتار ہے

بھاپ کا اعجاز ہے افسونگری ہے کیا ہے یہ
دیوِ غرّاں ہے چھلاوہ ہے پری ہے کیا ہے یہ

پی کے اک مینائے آبِ آتشیں وقتِ سحر
شام تک رہتی ہے سورج کی طرح گرمِ سفر

رات کو مہتاب بن کر بادیہ پیما ہے یہ
برق ہے ابرِ سیہ ہے موجۂ دریا ہے یہ

ایک موجِ مضطرب ہے ایک جوئے تیز گام
اک ربڑ کی گیند ہے آہو صفت مست خرام

چل رہی ہے صورتِ ابرِ رواں برسات میں
دن کو جالندھر میں ہے اور رات کو گجرات میں

ٹھوکریں کھاتے ہیں اس کی رہگذر میں شاہسوار
چھوڑتی جاتی ہے پیچھے ابر کو مثلِ غبار

اس کا انجن کس قدر ہے گرم و کلفت آفریں
اس کا پہلو کس قدر ہے نرم و راحت آفریں

ایک ہی شے ہے جو مثلِ برق و باد آوارہ ہے
کار ہے فرشِ زمیں پر چرخ پر طیارہ ہے

اصغر حسین خاں نظیر

ٹیپو سلطان کی لائبریری

تاریخ عالم سے اس امر کے ثبوت ملتے ہیں کہ کتب خانے نہایت قدیم زمانے میں عالم وجود میں آئے تھے۔ قدیم اشوریا اور مصر میں شاہی لائبریریاں قائم ہوئی تھیں۔ اشوریا کے بادشاہ آسر دانی پال کی مشہور لائبریری اس وقت بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ ہندوستان بھی بہت پرانے زمانے سے گہوارۂ علم کی حیثیت سے مشہور چلا آتا ہے۔ اس ملک میں بھی ایام سلف سے کتب کی فراہمی اور حفاظت کا کام جاری ہے۔ قدیم اور وسطی زمانے کے بادشاہ بڑے علم دوست اور ادب نواز تھے۔ اس سلسلے میں اُن کی حوصلہ افزا سرگرمیاں اور مساعی خاص طور پر قابلِ تحسین ہیں۔ پریس کی ایجاد سے پہلے کتابیں فرداً فرداً لکھی جایا کرتی تھیں۔ ہندو زمانے میں مٹھوں، مندروں اور شاہی محلات میں قلمی کتابیں جمع رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی بادشاہوں اور امراء کی ذاتی کوششوں اور تعاون کی بدولت بے شمار کتب فراہم کی گئیں اور لکھوائی گئیں۔ نیز ایسے علمی خزائن محفوظ رکھے جانے کے لئے کتب خانے بھی قائم کئے گئے۔ اس ضمن میں مغل بادشاہوں کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ حرماں نصیب شاہ ہمایوں نے تو اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر ہی زندگی سے ہاتھ دھوئے تھے۔ انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی دور میں اس ملک کے آزاد حکمرانوں کی قائم کردہ لائبریریوں میں سے میسور کے آزاد فرمانروا ٹیپو سلطان کا بیش قیمت کتب خانہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ٹیپو سلطان پر عام انگریز مورخین کے نقطۂ نگاہ سے یہاں بحث کرنا ہمیں مطلوب نہیں۔ وہ ٹیپو کی زندگی تاریک رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اس مضمون میں اس متنازعہ فیہ امر پر بحث کرنے کی فرصت نہیں۔ تاہم اجمالی طور پر یہ امر واضح کیا جا سکتا ہے کہ ٹیپو سلطان کی زندگی پر تعصبات سے بالاتر ہو کر روشنی ڈالنے کا وقت آ گیا ہے۔ اُن کے متعلق بلا خوف و رعایت یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ بزدل اور ڈرپوک نہیں تھے۔ انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کی نسبت وہ آزادی کی قربان گاہ پر شہید ہونا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے ہندوستانی شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں میں سے فقط ٹیپو سلطان نے شاہان فرانس و ترکی اور راجہ پیگو وغیرہ غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نظامِ سلطنت کی جانب بھی ان کی کڑی نظر رہتی تھی اور امورِ سلطنت میں وہ عرق ریزی سے کام لیا کرتے تھے اور وہ اپنے احکام اپنے ہاتھوں سے لکھ کر عمالِ دولت کے نام جاری کیا کرتے تھے۔ یہ امر بھی قابل قبول نہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کے مخالف تھے۔ سرنگری مٹھ میسور کے منتظم جگت گرو شری شنکراچاریہ کے نام ٹیپو سلطان کی طرف سے موصولہ چٹھیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹہ فوج کے افسروں کے ہاتھوں مٹھ کے لٹنے اور ناپاک کئے جانے پر ٹیپو نے مٹھ کی مورتیوں کی تجدید اور پوجا کا بندوبست کروایا تھا اور اس کام سے متعلقہ کل مصارف شاہی خزانہ سے ادا کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں شری شنکراچاریہ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اُن کی حکومت کی بہبودی اور ترقی کے لئے پوجا کریں۔

ٹیپو سلطان نے کئی مشرقی زبانوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فارسی اردو اور کناڑی زبان میں فصاحت کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ انہیں تحصیلِ علم کا بہت شوق تھا۔ علم دوستی اور ادب نوازی اُن کا مرغوب شیوہ تھا۔ انہوں نے کثیر التعداد فارسی اور عربی کتب کے نسخے فراہم کر رکھے تھے۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنی نجی لائبریری میں ہی گزارتے تھے۔ اُن کے مراسلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ راجدھانی سے کہیں دوسری جگہ جاتے تو اپنے کتب خانے سے کتابیں ساتھ لے جاتے یا بعد ازاں منگوایا کرتے۔

ٹیپو سلطان ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور میسور کی آزادی ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی۔ ٹیپو کے دیگر مال و متاع کے ساتھ اُن کی لائبریری اور مراسلات انگریزوں کے ہاتھ آ گئے تھے۔ انگریز عمال نے اس لائبریری کو حفاظت کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ صوبہ بنگال میں مشہور فورٹ ولیم کالج انہیں دنوں ۱۸۰۰ء میں قایم ہوا تھا۔ اُس وقت کے گورنر جنرل ویلزلی کے حکم سے مذکورہ لائبریری فورٹ ولیم کالج میں منتقل کر دی گئی۔ ۱۸۰۱ء میں چارلس سٹراٹ، ایک انگریز اس کالج میں فارسی کے نائب پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ علم و ادب کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کی نظر اس خزینۂ علم (لائبریری) پر پڑی اور انہوں نے فرصت کا وقت اس لائبریری کی کتب کے مطالعہ و جانچ پڑتال میں لگانا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے کالج کونسل نے چارلس سٹراٹ کے کام کی اہمیت سمجھ کر انہیں مراعات بہم پہنچائے جانے کی سفارش گورنمنٹ سے کر دی۔ گورنمنٹ نے اس سفارش پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی اور چارلس کی امداد کے لئے فورٹ ولیم کالج میں چار مولویوں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ لیکن انہیں دنوں ولایت سے مزید طلبا کے آ جانے پر مولویوں کو پڑھانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چارلس صاحب ان کی امداد سے محروم ہو گئے۔ فقط حسین علی نام کے ایک مولوی کی اعانت سے ہی انہوں نے ٹیپو لائبریری کے جملہ نسخہ جات کی ریسرچ جاری رکھی اور تمام کتب کی فہرست مرتب کر لی۔

عربی، فارسی اور ہندوستانی زبان کی ملی جلی کل کتابوں کی تعداد کل دو ہزار تھی۔ مسلم تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں کی کتب سے یہ لائبریری بھری پڑی تھی۔ تواریخ، سوانح حیات، مذہب و شریعت، سیاسیات، شعر و شاعری، حکایات و روایات، ریاضی، نجوم، فلسفہ، زبان دانی وغیرہ تمام موضوعات پر مشتمل کتب نے لائبریری کا دامن مالا مال کر رکھا تھا۔ جملہ کتب نہایت خوش خط نستعلیق خط میں نقش و نگار اور دلکش قلمی موشگافیوں سے سجا کر بڑی محنت سے لکھی گئی تھیں۔ وسطی زمانہ میں خوشنویسی بہترین آرٹ میں شمار کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں یہ آرٹ عروج کمال پر پہنچا۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں اس کے بے شمار شاہکار موجود ہیں۔

ٹیپو لائبریری کی بیشتر کتب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مال غنیمت کے ساتھ دیگر مقامات سے لائی گئی تھیں۔ بیجاپور، گولکنڈہ، کرناٹک کے علاقہ کے کئی مقامات سے بے شمار کتب اُن کے ہاتھ لگی تھیں۔ بعض کتب کے ابتدائی اور آخری اوراق نہ ہونے کی وجہ سے مصنفین کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا۔ ہر کتاب کے سرورق کے وسط میں ایک نمغہ کی شکل بنائی گئی تھی، اس میں خدا، حضرت محمدؐ، حضرت محمدؐ کی صاحبزادی فاطمہ، اُن کے فرزند حضرت حسن اور حسین کے نام تحریر کئے گئے تھے۔ سرورق کے چاروں کونوں میں پہلے چاروں خلفاء —— ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے نام دیئے گئے تھے۔ سرورق کی پیشانی پر "سرکارِ خداداد" اور نچلے حصے پر "اللہ کافی" کلمات لکھے ہوئے تھے۔ کسی کسی کتاب پر ٹیپو سلطان کے نام کی مہر ثبت تھی۔ ان کتب کے مقدم موضوع عام مذہبی مسائل، شریعت، اور صوفی مذہب تھے۔ ان دو موضوعات کی کتب ہی ٹیپو سلطان کو زیادہ مرغوب تھیں۔ انہیں خود بھی تصنیف کتب کا بہت شوق تھا۔ مگر ان کا تصنیف کردہ کوئی بھی مکمل صحیفہ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ اُن کی ذاتی مساعی اور اہتمام سے مختلف موضوعات پر پچاس کتب تصنیف اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی ملی ہیں۔

ٹیپو سلطان کی ان فراہم شدہ کتب سے ان کے زمانہ کے ذوقِ علم پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز فارسی زبان کی کئی ایک قرنوں کی رفتارِ ترقی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یورپ جب جہالت اور لاعلمی کی تاریکی میں گم تھا، ایشیا اس وقت علم و حکمت کے لحاظ سے کس درجہ ترقی پر پہنچا ہوا تھا —— یہ لائبریری اس امرِ واقعی کے ثبوت کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتب خانہ کی بہت سی کتابیں بعد میں انگلینڈ بھیج دی گئی تھیں۔ چند ایک معمولی کتب ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ذیل میں اس لائبریری کی چیدہ چیدہ کتب کا مختصر تعارف درج ہے۔

اس لائبریری میں تاریخ اور سوانح عمریوں کے بے شمار قیمتی نسخے جمع کئے گئے تھے۔ اُس زمانے کے مسلمان علما نے تاریخ دانی میں شہرت حاصل کی تھی۔ ہندوستان، عرب، پارس وغیرہ کئی ممالک کی تاریخی کتب سے ٹیپو سلطان کی لائبریری سیر داماں تھی۔ اُن میں سے 'روضۃ الصفا' بہت مشہور ہے۔ مشرقی لٹریچر میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے مصنف 'محمد بن خواوند شاہ بن محمد' ہیں۔ یہ عوام میں میر خند کے نام سے معروف تھے۔ ان کی یہ کتاب سات

حصص پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ ایک دیباچہ اور ضمیمہ بھی شامل ہے۔ کتاب کی تمہید میں مطالعہ تواریخ کے متعلق عام بحث کی گئی ہے۔ اور حکمران طبقہ کے لئے اس کے فواید بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد آفرینش عالم سے شروع کر کے پارس کی قدیم تواریخ، سکندرِ اعظم کی سوانح حیات، حضرت محمدؐ، پہلے چار خلیفوں اور بارہ اماموں کی سوانح عمریاں بنو امیہ، بنو عباس اور سلجوقی خاندان اور غزنی اور غور کے شاہی خاندانوں کے حالات اور چنگیز اور تیمور کی تاریخ دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مشہور تاریخ "خلاصۃ الاخبار" بھی ملتی ہے۔ یہ کتاب بھی ایشیا کی مستند تواریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ضخامت، بصیرت افروز دیباچہ، دس حصص اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی "میر خند کی اصلی تصنیف" کا دوسرا حصہ ہے۔ مذکورہ دونوں کتب کے علاوہ ایشیا اور ہندوستان کی تواریخ سے متعلق جو دیگر کتابیں ٹیپو لائبریری کی زینت تھیں ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) روضۃ الطاہران (۲) تاریخ یہود (۳) ظفر نامہ ــــــ تیموری حملوں کا تذکرہ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی تھی (۴) طبقات ناصری۔ یہ کتاب غلاماں خاندان کے بادشاہ ناصر الدین کے عہد میں لکھی گئی تھی اور مصنف کی طرف سے بادشاہ کے نام سے منسوب کر دی گئی تھی (۵) طبقاتِ اکبری ــــ اس کتاب کے مصنف نظام الدین احمد تھے (۶) فرشتہ کی مشہور تواریخ، محمد قاسم فرشتہ نے یہ کتاب تصنیف کی تھی (۷) منتخب اللبیب، ــــ مصنفہ مشہور تواریخ دان خافی خاں (۸) معاصر رحیمی (۹) اقبال نامہ جہانگیری (۱۰) شاہجہاں نامہ (۱۱) عالمگیر نامہ (۱۲) لطائف الاخبار ــ اس میں دارا کے حملہ قندھار کا تذکرہ ہے۔ کانڑی زبان میں تصنیف شدہ میسور راج ونش کی تواریخ کا فارسی ترجمہ ــــــ ٹیپو کی ہدایت کے مطابق اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

شعر و شاعری:۔ قدیم پارس بے شمار شاعروں کا وطن تھا فارسی زبان کا پرانا مجموعہ شعر و شاعری آج بھی چار دانگ عالم میں خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔ ٹیپو سلطان کی لائبریری میں فارسی شاعری کے بیش قیمت نسخے فراہم کئے گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہاں دیئے جاتے ہیں ــــ (۱) جامی کی تصنیف کردہ "یوسف و زلیخا" (۲) دیوان انوری ــــ (۳) جلال الدین رومی کی مثنوی (۴) کلیاتِ سعدی ــــ سعدی کے کلام کا مجموعہ (۵) سعدی کی بوستاں (۶) امیر خسرو کے کلام کا مجموعہ (۷) شیریں فرہاد (۸) دیوانِ حافظ (۹) رامائن کا فارسی ترجمہ (۱۰) شاہ نامہ وغیرہ

حکایات:۔ (۱) انوارِ سہیلی (۲) ہندی سے ترجمہ شدہ نصیحت آموز کہانیاں (۳) داستانِ سلیمان۔

سائنس:۔ (۱) جامع العلوم ــ اس کتاب میں سائنس کے مختلف موضوعات مثلاً نجوم، زراعت۔ طبیعات جغرافیہ وغیرہ پر خامہ فرسائی کی گئی ہے (۲) جواہر نامہ ــــ قیمتی پتھروں اور معدنیات کے متعلق سائنس (۳) خواص الحیوان ــ یہ علم الحیوانات کی کتاب ہے (۴) علم نباتات اور علم طبعی کا باتصویر صحیفہ ــــ ٹیپو سلطان کی ہدایت سے انگریزی اور فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا (۵) علم الخواب کی کتاب (۶) اقلیدس جیومیٹری کا گریک سے عربی میں ترجمہ (۷) بو سینا کی تصنیف کردہ علمِ طب کی شہرہ آفاق کتاب "قانون فی الطب"

ان کے علاوہ جو نادر نسخے تھے۔ افسوس کہ وہ ہندوستان سے برٹش میوزیم میں منتقل کر دیئے گئے اور آج اس ملک کے اہلِ ذوق ان سے استفادہ بھی نہیں کر سکتے۔

جگن ناتھ شرما پربھاکر

کیسے پاؤں

کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

گھر سے نکلی چلی ڈھونڈھنے بھر جوگن کا بھیس ــ چلتے چلتے تھک گئی میں پر پایا نہ پی کا دیس
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

گھر میں ڈھونڈا بن میں ڈھونڈا کھوج لیا سنسار ــ پربت پربت پر سر مارا پایا وار نہ پار
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

تاروں سے بھی میں نے پوچھا پی کا پتہ نشان ــ وہ بھی رو کر لگے گرانے دل پر اگنی بان
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

جن راہوں میں جا کے پڑی میں پایا نہ اُن کا انت ــ کس سے پوچھوں ہائے سکھی ری کوئی نہ سادھو سنت
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

آنکھیں پھوٹیں پاؤں بھی ٹوٹے ہو گئی میں مجبور ــ چھپ کے بیٹھے پاس مرے وہ کر کے مجھ کو دُور
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

اندرجیت شرما

دنیائے ادب

اقبال کی منظر نگاری

(ذیل کا مقالہ یومِ اقبال کی تقریب پر اُس جلسہ میں پڑھا گیا جو ۱۶ جنوری ۳۸ء کو ڈی اے وی کالج راولپنڈی کے ہال میں آنریبل شیخ سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل لندن کی صدارت میں منعقد ہوا)

جگن ناتھ آزاد بی اے (سیکرٹری انجمن اردو راولپنڈی)

ہمارے ملک کی تاریخ ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی یادگار اس کی زندگی میں اس قدر اہتمام کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں منائی گئی ہو۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ان کی سالگرہ پر آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ادباء شعراء اور اصحاب ذوق ہدیۂ مبارکباد پیش کر رہے ہیں اور یہ اس شکرگزاری کا اظہار ہے جو ہم سب پر ان کی گراں قدر خدمت گزاری کے لئے لازم آتی ہے۔ دورِ حاضر میں ان کے سحر انگیز کلام نے اہلِ وطن کے جذبۂ عمل کو بیدار کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس کے لئے علامۂ اقبال کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اقبال کا کلام صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ جس کی وسعت اور عمق کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے میں اس شاعرِ عالم کے کلامِ بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یعنی مجھے "اقبال کی منظر نگاری" کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ اس ایک خصوصیت کا نامکمل بیان بھی میرے لئے چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ لیکن کارفرمایانِ بزم کے ارشاد کی تعمیل میں وہ تاثرات جو مطالعۂ کلامِ اقبال کے دوران میں میرے دل نے قبول کئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اردو کی موجودہ اصلاح یافتہ شاعری جس کی داغ بیل حالی اور آزاد نے ڈالی تھی اقبال کے میدانِ عمل میں آنے سے پہلے مروج اور مقبول ہو چکی تھی۔ اس شاعری کا جزوِ اعظم منظر نگاری تھا، ان کے معصروں اور مقلدوں نے منظر نگاری میں خوب رنگ آمیزیاں کیں بعض شعرا نے اسی صنعتِ شاعری کو اپنا خاص مضمون بنا لیا بعض نے ملکی اور ملی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال کا تعلق صریحی طور پر دوسرے طبقے سے ہے۔ چنانچہ کلامِ اقبال میں جا بجا منظر نگاری کو وارداتِ قلب جذباتِ ملت اور نکات فلسفہ وغیرہ کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے ان کی اولین نظموں میں "کوہ ہمالیہ" کے دوسرے ہی بند سے اس حقیقت کا ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ہمالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے بلکہ ان کا اصل موضوع اس عنوان کے پردے میں "حبِ وطن" ہے۔

باوجودیکہ منظر نگاری اقبال کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے لیکن جہاں جہاں کلام اقبال میں منظر نگاری موجود ہے۔ وہاں یہ ایک سحر انگیز منظر پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا ؛ دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا ؛ وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

"ماہِ نو" پر چند اشعار لکھے ہیں میں شروع کے تین اشعار پیش کرتا ہوں انہی سے کلام کی اس خصوصیت کے کمال کا اندازہ لگا لیجئے۔ منظر نگاری کے تمام لوازمہ مثلاً قدرتِ زبان، ندرتِ تشبیہہ، علوِ تخئیل ان چھ مصرعوں میں انتہائی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل ؛ ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر گھٹاؤں کے منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا   سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرمن کا
نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر   ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا   عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ کالی گھٹا، لو برس پڑا بادل

برسات کے موسم کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک ایک مصرع پر فصاحت اور بلاغت نثار ہو رہی ہے۔ لفظ لفظ نظارے کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ خاص کر ساکنانِ راولپنڈی جس قدر ان اشعار کی صداقت کا احساس کر سکتے ہیں اور اُن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور مقام والوں کی قسمت نہیں۔

"ایک شام" جن جذبات کی مظہر ہے اُس کا احساس فقط حسّاس دل ہی کر سکتے ہیں۔ دریا کے کنارے شام ہو رہی ہے۔ سکوت ہر طرف اپنا تسلط جما رہا ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اقبالؔ اس خاموش کن اور غم انگیز منظر سے متاثر نہ ہو۔ کہتا ہے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت خاموش ہو گئی ہے   آغوش میں سب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے   نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے   یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا   قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

"گورستانِ شاہی" میں تو اقبالؔ نے منظر کشی کے جادو کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاندار اسلامی حکومتوں کے ویران کھنڈر شاعر کے سامنے ہیں۔ آنکھیں تباہ شدہ مناظر کو دیکھ رہی ہیں۔ حساس دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قطب شاہی اور عماد شاہی حکومتوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن آج اُن کے عظیم الشان شہنشاہ۔

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

عالیجناب شیخ صاحب نے جو ہماری خوش قسمتی سے آج کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں اس بلند پایہ نظم کی تمہید میں جون ۱۹۱۰ء میں چند سطور زیب اوراقِ مخزن کی تھیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک قصیدہ کا ذکر کرنے کے بعد شیخ صاحب لکھتے ہیں:-

"دوسری نظم جو گورستانِ شاہی کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے۔ ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے۔ اس کا ایک ایک مصرع ایسا درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے۔ . . . سلاطین قطب شاہیہ کے مزار اُن کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شب ماہ مگر ایسی شب ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی سچے شاعرانہ جذبات کے نشو و نما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہو گا۔ ان جذبات کا عکس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اتارا ہے۔ انہی کا حصہ ہے۔"

خود علامۂ اقبال نے اسی نظم کی تمہید میں لکھا:

"حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنائت فرما مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمۂ فینانس مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں رات کی خاموشی ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہو گا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔"

شہنشاہوں کے قبرستان کا المناک منظر، شبِ ماہتاب کا ابر آلود نظارہ اور اقبال کا دل حساس، اس اتفاق کو اردو شاعری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ نظم کا آغاز دیکھئے، کس درجہ بلند پایہ منظر نگاری ہے ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے   کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں   صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی   بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

یکایک شاعر کی توجہ اس یاس انگیز منظر سے ہٹ کر سامنے گولکنڈہ کے قلعہ کی جانب مبذول ہوتی ہے اور کہتا ہے ؎

آہ! جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اُٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سُکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

بیان کیا جا چکا ہے کہ منظر نگاری اقبال کے کلام میں وارداتِ قلب جذباتِ ملت، نکاتِ فلسفہ اور حبِ وطن وغیرہ مضامین کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس نظم میں یہ خصوصیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے، ان اشعار کو لیجئے ؎

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں
ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں
خاکبازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اسے
داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا
آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے
فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لئے

یا

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

یا

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ آغاز سے شاعر کا مطلب فقط منظر نگاری نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی ہاں اگر حبِ ملی اور منظر نگاری کا کمال دیکھنا ہو تو "گورستانِ شاہی" اقبال کے اردو کلام میں بے نظیر چیز ہے۔

"نمودِ صبح" کے زیرِ عنوان ایک نظم ہے۔ یہ دراصل ایک قصیدہ کے ابتدائی اشعار ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا گیا ہے مگر وقت کی تنگ دامانی کی وجہ سے بعض لاجواب نظموں مثلاً "رات اور شاعر" اور "بزمِ انجم" کو مجبوراً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

چونکہ شاعر نے اردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا، اگر فارسی منظومات میں سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش نہ کئے جائیں۔ سر اقبال کی فارسی تصنیفات میں "پیامِ مشرق" ایک ایسا چمن بے خزاں ہے جس میں اقبال کی منظر نگاری کے اچھوتے اور مکمل نمونے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم اپنے پورے شکوہ سے جلوہ گر ہے۔ شاعر دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

خیز کہ در کوہ و دشت
خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار
طوطی و درّاج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت
خیمہ زد ابرِ بہار

شاعر کی عمیق نظر فقط بہار تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بہار کے تاثرات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیز کہ در باغ و راغ
قافلۂ گل رسید
بادِ بہاراں وزید
مرغِ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسنِ گلِ تازہ چید
عشقِ غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ
قافلۂ گل رسید

نسیمِ صبح کی زبان سے کتنے لطیف اشعار کہلائے ہیں ؎

ز روئے بحر و سرِ کوہسار می آیم
ولیک سے نہ شناسم کہ از کجا خیزم
بہ سبزۂ غلطم و بر شاخِ لالہ می پیچم
کہ رنگ و بو ز مسامات او برانگیزم
خمیدہ تا نہ شود شاخ از گردشِ من
بہ برگِ لالہ و گل نرم نرمک آویزم

ساربانِ حجاز اپنے ناقہ پر سوار جا رہا تھا۔ صبح ہو رہی ہے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

مہ ز سفر پا کشید
در پسِ تل آرمید
صبح ز مشرق دمید
جامۂ شب بر درید
بادِ بیاباں وزید
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

شاعر نشاط باغ کشمیر میں بیٹھا ہے۔ بہار پورے جوبن پر ہے، دل پر جو کیفیت طاری ہو رہی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

زمیں از بہاراں چو بال تدروے ۔ ز فوارہ الماس بار آبشارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے ۔ کہ می آید از خلوت شاخسارے
نوا ہائے مرغ بلند آشیانے ۔ در آمیخت با نغمہ جویبارے

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے

ایک اور نظم میں کشمیر جنت نظیر کی تصویر کھینچی ہے فقط دو اشعار پیش کرتا ہوں

باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آب جو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

اتنا وقت نہیں کہ علامہ اقبال کی تمام تصانیف سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

"ھمایوں" — جگن ناتھ شرما

مصنف کے حالات اس کی تصانیف

(مزاحیہ)

مغربی طرز تنقید نے جسے آج کل تنقید عالیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارے نقادوں کی ذہنیت میں ایک خطرناک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس انقلاب کا سب سے نمایاں پہلو کسی مصنف کے سوانح حیات اس کی تصانیف سے اخذ کرنے کا جنون ہے۔ ہمارے نقادوں کی اس امر واقعہ پر نظر ہی نہیں کہ ہمارے مصنف بالخصوص شاعر آپ بیتی نہیں کہا کرتے بلکہ ایک علمی اور خیالی دنیا پیدا کر کے اس میں رہنے والے کسی فرضی شخص کے حالات اور جذبات اپنے نام سے بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کلام سے ان کی زندگی کے حالات اخذ کرنا خنثل ہی سے عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے لیکن مجھ ایسے کم مایہ شخص کے لئے ان بزرگوں کی روش کے خلاف بغاوت کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے مجبوراً ان کی پیروی کر رہا ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ دو تین شاعروں کے حالات ان کے کلام سے اخذ کر کے اس طرز تنقید کی لغویت پر کچھ روشنی ڈالوں۔ لیکن وقت بہت کم ہے۔ اس لئے صرف مرزا غالب کے حالات بیان کئے دیتا ہوں اور وہ بھی نہایت اختصار سے۔ مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے لیکن نئے تذکرہ نگاروں نے اس معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش اور تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا ہیموں بقال نہیں بلکہ اسد اللہ خاں ہی تھا۔ ان محققوں کے اس خیال کی تائید مرزا کے دو شعروں سے بھی ہوتی ہے یعنی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں تمام ہوا ۔ اے دریغا وہ رند شاہد باز

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسدؔ ہے اور اکثر میں غالبؔ۔ اس سے بعض لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں نے ثابت کر دیا ہے کہ غالبؔ اور اسدؔ در اصل ایک ہی شخص کے تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں کہ مرزا پہلے اسد تھے۔ پھر غالب بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسد تخلص نہیں چھوڑا فرماتے ہیں ؎

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا نے آخر عمر میں بھی نہیں بلکہ اپنی موت کے بعد لکھا تھا۔ پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ آخر تک اسد تخلص استعمال کرتے رہے۔

پیدائش:-

نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا۔ لیکن مرزا کی پیدائش اور عمر کے متعلق نئے اور پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سب نے غالب کا سن پیدائش ۱۲۱۲ھ لکھا ہے اور عمر ۷۳ سال لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ مرزا خود کہتے ہیں۔

فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا غالب نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے۔ بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے۔

والدین:-

غالب کے والد کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ خاں درج ہے۔ مرزا کے کلام سے اس معاملے پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر کے باپ کا نام ظہیرالدین بابر تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسداللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کچھ حرج نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی کم از کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم

معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سکول تو تھا نہیں۔ صرف ایک دبستاں تھا جس کی دیواروں پر مجنوں لام الف لکھا کرتا تھا۔ پس مرزا غالب گھر پہ ہی پڑھے ہوں گے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیوں کر لکھ سکتے اور اتنی تصانیف کہاں سے آ جاتیں۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں نظم و نثر لکھی ہے۔ پس وہ دونوں زبانیں جانتے تھے۔

پیشہ اور شغل۔

مرزا کا سب سے بڑا پیشہ تو ظاہر ہے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے تھے۔ خود مانتے ہیں کہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے۔ مثلاً انہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی۔ فرماتے ہیں۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

کچھ مدت یہ شیوہ بھی رہا کہ صبح سویرے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے اور سارا دن لوگوں کے خط لکھتے پھرتے۔ اس لئے کہ

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مختصر حالات۔

اب مرزا کے مختلف سوانح حیات سنئے۔ وقت کی تنگی کے باعث میں صرف چند ایک واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

مرزا کی زندگی اگرچہ نسبتاً عسرت میں گزرتی تھی۔ لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے۔ خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے انہیں دونوں جہان دے دیئے تھے۔ سنیئے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہوں گے۔ مرزا غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا۔ بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن ان کا گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید کرکٹ کھیلنے کے لئے بہت وسیع جگہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے جنگل میں جا بسے تھے۔ فرماتے ہیں۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات و خصائل:۔

مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے۔ جن کا نتیجہ نقصان یا تکلیف ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذرا سی غلطی کے باعث دربان سے چند یا گنجی کرا لی۔ کہتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی۔
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک دن خود محبوب سے بھی مار کھائی۔ لیکن قصور اپنا تھا۔ اس لئے نہایت ایمان داری سے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے یعنی۔

وصول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسی سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف

کرکے ایک غمخوار رازداں کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے۔

تاکرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملے میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے اسی لئے کہا ہے۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

اگر کبھی محبوب آنے کا وعدہ کرے تو سارا دن بلکہ یوں کہئے کہ ساری رات اپنے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر تنگ آکر کہتے ہیں۔

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

مرزا کا دل

غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ آفت کا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے شاکی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن اللہ میاں نے فضل کیا اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوز نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ مرزا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

غالب کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر کھدائی کے لئے تیز ہو جاتے فرماتے ہیں۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

محبت کے مریضوں کو عام طور پر سخت جانی کی شکایت ہوتی ہے، لیکن مرزا کی جان نہ تو سخت تھی اور نہ نرم بلکہ نہایت ہی خستہ تھی اور شاید بھربھری بھی۔ اس لئے کہا ہے۔

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اسی خستہ جانی کے باعث حضرت عیسیٰ کے لب ہلاتے ہی مرزا غریب لڑھک گئے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

غالب کا زمانہ

غالب کے زمانے میں دلی میں غم الفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ اب خدا جانے کیا حال ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی خوراک غم الفت تھی یا کم از کم غم الفت ان کی خوراک کا جزو عظیم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں ایک دو چیزوں کی ارزانی بھی تھی، مثلاً دل اور جاں بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اس کا اعتراف ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اس زمانہ میں پورے سات آسمان تھے اور سب کے سب دن رات گردش میں رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرزا کے زمانے کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی کو محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا کی ہیچمدانی بھی کھل گئی۔ جس کا اعتراف اس شعر میں موجود ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جرم

کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس حالت کو بھی غنیمت سمجھتے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب:

مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا۔ لیکن کسی ملک کسی شہر کسی گاؤں میں کوئی شخص بھی اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا مرزا کہتے ہیں۔

کام اس سے آ پڑا ہے جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

مرزا کا محبوب مرزا کی بات نہ سمجھتا۔ مرزا دعا کرتے ہیں:

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اور لطف یہ ہے کہ مرزا بھی اس کی بات نہ سمجھتے تھے کہتے ہیں ؎

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

اس محبوب کے عادات وخصائل بھی عجیب تھے۔ مثلاً گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس طرح اگر کبھی مرزا شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اٹھ بھاگتا اور سارے رقیبوں کو جمع کر لیتا۔ اسی لئے مرزا جھنجھلاتے ہیں۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

جب وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آکر پنہاں تبسم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے مرزا کہتے ہیں۔

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

معشوق تھا تو ستمگر لیکن آخر میں بے طلب بوسے دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی ملاحظہ ہو۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ؎ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا جبھی تو مرزا کو کہنا پڑا کہ

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

چند متفرق واقعات

ایک دفعہ مرزا نے اڑنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں کسی اور طریق سے اڑے ہوں گے لیکن جال میں پھنس گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں بھی گزاری۔

مرزا کا ایک درباں بھی تھا۔ جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا۔ مگر تھا وفادار۔ مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر میں سے گھاس کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں۔

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

بچپن میں ایک مرتبہ مرزا نے مجنوں پر پتھر اٹھایا تھا لیکن مارا نہیں آزاد مرحوم کو یہ واقعہ معلوم ہوتا تو فرماتے "اللہ اللہ کیسے رقیق القلب اور خدا ترس انسان تھے"۔ مرزا کا شعر سنیئے ؎

میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مرزا نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ بہشت سے واپس آکر محبوب سے فرماتے ہیں۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر نے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدے میں فرماتے ہیں۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایک مرتبہ مرزا کو چوروں کا سامنا ہوا۔ دیکھتے ہی بھاگ نکلے لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے۔ ایک ستم ظریف چور نے ڈانٹ کر کہا، کم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے۔ لے اب میرے پاؤں داب۔ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر کم و زیادہ پورے ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی رقیب کے گھر گیا۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے اور انہوں نے دیوان میں شامل کر دیئے ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو محبوب کے دروازے پر دھکے پڑتے تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے فرماتے ہیں۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی۔ اس کا انتقال بھی مرزا سے پہلے ہی ہوا۔ مرزا کہتے ہیں۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مرزا بچارے کی موت بھی غریب الوطنی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں:

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے کہا۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا دوڑا آیا۔ لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوئے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

لیجئے صاحب یہ ہے ہمارے خدائے سخن کی وہ صورت جو "تنقید عالیہ" کے آئینے میں نظر آتی ہے۔

(شیرازہ) ہرچند اختر

قطعہ

وہ لطف بھی گیا وہ مدارات بھی گئی
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی
ہم چاہتے تھے اور فزوں لطف یار کو
نقصہ یہ کیا ہوا کہ وہ بات بھی گئی

جلال الدین اکبر

کمزور بچوں کی طاقت کے لئے

اور

اور ان کے جسم کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے

ڈونگرے کا بال امرت

دینا چاہئے

کیونکہ اس میں بچوں کی صحت تندرستی و جسمانی نشوونمائی کے لئے بہت قیمتی

اور

نایاب ادویات شامل ہیں

بھگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

نوبل کا اینٹی ملیریا

پلورائڈ

نسخہ کوئین ہائی ڈرو کلورسنکوڈائن
ایسڈ آرسینوس ۱/۱۲ گرین
ایسڈ کاربولک ۱/۸ گرین
ایکسٹریکٹ نکس وامیکا ۴ گرین
کیپسین منتھول وغیرہ
خوراک ایک گولی سے دو گولی دن میں دو یا تین بار

جڑیا بخار کے علاوہ باقی سب بخاروں کا علاج ہے اور ملیریا انفلوئنزا اور بڑھی ہوئی تلی کے لئے خاص طور پر مفید ہے خوراک ایک گولی دن میں دو بار پچاس اور سو کی ڈبیوں میں قیمت پچاس والی پندرہ روپے فی درجن۔ سو والی ستائیس روپے فی درجن ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے۔

سول ایجنٹ۔

ایم اے جے نوبل نمبر ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

ہندوستان سنو

HINDUSTANSNOW

اگر آپ ہمیشہ ہندوستان سنو استعمال کریں گے تو یقیناً آپ کے چہرے کی جلد کبھی خراب نہ ہوگی بلکہ تازہ نرم اور گلاب جیسی ملائم رہے گی ہندوستان سنو کے استعمال سے جلد کی کوئی مرض نزدیک نہیں آتی۔ گرمی کے موسم میں چہرے پر لگانے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ مچھر کے کاٹنے کے بعد ہندوستان سنو لگانے سے جلن دور ہو جاتی ہے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے ہمیشہ استعمال کیا کریں۔ سورج کی تپش اثر نہ کرے گی غرض ہندوستان سنو گالوں کو ملائم کرنے چہرے سے چھائیں اور جھریاں دور کرنے کے لئے بہترین سنو ہے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ایجنٹ درکار ہیں مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

یونیورسل پرفیومری ورکس نمبر ۹۵ کامبیکر سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

آنریبل سر محمد یعقوب ممبر ایگزیکٹو کونسل وائسرائے ہند

"افسانہ نویسی دراصل انسانی فطرت نگاری کا دوسرا نام ہے۔ افسانہ نویس کے واسطے ضروری ہے کہ وہ نفسیات کا ماہر ہو تاکہ کیرکٹر کے برمحل فطری تاثرات کا اظہار کر سکے۔ عاشق صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے واسطے ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات منتخب کرتے ہیں اور ان کے اظہار کے لئے ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں کیرکٹر مُتصوِری ہیئت اختیار کر لیتا ہے یہ خوبی بہت کم افسانہ نگار حضرات میں پائی جاتی ہے میں دلی مسرت کیساتھ عاشق صاحب کو اُن کی اس کامیابی پر اور بیش از بیش ان کی مہارت نقاشیٔ فطرت پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

آنریبل جسٹس مرزا ظفر علی (لاہور ہائی کورٹ)

"زبان کی روانی، اظہارِ مطالب کی قوت، ادائے بیان کی ندرت، تراکیب کی جدت اور فقرات کی شگفتگی کے اعتبار سے اردو ادب کے موجودہ دور میں شاید ہی اس سے بہتر کتاب لکھی گئی ہو۔ افسانوں کے ذریعے سے زندگی کے حقایق اور فطرت کے رموز کو ایسے دلآویز پیرائے میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ مصنف کی دقّتِ نگاہ، وسعتِ معلومات اور بلندیٔ فکر کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں کی مونس و رفیق بن جائے گی۔ اور بڈھے اس کو پڑھ کر عہدِ حاضر کے نوجوانوں کے دلوں کی دنیا سے واقف ہو جائیں گے۔"

سوزِ ناتمام کے متعلق چند مشاہیر کی رائیں ملاحظہ فرمایئے

ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ سابق وزیر حکومتِ پنجاب

"سوزِ ناتمام ادبیات میں ایک بلند مرتبے کی اہل ہے۔ عاشق صاحب کو اردو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور جس مہارت و قابلیت کے ساتھ وہ افسانوں میں نفسِ انسانی کا تجزیہ کرتے اور افرادِ قصہ کی سیرت کے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ ایک نوجوان مصنف کے لئے قابلِ صد تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فنِ افسانہ نگاری کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کتاب کا انتہائی ذوق و شوق سے خیر مقدم کریں گے"۔

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں ایم اے لٹ ڈی (الہ آباد)

"مجھے سوزِ ناتمام کے مطالعہ سے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ یہ ایک شاندار تصنیف ہے جس میں عاشق صاحب کی انشاپردازی کی تمام امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔ زبان کی پاکیزگی خیالات کی بلندی اور اندازِ تحریر کی سحر آفرینی نے اسے ادبِ اُردو میں ایک نمایاں ترین مقام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ عاشق صاحب آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھیں گے اور ہماری زبان اُن کی علم ادب سے لبریز تصانیف سے متمتع ہوتی رہے گی۔"

سوزِ ناتمام کی ـــ قیمت ـــ صرف ـــ ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ لاہور

نیشنل لیباریٹریز لاہور کے تحفہ جات

مونا سنو

پر جلال بادشاہ سے لے کر بے خانماں گداگر تک

خوبصورتی کا خواہشمند ہے

اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جاتے ہیں اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا ایک دفعہ ضرور استعمال کریں

ہر اچھے دکاندار سے طلب کر سکتے ہیں

کاکل سنبل کے ساتھ قدرت کا بے بہا تحفہ

لمبے بال عورتوں کی خوبصورتی کو دوبالا کریں گے

مونا ہیر آئل

کے استعمال سے بال ناگن کی طرح سیاہ ریشم کی طرح ملائم گھٹنوں تک لمبے اور چمکدار نکل آئیں گے زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں ایک دفعہ استعمال کر کے ہماری محنت کی داد دیں۔

جملہ تحفہ جات

کو منگا کر ضرور استعمال کریں۔ تمام تحفہ جات کو ہمہ صفت موصوف پائیں گے

سول ایجنٹ

مونا کولڈ کریم

اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جاتے ہیں۔

بلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انارکلی لاہور

ڈرائیکو (سوکھا دودھ)

تازہ دودھ سے زیادہ اچھا اور مقوی

ننھے بچوں کے لئے بہترین طاقتور خوراک بصورت دودھ ڈرائیکو نہایت آسانی سے ہضم ہونے والی ایک غذا ہے جو بچوں اور بوڑھوں کو یکساں مفید ہے زچگی کے زمانے میں زچہ کو بھی طاقت دیتی ہے دراصل یہ اصلی اور خالص دودھ ہے جس میں سے سائنس کے ذریعہ پانی خشک کر لیا گیا ہے آزما کر دیکھئے سالہا سال سے بچوں کے خصوصی معالج اس خوراک کو بچوں کے لئے مفید بیان کر رہے ہیں۔

ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے

سول ایجنٹ:۔ ایم اے جے نوبل نمبر ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

آپ کے سنگار کا نکھار

آٹو دل بہار

کے چند قطروں پر منحصر ہے جو آپ اپنے رومال یا لباس پر لگائیں گے آٹو دل بہار ایک غیر معمولی دلفریب خوشبو ہے جو الکحل سے مبرا ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ چھوٹی شیشی ایک ڈرام ۱۲/ خوشبودار کارڈ اور مفت نمونوں کے لئے ۲/ کے ٹکٹ بھیجیں۔

آٹو مسی بلوم شب ہائے بہار کے پھولوں کی خوشبو قیمت مدنی اونس مفت نمونہ کے لئے ۲/ کے ٹکٹ۔

آٹو مشک بہار رومال کے لئے مشک اذفر کی بہترین خوشبو مفت نمونہ کے لئے ۲/ کے ٹکٹ۔

سول ایجنٹ:۔

اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲ اے ڈی

صناعی کا ایک شاہکار

Regd. L. No. 2482.
Regd. L. No. 2482

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Gilani Press, Hospital Road, Lahore
The Title & pictures printed at the Victoria Press, Railway Road, Lahore
Issued from office of the Adabi Dunya Commercial Building The Mall Lahore

جو پیسے بچانا چاہے
پڑھے

ہم دوسری فرموں کی طرح بڑے بڑے اور قیمتی اشتہارات نہیں دیتے اور اس طرح جو خرچ بچاتے ہیں اس کے فائدے میں اپنے گاہکوں کو سستا مال دیا کرتے ہیں ذرا غور سے آپ سوچیں کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس میں کہاں تک آپ کے فائدے کی بات ہے ہماری ہر قسم کی ماڈرن اور وضعدار فریمیں اور دیگر سامان موجود ہے ایک دفعہ ضرور آزما کر دیکھیں۔

تاجران جو ہماری ایجنسی کے خواہش مند ہوں ہم سے خط و کتابت کریں۔

حاتم برادرس آپٹیشین عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی

نوبل کا اینٹی ملیریا
پلورائڈ

نسخہ کونین ہائی ڈرو کلور سنکونائن
ایسڈ آرسینس ایک روپیہ بارہ آنہ گرین
ایسڈ کاربولک ایک روپیہ آٹھ آنہ گرین
اکسٹریکٹ نکس وامیکا چار آنہ گرین
کیپسین منتھول وغیرہ
خوراک ایک گولی سے دو گولی دن میں دو یا تین بار۔

جو ٹائیفائڈ کے علاوہ باقی سب بخاروں کا علاج ہے۔ ملیریا انفلوانزا اور بڑھی ہوئی تلی کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ خوراک ایک گولی دن میں دو بار۔ پچاس اور سو کی بوتلوں میں قیمت پچاس والی پندرہ روپے فی درجن۔ سو والی ستائیس روپے فی درجن۔ ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے۔

سول ایجنٹ۔

ایم اے جے نوبل نمبر ۹۱ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

GRIMAULTS SYRUP
of
Hypophosphite of Lime
GRIMAULT & Cie
گریمالٹ شربت
زندگی بھر کے لئے تندرستی کی ضمانت
ڈاکٹروں کا تجویز کردہ
والدین کا پسندیدہ
بچوں کے لئے مرغوب
گریالٹ شربت کا استعمال بچوں کو صحت اور طاقت دیتا ہے۔
GRIMAULT'S SYRUP

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — تصاویر: ۱- رقصِ بہار ۲- نانِ شبینہ — نمبر ۹

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

طبی دواخانہ اندور و بمبئی

جس طرح ہر ایک ملک کی آب و ہوا مختلف ہے ویسے ہی انسان کے طبائع مختلف ہیں اور اسی طرح جڑی بوٹیوں کی تاثیرات اور خواص بھی مختلف ہیں۔ مسئلہ کائنات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ادویہ جو ہمارے ملک میں رائج ہیں وہی ہمارے ملکی بھائیوں کو زیادہ تر مفید اور مزاج کے موافق ثابت ہوتی ہیں۔ ان کا طریق استعمال بھی نہایت سادہ سہل اور بے ضرر ہے اور یہ علاج اگرچہ بتدریج مگر پورا اثر پیدا کرتا ہے۔ اور مرض کو کلیتہً زائل کر دیتا ہے اور نہ روپیہ پیسہ کا زیادہ صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان ہی جڑی بوٹیوں سے ہندوستان کی آب و ہوا کا لحاظ رکھتے ہوئے مالوہ کا مشہور و معروف طبی دواخانہ نہایت عمدگی و صفائی سے مرکبات تیار کرنے میں غیر فانی شہرت حاصل کر چکا ہے اور ہندوستان کا بہترین یونانی دواخانہ تسلیم کر لیا گیا ہے کیونکہ اس کے نیک دل اور دیانت پسند مالکان نے اس عرصہ میں پبلک کی خدمت جس ایمانداری اور سچائی سے انجام دی ہے وہ ہندوستان کی طبی تاریخ اپنی نظیر آپ ہے۔ جہاں اس چشمۂ صحت سے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا فیضیاب ہوئے۔ وہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس دواخانے نے ان غیر ملکی دوافروش کمپنیوں کا شاندار مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ دواخانہ ہم ہندوستانیوں کے لئے ہر لحاظ سے مفید اور حد درجہ اہم ہے جس کا اندازہ پبلک کو بخوبی یاد ہے۔

دواخانہ کی باقاعدہ ابتدا ۱۹۱۵ء سے ہوئی۔ کچھ زمانے کے بعد دواخانہ جناب حکیم شیخ طیب علی صاحب کی سرپرستی میں آیا۔ موصوف کوئی معمولی درجہ کے طبیب نہ تھے بلکہ آپ کو جناب ارسطوئے زماں فلاطون دوراں حکیم محمد اعظم خاں صاحب الملقب بہ ناظم جہاں مصنف اکسیر اعظم۔ رموز اعظم و قرابادین اعظم وغیرہ و سرپرست خاص طبی دواخانہ کے شاگرد رشید ہونے کا فخر حاصل تھا۔

چونکہ اس زمانہ میں مہاراجہ صاحب اندور اور ان کے خاندان کو طب یونانی سے خاص شوق اور دلچسپی تھی اور آپ عرصۂ دراز تک اس فرمانروا خاندان کے معالج خاص رہے مالکان دواخانہ کی خواہش پر عالیجناب حکیم محمد اعظم خاں صاحب ممدوح و مغفور نے بھی ہمیشہ اس دواخانہ کو اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمایا۔

۱۹۲۳ء میں حکیم شیخ طیب علی صاحب کے انتقال کے بعد طبی دواخانہ کا کاروبار آپ نے دونوں صاحبزادوں یعنی حکیم غلام علی صاحب و حکیم حاجی ملا محمد حسین صاحب کے زیر انتظام آنے پر آپ صاحبان نے تمام امکانی کوششوں سے دواخانہ کو انتہائی ترقی دی۔ ۱۹۲۹ء میں اندور میں طبی دواخانہ کے لئے ایک زبردست اور عالیشان عمارت تیار ہوئی جس میں دواخانہ کے متعلق ہر شعبہ کو علیحدہ علیحدہ مقرر کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ نے بصرف زرکثیر سائنس کی وہ تمام ایجادات فراہم کیں جن کی موجودگی میں کوئی دواخانہ سائنٹفک دواخانہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے

منجملہ دونوں بیدار مغز منتظمین کے حکیم غلام علی صاحب نے دواخانہ کے بیرونی معاملات پر اپنی خاص توجہ منعطف فرمائی۔ حکیم حاجی ملا محمد حسین صاحب نے معالجۂ مریضان و تیاری مرکبات و دیگر ضروری امور کی طرف توجہ فرما کر طبی دواخانہ کو صحیح معنی میں ہندوستان کا واحد و لاثانی دواخانہ بنا دیا۔

اس دواخانہ کے لئے ہلکر سٹیٹ کے چیف میڈیکل عالیجناب لفٹنٹ کرنل جاسپر رابرٹ جالے ٹرل صاحب سی آئی ای آئی ایم ایس (ریٹائرڈ) ایم بی بی سی۔ ایچ او ایل ایم رکن مجلس مشیران ریاست و انسپکٹر جنرل صیغہ صحت و حالجات و صحت عامہ نے بعد معائنہ نہایت اچھے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ علاوہ ازیں بھوپال کے سیکرٹری آف سٹیٹ کونسل و محکمہ حفظان صحت و تعلیمات و سابق سیکرٹری ردبکاری خاص عالی جناب قاضی ولی محمد صاحب نے جو رائے دواخانہ کے معائنہ فرمانے کے بعد ظاہر فرمائی ہے اس میں خاص طور پر اس دواخانہ کو لکھنو دہلی و ہندوستان کے دیگر دواخانوں کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔

۱۹۳۴ء میں بمبئی کی قدرشناس پبلک کی خواہش سے اس دواخانہ کی ایک برانچ بمبئی میں قائم کی گئی ہے جس کا انتظام حکیم غلام علی صاحب کے خلف اکبر حکیم محمد علی صاحب طبیبی طبیب کامل سند یافتہ آصفیہ طبیہ کالج گورنمنٹ بھوپال کے زیر نگرانی ہے اب تک صرف اس برانچ سے تقریباً ایک لاکھ بندگان خدا نے فایدہ حاصل کیا ہے ۱۹۳۶ء میں شہر اندور ہی میں ایک اور برانچ شہر کے دور دراز مقامات پر رہنے والے اصحاب کے اصرار پر بمقام روڈ شیوا گنج اندور کھولی گئی ہے۔ جو نہایت عمدہ طریقہ پر اہل ضرورت کو بہترین دوائیں مہیا کرتی ہے۔

الغرض طبی دواخانہ یونانی اندور کی یہ قابل رشک ترقیاں طبی دنیا کے لئے قابل فخر ہیں۔

ادارہ

رقصِ بہار

نانِ شبینہ

بزم ادب

ادبی دنیا کا سالنامہ حسب معمول دسمبر کے وسط میں شائع ہو کر دلدادگان ادب کے لئے تسکینِ ذوق کا سامان بہم پہنچائے گا۔ ادبی دنیا کے سالنامے ہمارے صحافتی ادب میں جو امتیازی درجہ رکھتے ہیں اسے نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ بلند تر کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی اور ہمیں اپنے قلمی معاونین سے پوری توقع ہے کہ وہ حسبِ سابق اپنے بیش قیمت مضامینِ نظم و نثر سے اس سالانہ محفل کی رونق افزائی فرمائیں گے۔

سالنامہ کا غالباً سب سے بیش قیمت مضمون ہمارے فاضل دوست پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے لکھ رہے ہیں۔ فاضل موصوف گذشتہ تعطیلاتِ گرما میں غالبِ مرحوم کے کلام۔ سوانح۔ مکتوبات و تصانیف کے متعلق جدید معلومات حاصل کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک تحقیقی سفر پر گئے تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے دہلی۔ رام پور۔ پٹنہ۔ کلکتہ۔ حیدر آباد دکن اور دیگر مقامات کے ان علم دوست مشاہیر سے ملاقاتیں کیں جن کے کتب خانوں میں غالب کے متعلق کوئی کتاب یا تحریر موجود تھی اور ان مقامات کے سرکاری کتب خانوں کے نوادر سے بھی استفادہ فرمایا اور بہت سی بیش قیمت معلومات حاصل کیں۔ ان سب کا ایک مجمل سا خاکہ آپ ادبی دنیا کے سالنامے کے لئے مرتب فرما رہے ہیں۔ ناظرین دیکھیں گے کہ یہ ایک نہایت قابلِ قدر مضمون ہو گا۔

ہمارے عزیز دوست اندر لال داس صاحب بقرؔ جو "سوسائٹی" کے ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آج کل اپنے تعلیمی مشاغل کے سلسلہ میں لندن میں مقیم ہیں۔ لیکن سات سمندر پار ہونے پر بھی ادبی دنیا ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوا۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں انہوں نے ہمیں ایک نئے ڈرامے کی نوید سے مسرور فرمایا ہے جو سالنامہ کی زینت بنے گا۔

ہمارے مکرم مضمون نگار میراجی مشہور بنگالی شاعر ودیاپتی اور اس کے کلام کے متعلق ایک نہایت فاضلانہ مضمون تیار کر رہے ہیں۔ ہمارے ناظرین میراجی کے دلکش طرزِ نگارش اور ان کے رس بھرے گیتوں سے بارہا کیف اندوز ہو چکے ہیں۔ اس لئے سالنامے کے اس مضمون کے لئے جو اپنے اندر نشہ آور شیرینی کے بہت سے وعدے پنہاں رکھتا ہے انہیں اپنے کام و دہن کو تیار کر لینا چاہئے۔

ان مضامین کے علاوہ ہر صبح کی ڈاک اپنے دامن میں گلہائے نظم و نثر کے تازہ بتازہ انبار لا رہی ہے۔ دستِ گلچیں ان کے انتخاب میں مصروف ہے اور وقت آنے پر چشمِ تماشا دیکھے گی کہ اس کے لئے کس کس طور سے تسکینِ ذوق کا سامان کیا گیا ہے۔

انعامی مضامین

پہلے کی مانند اس دفعہ بھی انعامی مضامین کا ایک علیحدہ سلسلہ قائم کیا جا رہا ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

منصور گولڈ میڈل۔ (دوسرا سال)

ہمارے مکرم دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے اردو ادبیات سے جو والہانہ دلبستگی رکھتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پچھلے سال منصور احمد مرحوم کی یاد میں آپ نے سالنامے کے بہترین علمی مضمون پر منصور گولڈ میڈل عطا فرمایا تھا۔ آپ ادب نوازی کا یہ سلسلہ مستقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس سال بھی آپ کی طرف سے منصور گولڈ میڈل سالنامہ کے بہترین علمی مضمون کے لئے دیا جائے گا۔ اس میڈل کے علاوہ ادارہ ادبی دنیا کی طرف سے مندرجہ ذیل انعامات دیئے جائیں گے۔

(۱) بہترین ادبی مضمون	پندرہ روپے
(۲) بہترین افسانہ (طبعزاد)	دس روپے
(۳) بہترین افسانہ (ترجمہ شدہ)	آٹھ روپے
(۴) بہترین ڈرامہ	دس روپے
(۵) بہترین مزاحیہ مضمون یا افسانہ	آٹھ روپے

(۶) بہترین نظم سات روپے۔ بہترین غزل پانچ روپے

سالنامہ کے متعلق آخری تفصیلات نومبر کی اشاعت میں دی جائیں گی اس وقت ہم اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں فقط یہی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے قیمتی مضامین جس قدر جلد بھیجیں گے اسی قدر بہتر ہو گا۔ کیونکہ مضامین کی ترتیب و تزئین کا کام ایک مستقل فرصت کا طالب ہوتا ہے۔ اور یہ فرصت سالنامہ کی اشاعت تک ہر روز کمتر ہوتی چلی جائے گی۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

دنیا کی شفیق ترین ماں ـــــ مادرِ روس

بچوں کے ساتھ ہر کوئی محبت کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے سرمایہ پرست ملکوں میں صرف انہیں بچوں کا بچپن پُرمسرت ہوتا ہے جو سونے کے کھلونے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کلیہ سے صرف ایک ملک مستثنےٰ ہے جہاں بچوں کے لئے یہ تفریق روا نہیں رکھی جاتی اور جہاں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر بچے کے لئے پیدائش کے دن سے ہی یکساں غور و پرداخت اور نگہداشت عمل میں آئے۔ یہ ملک سوویٹ روس ہے جس کے بدترین مخالف بھی ان حقایق کو جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتے

سوویٹ روس میں ہزاروں زچہ خانے (Maternity homes) حکومت کی طرف سے قایم کئے گئے ہیں۔ ان زچہ خانوں میں جو حصہ بچوں کے لئے مخصوص ہے وہاں علاوہ ماہرین تولید کے، بچوں کے امراض کے خاص ماہر ڈاکٹر مقرر کئے گئے ہیں۔ بچوں کے نشو و نما اور صحت کے لئے ان ڈاکٹروں کا وجود اشد ضروری ہے کیونکہ بچے اپنی پیدائش کے اولیں ایام یہیں گذارتے ہیں جو اُن کی ساری زندگی میں سب سے زیادہ پُرخطر ہوتے ہیں۔

بچوں کے لئے طبی مشورے کے مراکز

ماں جب اپنے بچے کو لے کر زچہ خانے سے رخصت ہوتی ہے تو فوراً دفتر مشورہ میں اطلاع کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی وقت ایک نرس متعلقہ حلقے کے مرکز سے نومولود کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ نرس بچے کا معائنہ کرتی ہے، گھر والوں کی معاشرتی حالت کا موازنہ کرتی ہے اور ماں بچے کی نگہداشت اور رکھ رکھاؤ کے متعلق ضروری ہدایات دیتی ہے۔

بچہ مستقل طور پر مرکز والوں کے زیرِ نگاہ رہتا ہے یہاں تک کہ وہ چار سال کا ہو جاتا ہے۔ اس مرکز کے ڈاکٹر نہ صرف بیمار بچوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں بلکہ وہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ تندرست بچوں کا معائنہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہر بچے کی نشو و نما پر اُن کی نگاہ ہوتی ہے اور اُن کے وزن اور تمام جسمانی تبدیلیوں پر ان کی نظر رہتی ہے۔ اسی وقت نظری کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام جسمانی عیوب کو بروقت بھانپ لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ڈاکٹر جو مستقل طور پر بچوں کی ایک مقررہ تعداد پر متعین ہوتے ہیں (جو اُن کے اپنے مرکز سے متعلق ہوتی ہے) نہ صرف حفظ ماتقدم کے قابل ہوتے ہیں بلکہ کنٹھ مالا، کبڑے پن اور تپ دق جیسے خطرناک امراض کا دفعیہ کر لیتے ہیں۔

ہر مرکز میں ایک آلہ دافع امراض عضوی (Physio-therapeutic cabinet) موجود رہتا ہے جس میں بلور کے لیمپ نصب ہوتے ہیں۔ اسی کے ذریعے سے کبڑے پن جیسی امراض کے دفعیہ اور ان عوارض کے روک تھام کا کام لیا جاتا ہے۔

دودھ رسوئیاں

علاوہ ازیں انہیں مراکز کے ساتھ خوراکی دوا خانے بھی ملحق ہوتے ہیں جنہیں دودھ رسوئیاں کہتے ہیں۔ چنانچہ جن بچوں کو طبی مشورے کے مطابق کسی خاص خوراک کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں سے مہیا کی جاتی ہے۔ اس وقت سوویٹ روس میں بچوں کے لئے ایسے چار ہزار طبی مراکز موجود ہیں جو نہ صرف بچوں کی امراض اور ایام طفلی کی اموات کو گھٹانے کے لئے جنگ کر رہے ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند نسل کی پرورش کر رہے ہیں۔

بچوں کے تعلیمی شفاخانے

چھ سال سے زیادہ عمر کے بچے تعلیمی شفاخانوں کے زیرِ نگرانی آ جاتے ہیں۔ یہاں بھی اور مراکز مشورہ میں بھی بچوں کے ڈاکٹروں کو بچوں کی مختلف امراض (متعدی امراض، امراض چشم وغیرہ) کے ماہرین کے ذریعے سے عملی ہدایات دی جاتی ہیں۔ ہر بچے کے لئے اس کا معالج "گھر کا ڈاکٹر" کے مترادف

ہے جس کی طبیعت کو اس کا معالج پیدائش کے روز سے جانتا ہے۔ اس وقت سوویٹ روس میں ۱۵۰۰ سے زیادہ تعلیمی شفاخانے موجود ہیں۔

بچوں کے ہسپتال ہر اک مشورہ اور تعلیمی شفاخانے خطرناک بیماروں کو بچوں کے ہسپتالوں میں بھیج دیتے ہیں جن میں مریض کے طبی معائنے کے لئے جدید ترین آلات اور ادویات موجود ہیں۔ مختلف اقسام کے ایکس رے کے آلات اور ٹیکہ لگانے کی متعدد دوائیاں یہاں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ ان ہسپتالوں میں چالیس ہزار مریضوں کے لئے جگہہ مہیا کی گئی ہے۔ صحت افزا مقامات میں ایسے بچوں کے لئے خاص طور پر یہ انتظامات کئے گئے ہیں جو تپ دق یا وجع مفاصل کے مریض ہوں۔ جو بچے کسی شدید علالت کے باعث بہت کمزور ہو رہے ہوں انہیں بھی انہی صحت افزا مقامات میں بھیج دیا جاتا ہے۔

بارہ ہزار بچوں کے معالج اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ سوویٹ روس میں ہر بچے کے لئے طبی امداد مفت ہے۔ ایسے تمام اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سوویٹ روس جیسی وسیع و عریض سلطنت کے لئے بچوں کے ڈاکٹروں کی ایک خاصی تعداد کی ضرورت ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بچوں کے ڈاکٹروں کی تعلیم کے لئے ملک کی بارہ بڑی بڑی طبی درسگاہوں میں الگ الگ جماعت قایم کی گئی۔ بچوں کا ڈاکٹر بننے کے لئے ہر متعلم کو پانچ سال تک تعلیم لینی پڑتی ہے۔ چنانچہ اس وقت سوویٹ روس میں بارہ ہزار سے زیادہ بچوں کے ڈاکٹر فارغ التحصیل ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور امید ہے کہ ۱۹۴۰ء میں ان کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

پھر کیا تعجب ہے اگر سوویٹ روس کے مداحوں میں رومین رولینڈ، آئن سٹائن، رابندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو جیسی متعدد ہستیاں موجود ہیں۔

مظفر احمد

فرانس کا آوارہ شاعر

فرانسا وِلاں

آوارہ کے لفظ سے فرانس کے کسی ایک شاعر کو اس ملک کے دیگر شعرا سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عموماً فرانس کے شعرا اوباش اور آوارہ مزاج رہے ہیں۔ لیکن اس وقت جس شاعر کا بیان میں کرنے کو ہوں اُسے ایک طرح سے شاعری کا ضحاک کہا جا سکتا ہے۔ آج ولاں کو پندرھویں صدی کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ لیکن مغرب کی تاریخ ادب میں بہت کم نام ایسے ملیں گے جن کے حالات پر اتنے عرصے تک تاریکی کا پردہ پڑا رہا ہو۔ یورپ کی علم پروری اور خصوصاً فرانسیسیوں کی ادب نوازی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات ناممکنات سے معلوم ہوتی ہے کہ فرانسیسی شاعری کے ابوالآبا کے متعلق بہت عرصے تک لوگوں کی سوانحاتی واقفیت محض سرسری ہو۔ لیکن حقیقت یہی تھی۔ ۱۸۷۷ء کے آغاز تک کسی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس شاعر کا اصلی نام کیا ہے اور اس کے ذاتی حالات کے متعلق بھی لوگ صرف وہی باتیں جانتے تھے جو اُس کے اپنے کلام سے معلوم کی جا سکی تھیں اس کے بڑے بڑے مداحوں کو بھی صرف اسی قدر معلوم تھا کہ اسے دوبار نامعلوم جرائم کی بنا پر موت کی سزا ہوئی اور نیز کی عمر تک اس کی ماں زندہ تھی اور اُس کا باپ مر چکا تھا اور اس نے پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اُس کے دوست احباب رذیل ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اُس نے اپنی جوانی کا زمانہ مے خواری اور عیاشی میں ضائع کیا۔ اور اس پست زندگی کو قائم رکھنے کے لئے، جس میں کبھی اندھی ہوس پرستی اور کبھی فاقہ کشی کا سامنا رہتا تھا، وہ بے حد گھناؤنے یا کمینہ افعال کے ارتکاب میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا اور موت کی سزا سے مخلصی حاصل ہونے کا باعث شاہ لوئی یازدہم اور وہ امرا تھے جو اس کی ادبی اور شاعرانہ خصوصیات کے مداح تھے۔ ۱۸۷۷ء میں فرانسیسی محقق آگسٹے لونگنان کی کتاب شائع ہونے سے پیشتر بھی ایک دو باتیں فرانس کے پہلے شاعر کے بارے میں کہی سنی جاتی تھیں۔ لیکن آگسٹے لونگنان کی تحقیقات سے اس شاعر کے طرز زندگی اور عادات واطوار کے متعلق صحیح معلومات عام ہوئیں اور دنیا نے پیرس کے بے باک اور بدقسمت شاعر کی دلکش شخصیت اور اس کی عجیب وغریب جنون انگیز اور وحشیانہ زندگی کے بارے میں حقیقت معلوم کی وہ شاعر جس کا زور دار اور آتشیں کلام پندرھویں صدی کے فرانسیسی ادب کے دھندلکے میں ایک شعلہ گوں سیارے کی مانند نمودار ہوتا ہے۔

کسی طرح کے مبالغے کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۴۳۱ء کا سال فرانس کی قومی زندگی میں ایک انقلابی سال تھا۔ سو سال تک قومی احیاء اور قیام کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد فرانس کے باشندے آخر کار چارلس ہفتم کے سر پر تاج رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کامیابی کا سہرا دنیا کی اُس شریف اور اولوالعزم عورت کے سر تھا جس کا نام جون آف آرک ہے۔ پیرس کو سولہ سال کے بعد اپنے بادشاہ کی حکومت حاصل ہوئی اور اس کے بعد چار یا پانچ سال کے اندر ہی انگریزوں کو فرانس سے مکمل طور پر نکال دیا گیا۔ جون آف آرک نے فرانس کی بکھری ہوئی اور متضاد طاقتوں کو یکجا کر دیا اور لوگوں میں حب الوطنی کی وہ روح پھونک دی جسے قومی زندگی کی ابتدا کہا جاتا ہے۔

جب کسی قوم یا ملک میں نئی زندگی کی تحریک ہوتی ہے تو اس کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک بڑی علامت قومی زبان کی تشکیل بھی ہے۔ از بسکہ قومی احیاء کے لئے قومی زبان لازمی ہے اس لئے قومی احیاء کے دور میں قومی زبان کا تشکیل پانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ پندرھویں صدی کے درمیانی عرصے تک فرانس میں کوئی قومی زبان نہ تھی۔ صد سالہ جنگ کے اختتام کے بعد جوں جوں قومی استحکام عمل میں آیا، قومی زبان بھی ایک مخصوص صورت اختیار کرتی گئی۔

لیکن قومی زبان کی تشکیل میں نثر کی بجائے نظم کا بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے اردو زبان کا ابتدائی ادب بلکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک سرا دبی تخلیق نظم ہی کی صورت میں نمودار ہوتی رہی۔ شعرائے اردو کو بہتر زبان بنانے میں جو کام کیا اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور قومی انحطاط کے بعد سرسید سکول کے نثر نگاروں کی بہ نسبت، سب جانتے ہیں کہ حالی کی مسدس اور چپ کی داد نے عوام کو اردو ادب اور اردو زبان کی قومی اہمیت کی طرف رجوع کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔

پندرھویں صدی کے درمیانی دور سے پہلے فرانسیسی شعرا کے کلام میں قومی زندگی کے احساس کا قریباً فقدان تھا۔ حب الوطنی کے جذبات یقیناً موجود تھے لیکن اُن کا پورا پورا اظہار شاعری میں نادر معدوم کی ذیل میں آتا تھا۔ اس وقت کی شاعری کے موضوع بے حد محدود تھے۔ محبت، جوانمردی، مذہب وغیرہ اور ان جذبات کے اظہار میں بھی اگرچہ بسا اوقات دلکش نغموں کی تخلیق ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اُسے بہ حیثیت مجموعی کوئی قومی رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس ابتدائی شاعری میں مقررہ اصولوں سے پیدا شدہ تصنع اس بات کا احساس دلاتا تھا گویا سفر کی ذہنیت جذبات کی بے ساختگی اور فطری اخلاص اور بے باکی سے یکسر عاری ہے۔ اس شاعری میں ایسی دھندلی صورتیں نگاہوں سے دو چار ہوتی ہیں جن میں زندگی کی تازگی مفقود ہے۔ قوم کے جد بداشو و نما پر دلکش اور شیریں نغمات کسی قسم کا قطعی اثر ہرگز نہیں کر سکتے۔ جب اجتماعی زندگی حیاتِ تازہ کی بھٹی سے نئی روح لے کر منصۂ شہود پر آرہی ہو تو کسی میٹھے راگ میں یہ قدرت نہیں ہو سکتی کہ وہ قومی زبان میں نئی تحریک پیدا کر دے جو اس حیات تازہ کے سیاسی اور سماجی اقدامات کے مطابق ہو۔ قدرت اس کام کے لئے جس فرد کا انتخاب کرتی ہے وہ گنوار، غیر مہذب اور صورت اور تخیل میں عامیانہ ہو تو ہو، لیکن اس کے لئے یہ ایک بات ہی لازمی ہے اور کافی کہ اُس کے ہونٹ سرودِ ابدی کے آتشیں جام کو چھو چکے ہوں اور اُس کی آواز میں ایک نئی دنیا کا لب و لہجہ گونج رہا ہو۔

وِلان بہت حد تک ایسا شاعر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ماحول میں گھرا ہونے کے باعث بہت ہی ذاتی اور کتابہ پسند شاعر بھی تھا۔ اپنے تمام کلام کا بنیادی مواد اُس کی اپنی ذات تھی۔ اس کے کلام کے دو لمبے حصے جن کے نام "چھوٹا عہدنامہ" اور "بڑا عہدنامہ" ہیں تمامتر سوانحاتی ہیں اور اُس کی بدنصیبیوں، مصیبتوں، پستی، عشق و عاشقی، نفرت اور دشمنی بلکہ بعض اوقات اس کے جرائم کے ذکر و بیان سے بھرپور ہیں اور اس کی دوسری مختصر نظموں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان مختصر نغموں کی فضائے بعید بھی اس کی اپنی ہی ہنگامہ خیز زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اور شعرا کی بہ نسبت وِلان کے معاملے میں ضروری ہے کہ اس کے کلام تک پہنچنے سے پہلے ہم اس کے حالات سے آگاہی حاصل کر لیں۔

وِلاں کا اپنا نام فرانسا دی مونٹ کاربیٹے تھا۔ وِلاں کا نام اس نے ایک اور شخص کے نام سے لیا تھا جس کا نام گلوم دی ولان تھا۔ یہ شخص ایک نیک پادری تھا جس نے وِلاں کو اس کے باپ کی موت کے بعد متبنٰے بنا لیا تھا۔ اس وقت شاعر کی عمر ابھی نو ہی سال کی تھی۔ وِلاں پر پادری کی مہر و شفقت بے اندازہ تھی۔ جوانی کے بعد شاعر نے جب بدکاری اور مجرمانہ طرزِ زندگی کو اپنا خاصہ بنا لیا تب بھی وہ پادری اُس سے ہمیشہ نیک سلوک کرتا رہا اور اس کی اس خیر اندیشی میں ذرّہ بھر فرق نہ آیا اور اس مہربانی کے لئے شاعر وِلاں بھی عمر بھر اپنے ہمدرد اور مہربان پادری کا ممنون رہا۔ لیکن اس نے اظہار تشکر کے طور پر بھی کبھی اپنے طرزِ عمل کو سدھارنے کی کوشش نہ کی۔

۱۴۴۹ء میں وِلان نے پیرس کے دارالعلوم سے بی اے اور ۱۴۵۲ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا لیکن ان علمی سندوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ پندرھویں صدی کے فرانس میں یہ ڈگریاں تہذیب و تمدن اور علم و فن کے وہ اثرات پیدا کرنے کے ناقابل تھیں جو ان کے سننے سے آج کسی سامع پر ظاہر ہوتے ہیں اور اس تعلیم کے بہت ہی کم اثرات وِلان کی ذہنیت پر باقی رہے۔ اُس کی ایک نظم "نازنینوں کا نوحہ" سے اس پس ماندہ علم کی ایک جھلک ظاہر ہوتی ہے (یہ نظم اس مضمون کے آخر میں دیکھئے)

پیرس کے دارالعلوم میں علم حاصل کرنے کے دوران میں ہی بدقسمتی سے وِلان ایک اور علم کی طرف بھی رجوع ہو گیا۔ جس کا عملی پہلو اس کتابی علم سے کہیں زیادہ خطرناک اور مضر اخلاق تھا اور اس خطرناک علم کو حاصل کرنے کا وسیلہ بُری صحبت تھا۔ اس کے دو طالب علم دوست آگے چل کر پھانسی کی سزا کو پہنچے۔ صنف نازک اور مے خانوں کی طرف توجہ کرنے میں ہی اس کا بہت سا وقت صرف ہونے لگا۔ اس کے کلام ہی

سے پیرس کے میخانوں اور وہاں پھرنے والیوں سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ولاں اچھی، خوش حال اور باعزت زندگی بسر کرنے کا بے حد شایق تھا لیکن ایسا اس کے مقدّر میں نہیں تھا۔ جوانی کے افعال اُسے ہر دم اس کی دل پسند زندگی سے دور اور باشانہ جھمیلوں اور ہاؤ ہو کے ہنگاموں میں الجھاتے رہے۔ لیکن سیہ کاری اور ہر طرح کے عیوب کے طوفان میں بھی ایک دو کونے اس کے دل کے ایسے رہ گئے جن کی روشنی اس سے شیریں گیت کہلواتی رہی۔ میخانوں کی ہنگامی زندگی کے باوجود اُسے عمر بھر اپنی ماں سے بے حد محبت رہی اور یہی ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بسا اوقات شعرا کے باغِ حیات میں ایک ایسی خوشبو پھیلتی دکھائی دیتی ہے جو نظامِ عالم کو مہکانے کا باعث بنتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بہت سے ایسے طلبا ولاں کے دوست بنے جو اپنی آیندہ زندگی میں چل کر اچھے عہدوں پر فائز ہوئے اور انہی کی بدولت اکثر ولاں حکومت کی سرزنش سے بچنے میں کامیاب ہوتا رہا۔

چوبیس سال کی عمر تک ولاں کی زندگی میں کوئی ایسی خاص بات واقع نہیں ہوئی جس کی بنا پر اس کی سیرت اور چلن پر حرف زنی کی جا سکے لیکن جوانی کے زمانے کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ اُس نے اپنے عہدِ شباب میں اکثر لوگوں سے کہیں زیادہ عیش کئے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے عیاشی اور مے خواری کی زندگی گذاری ہے اور یہیں یہ بات بہت جلد قرینِ قیاس معلوم ہو سکتی ہے۔ جب ہم اس کے کلام میں میخانوں، بدمعاشوں، اور بدکار عورتوں کی ایک ختم نہ ہونے والی داستان پڑھتے ہیں۔ اپنی افتادِ طبع کے بارے میں بھی وہ ایک جگہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کی سیرت میں اُن عیبوں کا کثرت سے امتزاج ہے جو انسان کو قعرِ مذلت کی طرف نہایت آسانی سے لے جا سکتے ہیں یعنی وارفتہ مزاجی، چھچھورا پن۔ مے خواری، فضول خرچی اور جس شخص میں اتنے "خصائص حسنہ" کا اجتماع ہو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں مستقبل کے نتائج کا خیال تک نہ آنے دے گا۔ رفتہ رفتہ ولاں کا بُرا چلن پیرس میں اس قدر زبان زدِ عام ہو گیا کہ لوگ "ولان" سے "ولانری" حاصل مصدر بنا کر روزمرہ کی زبان میں استعمال کرنے لگے جیسے اردو میں ٹھگ سے ٹھگی اور اس لفظ کا استعمال اُس وقت تک جاری رہا جب تک ولاں کی شہرت شاعر اور عیب کار کی حیثیت سے قایم رہی۔

اسی زمانے میں ولاں کی زندگی میں ایک ایسی ہستی نمودار ہوئی۔ جس کا اثر ولاں کے ذہن سے تمام عمر نہ گیا اور جو ولاں کے اپنے کلام میں بار بار کہنے کے مطابق اس کی گمراہی اور بے وقت انجام کا باعث ہوئی۔ یہ شخصیت ایک نوجوان عورت تھی جس کا نام کیتھرین واسیلیز تھا۔ ولاں کے تمام کلام میں ایک پاکباز اور سچی محبت کی متواتر یاد موجود ہے اور اس یاد کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہر جگہ اپنی محبوبہ کی بے اعتنائی۔ بے وفائی اور ظلم کا شکوہ کئے جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ولاں کی محبوبہ کی بے اعتنائی کی وجہ ایک اور شخص ہو جس کی موجودگی میں ولاں ایک بار اپنے پٹنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کیتھرین نے کبھی بھی ولاں پر نظرِ التفات نہیں کی تھی۔ وہ خود مانتا ہے کہ شروع میں وہ اُسے اپنے جال میں پھنسانے کے بعد مہربان بھی رہی۔ اس کا اظہار ایک اور جگہ بھی ہے جہاں ولاں اپنی محبوبہ پر زرپرستی کا الزام لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے زر کے بدلے ولاں کو اپنی عنایات سے سرفراز کیا اور جب زر نہ رہا تو اپنی توجہات کا مرکز ایک بدصورت بوڑھے لیکن امیر آدمی کو بنا لیا۔ لیکن عین ممکن ہے کہ ایسے اہم الزامات اس نے برانگیختگی اور حسد کے اس ہنگامی دور سے میں اختراع کئے ہوں جبر کا شکار نگاہ کرم نہ ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی ہر ایک عاشق ہو جایا کرتا ہے۔ ذمہ دار شہادت اس بات کی متقضی ہے کہ کیتھرین نے کبھی کوئی اہم بدسلوکی ولاں سے نہیں کی۔ بہر حال اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ ولاں کو کیتھرین سے دلی محبت تھی لیکن یہ پرخلوص جذبہ بھی آوارہ مزاج شاعر کو راہِ راست پر چلانے میں کوئی مدد نہ دے سکا اور اس پاکباز محبت کے باوجود شبانہ روز میخانوں کے عشقی ہنگاموں میں پوری طرح حصہ لیتا رہا اور یوں اُس کے کلام میں بے شمار عورتوں کے نام رونق افروز ہوتے رہے اور اُس کے ماحول کی ناگوار اور رسوا و بدنام ہم آہنگی کو مکمل بنانے کے لئے کبھی بھی نسوانی اجزا کی کمی نہ ہو کیتھرین کے واقعے سے ولاں کی ذہنیت ایک عجیب قسم کا اجتماع ضدین معلوم ہوتی ہے اور یہی دورنگی اس کے کلام میں بھی ہمیشہ موجود رہی۔ بلکہ اُس کی زندگی کے واقعات کا گوناگوں انداز اس کے کلام کو بھی بوقلموں بنا دیتا ہے۔ لیکن اس رنگا رنگ کے ہنگامے میں ہم ایک بات سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ یہ کہ جو شخص ایک عورت سے اتنی سچائی اور پاکیزگی سے محبت کرتا ہو وہ کیونکر ذلت کی اس پستی میں رہ سکتا ہے جو ولاں کا شیوہ تھی۔ مگر اب جدید نفسیات کی علمی روشنی کا زمانہ آ چکا ہے اور ہم

چکے ہیں کہ انسان کے بیرونی چلن اور رویے ہی سے اس کی سیرت کی گہرائی تک رسائی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ذہنی فعل پر ان تمام الجھے ہوئے مسائل کے حل کا دار و مدار ہے جنہیں ہم دور سے دیکھ کر سلجھانے کے ناقابل سمجھ بیٹھے ہیں۔

جس وقت سے ولاں نے جرائم کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا۔ چند باتیں اس کی زندگی کے لئے مخصوص ہو گئیں۔ عیاشی، میخواری، چوروں، رہزنوں اور آوارہ عورتوں کی صحبت، جرائم، فراریاں، قید اور سزائیں اور ان مختلف سزاؤں کے سلسلے میں دو بار اسے موت کی سزا ملی۔ اگرچہ اس کے مداحوں اور بڑے طبقے کے بہی خواہوں نے اس کی سزاؤں کو کم کروا دیا اس قسم کی ہنگامی زندگی میں مفلسی ایک لازمی چیز تھی اور اس غریبی کے مصائب ہی نے اس کے کلام میں وہ تلخ اور پُرخلوص اور بے باک لہجہ پیدا کیا جو اس کی شاعرانہ تخلیق کو اپنے ہمعصروں کی پُرتکلف اور مصنوعی شاعری سے ممتاز کرتا ہے۔ اُس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گویا ایک کمزور فطرت انسان ہے جو گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر درد کی شدت سے چلاتا ہے لیکن اس کی توبہ ہر بار ٹوٹتی ہے۔ اُس کے گناہوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں اس کی روح کے زخم پہلے سے زیادہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ متضاد خیالات ولاں کے کلام میں عورتوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں وہ ماں کا متوالا ہے، کہیں وہ عورت اور مرد کے صحیح تعلق کا معترف ہے اور کہیں نفس پرستی سے عاجز ہو کر عورت کو ایک حربۂ عیش کے سوا اور کچھ بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

تیس سال کی عمر سے پہلے ہی اُسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وقت اب پورا ہو چکا ہے۔ عیاشی، قید اور مشقت اور فاقوں کی غضبناک زندگی اپنا کام کئے بغیر نہ رہی۔ قدرتی نتائج ظاہر ہوئے، جوانی اور کوتاہ بینی کے امراض کے علاوہ اب اُسے سِل کا سامنا ہوا اور اس کے پھیپھڑے گلنا شروع ہو گئے۔ وہ اپنے اس مرض کا ذمہ دار اولینز کے پادری کو ٹھہراتا ہے کیونکہ اُس نے اُسے متواتر ٹھنڈا پانی پینے پر مجبور رکھا تھا۔ ان تمام حالات سے غمگین، بے دل اور ناامید ہو کر، اور قید اور موسم کی سختیوں سے اپنے خون کی سرخی کھو کر، خالی جیب اور خالی پیٹ کے ساتھ، ضعف سے بات کرنے کے ناقابل، آخر کار اس کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے اپنی گذشتہ زندگی کی مضر حماقتوں کی اہمیت کو جانا اور ناپائدار عشرتوں سے بدظن ہوا۔ اُن عشرتوں سے جن کے دوبارہ حاصل ہونے کی نہ امید تھی نہ اہلیت۔ مصیبت اور اذیت سے اس کی عقلی قوت تیز تر ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اُن پر پشیمانی ظاہر کی۔ دشمنوں کو معاف کیا اور اطمینان قلبی کے لئے مذہب اور ماں کی برکت والی محبت کی طرف رجوع ہوا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینے لگا کہ ہر چیز فانی ہے اور بُری زندگی کے بعد بھی ایک بہتری ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اچھی موت مرے۔

ولاں کا کلام مختصر نظموں۔ گیتوں اور چھوٹی اور بڑی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ہیئت کے لحاظ سے وہ کلام پندرھویں صدی کے عام فرانسیسی شعراء کے مطابق ہے لیکن روح میں بے حد مختلف۔ اُسے شاعرانہ اصولوں اور مقررہ قوانین کی مطلق پروا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دو لمبی نظمیں "چھوٹا اور بڑا عہد نامہ" عجب بے ڈھب واقع ہوئی ہیں جن میں جابجا غیر متعلق مواد داخل ہے۔ لیکن اس سے اس کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی داغ نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اپنے زمانے کے دوسرے شعراء کی طرح محض ایک نظم نگار ہی نہ تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے دوسرے شعراء کی طرح سرکار دربار کی منفعت بخش فضا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اس کی زندگی تلخ، آزاد اور بے روک تھی۔ ولاں کی نظموں میں زیادہ تر بدمعاشوں کی قابلِ رحم، ہولناک اور ظلم سے بھرپور دنیا کا ایک گہرا نقشہ موجود ہے۔ گویا وہ نظمیں اس کی روح کی پریشان حقیقتوں کا سچا مرقع ہیں۔ لیکن یہی سچا مرقع اکثر مقامات پر بے حد پُرخلوص اور اثرانگیز خصائص لئے ہوئے ہے۔ ولاں کی شاعری میں کہیں عیش و عشرت اور زندہ دلی کی افراط ہے اور کہیں موت و حیات اور عزت کی کشمکشوں کی بہتات۔ فرانسیسی شاعری میں ولاں پہلا شاعر ہے جس کے کلام میں ایک روحِ منفرد کا بے باک اظہار ہے۔

ولاں کی تمام زندگی اور اس کے اپنے پیش کردہ نقشے کو دیکھتے ہوئے جسے وہ بے حد اکھڑ اور حقیقت پرستانہ انداز میں پیش کرتا ہے ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ مختلف صورتِ حالات میں اس کی زندگی یقیناً مختلف اور بہتر ہوتی۔ اگر اُسے محبت میں کامیابی ہوتی اور اگر وہ اُس بلند معیارِ حیات کی توقع کر سکتا جس کا ذکر وہ بے حد حساس انداز میں کرتا ہے، تو ممکن تھا کہ اپنے وقت کی تاریخ میں اور ادب میں زیادہ اچھی اور باعزت جگہ حاصل کرتا اور بے پروائی اور خواہشات کی اندھا

دھند تکمیل اور ناکام محبت کا جنون بھی ویلاں اُسے سماج کے لئے محض ایک عضوِ معطّل ہی نہ بنا دیتا۔ لیکن ہم یہ خیال ہی کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اثرات جو اس کی زندگی میں جاری وساری رہے انہوں نے اس کے جوہرِ خداداد اور ذہانت کی نشو ونما اور پختگی میں کوئی مدد نہ کی اور اُسے اپنے رنگ کا ممتاز شاعر بنانے میں کوتاہی کی۔ کیونکہ آیندہ نسلوں کو کسی فن کار کی ذاتی اور اخلاقی حیثیت سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا اس کی تخلیق سے۔ انیسویں صدی کے سب سے بڑے فرانسیسی نقاد تھیو فائل گاٹیے کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ "اگر یوں ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم ایک ایماندار انسان کو حاصل کر لیتے لیکن ایک شاعر ہمارے ہاتھوں سے چلا جاتا اور اچھے شاعر اچھے آدمیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نایاب ہیں۔ اگر اچھے آدمی بھی کوئی عام نہیں!"

اب وِلاں کے کلام کو دیکھئے لیکن ایک دو باتیں باقی ہیں۔

میں نے صرف مختصر نظموں کو ہی لیا ہے اور اس میں بھی روحِ سخن کو قایم رکھتے ہوئے۔ ہندوستانی محاورے اور فضا کا خیال رکھا ہے تاکہ فرانسیسی اور انگریزی میں جو لطف وہاں کے رہنے والے اٹھا سکتے ہیں وہی لطف اردو والوں کو بھی آ سکے۔ خصوصاً آخری نظم "نازنینوں کا نوحہ" کا ولاں سے اتنا ہی تعلق رہ گیا ہے کہ اُس کی صورت اور خیال ولاں سے ہے۔ باقی نظم میری اپنی ہے لیکن اس نظم کا پابند ترجمہ کرنے میں صرف ایک بے رنگ انشا کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ "الوداع" اور "محبوبہ کی موت" ولاں اور کیتھرین سے متعلق ہیں۔ "موت" سے ولاں کی پشیمانی کے بعد کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ "جو ہوتا میں راجہ" محض ایک دلکش نغمہ ہے اور "زبلا" ولاں کی ہنگامہ پرور میخانوں کی زندگی اور عشرتوں کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس میں بھی ہلکا سا ناصحانہ رنگ اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ عالم دوبارہ نیست سے عیش کوشی کی ترغیب دینا میرے خیال میں محض حسنِ تعلیل ہے۔

محبوبہ کی موت

موت سے، موت ہی سے شکوہ شکایت ہے مجھے
موت ہی دہر میں اک وجہِ مصیبت ہے مجھے
موت نے چھین لیا مجھ سے مری راحت کو،
موت سے ہو نہ سکا دیکھے مری راحت کو!

دشمنی اب تو رہے گی مرے دل میں تیری،
جب تلک جانِ جہاں مل نہ سکے گی میری!
موت ہی میری طریقہ ہے، ملا دے ایسے!
دشمنی اپنی مرے دل سے مٹا دے ایسے!

جب سے سینے سے مرے تو نے جدا اُس کو کیا،
مجھ میں تو موت ہی نہیں باقی، تو جینا کیسا!
دو تھے ہم، دو تھے مگر دل تو ہمارا اک تھا،
سانس بھی ایک تھا، جینے کا سہارا اک تھا!
اور جو وہ مرگئی، اب مجھ کو بھی مرنا ہے ضرور!
مجھ کو بھی موت کے رستے سے گذرنا ہے ضرور!
ورنہ جینا میرا جینا نہیں، مرنا ہوگا!
زیست بھی موت کے صحرا سے گذرنا ہوگا!

الوداع

الوداع! اشک سے لبریز ہیں آنکھیں میری،
الوداع! اب نہ نظر آئے گی صورت تیری!
الوداع! مہر و محبت! تجھے اب سے رُخصت!
الوداع! قلبِ حزیں، درد و کرب سے رُخصت!
الوداع، جانِ جہاں! روحِ حسیں! اب رُخصت!
تیرگی آئی ہے اے ماہ جبیں! اب رُخصت!
اب تو تقدیر میں ہی لکھی ہے فرقت تیری!
الوداع! اشک سے لبریز ہیں آنکھیں میری!

جو ہوتا میں راجہ

جو ہوتا میں راجہ، مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ!
کئی ملک قبضے میں کرتا میں،
پھر تیرے قدموں پہ جھکتے،

ہر اک ملک کے رہنے والے!
وہ کھاتے تری مست آنکھوں کی قسمیں،
ترے کالے بالوں کی، ہونٹوں کی قسمیں،
ترے نرم ہونٹوں کی، بالوں کی قسمیں
وہ کھاتے!
ہمیشہ وفادار تیرے وہ رہتے،
ہمیشہ وفادار میں تیرا رہتا،
ہمیشہ وفادار تو میری رہتی!

جو ہوتا میں راجہ
تو لاتا میں ہیرے،
میں لے آتا موتی،
کئی لعل، نیلم تجھے لاکے دیتا،
یہ دنیا انگوٹھی کا ہوتی نگینہ!
ستاروں کی مالا گلے میں لٹکتی!
یہ چاند اور سورج بھی ہوتے،
ترے نرم اور گرم سے جسم کے بے بہا اور انمول گہنے!
تجھے لاکے یہ کچھ میں دیتا مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ!

مگر میں بھلا دوں یہ وحشی سے سپنے!
جنوں خیز الفاظ دل میں نہ آئیں،
اور اونچے خیال آسماں سے نہ لائیں!
زمیں کے ہیں تو اور میں رہنے والے!
کہیں دور بن میں،
برندا کے بن میں،
مجھے دے رہی ہے سنائی
کنھیا کی بنسی!
یہ سر ہیں کہ جادو
جنہیں سن رہی ہے-
کوئی سانولی، مست، رس والی گوپی،
کنھیا کی رادھا کہ گوکل کی رانی!

یہ سُر ہیں محبت کی تانیں کہ جن سے
پریتم کو سسندر سے سندر بنادیں-
پریمی کی آنکھیں!
یہ سُر ہیں محبت کے جادو کہ جن سے-
پریتم کو اپنا بنالیں
پریمی کے جذبے!

تجھے بھی میں اک گیت ہی لاکے دیتا مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ میری جاں!
جو ہوتا میں راجہ!

موت

گدا کی موت ہو یا شاہ کی، جس کی بھی موت آئے،
یقینی بات ہے اتنی کہ موت آئے تو دکھ لائے!
ہر اک دکھ سے ہے بڑھ کر موت کا لمحہ اذیت میں،
نہیں ہے موت کو تفریق غربت اور امارت میں!
جب آئے سانس کی تنگی، ہوا معدوم ہو جائے،
نظامِ جسم میں ہلچل سی اک معلوم ہو جائے،
پسینہ چھوٹے پیشانی پہ، ہر رگ میں تشنج ہو،
بہاؤ خون کا رک جائے، اک الجھن پڑے دل کو!
خدا محفوظ رکھے سب کو اس دن کی اذیت سے،
مداوا کس کے بس میں مخلصی کا اس مصیبت سے!
کسی بھی شخص کو مرنے کے دکھ سے کب رہائی ہے؟
مرا وہ جس کی آئی، اور مرے گا جس کی آئی ہے!
نہیں ماں باپ کے بس میں چھڑانا اس مصیبت سے
نفس جو آخری ہوگا ملے گا وہ راحت سے!
ہر اک انسان کے دل میں ہے لرزش موت کے ڈر سے،
جب آیا موت کا لمحہ گئے ہوش و حواس گھر سے!

عجب اک بے حسی کا کیف چھایا ذہن پر یکسر !
اور اک زردی نے اپنا گھر بنایا آکے چہرے پر!
رگیں سب تن گئیں اور سانس نے بھی ہار ہی مانی ،
ہوا سب گوشت ڈھیلا جسم کا، ہر چیز ہے فانی !
گلوئے نرم بھی لا اینٹھ کر تندی سے شدت سے !
پڑا اعصاب پر اک زور، اس کاری اذیت سے !
وہ ہر اک جسم حباب زینت آغوش عاشق ہے ،
جو اس دم حسن وخوبی میں مسلم ہے کہ فائق ہے!
وہی ہر جسم جس کو نرم اور شیریں سمجھتے ہیں ،
وہی ہر جسم جس پر سینکڑوں افراد مرتے ہیں !
اُسے بھی آخری لمحے میں دکھ کا سامنا ہوگا !
سفر پر آسماں کے ساتھ سب کے اک خدا ہوگا !

بُلاوا

سندر ناری! گوری کاری! ہلکی بھاری! سب آؤ تم!
دبلی پتلی، چھوٹی موٹی! کچھ مجھ سے بھی سن جاؤ تم!
لمبی لچھوٹی سی گردن، ابھرا سینہ، موہن جوبن ،
یاں آؤ تم، ہاں لاؤ تم، یاں آؤ مجھے دکھلاؤ تم!
یہ نین نشیلے مدماتے، یہ گال رسیلے للچاتے ،
یہ بال رنگیلے لہراتے ہاں، ان میں مجھ کو پھنساؤ تم!
یہ روپ جوانی دو دن کی، پھر قدر نہیں ہوگی ان کی،
اب دل کا سودا کرلو تم، چاہو اور رچا ہی جاؤ تم!
جب روپ نہیں تو پریت نہیں، جب پریت نہیں جینا کیسا؟
اس جوبن سے کچھ کام بھی لو، برتو بھی اور برتاؤ تم!
کیا دیر ہے اب؟ کیا سوچ ہے اب؟ یہ وقت نہ پھر آئے گا
اب وقت تمہارے ہاتھ میں ہے، اس میں چین اڑاؤ تم!

اک دن دھولے ہو جائیں گے جو بال تمہارے کالے ہیں!
نینوں کا نشہ ہلکا ہوگا جوبن سے جو متوالے ہیں !
سب جسم میں جھریاں دیکھو گی اور خود سے نفرت ہوگی تمہیں
یہ باہیں ایسی سوکھیں گی جیسے کہ سوکھے ڈالے ہیں!
آنکھوں کا رس بہہ جائے گا یہ گال تمہارے پچکیں گے،
کانوں کو سنائی کیا دے گا جن میں سونے کے بالے ہیں!
یہ موہن جوبن ڈھلکے گا، یہ سیدھا قد جھک جائے گا ،
یہ روپ جوانی فانی ہے، یہ دھوکے مٹنے والے ہیں!
کیا سوچ ہے؟ آؤ، عیش کرو، اک دن یہ منہ سے نکلے گا،
"جو ساون تھا وہ پت جھڑ ہے، جو نغمے تھے وہ نالے ہیں!"

نازنینوں کا نوحہ

کہاں ہیں کنھیا کی اب گوپیاں؟
برندا کے بن کی ہری ڈالیاں
ہواؤں سے ہل ہل کے ہیں نوحہ خواں!
یہی کر رہی ہیں وہ ہر دم فغاں
کہاں وہ زمانے، کہاں اب وہ دور!
ہے بن کا سماں اور اب رنگ اور!
کہاں ہے مراری کی رادھا، کہاں؟
کہاں ہے وہ جنگل کی شاما، کہاں؟
کہاں رام چندر کی سیتا کہاں؟
وہ میواڑ بستی کی میرا کہاں؟
وہ جلوے نگاہوں سے اب کھو گئے!
کہیں دور جا کر سبھی سو گئے!
کہاں ہیں وہ اندر کی پریاں کہاں؟
کہ جن سے بنا راگ سارا جہاں؛
جوانی سے اُن کی جہاں تھا جواں،
جوانی گئی، اب جوانی کہاں!
ہیں تاریکیاں ذہن پر چھا گئی!
اداسی سے ہے روح گھبرا گئی!
کہاں ہے وہ اوما؟ کہاں ہے ستی!
کہاں بھگوتی اور پاروتی؟
کہاں ہے بہادر کی روپامتی،

ہوئی عشق کی آگ میں جو ستی!

نہیں، آہ! دنیا میں اب رانیاں!
یہ دنیا ہے رہنے کی بستی کہاں؟

سوئمبر کی سنجوگتا ہے کہاں؟
بتائے کوئی آج اس کا نشاں!
بندا کے بن میں جو تھیں نغمہ خواں،
کہاں ہیں کنھیا کی سب گوپیاں؟

ہوا عشق کا نام بیتی ہی بات!
عدم ہو گئی زندگی کی وہ رات!

پرانا عروج شہانہ گیا،
جوانی کا رنگیں فسانہ گیا!
وہ اندازِ روز و شبانہ گیا!
زمانہ گیا، وہ زمانہ گیا!

رہ گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا!
ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

میراجی

رباعی

مغرب میں تم اے شمس و قمر چھپ جاؤ
کچھ دیر رواروی سے فرصت پاؤ
ہیں ایک نئے مہر کے آثار طلوع
اے اہل زمیں سب ضیا پر آؤ

ناجو رامری

حسیات

یوسف کی طلب میں ہے زلیخا کئی دن سے
وامق کی عناں گیر ہے عذرا کئی دن سے

پہلو میں ہے وہ جان تمنا کئی دن سے
مسکن ہے مرا حاصلِ دنیا کئی دن سے

بیمارِ غمِ عشق ہے اچھا کئی دن سے
اُس آنکھ میں ہے شانِ مسیحا کئی دن سے

ہے ابرِ کرم نخلِ تمنا پہ نچھاور
بے تاب ہے الطاف کا دریا کئی دن سے

ہے شام و سحر مطلعِ انوار مرا گھر
دیکھا نہیں روئے شبِ یلدا کئی دن سے

کس ملک کی شاہی مجھے اللہ نے دے دی
بے چین سے ہیں قیصر و کسریٰ کئی دن سے

وہ مست نگاہیں مجھے کیا کہتی ہیں پیہم
ہے پیشِ نظر کوثر و طوبےٰ کئی دن سے

ہے رشکِ چمن لالہ و گل سے تری خلوت
ویراں ہے چمن صورتِ صحرا کئی دن سے

باتیں ہیں کہ ہیں زمزم و تسنیم کی موجیں
مخمور ہوں بے ساغر و صہبا کئی دن سے

راتیں ہیں کہ ہیں جنت و فردوس کے منظر
ہے تجھ پہ مجھے حور کا دھوکا کئی دن سے

میں ہوں ترا جلوہ ہے شبستانِ طرب ہے
آشوبِ جہاں کی نہیں پروا کئی دن سے

گھر گھر میں مسرت کی ضیا پھیل گئی ہے
ہے نورفشاں جلوۂ زیبا کئی دن سے

ہے اب تو نظیرؔ ایک نئے رنگ پہ شیدا
اربابِ سخن میں ہے یہ چرچا کئی دن سے

اصغر حسین خاں نظیرؔ

قربانی

ایک جانب پہاڑ تھا اور دوسری جانب کھڈ۔ تنگ اور خمدار سڑک پر ہماری موٹر دھیرے دھیرے چلی جا رہی تھی سرسبز پہاڑوں میں سے شفاف پانی کے چشمے نکل کر سڑک پر سے بہتے ہوئے کھڈ کی گہرائی میں گر کر غائب ہو جاتے میرے ساتھ کی نشست پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وضع قطع سے وہ کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ مگر ایک طالب علم کی سی شوخی اور بے تکلفی اس میں نہ تھی۔ وہ نہایت ہی سنجیدہ اور محتاط تھا اور شاید اس سنجیدگی اور خاموشی میں ہی کوئی بات تھی جو مجھے اس سے تعارف پیدا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کئی دفعہ میں نے بات چیت شروع کرنے کی کوشش بھی کی مگر اُس کا جواب اس قدر مختصر اور مکمل ہوتا کہ بہت کوشش کرنے پر بھی سلسلۂ کلام جاری نہ رکھ سکتا۔ متحرک موٹر میں سے وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے باہر دیکھتا مگر اتنی کھوئی کھوئی نظروں سے گویا اُس پر کیف نظارے سے بھی اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور اُس کے خیالات کا موضوع ان تمام دلچسپیوں سے بالاتر تھا کبھی کبھی اُس کا چہرہ نہایت غمگین ہو جاتا اور وہ اپنی نظریں باہر سے ہٹا کر اپنے قدموں پر جما دیتا اور اپنا سر نشست کی پشت پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس طرح بند کر لیتا گویا اُس کا تھکا ہوا دماغ اب سوچنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اُس کے مایوسانہ طرزِ گفتگو نے میری دلچسپی کو ہمدردی میں تبدیل کر دیا اور اس کا شریکِ غم بننے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ سری نگر پہنچنے تک مجھے اُس کی نسبت کچھ واقفیت حاصل ہو گئی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے اس کا نام بھی دریافت کر لیا۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی پہلگام ہی جا رہا ہے۔ رات ہم نے سری نگر میں ہی بسر کی اور دوسرے روز بہت سویرے روانہ ہو کر ہم لوگ دوپہر سے پہلے پہلگام پہنچ گئے۔

ایک چھوٹی سی سبز پہاڑی پر دو خیمے لگوائے گئے۔ ایک میرا اور دوسرا ہریش کا۔ دن کا زیادہ حصہ یا ہریش میرے تنبو میں رہتا یا میں ہریش کے تنبو میں یا پھر تمام دن ہم دونوں گھومتے ہی رہتے۔ جب چلتے چلتے بالکل تھک جاتے تو کسی چشمے کے کنارے لیٹ کر اس طرح باتیں کرنے لگتے گویا اُس ہیبت تک پھیلے ہوئے جنگل کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

میں حیران تھا کہ اتنے قلیل عرصے میں ہم دونوں ایسے دوست بن گئے شاید قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کی رفاقت کے لئے چن لیا تھا۔

ہمارے خیموں کے نزدیک ہی ایک سرد اور شفاف پانی کا چشمہ بہتا تھا۔ اُس کا تیز رفتار پانی پتھروں سے ٹکراتا ہوا گذرتا تو اس کی آواز اس وادی کے ہر حصے میں سنائی دیتی۔

روز شام کو میں اور ہریش اُس کے کنارے بیٹھا کرتے۔ اس بہتے ہوئے پانی کے شور میں ہریش سے باتیں کرنے میں مجھے جو لطف حاصل ہوتا تھا۔ وہ پھر کبھی میسر نہ ہو سکا۔ گو یہ لطف چند روزہ تھا مگر اس کی یاد کے نقوش میرے دل پر اب تک ثبت ہیں اور شاید ہمیشہ ثبت رہیں گے۔

پہلگام میں ہماری وہ ساتویں شام تھی۔ چشمے کے کنارے خاموش بیٹھے میں اور ہریش اُس کی قدرتی موسیقی کو سمجھنے کی بے سود کوشش کر رہے تھے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور جسم میں کپکپاہٹ پیدا کرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

"گوپی" ہریش نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے مدت سے تمنا تھی کہ زندگی میں ایک ایسا دوست پا سکوں جو میرے ہر غم میں شریک ہو۔ ہر بات میں راز دار ہو جس سے میں زندگی کی اہم ترین مشکلات کا حل دریافت کر سکوں . . . !"

کنارے سے ایک کنکر اٹھاتے ہوئے میں نے ہریش کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی نظروں سے پانی پر بہتی ہوئی ایک لکڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے چہرے کی غیر معمولی افسردگی نے سات روز پہلے کے واقعات میری یاد میں اس طرح تازہ کر دیئے گویا وہ ابھی ظہور میں آئے تھے ہاتھ کا کنکر ہوا میں اچھالتے ہوئے میں نے کہا "ہریش، آج پھر تم اتنے غمگین کیوں ہو۔!"

بہت دیر تک ہریش خاموش بیٹھا زمین کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیمے مگر فیصلہ کن لہجے میں بولا "میں پرسوں واپس جا رہا ہوں"۔

اس کے الفاظ صاف سن کر بھی میں ان پر اعتبار نہ کرسکا۔ بے معنی نگاہوں سے میں اس طرح ہریش کی طرف دیکھنے لگا جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہ تھا ہریش کو خاموش دیکھ کر آخر میں نے کہا "تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو ہریش!" "میں نے کبھی تم سے مذاق کیا ہے۔ گوپی" اور پھر ایک مختصر سے توقف کے بعد وہ بولا "گھر سے تار آیا ہے ——"

میرے اصرار پر ہریش نے وہ تار مجھے دکھایا۔ تار ہریش کے والد کا تھا لکھا تھا "بملا اور اس کی والدہ بدھ کو پہنچ رہی ہیں"۔

تار کی اس سطر کو میں کئی بار پڑھ گیا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ ہریش مجھے بتا چکا تھا کہ اس کی والدہ گذر چکی ہیں اور اس کے کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہیں۔ پھر یہ بملا کی والدہ اور بملا کون ہیں اور ان کے آنے سے ہریش کے واپس جانے کا کیا تعلق ہے! میری دلچسپی نے بیتابی کی صورت اختیار کرلی کسی قدر رکتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ بملا کی والدہ اور بملا کون ہیں۔ ہریش!"

اپنی نظریں میرے چہرے پر جما کر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہارے ہمسایہ!"

"لیکن ... لیکن ... ان کا ذکر تو ... شاید تم نے مجھ سے پہلے کبھی نہیں کیا .... کیوں!"

کنارے سے پتھر اٹھا کر پانی میں پھینکتے ہوئے ہریش نے جواب دیا "ہاں"

اور بھی حیران ہو کر میں نے کہا۔ "مگر تمہارے واپس جانے کا ذکر تو اس میں کہیں بھی نہیں ہے۔ ہریش!"

میری بات کا جواب دیئے بغیر ہریش اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا گلوبند گلے میں لپیٹنے لگا۔

"کیوں اٹھ کھڑے کیوں ہوگئے" میں نے کہا "کیا میری بات کا جواب نہیں دوگے؟"

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ مگر صرف ایک لمحہ کے لئے اور پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچتا ہوا بولا۔ "اٹھو اب واپس چلیں۔ کافی سردی ہوگئی ہے"۔

کچھ کہے بغیر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چشمے کے کنارے کنارے ہم دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ کچھ دور چل کر میں نے کہا۔ "دنیا میں انسان ہر کسی کا اعتبار کیسے کرسکتا ہے۔ ہر راہ چلتے سے کیوں کر اپنے دل کا حال کہہ کر ہمدردی کی امید کی جاسکتی ہے"۔ میرے لہجے میں کسی قدر تلخی آگئی تھی۔ ہریش نے نگاہ اٹھا کر تعجب سے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا میں کہتا گیا۔ "اور اس میں غلطی دنیا کی ہے کہ وہ امید کرتی ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے۔ چاہے وہ اعتبار کے قابل ہو یا ... "

ہریش ٹھہر گیا۔ اپنے کانپتے ہوئے بازو میرے شانوں پر رکھ کر اس نے کہا۔ "تیری خاموشی کا تم غلط مطلب سمجھے گوپی۔ شاید تم بھول گئے کہ تم میرے دوست ہو۔ ایک ایسے شخص کے دوست جس نے آج تک کسی کو دوست نہیں کہا اور ایک ایسے دوست جیسا مجھے شاید عمر بھر نصیب نہیں ہوگا"۔

مسرت اور محبت کے ملے جلے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے!

چند لمحوں کے لئے ہم دونوں خاموش رہے۔ نزدیک ہی بہتے ہوئے پانی کی آواز کے سوا فضا بالکل خاموش تھی۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہوچکا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں پر چیل کے بلند درخت سہمے ہوئے سے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ دور دور تک لگے ہوئے خیموں کے مدھم چراغ کسی دل شکستہ کی آخری امید کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بالکل چھپ گیا تھا اور ہمارے خیموں تک پہنچنے سے پہلے ہی بارش بھی شروع ہوگئی۔

وہ تمام رات آنکھوں میں ہی گذری۔ چشمے سے واپس آنے کے بعد ہریش غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ اس کے دل میں جو طوفان بپا تھا۔ شاید اس کی ہم آہنگی کے لئے قدرت نے بھی عناصر کو آزادی دے دی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل بار بار زور سے گرجتے اور بجلی کی چمک خیمے کے اندر تک پہنچ کر آنکھوں کو چوندھیا دیتی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے جب میرے اصرار پر ہریش نے اپنا قصہ شروع کیا۔

"میری پیدائش اور پرورش ایک گاؤں کی دیہاتی فضا میں ہوئی تھی اس کی سادہ زندگی میں۔ میں اس قدر خوش تھا کہ دنیا کے غم و اندوہ کا مجھے علم ہی نہ تھا۔ میری زندگی کا پہلا المناک واقعہ والدہ کی موت تھی۔ ان کی زندگی میں میری عمر کا جو حصہ بسر ہوا تھا۔ وہی میری زندگی کا بہترین وقت تھا۔ وہ سولہ سال کا عرصہ جس میں بچپن کا اختتام اور جوانی کا آغاز دونوں شامل

ہیں۔ ایک شیریں خواب تھا جو اب تک راتوں کو میری بند آنکھوں کے پردہ پر ایک فلمی تصویر کی طرح جلوہ نما ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اس حصے میں جو ہستی میرے دکھ سکھ سب میں شریک رہی وہ تھی۔ بملا۔ بملا اور میں بچپن ہی سے ساتھ کھیلے تھے اور جتنی ہمدردی اور رفاقت ہم دونوں کے درمیان تھی، اتنی دو کم عمر بچیوں میں ہونی ذرا مشکل ہی ہے۔ بملا کے والد ہمارے پرانے ہمسایہ اور والد کے دلی دوست تھے اور ان کی موت نے بملا کی والدہ اور بملا کو ہم لوگوں کے نزدیک کر دیا تھا۔

کالج کی تعلیم کے باعث مجھے اپنا پیارا گاؤں چھوڑ کر نزدیک کے ہی ایک شہر میں جانا پڑا۔ یہ ایک اندوہناک واقعہ تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں اپنے بچپن کے سنگی ساتھیوں سے الگ ہو رہا تھا جس کا مجھے بے حد رنج تھا۔ مگر بہت جلد ہی اس نئے طرز زندگی کی دلچسپیوں نے گاؤں کی سادہ زندگی اور بچپن کے سنگی ساتھیوں کی یاد کو میرے دل سے محو کر دیا۔

اس چار برس کے عرصے میں موسم گرما کی تعطیلات کے سوا گھر جانے کا موقع کم ہی ملتا تھا اور ان تعطیلات کے دوران میں بھی میں کالج کھلنے کے انتظار میں ہی رہتا۔ میرا گھر وہی تھا۔ وہاں کے سب انسان ویسے ہی تھے۔ مگر مجھے اب اُن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ نہ کسی سے مل کر مجھے کوئی خاص خوشی ہوتی اور نہ کسی سے رخصت ہوتے وقت کوئی رنج ہوتا۔ گذرے ہوئے زمانے کے احساسات اور جذبات کو میں بچپن کی بھول سمجھ کر دل سے بھلا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنی کوششوں میں نہ معلوم میں کہاں تک کامیاب ہوتا اگر کالج کی مختصر سی زندگی میں ایک ایسی ہستی سے میری ملاقات نہ ہو جاتی جس نے میرے خیالات کی رَو کا رُخ بالکل بدل دیا اور زندگی بسر کرنے کے لئے ایک نئی راہ دکھا دی جس کا راہبر "فرض" کی بجائے "جذبۂ دل" تھا اور جو پہلی راہ کی طرح تاریک اور دشوار نہیں بلکہ روشن اور پرلطف تھی۔

تعلیم کے ختم ہوتے ہی اُس نئی طرز زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس ماحول کو جس میں میری زندگی کے چار بہترین برس گذرے تھے۔ الوداع کہہ کر جب میں گھر جانے کے لئے رخصت ہوا تو میری حالت اُس انسان کی سی تھی جسے جنت کی سیر کرا کے دوزخ میں لوٹ جانے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ سب سے زیادہ قلق مجھے اس محبوب ہستی سے الگ ہونے کا تھا جس نے میری زندگی میں ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دی تھی اور جس کی یاد کے نقوش کو اپنے دل سے مٹا دینا میرے لئے ایک ناممکن سی بات تھی۔

گھر آ کر مجھے معلوم ہوا کہ والد بملا کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جس کی امید مجھے چار برس پہلے ہو سکتی تھی اور تب یہ میرے لئے باعث مسرت بھی ہوتی مگر میری زندگی کے ان چار برس میں ہر چیز اتنی تبدیل ہو گئی تھی کہ اس خبر کے سننے کی نہ تو اب کوئی امید باقی رہی تھی اور نہ خواہش اُس ماحول میں جس سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس سادہ اور بے لطف زندگی کو تمام عمر کے لئے قبول کر لینا۔ ایک ایسی خبر تھی جس نے میرے مستقبل کے تمام خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

والد کی طبیعت سے میں خوب واقف تھا کسی مناسب وجہ کے بغیر اُن کا ارادہ پلٹنے کی کوشش کرنا نہ صرف بے کار بلکہ میری ہمت سے بھی بعید تھا۔ اگر کوئی امید تھی تو وہ بملا کا موہوم انکار تھا۔ مگر بملا انکار کیوں کرتی!

ہمارے گاؤں میں اُن دنوں میعادی بخار کا بہت زور تھا۔ اسی میں بملا بھی پڑ گئی۔ والد کو تو اپنے کام سے فرصت نہ ملتی تھی۔ علاج معالجے کی بہت سی ذمہ داری میرے ہی شانوں پر آ پڑی اور میرا اس کے ہاں آنا جانا بہت بڑھ گیا۔ مگر میں یہ سب کچھ محض اپنا فرض سمجھ کر کرتا اور بات چیت کے معاملے میں بھی غیر معمولی کفایت شعاری سے کام لیتا یہ بات بملا اور اُس کی والدہ نے محسوس کی یا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر میں نے اپنا میلان اُن سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

اُس روز سویرے ہی بملا کا بخار اترا تھا۔ دوپہر کو میں گیا تو بملا کہنے لگی۔ "ماں کہہ رہی تھیں، بچاری نے کتنی تکلیف اٹھائی۔ مگر ہر شخص بھائی سب سے زیادہ تو تم نے تکلیف اٹھائی۔ دل میں کہتے تو تم بھی ہو گے۔ کہ آج تک تمہارے لئے کیا تو کچھ بھی نہیں بس تکلیف دینے کو ہی ہوں۔ کیوں"!

مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا "اگر آج تک کچھ نہیں کیا تو کیا ہوا۔ اب کر سکتی ہو۔ ابھی تو . . . ." زیادہ دیر تک میں مسکرانے کی کوشش نہ کر سکا۔ بملا کسی قدر حیرت اور بے تابی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لہجے کی افسردگی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا "تم اب بھی ماں سے کہہ سکتی ہو کہ یہ شادی ہمارے لئے باعث مسرت . . . ."

ایک سانس میں میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔ اس نامکمل فقرہ کا مطلب بملا کیا سمجھی۔ مجھے معلوم نہیں۔ مگر اُس نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا کر اپنی ٹانگوں پر پڑے ہوئے کمبل پر جما دیں۔ گہری خاموشی اور خیالات کے سمندر میں وہ ایسی ڈوب گئی گویا میری موجودگی کا بھی احساس نہ رہا۔ اس تلخ خاموشی کا ایک ایک لمحہ میرے لئے پہاڑ ہو رہا تھا۔ آخر دوا لانے کا بہانہ کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا اگر بملا اب بھی اسی طرح بے حس و حرکت خاموش پڑی

رہی۔گویا موجودگی اور غیر موجودگی اس کے لئے دونوں یکساں تھیں۔

اس واقعہ کو تین روز گذر گئے مگر میں بملا کے ہاں نہیں گیا۔ تیسرے روز بملا کی والدہ کے بلانے پر مجھے جانا پڑا۔ "تمہیں کیا ہوا۔ ہریش!" مجھے دیکھ کر وہ بولیں "تین روز سے شکل تک نہیں دکھائی۔ بملا کا بخار اتر گیا شاید اسی لئے۔ مگر میں کہتی ہوں۔ ابھی اس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی اگر ہوتی تو دن بھر یوں منہ لپیٹے کیوں پڑی رہتی۔ تم ڈاکٹر سے جا کر کہو نہ!"

"اچھا" کہہ کر میں الٹے پاؤں واپس آ گیا۔ بملا دوسرے کمرے میں تھی اُس نے کچھ سنا یا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر میں ڈاکٹر کے ہاں نہیں گیا۔

اس واقعہ کے تیسرے روز رات کو والد نے مجھے بلا کر پوچھا۔ "میری دلی خواہش تھی کہ تمہیں اور بملا کو رشتۂ ازدواج میں منسلک دیکھ لوں۔ مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہیں۔ تم سے اس بارے میں بملا نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں تو" میں نے ذرا خاموش رہ کر جواب دیا۔

آہستہ سے "ہوں" کہہ کر والد خاموش ہو گئے۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد وہ بولے "تمہاری اور بملا کی شادی نہیں ہو سکتی۔ بملا کو انکار ہے"۔ والد کے لہجے سے صاف ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں نے ان کو بملا کی بات پر ناراض ہوتے دیکھا تھا۔ میں پتھر کے ستون کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس خبر پر خوش ہوں یا افسردہ میں یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔

"اچھا جاؤ" والد نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "سفر کی تیاری کر لو۔ کل سویرے ہی تم کو پہلگام جانا ہو گا"۔

"پہلگام!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" والد بولے "وہاں جا کر رہنے کا انتظام کرو۔ ایک ہفتہ تک بملا بھی اپنی والدہ کے ہمراہ وہاں آ جائے گی"۔

وہ رات میں نے جاگ کر کاٹی۔ دماغ میں خیالات کا اس قدر ہجوم تھا کہ رات نہایت مختصر معلوم ہوئی۔ بظاہر میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل حل ہو گئی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی رفع ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے مسرت نہیں ہوئی۔ وہ سکون جس کی امید میں میں نے سب کچھ کیا تھا۔ وہ امن جس کے انتظار میں میں مدت سے تھا اُس سکون اور اُس خاموشی کی جگہ میرے دل میں ایک طوفان بپا تھا۔ پہلے میں ایک بہادر سپاہی تھا جو فتح کی امید میں لڑ رہا تھا اب میں ایک بزدل فاتح تھا جس نے دوسرے کی مدد سے فتح حاصل کی تھی۔ یہ خیال میرے دماغ میں آئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس بزدل فاتح سے وہ بہادر سپاہی اچھا تھا۔ مگر اب واپس لوٹنا بہت مشکل تھا جس زینے پر میں چڑھا تھا اُس سے اترنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پہلگام کا خیال آتے ہی کوہستان کشمیر کی اُن برف آلود چوٹیوں اور پرسکون وادیوں کا نقشہ میری نظروں میں پھر گیا۔ جن کی تعریف میں مدت سے سنتا آ رہا تھا۔ سکوت اور خاموشی کی ہلکی سی جھلک نے میری تاریک زندگی میں امید کی ایک مدھم سی روشنی پیدا کر دی اور اسی امید کو لے کر میں نے سفر شروع کیا۔ تب مجھے خواب میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ اس سفر میں میری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہو گی جو میرا بہترین دوست اور رازدار بن جائے گا"۔

اتنا کہہ کر ہریش خاموش ہو گیا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ بارش اور ہوا کے تھمنے سے فضا میں اُس پرشور چشمے کی آواز کے سوا۔۔ جس کا پانی اس رات کی تاریکی میں بھی پتھروں پر سر پٹکتا کسی کی تلاش میں بھاگا جا رہا تھا۔۔۔۔ بالکل خاموشی تھی۔

اگلے روز ہریش کو بخار ہو گیا۔ شاید شام کو بارش میں بھیگ جانے کی وجہ سے۔ میں ریاستی ہسپتال کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر دیکھ کر جانے لگا تو ہریش بولا "ڈاکٹر صاحب مجھے ایک روز میں اچھا کر دیجئے۔ میں کل واپس جا رہا ہوں"۔

ڈاکٹر نے متعجب ہو کر کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو کبھی آپ کو ایسا مشورہ نہیں دوں گا"۔

ڈاکٹر تو اتنا کہہ کر چلا گیا مگر ہریش نے گویا اُس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن میں کسی حالت میں رک نہیں سکتا" اور پھر میری طرف دیکھ کر وہ بولا "گوپی میں کل ضرور جاؤں گا"۔

مجھے خیال ہو رہا تھا کہ ہریش نے اپنا قصہ سناتے وقت مجھ سے کچھ چھپا لیا ہے۔ اُس کے دل میں جو ہلچل مچی ہے۔ اس کا کچھ اور باعث بھی ہے۔ مگر ہریش نے مجھ پر ظاہر نہیں کیا۔ میں اُس کے سرھانے خاموش بیٹھا بہت دیر تک یہی سوچتا رہا۔ آخر میں نے کہا "ہریش تم واپس جانے کے لئے اس قدر بے تاب کیوں ہو؟"

ایک سوکھی ہنسی ہنس کر ہریش بولا "کیا تم کو مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا"۔ ایک لمبی سانس لے کر اُس نے کہا "میرا دل چاہتا ہے گوپی! کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ بہت دور۔ کسی ایسی جگہ جہاں بملا کا صرف نام ہی سن سکوں۔ اُس کی شکل نہ دیکھنی پڑے۔ اُس سے بات نہ کرنی پڑے"۔

دوسرے روز ہی ہریش کا بخار اتر گیا۔ اسی روز دوپہر کو بملا کی

والدہ اور بملا بھی پہنچ گئیں تیسرے روز سویرے ہی ہریش واپس چلا گیا۔ چلتے ہوئے وہ بملا کی والدہ سے کہنے لگا "آپ لوگ بالکل گھبرائیے گا نہیں اگر کسی قسم کی تکلیف ہو تو گوپی بابو تو یہیں ہیں۔ مجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہ سمجھئے گا"

میں نے محسوس کیا کہ ہریش کا جانا بملا کی والدہ کو ناگوار گذرا ہے۔ مگر بملا اس قدر خاموش اور محتاط تھی کہ اس کے احساسات کے متعلق میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ہریش کو گئے پندرہ روز گذر گئے۔ اس عرصے میں ہریش کے دو خط مجھے ملے مگر ان میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی۔ اس پندرہ روز کے عرصے میں میں اپنے نئے ہمسایوں سے اتنا ہل مل گیا تھا کہ مجھے خود تعجب ہوتا تھا اور اس میں زیادہ خوبی میرے ہمسایوں کی ہی تھی جو مجھ سے اتنی ہمدردی اور اپنایت کا سلوک کرتے تھے۔ اس مختصر عرصے میں میں بملا کو جتنا بھی سمجھ سکا تھا۔ اُس سے مجھے یقین کرنا پڑا کہ ہریش برسوں ساتھ رہ کر بھی بملا کو نہیں سمجھ سکا۔ بملا۔ جتنا کہ ہریش سمجھتا تھا۔ اُس سے بہت زیادہ اچھی تھی۔ بملا سے میری گفتگو مختلف باتوں پر ہوا کرتی مگر ہریش کا ذکر اس میں کبھی نہ آتا۔ ایک روز شام کو بملا کہنے لگی "آج ایک بات پوچھتی ہوں۔ گوپی بابو سچ سچ جواب دیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہریش بھائی واپس کیوں چلے گئے؟"

اس خلاف توقع سوال سے میں ذرا گھبرا سا گیا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ بملا کی زبان سے میں ہریش کا نام سن رہا تھا۔ ذرا سوچ کر میں نے کہا "یہ خیال تو مجھے بھی ہوتا ہے کہ اُن کے واپس جانے کا ارادہ صرف دو روز پہلے ہوا تھا۔ مگر کیوں، یہ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں"۔

ذرا خاموش رہ کر بملا بولی "یہ تو میں جانتی ہوں کہ اُن کے جانے کی ایک وجہ ہمارا آنا بھی ہے مگر اس کے علاوہ اگر اور بھی کوئی وجہ تھی تو وہ میں سننا چاہتی ہوں"۔

مگر ایسی کسی وجہ کے متعلق میرے لاعلمی کا اظہار کرنے پر وہ موضوع وہیں ختم ہو گیا۔ اس روز کے بعد ہریش کے متعلق بملا سے میری گفتگو نہیں ہوئی شاید اس لئے کہ اس کے بعد بملا سے میری بات چیت ہوئی ہی بہت کم۔ بملا کو اب ایک نئی سہیلی مل گئی تھی اور وہی سہیلی اس کے تمام وقت کی پوری مالک تھی یہ سہیلی لیلا تھی۔ بملا نے میرا تعارف بھی لیلا سے کرا دیا اور بملا سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ لیلا ابھی حال ہی میں پہلگام آئی ہے اور ابھی کافی عرصہ رہے گی۔ لیلا اُن انسانوں میں سے تھی جو ہر فضا اور ہر سوسائٹی میں بہت جلد ہر دلعزیز ہو جاتے ہیں۔ لیلا نئی روشنی کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جس میں شوخی اور بے تکلفی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کا ہنسنا۔ اس کا بولنا۔ اس کا مسکرانا۔ اس کی معمولی سے معمولی حرکات میں بھی ایک خاص بات تھی۔ ایک خاص طاقت تھی جو نامعلوم طور پر دوسرے کا دل تسخیر کر لیتی تھی۔

بملا اور لیلا کے تعلقات روز بروز گہرے ہوتے دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا کہ بملا نے لیلا کو ہریش کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا ہے اور میرا یہ شک یقین میں بدل گیا۔ جب ایک روز لیلا نے مجھے بالکل تنہا پا کر کہا "معاف کیجئے گا گوپی بابو آج ایک بات کہتی ہوں۔ ہریش بابو آپ کے تو بہت دوست ہیں۔ کیا آپ نے بھی اُن کو نہیں سمجھایا؟"

لیلا کا مطلب کس سمجھانے سے ہے۔ یہ میں بخوبی سمجھ گیا۔ مگر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "سمجھایا؟ کس معاملے میں؟"

"اُسی بملا دیوی کے معاملے میں" لیلا کہتی گئی "کیا ہریش بابو بچپن کی ہمجولی کے احساسات کی بھی تھاہ نہ پا سکے۔ اُن کی اس سرد مہری سے بملا دیوی کے دل کا کیا حال ہو گا۔ یہ بھی وہ نہیں سمجھ سکے۔؟"

"ہاں" میں نے کہا۔ "یہ یقین تو مجھے بھی ہوتا جاتا ہے کہ ہریش بابو نے بملا دیوی کو سمجھنے میں بہت بڑی بھول کی ہے"۔

"مگر آپ نے اُن کو یہ بھول سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟"

لیلا کے اس سوال پر ذرا مسکرا کر میں نے کہا۔ "کوشش، ہاں بیشک میں نے نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ ان کا ارادہ بہت مصمم معلوم ہوتا تھا اور دوسرے مجھے اس بات کے لئے وقت بھی نہیں ملا اس سے پہلے کہ میں بملا دیوی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ وہ یہاں سے چلے گئے . . . اور . . . ."

"مگر آپ خط میں تو اُن کو لکھ سکتے تھے"۔ لیلا بیچ ہی میں بول اُٹھی

"لکھ تو سکتا تھا" میں نے کہا "مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نظر نہیں آتا۔ ایک صاف سطح پر۔ چاہے وہ سخت بھی ہو۔ کسی چیز کے نقوش ثبت کرنا ممکن ہے۔ مگر ایک ایسی نرم سطح پر جس پر پہلے سے ہی کسی قسم کے نقوش ثبت ہوں ان پہلے نقوش کو بالکل مٹائے بنا اُن کی جگہ دوسرے نقوش ثبت کرنا ناممکن ہے"۔

لیلا نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔ شاید وہ میرا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنے مطلب کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا "اور میرے خیال میں یہی حال ہریش بابو کے دل کا بھی ہے"۔

چند منٹ حیرت سے خاموش رہ کر لیلا بولی "اُن موجودہ نقوش کا مالک کون ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں" میں نے کہا "میں بھی کچھ نہ جان سکا اور میرے خیال میں

اس راز کو صرف دو ہی انسان جانتے ہیں۔ ایک ہریش بابو اور دوسرے ان نقوش کی مالکہ۔"

بیلا نے آہستہ سے "ہوں" کہہ کر کسی دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔

اُس روز کی گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا اور میں نے ہریش کو ایک خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ خط کیا تھا ایک زبردست تقریر تھی جس میں میں نے بملا کے احساسات کی صحیح تصویر کھینچنے کی کوشش کی تھی اور ہریش کا ارادہ بدلنے کی کوشش میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر تم بملا کے لطیف جذبات کو ٹھکرا کر اسی طرح مسرت کی تلاش میں دوڑتے رہے تو تم کو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی بلکہ تمہاری تمام سرگرمیوں کا انجام ایک بے گناہ اور معصوم زندگی کی تباہی ہوگا۔"

میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میں غیر معمولی جوش سے کام لے رہا ہوں مگر لیلا کے کہنے کا مجھ پر اتنا اثر ہوا تھا کہ اس سے کم میں اور کچھ نہیں لکھ سکتا تھا۔ ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد ہریش کا جواب آیا اس نے لکھا تھا:۔

"تمہیں میری مسرت سے اتنی دلچسپی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بملا کے جذبات کی تصویر تم نے بہت صحیح کھینچی ہے۔ میں بھی اپنے تصور میں بالکل ایسی ہی تصویر کھینچا کرتا تھا۔ آج تک وہ تصویر دھندلی تھی مگر آج بالکل صاف ہو گئی۔ بملا کتنی اچھی ہے یہ میرے دل سے زیادہ کوئی نہیں جانتا اور میں اپنا فرض بھی بخوبی سمجھتا ہوں۔ مگر میں تم کو بتا چکا ہوں کہ میری زندگی کا رہنما اب "فرض" نہیں بلکہ "جذبۂ دل" ہے میرے اندر "فرض" اور "جذبہ" کے درمیان جو کشمکش ہو رہی ہے اس کا اندازہ شاید تم بھی نہیں لگا سکتے کس کی فتح ہوگی۔ یہ دیکھنا ابھی میرے لئے باقی ہے۔"

اس کے ایک روز بعد مجھے ہریش کا دوسرا خط ملا جو نہایت ہی مختصر مگر فیصلہ کن تھا۔ "گوپی" ہریش نے لکھا۔ "اُس جذبہ اور "فرض" کی کشمکش میں "فرض" جیت گیا۔ "جذبہ" جس سہارے بڑھ رہا تھا۔ وہ سہارا ہی ٹوٹ گیا۔ دنیا کتنی پُرفریب ہے میرے دوست!

اس میں کسی کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا . . . خود اپنا بھی نہیں . . ."

گو بظاہر خط نہایت مختصر تھا مگر ان چند سطروں کے پیچھے ایک دنیا پنہاں تھی۔ غیر معمولی اختصار نے احساسات کا اظہار بے معنی سا کر دیا تھا مگر اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کسی خلاف توقع واقعہ سے ہریش کے دل کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور شاید یہ صدمہ ہی اُس کے ارادے میں تبدیلی کا ذمہ دار تھا

شام کو بیٹھا میں کتاب پڑھ رہا تھا کہ کسی نے خیمے میں قدم رکھا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو بملا لیلا کا ہاتھ پکڑے کھڑی ہے۔ وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے ہی بملا بولی "گوپی بابو ایک تکلیف کیجئے گا۔ ہمارے چلنے کا انتظام کر دیجئے۔ ہم لوگ پرسوں واپس جا رہے ہیں۔"

میں نے حیرت سے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی افسردگی آج مسرت سے بدل گئی تھی۔ آج پہلی بار میں نے بملا کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

"اتنی جلدی" میں نے کہا "ابھی تو وہاں موسم بہت گرم ہوگا۔"

"کلیجے میں ٹھنڈک ہونی چاہئے گوپی بابو"۔ بملا نے ہنستے ہوئے کہا "موسم کی گرمی اور سردی سے کیا ہوتا ہے۔"

"مگر آپ کے جانے سے" میں نے کہا "لیلا دیوی کو تو بالکل سناٹا ہو جائیگا۔"

لیلا اب تک بالکل خاموش کھڑی تھی۔ میری بات کا جواب دیتے ہوئے کسی قدر افسردگی سے اُس نے کہا۔

"نہیں ایک ہفتہ تک میں بھی واپس جا رہی ہوں۔"

"تو میں ہی کچھ قصوروار ہوں کیا؟" میں نے سوکھی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میں بھی سفر کی تیاری کئے لیتا ہوں۔" "نہیں گوپی بابو آپ ابھی یہیں ٹھیریئے"۔ بملا نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی تو وہاں موسم بہت گرم ہوگا۔"

اور پھر لیلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتی ہوئی بملا وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد میں ایک ماہ پہلگام میں اور رہا مگر لیلا سے میری ملاقات ایک دفعہ بھی نہیں ہوئی شاید وہ ایک ہفتہ سے بھی پہلے وہاں سے چلی گئی۔

اُسی سال سردیوں میں بملا اور ہریش کی شادی ہو گئی شادی میں مجھے لیلا سے ملنے کی کامل امید تھی مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لیلا کا خط آ گیا ہے۔ وہ نہیں آ سکے گی۔ اس کے والد بیمار ہیں

* * *

اس شادی کے ایک سال بعد مجھے احمد آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ بازار میں سے گذر رہا تھا کہ کسی نے پکارا۔ "گوپی بابو"

نگاہ اٹھا کر میں نے دیکھا۔ ایک عورت موٹے کھدر کے لباس میں ملبوس میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہی میرے منہ سے نکلا "لیلا دیوی!"

"ہاں" لیلا نے میرے تعجب پر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہیئے گوپی بابو۔ ہریش بابو اور بملا دیوی تو اچھے ہیں نا؟"

"اچھے ہیں" میں نے کہا۔ "مگر لیلا دیوی . . . تم یہاں . . .؟"

یہ پہلی دفعہ تھی کہ لیلا کو میں نے "تم" کہہ کے پکارا۔

"ہاں" لیلا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں یہیں رہتی ہوں۔ "گاندھی آشرم" میں . . ."

مدن موہن لقایا

حدیثِ نشاط

ہر برگ فرطِ حسن سے رشکِ جناں ہے آج
غرقِ جمال وسعتِ کون و مکاں ہے آج

اُمڈا ہے ذرّے ذرّے سے اک سیلِ رنگ و نور
ہر جزوِ کائنات تبسّم فشاں ہے آج

پنہاں ہے خار خار میں سو جنتِ نگاہ
پھولوں کی شاخ شاخ ثریّا نشاں ہے آج

یکسر شباب پوش ہے یہ دہرِ دیر سال
رعنائیٔ نشاط سے ہر شے جواں ہے آج

اک شاخ تاک پر ہی نہیں اس انحصار
افشردہ ہر شجر سے مئے ارغواں ہے آج

صد میکدہ بدوش گھٹائیں ہیں مے فروش
ہر سمت ایک سیلِ مسرت رواں ہے آج

رقصاں سوادِ خلد میں ہیں حوریانِ شوخ
جبریل اوجِ عرش پہ نعرہ زناں ہے آج

ذرّے نہیں ہیں بلکہ مری بارگاہ میں
اترا فلک سے قافلۂ اختراں ہے آج

زیرِ زمیں حسد سے ہے پرویز سینہ کوب
جم میری بارگاہ کا اک پاسباں ہے آج

کیوں کر نہ میرا پاؤں فلک پر پڑے شہید
میری جبینِ شوق سے وہ آستاں ہے آج

شہید ابن علی

زمرّد کی چوری

سمنز کی پراسرار ہستی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے دوست بہت کم اور اس کا مستقل پتہ کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً قاہرہ سے بنکاک تک مختلف شہروں میں کچھ عرصہ کے لئے ٹھہرا ہوا نظر آجائے گا۔ اور پھر ناگہاں اور پراسرار طور پر گم ہوجائے گا۔ اور کسی کو پتہ نہیں لگے گا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کبھی کبھی بدھ، شیوا، محمد اور ایشیا کے دیگر مقتدر رہنماؤں اور دیوی دیوتاؤں کے پیروؤں سے اس طرح مل جل جاتا ہے کہ کسی کو اس کے عیسائی ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ تنہا ہی رہتا ہے۔ صرف میکس ہی اکثر اس کے ہمراہ دیکھا جاتا ہے۔

میکس ایک بندر ہے اور یہی بندر اُن واقعات کی مرکزی شخصیت ہے جو اس کو قاہرہ کے مختصر سے قیام کے دوران میں پیش آئے۔

. . . .

سمنز اپنے کمرے میں میز کے قریب کھڑا ہوا ایک خط پڑھ رہا تھا اس کی آنکھیں کاغذ کے ایک میلے سے ٹکڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ سمنز نے دھیمی آواز میں پڑھا۔

"اگر تم ایک سو پاونڈ کمانا چاہتے ہو تو بہت جلد میری دُکان پر پہنچو۔ ــ مرلین" اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کاغذ میکس کی طرف جو میز پر بیٹھا ہوا تھا پھینک دیا، بندر نے اُسے فوراً اٹھا لیا اور الٹا پکڑے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اُس پر نظریں جمادیں گویا پڑھ رہا ہے۔

"اچھا . . . تمہارا کیا خیال ہے" سمنز نے کہا۔ میکس نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا اور دو تین دفعہ چیں چیں کیا "ایک سو پاونڈ" سمنز نے کہا "جب آدمی کی جیب خالی ہو تو کافی رقم ہے۔ لیکن اب میں ایک کمینہ اور بزدل چور بننے سے تنگ آچکا ہوں۔ اگرچہ پولیس کی آنکھوں میں خاک جھونکنا بہت مزے کی بات ہے۔ اور مجھے اس سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے لیکن پھر بھی میری رگوں میں شرافت کا ایک شررہ ضرور باقی ہے اور میرا ضمیر ابھی بالکل مردہ نہیں ہوا" . . . . سمنز کے کندھے کسی مقدس جذبے کے ماتحت حرکت میں آئے۔ "کیا مجھے مرلین سے ضرور ملنا چاہئے؟" اس نے کہا "وہ بدمعاش ہے اور ایسا بدمعاش جو ہمیشہ دوسروں کو تباہ و برباد کرنے کی سکیمیں تیار کرتا رہتا ہے۔ لیکن ایک سو پاونڈ جب جیب خالی ہو . . . ."

سمنز جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے کی طرف مڑا۔ جب اس کے جانے کے بعد دروازہ بند ہوا تو میکس میز پر آلتی پالتی مارے "چیں چیں" کر رہا تھا۔

باہر تاریکی تھی اور سمنز بلند عمارتوں کے سایوں میں خاموشی سے جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرلین کی دکان ایک گھنٹے کی مسافت پر قاہرہ کے بدترین حصے میں واقع ہے جو ادنیٰ درجے کے لوگوں کے مکانات سے بھرا ہوا ہے اور مرلین خود بھی ٹھگنا، بدصورت، فریبی اس ماحول سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ رات کا وقت تھا اور ایسا وقت جب قاہرہ کی سرزمین ایک سفید آدمی خاص کر سمنز کے لئے محفوظ نہیں تھی۔ اس وقت سمنز جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا مرلین سے ملنے کے لئے جا رہا تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ مرلین کی دُکان کے تاریک دروازے میں داخل ہوا۔ دروازے پر نام کی تختی نہ تھی اور دریچے بھورے رنگ کے میلے پردوں سے ڈھنپے ہوئے تھے۔

درحقیقت مرلین خارجی دنیا کے لئے نہیں بنا تھا۔ اس کا دروازہ کبھی کبھی سفید فام سیاحوں کے لئے کھلتا۔ اگر کبھی پولیس وہاں آجاتی تو سوائے ایک غلیظ اور گندی دکان کے اُس کو کچھ نہ دکھائی دیتا، لیکن جن کو مرلین خود بلاتا اُن کے لئے وہاں سب کچھ موجود تھا۔

سمنز نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی

اس کی آنکھیں بہت جلد تاریکی میں کھو گئیں اور وہ کچھ عرصہ کے لئے بالکل
معلوم نہ کر سکا کہ اس فریب گاہ کے اندرونی دروازوں کے پیچھے کیا کچھ ہو
رہا ہے۔ چند لمحے تاریکی میں کھڑا رہنے کے بعد اس نے پردے کے پیچھے
سے مرلین کو اپنی طرف بغور دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اور تنگ
لیکن تیز آنکھیں اس کی ہر حرکت کو بھانپ رہی ہیں۔

سمنز مرلین کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ "تمہیں میرا خط مل گیا ہے۔"
مرلین نے ایسی آواز میں کہا جو وہ دھات کے ٹکڑوں کو آپس میں رگڑنے سے
پیدا ہوتی ہے۔

"مجھے تمہارا خط مل گیا ہے ـــ مرلین" سمنز نے جواب دیا۔
"اس کے متعلق کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہاں آؤ" مرلین نے کہا۔ سمنز پردے کے اور زیادہ قریب
ہو گیا۔ بوڑھا مرلین لوہے کے جنگلے سے جس کے اندر وہ بیٹھا ہوا تھا اس
پر جھکا اور چھوٹی چھوٹی پانچ انگلیوں نے ایک آہنی شکنجے کی طرح اس کے بازو
کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "میرے پاس اس وقت سو پاؤنڈ ہیں۔" یہ کہتے
کہتے مرلین کا ہاتھ اس کی جیب کے اندر چلا گیا۔ "اگر تم میرے کہنے پر عمل کرو
اور کسی کو نہ بتاؤ تو انہیں حاصل کر سکتے ہو۔"

"ہاں" سمنز کا جواب غیر دلچسپ اور بے پروایانہ تھا۔

"تم میرے کہنے پر عمل کرو گے؟"

"یہ تو اس پر منحصر ہے کہ کیا کرنا چاہئے۔"

اب اس کی انگلیاں سمنز کے بازو میں زیادہ مضبوطی سے گڑ گئیں
اور چہرہ اور بھی قریب آگیا۔ یہاں تک کہ سمنز اس کی گرم سانس محسوس کرنے
لگ گیا۔ "قاہرہ میں ایک انگریز تاجر وارد ہوا ہے" مرلین نے آہستگی سے
کہا "اور اس کے پاس ایک سبز پتھر ہے جو بہت قیمتی ہے۔ مجھے یہ کیسے
معلوم ہوا؟ جس چور نے اس کے پاس وہ پتھر بیچا تھا، وہ میرا دوست
تو نہیں البتہ مجھے جانتا ضرور تھا۔ چند پاونڈ ادا کر کے میں نے اس سے یہ بھی
معلوم کر لیا ہے کہ وہ کہاں مقیم ہے اور پتھر کی قیمت کیا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!"
سمنز مسکرا رہا تھا،

"اور اس ایک سو پاونڈ کے لئے مجھے وہ پتھر تمہارے لئے چرانا
ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں میں تمہیں ضروری ہدایات دے دوں گا۔ تم وہ پتھر چرا کر میرے
پاس لے آنا اور میں یہ رقم تمہیں ادا کر دوں گا" سمنز بوڑھے کے پُراز
اشتیاق چہرے کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے جنگلے پر جھکا "اور پتھر سو
پاونڈ سے زیادہ قیمت کا ہے" اس نے دریافت کیا "یقیناً زیادہ قیمتی
ہے" مرلین نے جواب دیا۔

"بالفرض میں وہ پتھر چرا کر تمہیں نہ دوں اور اپنے پاس رکھ لوں تو
پھر کیا ہو" سمنز نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور بالفرض میں پولیس میں اطلاع دے دوں کہ پتھر کس کے
پاس ہے تو پھر کیا ہو" مرلین نے بالکل سمنز کے لہجے میں جواب دیا۔

سمنز کو ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک
ایسی پُراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس کے معانی مرلین جیسا جہاندیدہ
مکار اور بدمعاش بھی نہ سمجھ سکا۔

"میں یہ سب کچھ کر دوں گا" سمنز نے کہا۔

مرلین جنگلے پر جھکا اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا سمنز کی طرف بڑھایا اور
پھر دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب گیارہ بجے ہیں یہ لو
ہدایات اور کل صبح چھ بجے تک تمہیں آنا ہوگا!"

"اور ایک سو پاونڈ"

"تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے" یہاں مرلین کا ہاتھ پھر کوٹ کی
جیب کی طرف گیا اور سمنز کاغذ لے کر بغیر کچھ کہے جلدی جلدی ناصاف
فرش کو طے کرتا ہوا باہر آگیا۔ جب وہ دروازے سے نکل رہا تھا۔ مرلین جنگلے
پر جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

رات کا ڈیڑھ بجا ہوگا کہ ایک سایہ سا قاہرہ کے یورپی حصے کے
ایک چوراہے سے گزرتا ہوا دکھائی دیا۔ پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے
مڑ کر اسے دیکھا اور اطمینان سے اس کی طرف سے پیٹھ پھیر لی۔ کیونکہ اس
کا اس وقت گزرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بس ایک اور انگریز کہیں سے
آرہا ہوگا اور یہ ایک غیر ضروری سی بات تھی۔ سمنز نے اپنا سفر جاری رکھا اور
ایک دفعہ بازار میں چلتے ہوئے بجلی کے قمقمے کی روشنی میں کھڑے ہو کر کاغذ
کے ٹکڑے پر ایک نظر ڈالی اور پھر جیب میں ڈال کر دہنے ہاتھ کے بازار میں
داخل ہو گیا۔ نصف گھنٹہ بعد وہ ایک پتھریلی عمارت کے سائے میں جارہا تھا
اور اس کے سر پر ایک عظیم الشان مربع شکل کی عمارت چھائی ہوئی تھی۔ اس
جگہ وہ ٹھہر گیا اور خاموشی سے کچھ کام کیا۔ چند لمحوں کے بعد دریچے کا شیشہ
اپنی جگہ سے اتنا سرکا کہ وہ اسے اپنی جگہ سے ہٹا سکتا تھا۔ اس کے
ہٹانے کے بعد اس کی انگلیاں تاریکی میں اوپر کو گئیں ایک دھیمی سی آواز

پیدا ہوئی اور دریچہ کھل گیا، جو کچھ عرصہ تک یوں ہی کھلا رہا۔ باہر مکمل سکوت چھا رہا تھا۔ صرف ایک دفعہ ایک سپاہی کے گزرنے کی آواز پیدا ہوئی جو اِدھر اُدھر دیکھے بغیر مکانوں کے سائے میں کھو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں کی آواز بھی باہر چھائے ہوئے سکوت میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ لیکن مکان کے اندرونی حصے میں ایک محتاط سا پیکر دیں میں رینگ رہا تھا جو تنگ و تاریک راستوں اور کمروں سے ہوتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں جا کر ایک لمحہ کے لئے رکا اور اس مختصر سے وقفے میں ایک چابی ایک صندوقچی کے قفل میں گئی۔ پھر جب وہ سایہ کچھ عرصہ کے بعد اٹھا تو اس کے ہاتھ پر زمرد رکھا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سایہ باہر کے کمرے کے کھلے ہوئے دریچہ سے باہر کو دگیا اور اس نے دریچہ بند کر کے شیشہ اپنی جگہ پر لگا دیا۔

یہ کام کر کے وہ تاریکی سے بازار میں آگیا۔ جہاں سے سمنر مسکراتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چوراہے سے گزرتے ہوئے پھر اُسی سپاہی نے اُسے دیکھا اور پہلے کی طرح پھر اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ قاہرہ کے بازاروں میں چلتے پھرتے انگریز کوئی اہمیت نہیں رکھتے ، بس ایک انگریز کہیں سے آ رہا ہو گا

سمنر خموشی سے چلا جا رہا تھا۔ مگر اب کے اس کی منزلِ مقصود مرلین کی دکان نہیں تھی۔ اس لئے وہ قاہرہ کے مرکزی حصے سے گزرنے کی بجائے نہایت تنگ و تاریک گلیوں سے گذر رہا تھا، جو اکیلے دُکیلے سفید آدمی کے لئے محفوظ نہیں تھیں، لیکن وہ سمنر کے گھر کی طرف جاتی تھیں اور اُسے جلدی تھی، کیونکہ مرلین نے چھ بجے کا وقت دیا تھا، جب وہ اپنے مکان پر پہنچا تو چار بج رہے تھے اور باقی دو گھنٹے میں اُسے بہت کچھ کرنا تھا۔

وہ جوں ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک بھورا سا جانور بھاگ کر اُس کی طرف آیا اور اس کے کندھوں پر بیٹھ گیا۔ سمنر دروازہ بند کر کے کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی میز کی طرف گیا۔ "میں ایک غلط کار چور ہوں" اور اُس نے تلخی سے کہا "جہاں تک چالاکی کا تعلق ہے یہ کوئی بری بات نہیں لیکن۔ لیکن راتوں کو شرفا کے گھروں میں گھسنا اور قیمتی اشیا چرانا یقیناً کمینگی ہے۔ میں اس بزدلانہ زندگی سے تنگ آ چکا ہوں . . . . میکس !"

میکس نے جواب نہ دیا۔ عموماً جب سمنر بولتا تو میکس ایک قسم کی چڑچڑی آواز نکال کر جواب دیا کرتا تھا۔ لیکن اب کے سمنر کی آواز میں ایک قسم کی سختی تھی جس نے میکس کو اس کے چہرے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اب کے سمنر کے چہرے پر شکن نمودار تھے۔ جو پہلے شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے تھے۔ سمنر کچھ سوچ رہا تھا۔ اُسے ان دو گھنٹوں میں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

وہ پھر آپ سے آپ کہنے لگا "مرلین کی عادت ہے کہ وہ نقدی اور دیگر قیمتی اشیا کوٹ میں رکھتا ہے۔ میکس یاد رکھو وہ کبھی بھی اس کے برعکس نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس طرح اُن اشیاء کی حفاظت اچھی طرح کر سکتا ہے۔"

سمنر میز کی طرف گیا اور زمرد اُس پر رکھ دیا کمرے کی دھیمی روشنی میں اُس میں سے ہزاروں شعاعیں پھوٹ نکلیں۔ میکس جلد جلد اس کی طرف گیا۔ "یہ زمرد" سمنر نے کہا "ایک شریف انگریز کی ملکیت ہے جو میری طرح بدمعاش نہیں ہے۔ لیکن میں یہ اس کے ہاں سے چرا لایا ہوں۔ تاکہ مرلین کو دوں اور وہ مجھے سہ پاؤنڈ ادا کرے جن کی مجھے اشد ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی میں مرلین کو دنیا کا کمینہ ترین انسان سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے اسے واپس حاصل کر لینے کی کوئی ترکیب سوجھ گئی . . . ." سمنر نے زمرد اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ میکس بغور دیکھ رہا تھا۔

"میکس آؤ اور نکال لو" اس نے جلدی سے کہا۔ بندر نے اس کی طرف دیکھا وہ اس کے تحکمانہ لہجے کو سمجھ رہا تھا بندر نے اُسے جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ دو ننھے ننھے ہاتھ اُس کی جیب میں گئے اور زمرد نکال لائے۔

"بہت خوب" سمنر نے کہا "اب ایک دفعہ اور"۔ زمرد کو لے کر اُس نے پھر جیب میں رکھ لیا۔ جہاں سے بندر پھر نکال لایا۔ سمنر نے بندر کو چوری کرنا سکھا رکھا تھا۔ کئی دفعہ اس بندر نے اجنبیوں کی جیبوں سے قیمتی اشیا چرائی تھیں اور وہ اس فن میں اس قدر طاق ہو چکا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور یہ اپنا کام کر لیتا تھا۔ "یہ پتھر" اس نے کہا "مرلین کی جیب میں ہو گا۔ سمجھ گئے میکس!"

وہ اگر سمجھ نہیں رہا تھا تو یقیناً ان حرکات کا ضرور بغور مطالعہ کر رہا تھا جو اُس کے سامنے بار بار دہرائی جا رہی تھیں اور وہ ان کو اپنے دماغ میں بٹھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اب سمنر نے زمرد جیب میں ڈال لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر خراٹے لینے لگ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے بندر نے اسے بغور دیکھا اور اس کے قریب جا کر کچھ عرصہ تک خراٹوں کو سنتا رہا۔ پھر خاموشی سے

کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور زمرد نکال لایا ۔۔۔۔ سمنز کی تسلی ہو گئی۔

سمنز نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا نصف گھنٹے کے بعد وہ پھر قاہرہ کے غلیظ ترین حصے میں موجود تھا اور پھر مرلین کی دکان میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ مکار اور دغا باز شخص جنگلے کے پیچھے بت کی طرح بیٹھا ہوا اُس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

"وعدے آئے" مرلین نے صاف الفاظ میں کہا لیکن ان میں اشتیاق کا ایک بے پناہ سیلاب چھپا ہوا تھا۔

"ہاں لے آیا ہوں" سمنز نے جواب دیا۔ "یہ ہے لیکن پہلے سو پاونڈ نکالو۔"

چوہے کی سی آنکھیں سمنز کے چہرے کی طرف اٹھیں اور ہاتھ جیب کی طرف گئے اور وہ مکارانہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ اتنے میں نوٹوں کا ایک بنڈل اس کے ہاتھ میں تھا۔ "یہ ہیں سو پاونڈ" اس نے زیر لب کہا "آپ نے زمرد" سمنز نے زمرد اس کو دے دیا جس کو مرلین ایک لمحے کے لئے دیکھتا رہا۔ اور پھر جس جیب سے نقدی نکالی تھی۔ اُسے وہیں رکھ لیا۔

"مجھے ڈر تھا" اس نے کہا "کہ کہیں تم اس کی بجائے مجھے کوئی نقلی پتھر نہ لادو کیونکہ تم بہت چالاک ہو۔" "ہاں" سمنز نے کہا۔ "میں چالاک تو ضرور ہوں اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اصلی کی بجائے نقلی لا دیتا۔ لیکن تم تو ایک ہی نگاہ میں اصل اور نقل میں تمیز کر سکتے ہو۔"

بوڑھا ہنسا۔ سمنز نے ہنسی کی طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن یہ ضرور دیکھا کہ زمرد اس کے اندازہ کے مطابق ٹھیک اس کی جیب ہی میں گیا ہے۔

"اُمید ہے آپ اِسے کسی محفوظ جگہہ پر رکھیں گے" سمنز نے کہا۔

"محفوظ ترین جگہہ" مرلین نے کہا اب کے اس کی آواز میں یقین تھا۔ "میری جیب ہے سمنز قاہرہ میں ایسے ایسے چور موجود ہیں جن کے لئے تجوریاں کھولنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو میری جیب میں ہاتھ ڈالے اور مجھے خبر نہ ہو سمنز میں بلا کا ذکی الحس ہوں" سمنز اس کے ان الفاظ کو سن رہا تھا۔ اگرچہ اس کے ہونٹوں پر اس کا جواب نہ تھا لیکن دل ہی دل میں وہ ہنس رہا تھا۔ واپس جاتے ہوئے وہ دروازے سے بمشکل ہی نکلا ہوگا کہ اس سے ہنسی بند نہ رکسکی اور وہ پھر واپس مڑ آیا۔

"آج کی رات بہت کامیاب رات تھی مرلین امید ہے کل بھی ایسی ہی ہوگی۔ کوئی خوشنما سا خواب دیکھتے رہنا" یہ سمنز کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

. . . .

تقریباً چار گھنٹے کے بعد مرلین کی دکان کا دروازہ پھر کھلا مرلین آیا اور جنگلے پر جھک کر اس آدمی کو جو ناصاف فرش کو طے کرتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا بغور دیکھنے لگا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا . . . . بہت بوڑھا جس کے چہرے کو جھریوں اور جسم کو میل نے ڈھانپ رکھا تھا، داڑھی خضاب سے سیاہ تھی اور چہرے کے بہت سے حصے کو چھپا رہی تھی۔ لباس جگہہ جگہہ سے پھٹا ہوا اور بوسیدہ تھا اور کندھے پر ایک چھوٹا سا بندر بیٹھا تھا۔

"اچھا" مرلین نے کہا وہ ایسے اشخاص کو وقت دینے کے لئے تیار نہ تھا "کیا چاہتے ہو؟"

"نقدی" بوڑھے نے کہا اور مرلین فوراً سمجھ گیا کہ نووارد اطالوی لہجے میں بول رہا ہے جو ایک انگریز کے صاف ستھرے لہجے سے بالکل مختلف تھا اور خاص طور پر سمنز کے لہجے کی طرح نہ تھا۔

بوڑھا ذرا آگے کو جھکا اور بندر کو چھوا جو فوراً اچھل کر فرش پر آگرا۔

"تم کیا چاہتے ہو" مرلین نے پھر پوچھا۔

"بندر بیچنا چاہتا ہوں"۔ بوڑھے نے کہا۔ مرلین ہنسا ایک خشک اور بھینچی ہوئی ہنسی جس میں مزاح سے حقارت زیادہ تھی۔

"میں بندر کو کیا کروں گا دفع کر داس کو!"

"یہ بہت اچھا بندر ہے" بوڑھے نے کہا "یہ ناچ سکتا ہے۔ گا سکتا ہے، اگر تمہارے کپڑوں میں جوئیں ہوں تو وہ بھی نکال سکتا ہے۔"

"لیکن پھر بھی میرے کسی کام کا نہیں"۔

بوڑھا اور زیادہ آگے کو جھکا اور کہا "یہ بندر چوری بھی کر سکتا ہے"

مرلین اچانک چوکنا سا ہو گیا۔ جیسے اُس کو اس سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی ہو۔ بندر کو چوری کرنا سکھایا گیا تھا اور ہر ایسی بات جسے چوری سے نسبت ہو۔ مرلین کے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔

"ایک پاونڈ" مرلین نے کہا۔

"ایک پاونڈ؟ بندر کی قیمت تو دس پاونڈ ہے"۔ بوڑھے نے کہا

مرلین نے شانوں کو ہلکی سی جنبش دی۔ اب اُس کے دل میں بندر کو حاصل کرنے کی آرزو تو پیدا ہو چکی تھی لیکن اس نے اپنے چہرے سے استغنا کا اظہار کیا کیوں کہ خریدار کے لئے اظہار شوق گناہ ہے اور بے پروائی زود اثر ——— "مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے" مرلین نے کہا ——— "لیکن یہ بندر ہے بہت اچھا یہ لوگوں کو لوٹ لوٹ کر تمہیں دولت مند بنا دے گا" بوڑھے نے کہا۔

"میں تو تمہیں صرف ایک پاؤنڈ دے سکتا ہوں اس سے زیادہ ایک پنس بھی نہیں"۔

"ایک پونڈ ——— صرف ایک پاؤنڈ" بوڑھے کا جواب ایک دلدوز چیخ کی طرح تھا۔ "لیکن بندر قیمتی ہے"۔

"قیمتی ہے تو ہوا کرے" بوڑھے مرلین نے کہا۔

بوڑھے نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ایک گہرا سانس لے کر بندر اُس کی طرف بڑھا کر ہاتھ پھیلا دیا۔

"ایک پاؤنڈ ہی دے دو" اس نے دردناک آواز میں کہا "لیکن تم مجھے لوٹ رہے ہو"۔

بوڑھا مرلین اب پھر ہنس رہا تھا اس نے جلدی سے ایک پاؤنڈ نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھ دیا جو اسے جیب میں ڈال کر چل دیا۔

مرلین جب بندر کو لینے کے لئے آگے بڑھا تو اُسے بوڑھے کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نظر نہ آئی جو اس کی داڑھی کی آڑ میں کھیل رہی تھی۔ اُسے اس ننھی سی مخلوق سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ یہ چوری میں ماہر تھی۔

مرلین نے یہ بھی نہ دیکھا کہ جب بوڑھا باہر گیا تو اُس نے دروازے کو زور سے بند نہیں کیا اور تھوڑا سا کھلا چھوڑ گیا۔ کیونکہ مرلین اس وقت بندر کے گلے میں رسی باندھ رہا تھا تاکہ کہیں بھاگ نہ جائے اس نے اسے جنگلے سے باندھ دیا اور اس مصروفیت میں اُسے دروازے کو دیکھنا یاد تک بھی نہ رہا جس کو بوڑھا کسی قدر کھلا چھوڑ کر خود باہر چلا گیا تھا۔ مرلین اس سودے سے بہت خوش تھا اور اس نشے میں مخمور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ وہاں بیٹھا ہوا زمرد اور اس سودے کے متعلق سوچ سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور ایک قسم کا اطمینان محسوس کر کے لذت پا رہا تھا۔ دکان تاریک اور بازار سنسان تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگ گیا پھر آنکھیں بند ہونے لگیں اور بہت دیر تک بیدار نہ رہ سکا۔

——— اُس کا سر کرسی کے ایک طرف آ لگا۔ اب وہ سو رہا تھا۔ ارد گرد کے حالات سے بے خبر اور کرسی کے نیچے بندر رسیوں کی گرہیں کھولنے میں مصروف تھا جو اُس کی پرانی عادت تھی۔ مرلین خراٹے لے رہا تھا اور بندر کی پتلی پتلی انگلیوں نے اس کام کو سر انجام دے لیا۔ اب وہ چپکے سے اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور اُس کا ہاتھ مرلین کے کوٹ کی جیب میں گیا اور جب باہر نکلا تو وہ نوٹوں کا ایک بنڈل، ایک سگرٹ کیس اور زمرد پکڑے ہوئے تھا۔

بندر نے ان اشیا کو غور سے دیکھا اور پہلے سے زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ بوڑھا مرلین ان واقعات سے بے خبر کسی دلکش خواب میں کھویا ہوا تھا۔ اُسے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ بندر جنگلے سے دروازے کی طرف جا رہا ہے اور ساتھ ہی اُسے لوٹے لئے جاتا ہے۔ بندر کے جانے کے بعد بہت عرصہ تک وہ اُسی حالت میں سوتا رہا اور مرلین کی دکان سے باہر نکل کر بندر زور سے بازار کی طرف بھاگا کہ اُسے ایک ننھا سا آواز سنائی دی وہ ٹھہر گیا اور کچھ لمحوں کے بعد بندر اسی غلیظ بوڑھے کے بازوؤں میں تھا جس نے اسے ابھی ابھی بیچا تھا۔

بوڑھا ہنس رہا تھا اور جب اس نے نوٹوں کے بنڈل اور اس کے ساتھ دیگر اشیا کو دیکھا تو اس کی مسکراہٹ اور طویل ہو گئی۔ اس نے بندر کے ہاتھوں سے ان اشیا کو لے کر بہ حفاظت جیب میں رکھ لیا اور تاریک بازاروں سے ہوتا ہوا اپنے دروازے پر آ کر ایک لمحہ کے لئے رکا اور ادھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے داڑھی ہٹا دی۔

نیچے چھپا ہوا چہرہ ناصاف ضرور تھا، لیکن جھری دار نہیں تھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ہم کامیاب ہیں میکس" اس نے آہستہ سے کہا "تمہیں مجھ پر اعتماد ہے ننھے بدمعاش . . . . ." یہ کہتے کہتے اس نے بندر کو اٹھا سینے سے لگا لیا اور زور سے بھینچا . . . .

. . . .

اُسی رات قاہرہ کے یورپی حصے میں اسی سپاہی نے ایک بے پروا سے آدمی کو بازار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ آدمی سمتر تھا اور وہ ایک خاص مکان کی طرف جا رہا تھا اور اُس کی جیب میں ایک سبز پتھر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا، ایک دفعہ پھر وہ نیچی کھڑکی کی طرف گیا اس نے شیشہ کو اپنی جگہ سے ہٹایا اور تاریکی میں ہاتھ اوپر لے جا کر

کھڑکی کی چٹخنی کو نیچے کی طرف دبایا اور کھڑکی کھل گئی۔ پھر وہ کھڑکی کے راستے اندر قالین پر کودا۔ اب کے اس کے عمل میں ہچکچاہٹ نہیں تھی بلکہ ایک گونہ اطمینان اور سکون تھا۔ وہاں سے وہ تاریک سایوں ہی سے گذرتا ہوا اس کمرے کی طرف روانہ ہوا جہاں وہ پہلے بھی جا چکا تھا اور اسے تاریکی میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔

پانچ منٹ میں دروازہ کھل گیا وہ وہاں سے مطلوبہ کمرے کی طرف گیا اور اندھیرے میں اس صندوقچی کو ہاتھ لگایا جسے وہ پہلے بھی چھو چکا تھا۔ پہلے کی طرح چابی گھما کر اس کا ڈھکنا اٹھایا اور جیب سے زمرد نکال کر اسے بغور دیکھا۔ یہ ایک بہت ہی قیمتی پتھر تھا اور خوبصورت بھی جس سے روشنی کی شعاعیں نکل نکل کر تاریکی کے سینے میں تیر سی پیوست کر رہی تھیں لیکن سمنز ایسا چور نہیں تھا جو اپنے ایک شریف ہم قوم کو نقصان پہنچاتا اور اپنے سسکیاں لیتے ہوئے ضمیر کی آواز کی طرف سے کان بند کر لیتا۔

اس نے زمرد کو احتیاط سے صندوقچی میں رکھ دیا اور صندوقچی کو اس کی مناسب جگہ پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

زمرد کے مالک کو شاید زمرد کی کہانی کی خبر تک بھی نہ ہو اور اُسے مرلین۔ سمنز اور بندر کی حقیقت کا علم بھی نہ ہو سکے اور شاید اس کو اتنا بھی پتہ نہ لگا ہو کہ زمرد کھو گیا تھا۔

جب سمنز کھڑکی سے نکل کر باہر آیا اور اُسے بند کر دیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ قاہرہ کے سپاہی نے اُس سفید فام انسان کو واپسی پر دیکھا لیکن اس کی مسکراہٹ کو نہ دیکھ سکا۔

وہ دروازہ بند کر کے میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میز پر نوٹوں کا ایک بنڈل اور سگرٹ کیس رکھا ہوا تھا اور قریب ہی ایک سو پاؤنڈ پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے سگرٹ سلگایا۔ میکس اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"کل" سمنز نے کہا "ہم قاہرہ سے چلے جائیں گے۔ میں ایک سیاح ہوں اور پولیس میری تلاش میں ہے۔ مجھے سیاحانہ زندگی پسند ہے کیونکہ یہ تمام زندگیوں کا خلاصہ ہے۔ آج میں محسوس کر رہا ہوں کہ انگریز قوم کا ایک فرد ہوں اور پہلے سے نیک ہوں"۔

میکس نے بالکل کوئی جواب نہ دیا صرف اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

سمنز سگرٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بندر کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

(ماخوذ)

"تابش صدیقی"

غزل

کیا ستم تو نے لطفِ یار کیا — دل کو بے تاب و بے قرار کیا

ہائے وہ لذّتِ سزا ہم نے — جُرم الفت ہزار بار کیا

سُن نہ سکتے تھے حال اگر میرا — کیوں نگاہوں کو لطف بار کیا

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل — کس قدر ہم نے اختصار کیا

اس کے انکار ناز پرور نے — وصل کا عہد استوار کیا

بے کسی میں غمِ محبت کا — دشمنوں ہی کو رازدار کیا

کچھ نہ بن آئی جانِ مضطر سے — جبر پر صبر اختیار کیا

آج کیوں ناز نے تمنّا سے — سخن تلخ و ناگوار کیا

سخنِ میر نے مجھے اکبر

بے نیازِ مے و نگار کیا

جلال الدین اکبر

گلبرگہ کا رُومان

گلبرگہ میں ایک ایسی عمارت ہے جس کی وجہ سے اسے ایک خصوصیت حاصل ہے اور جس کے باعث وہ ہندوستان کے تمام شہروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت اس کی عظیم الشان جامع مسجد ہے جو ہندوستان بھر میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے قرطبہ کی مشہور مسجد کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ گلبرگہ کی مسجد کے نمونے پر ہندوستان میں کبھی کوئی اور مسجد تیار نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس مسجد کا صحن سقفی ہے اور نمازیوں کو سورج کی گرمی سے بچانے کے لئے بہت موزوں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ گلبرگہ کی یہ مسجد ۱۳۶۷ء میں، جبکہ بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی، بنائی گئی۔ مسجد کی چھت گنبدوں کا ایک جنگل دکھائی دیتی ہے۔ اندرونی حصے میں محرابوں کا ایک سلسلہ ہے یہ محرابیں ایک سو چوکور ستونوں سے پیدا کی گئی ہیں اور یوں محرابوں اور ستونوں سے بے شمار بغلی راستے بن گئے ہیں۔ مسجد کی تمام عمارت کا رقبہ ۳۸۰۱۶ مربع فٹ ہے اور آرائش اور نقش و نگار کی کمی کے باوجود عمارت کی ظاہری حیثیت پُر تکلف اور بیش قیمت دکھائی دیتی ہے فرگوسن نے جو ہندوستانی فن تعمیر کا زبردست نقاد ہے اس مسجد کو ہندوستان میں افغانوں کی بنائی ہوئی بہترین مسجدوں میں شمار کیا ہے۔ پہلو کی دیواروں میں بڑی بڑی محرابیں پیدا کی گئی ہیں اور انہی سے روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کے فرحت زا صحن میں کھڑے ہو کر اگر انسان ذرا سا دھیان دے تو گلبرگہ کی گذری ہوئی شان و شوکت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ وہ گلبرگہ جو ایک زمانے میں دکن کا دارالسلطنت تھا۔

چودھویں صدی کا درمیانی زمانہ ہے، جنرل ظفر خاں نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے۔ بات اتنی ہے کہ محمد تغلق نے دو مختلف موقعوں پر اپنا دارالسلطنت دہلی سے ہٹا کر دولت آباد میں قائم کرنا چاہا۔ باغی کو فتح نصیب ہوتی ہے اور اگرچہ اس کی تاج پوشی ۱۳۴۷ء میں دولت آباد ہی میں ہوئی اس نے گلبرگہ کو اپنا دارالسلطنت منتخب کیا۔

گلبرگہ غیر معمولی افسانوں اور دل کش رومانوں کا شہر ہے اور اس کے ان رومانوی تصورات کا آغاز اُس پہلے حکمران ہی سے ہوتا ہے جس نے اسے راج دھانی کے لئے انتخاب کیا اور حسن آباد یا احسن آباد کا نام دیا۔ کیونکہ اس کا اپنا نام حسن تھا۔ گلبرگہ کے پہلے بادشاہ کی زندگی میں الف لیلہ کے افسانوں کا سا رنگ پایا جاتا ہے اور انہی کے اثر سے یہ شہر ایک خاص مشرقی لئے ہوئے ہے تاریخی لحاظ سے ان باتوں کو حقیقت کا رتبہ حاصل ہو یا نہ ہو ہماری دلچسپی رومان اور افسانے میں ہے اور ہمیں تو افسانہ ہی حقیقت سے کہیں دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ علاؤالدین حسن گنگو نے اپنی زندگی سیڑھی کے پہلے زینے سے شروع کی۔ وہ دہلی کے ایک برہمن گنگو کے ہاں ایک معمولی ملازم تھا۔ ایک دن جب وہ اپنے مالک کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا اُسے کھیت میں سے سونے اور چاندی سے بھرا ہوا ایک برتن ملا علاؤالدین دیانتداری ہی کو بہترین مصلحت خیال کرنے والوں میں سے تھا اس لئے برتن جوں کا توں مالک کے پاس پہنچا دیا۔ گنگو برہمن پر اس دیانتداری کا بے حد اثر ہوا اور اس نے اس تمام معاملے کا حال اپنے آقا غیاث الدین تغلق کے گوش گذار کر دیا۔ غیاث الدین نے یہ سن کر حسن کو ایک سو سواروں کی سرداری سپرد کر دی۔ گنگو برہمن شاہی دربار کا نجومی تھا۔ اُس نے حسن کی جنم پتری بنائی اور اس سے ظاہر ہوا کہ ایک روز حسن شاہی رتبہ حاصل کرے گا۔ حسن ان باتوں سے گنگو کا بہت ممنون ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر ایسا دن آیا تو وہ تخت پر بیٹھتے ہی اپنے پرانے مالک کی یاد میں گنگو بہمن کا لقب اختیار کرے گا۔ حسن اپنی بات کا دھنی تھا۔ ترقی کے بعد اپنے پہلے مالک سے بے اعتنائی کی بجائے اس نے اپنے عہد کا پاس کیا اور مسلمان ہونے کے باوجود اپنے پرانے مالک کی ذات بہمنی کو اپنا لقب بنایا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنی گلبرگہ کی نئی سلطنت کا عہدہ انچی گنگو کو بنا دیا۔

حسن نے بے اندازہ دولت سمیٹی۔ فرشتہ کی تاریخ سے

معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین حسن نے اپنے بڑے بیٹے محمد کی شادی پر دس ہزار خلعت اپنے دربار کے امرا میں تقسیم کئے اور ان کے علاوہ دو سو ہیرے سے مرصع خنجر بھی عنایت کئے۔ ۱۳۵۸ء میں علاؤالدین حسن مر گیا اور عنان سلطنت محمد کے ہاتھ میں آئی۔ علاؤالدین حسن کا مقبرہ گلبرگہ میں ہے اور اس کی تعمیر میں تکلف کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ استحکام اور سادگی ہی اس کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔ یہ مقبرہ گلبرگہ کے سات دوسرے بادشاہوں اور حسن کے بعد تخت پر آنے والوں کے مقبروں سے ذرا فاصلے پر ہے اور اس کی عمارت کے زور اور استحکام سے پہلے بہمنی بادشاہ حسن کی جسمانی اور اخلاقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

گلبرگہ کے پرانے قلعے کی مضبوطی سے اس کے تعمیر کرنے والے سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کی زبردست قوت ارادہ آج اس قدر انقلاب زمانہ کے باوجود بھی پڑتی ہے۔ گلبرگہ کا قلعہ چوکور اور زمین سے قریباً پچاسی فٹ بلند ہے۔ اوپر کی جو توپیں موجود ہیں وہ اپنے حجم کے لحاظ سے ہولناک ہیں۔ اگرچہ یہ توپیں اب اتار لی گئی ہیں اس کے باوجود ان کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اس زمانے کی شان و شوکت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب ان توپوں نے کئی اہم کام سرانجام دئے تھے قلعے کی چوٹی سے گلبرگہ اور اس کے نواحی علاقوں کا ایک دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ بیرونی دیوار مٹی سے بنائی گئی ہے لیکن وہ پر شکوہ اور مضبوط ہے۔ اندرونی دیوار برجوں، مورچوں اور پناہ گاہوں کے ایک ان گنت سلسلے کو ملاتی ہے جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے گول پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یوں گویا قدرت نے اپنے خام مواد کو انسانی ساخت کے سانچے میں ڈھالا ہوا ہے۔ مدافعت کے دونوں خطوط کے درمیان خندق واقع ہے جو اب خالی اور بالکل بے ضرر ہے لیکن ایک وقت تھا کہ یہی خندق دشمن کے حملے روکنے کے لئے ایک زبردست رکاوٹ تھی۔ خندق کی تہ میں مختلف نباتات نے اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اور یوں اس سے ایک عجیب ویرانی سے ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جب محمد شاہ بہمنی نے ورنگل کے راجہ پر فتح حاصل کر لی تو راجہ نے ایک ہاتھی دانت کا تخت گلبرگہ کے بادشاہ کی نذر کیا۔ اس تخت پر سونے اور جواہرات کا کام کیا ہوا تھا۔ چند سال کے بعد اس تخت کی قیمت کا اندازہ چھتیس لاکھ پاؤنڈ کیا گیا۔ روایات کے مطابق گلبرگہ کی جامع مسجد پہلے دربار کا کام بھی دیتی تھی۔ چنانچہ یہ نیا تخت وہیں رکھا گیا تھا اور علاؤالدین حسن کا پرانا سیمیں تخت خزانے میں داخل کر دیا گیا۔

ڈاکہ زنی کا قلع قمع کرنے کے لئے محمد شاہ کے طریقے بہت باقاعدہ اور کاری تھے۔ اس کے زمانہ حکومت میں ایک سال کے اندر اندر آٹھ ہزار ڈاکوؤں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا اور ان کے سر گلبرگہ کے دروازوں کے باہر کھمبوں پر آویزاں کر دئیے گئے۔ تاکہ عوام کو عبرت ہو۔ محمد شاہ ۱۳۷۵ء میں مر گیا۔ اس کے بعد مجاہد شاہ کی باری آئی۔ لیکن اسے تین ہی سال کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد مجاہد کا قاتل تخت کا مالک بنا لیکن ایک روز جامع مسجد میں نماز کے دوران میں اسے بھی خنجر سے ہلاک کر دیا گیا۔

محمد شاہ ثانی کے زمانے میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ اس بادشاہ کو بعض اوقات ارسطو کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں علم و ادب کا مرکز ہونے کی حیثیت سے گلبرگہ کی شہرت دور دور تک جا پہنچی محمد شاہ ثانی نے فارسی کے مشہور عالم شاعر حافظ شیرازی کو بھی گلبرگہ آنے کی دعوت دی۔ اور حافظ نے آنا قبول بھی کر لیا۔ محمد شاہ ثانی نے حافظ کے لانے کے لئے ایک جہاز روانہ کیا لیکن بدقسمتی سے ارمز کے مقام پر ٹھیرنے کے بعد جہاز کو طوفان نے آ لیا اور اسے واپس بندرگاہ میں جانا پڑا۔ لیکن حافظ نے سمندر کے سفر کی جانفشانی کا ایک مظاہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ گلبرگہ پہنچ کر جو تحائف اسے ملیں گے ان کی قیمت سمندر کے ایک لمبے سفر کے مصائب کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔ اس لئے اس نے سفر کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اگر حافظ شیرازی اس وقت ہندوستان آ جاتا تو اس کا یہ سفر تاریخی اور ادبی لحاظ سے ایک یادگار سفر ہوتا اور ہندوستان کے ادب کی تاریخ پر اس کے نقوش لافانی ثابت ہوتے لیکن محمد شاہ ثانی نے شاعر کی ستائش کے طور پر، اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سفر کے تکمیل نہ پانے کے باوجود بلبل شیراز کو ایک ہزار اشرفیاں بھجوا دیں۔

وہ مقبرہ جس کی گلبرگہ میں سب سے بڑھ کر عزت کی جاتی ہے بندہ نواز گیسو دراز کا ہے۔ یہ بندہ نواز ۱۴۱۳ء میں گلبرگہ میں وارد ہوئے بندہ نواز کا تعلق اسی چشتی خاندان سے تھا جس سے شیخ سلیم چشتی جن کا مقبرہ فتحپور سیکری میں ہے پیدا ہوئے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا گلبرگہ میں بندہ نواز کے مقبرے کی عمارت دلکش اور پروقار ہے۔ یہ مقبرہ ۱۶۴۰ء کے قریب تعمیر کیا گیا تھا اور اسے بندہ نواز کے ایک وارث ہی نے تیار کیا تھا۔ دیواروں پر نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنہرے رنگوں میں منقش ہیں۔ ایک فارسی رباعی میں بندہ نواز کی نیکی کی تعریف بھی منقوش ہے۔ اس مقبرے کے قریب کئی

ایسی عمارتیں ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب نے بنوائی تھیں اور وہ اکثر اس مقبرے کی زیارت کے لئے گلبرگہ آیا کرتا تھا۔ ان عمارتوں میں ایک بڑی سرائے بھی ہے جہاں زائرین کے رہنے کا انتظام مفت کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک نہایت خوبصورت محرابی پل ہے۔ سرائے کے احاطے میں زائرین اور فقیروں کی آوازوں کا ملا جلا شور برپا رہتا ہے اور تیسرے پہر کے وقت جبکہ رات کا کھانا تیار کیا جا رہا ہو۔ چھوٹے چھوٹے مطبخوں سے اُٹھنے والا دھواں ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں لرزاں سایوں کو ایک نیلا اور خاکستری لباس پہنا دیتا ہے۔

۱۶۸۶ء میں گلبرگہ کو دہلی کی سلطنت کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور ۱۶۸۶ء میں خواجہ گیسو دراز کی درگاہ پر اورنگ زیب کی آمد ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس نے اس وقت بیجاپور کو فتح کر لیا تھا۔ اور گولکنڈہ کی طرف ایک اور سلطنت پر قابو پانے کے لئے جا رہا تھا۔

بندہ نواز کا مقبرہ شہر کی دیواروں سے باہر واقع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ نواز نے فیروز شاہ بہمنی کے بیٹے کو اپنی برکت سے محروم قرار دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ فیروز شاہ کا بھائی احمد آیندہ تخت پر بیٹھے گا۔ اس لئے بادشاہ نے بندہ نواز پر بغاوت کا الزام لگایا اور کہا کہ اُس کی تعلیم سلطنت کے لئے بے حد مضر ہے لیکن احمد نے بندہ نواز کی حمایت کی اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ بندہ نواز شہر کو چھوڑ کر اس مقام پر رہنے لگے جہاں یہ مقبرہ واقع ہے اور یہی مقام گذشتہ پانچ صدیوں میں گلبرگہ کے لئے ایک برکت ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اس درگاہ کی شہرت کی وجہ ہی سے گلبرگہ کی شہرت جوں کی توں قایم رہی ہے۔ ہزاروں زائرین اور تاجر ہر سال گلبرگہ آتے ہیں۔ ستمبر کے مہینے میں چودہ دن تک بندہ نواز گیسو دراز کا سالانہ عرس ہوتا ہے اور اس میلے میں مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اس میلے کی وجہ سے شہر کی تجارت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

فیروز شاہ بہمنی گلبرگہ کے عظیم ترین بادشاہوں سے تھا اور اُس کی شخصیت ایک زبردست شان و شکوہ کی مالک تھی۔ اُس کے زمانہ سلطنت میں گلبرگہ کی شان اور ترقی انتہائی زینے پر تھی۔ ہر سال شاہی انتظامات کے ماتحت گوا اور چاول سے بیرونی تجارت کے لئے جہاز روانہ کئے جاتے تھے۔ فرشتہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ بہمنی مختلف زبانوں کا ماہر تھا۔ اُس کے حرم میں تیرہ سے زیادہ مختلف قوموں کی عورتیں تھیں اور فیروز شاہ اُن سب سے اُن کی قومی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اُس میں صرف دو ہی باتیں ایسی تھیں جنہیں مذہبی لحاظ سے غیر مستحسن کہا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شراب کا عادی تھا اور دوسرے موسیقی کا بے حد شائق تھا۔ وہ اپنی ان عادتوں کے متعلق عموماً اظہار افسوس کیا کرتا تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ چونکہ موسیقی اس کی روح کو خدا کی طرف راغب کرتی ہے اور شراب وہ کبھی اتنی مقدار میں استعمال نہیں کرتا کہ نیک و بد کا امتیاز باقی نہ رہے اس لئے اُسے توقع ہے کہ اُس کے یہ دو گناہ خدا معاف کر دیگا۔

گلبرگہ سے بارہ میل کے فاصلے پر فیروز آباد کے کھنڈر واقع ہیں۔ یہ عیش و عشرت کا ایک مضبوط اور زبردست شہر تھا جسے فیروز شاہ کی عشرت پسند طبیعت نے بنا کر اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ اس شہر کی عمارتیں اب بالکل کھنڈر بن چکی ہیں۔ یہاں کئی ایک دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ فیروز آباد کے بازار اور کوچے وسیع اور باقاعدہ تھے۔ اس کی دو مشہور عمارتیں "کنچنی محل" یعنی رقاصہ عورتوں کا محل، اور "شاہی حرم" ہیں۔ زنانہ حرم میں بہت سے شاندار صحن بھی ہیں اور دریائے بھیما سے ایک نہر نکال کر یہاں پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر صحن کی مکینوں پر بادشاہ کی منظور نظر حرموں کی حکومت ہوتی تھی اور حرم کے تمام انتظامات بہت سختی اور باقاعدگی کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے۔ فیروز شاہ ایک بہت ہوشیار اور عقلمند انسان تھا۔ چنانچہ حرم کی ہر عورت یہی سمجھتی تھی کہ وہی سلطان کو سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔

گلبرگہ میں فیروز شاہ کا جو مقبرہ ہے وہ بہمنی مقبروں میں ایک خاص رتبہ رکھتا ہے۔ یہ ایک قلعہ نما عمارت ہے اور اس پر بڑے بڑے گنبد ہیں۔ فیروز شاہ کے اس مقبرہ میں جالی کا کام خاص طور پر قابل دید ہے اندرونی حصے کی آرائش بھی شاندار ہے اور بہ ہیئت مجموعی یہ عمارت اس عظیم الشان بادشاہ کے شایان شان ہے۔ فیروز شاہ کی راجہ وجے نگر سے ملاقات ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور شان و شوکت کی نمائش کے لحاظ سے اپنے مقابلے میں بہت کم مثالیں رکھتی ہے۔

گلبرگہ کے قلعے کے قریب ہی سراج الدین کی درگاہ ہے۔ یہ اپنے تناسب اور نازک میناروں کی وجہ سے بہت خوبصورت عمارت ہے سراج الدین گلبرگہ میں ۱۳۵۱ء کے قریب آئے اور ان کی درگاہ بھی بندہ نواز کی درگاہ کے برابر ہی مقدس خیال کی جاتی ہے۔

گلبرگہ میں جو مقبرہ ہے وہ گنبدوں والا ہے۔ لیکن ایک مقبرہ اس

لحاظ سے بھی امتیاز رکھتا ہے۔ یہ رکن الدین کا مقبرہ ہے۔ جب بندہ نواز گلبرگہ میں آئے تو رکن الدین پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ رکن الدین اور بندہ نواز میں ایک جھگڑے کی وجہ سے رکن الدین اس جگہ الگ تھلگ رہنے لگے جہاں کہ ان کا مقبرہ اب موجود ہے۔ اس درگاہ پر بھی ہزارہا لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اس عمارت کے قریب ہی ایک اور عمارت ہے۔ اس کا نام چور گنبد ہے۔ اس عمارت سے بھی ایک خاص روایت وابستہ ہے بندہ نواز کے وقت بھی یہ عمارت موجود تھی اور ان کی خدمت میں ان کے استعمال کے لئے پیش کی گئی تھی۔ لیکن بندہ نواز نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس عمارت کو ایک سود خوار مہاجن نے بنایا تھا اور سود کے روپے سے تیار شدہ عمارت میں رہنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ اس واقعے کے بعد سے اس عمارت کو لوگ منحوس خیال کرنے لگے اور یہ غیر آباد ہی رہنے لگی۔ لیکن ایک چور اور رہزن تھا جو بندہ نواز کی اصول پرستی کا قائل نہ تھا۔ اُس نے اس عمارت کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے بے حد موزوں پایا اور اس میں اقامت اختیار کر لی۔ بہت عرصے تک لوگوں کو اس بات کا علم نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن صیاد آپ اپنے جال میں آگیا۔ اور قانونی کارروائی کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اُس دن سے اس عمارت کا نام چور گنبد مشہور ہو گیا۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ ولی بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اس نے دارالسلطنت گلبرگہ سے بیدر تبدیل کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے بعد سے گلبرگہ میں پے در پے انقلاب آتے گئے۔ کبھی بہمنی خاندان کے قبضہ میں چلا جاتا اور کبھی اس پر بیجاپور کے عادل شاہی قابض ہو جاتے۔ ۱۶۵۷ء سے ۱۷۲۴ء تک گلبرگہ مغلوں کے قبضے میں رہا اور پھر نظام کے اعلانِ خود مختاری کے بعد سے ریاست دکن میں شامل کر لیا گیا۔

گلبرگہ میں مقبروں کی اتنی کثرت ہے کہ اس کی بیشتر پرانی عمارتیں دفاتر کے طور پر استعمال ہوتی رہیں لیکن اب محکمۂ آثارِ قدیمہ حیدرآباد کی محنت سے تمام عمارتوں کا مناسب انتظام کیا جا چکا ہے۔ اور بہمنی بادشاہوں کی یادگاریں محفوظ ہیں۔

(ماخوذ) **فیروزہ خانم**

اعجازِ بیان

بے حجابانہ مرے پاس آئیے !   آئیے آکر یہیں رہ جائیے

پھر کوئی مبہم اشارہ کیجئے   جو نہ سمجھوں پھر وہی کہہ جائیے

شادماں ہو جاؤں گو پاؤں نہ بھید   اس طرح کچھ زیرِ لب فرمائیے

مجھ کو دھوکا ہو نوازا آپ نے   کاسۂ سر یوں مرا ٹھکرائیے

فرطِ حیرت سے میں سمجھوں خواب ہے   دفعتاً یوں میرے پاس آجائیے

کچھ خفا ہیں آپ میرے خواب میں   آئیے اس خواب سے چونکائیے

یوں نہ اُٹھ کر جائیے چیں بر جبیں   ہاں خدارا مسکراتے جائیے

میرے شکوے آپ یوں ہی ٹالئے   کچھ نہ سنئے اور خفا ہو جائیے

آہ وہ بے اختیاری شوق کی   سنئے سب کچھ اور چپ رہ جائیے

کش مکش کا ہائے وہ عالم نہ پوچھ !   بڑھئے آگے اور پھر رک جائیے

پھر اُٹھا لوں آپ کو آغوش میں   پھر اُسی انداز سے گر جائیے

کچھ نہ کہئیے آپ سے بس آپ کو　　دیکھتے ہی دیکھتے کھو جائیے

دیکھئیے میری نظر سے اپنا حُسن　　دیکھئیے اور دم بخود رہ جائیے

پھر مری بے باکیاں ہیں منتظر　　پھر اُسی انداز سے شرمائیے

پھر اُسی انداز سے شرمائیے　　جھینپ کر دیوار سے لگ جائیے

میں جو چاہوں چھیڑنا تو سر بسر　　پیکرِ شرم و حیا بن جائیے

اور کبھی موقع ملے گر آپ کو　　چھیڑئیے اور چھیڑ کر چھپ جائیے

مت خدا را برگِ گل کو چومئیے　　مت خدا را دور سے ترسائیے

لیجئیے یہ دل ہے اس کو روندئیے　　روندئیے مت پھول کو باز آئیے

کر چکا غیر آپ سے پہلو تہی　　اب تو پہلو میں خدا را آئیے

لائیے دل تک مرے جسمِ گداز　　ریشمی ملبوس کو سرکائیے

دیکھئیے اعجاز! جاں اِس چھیڑ پر
اس ادائے ناز پر مر جائیے

سعید احمد اعجاز

جنگ عالمگیر کے بعد ایک ایکٹ کی تمثیلوں کا ظہور ہوا اور ان کی روز افزوں مقبولیت اب اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اب جبکہ افق یورپ پر جنگ کے سیاہ بادل پھر سے امڈے چلے آ رہے ہیں اور یورپین سلطنتوں نے جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح افواج کو اپنی سرحدوں پر متعین کر دیا ہے اور ہفتوں اور دنوں کا نہیں بلکہ گھنٹوں کا سوال ہے کہ تاریخ عالم کی مہیب ترین اور بعید از خیال تباہ کن جنگ شروع ہو جائے۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ ادب کی اس صنف پر اس آنے والی مہیب جنگ کا کیا اثر ظاہر ذیل میں ناظرین ادبی دنیا کی خدمت میں اسی قبیل کا ایک ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے جو ایک طرف تو ان نوجوانوں کے خیالات عیاں کرتا ہے جنہوں نے جنگ عالمگیر میں حصہ لیا اور دوسری طرف ان قدامت پسند بزرگوں کی ذہنیت ظاہر کرتا ہے جو جنگ میں نہیں گئے لیکن سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹوں یا بھتیجوں کو میدانِ کارزار میں بھیج کر اپنے قومی فرائض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ اس تمثیل کے نمایاں کردار فلپ اور اس کا چچا جیمس ہیں اور یہ دونوں کردار گویا دو پشتوں کے نمونے ہیں اور انہیں کی باہمی کشمکش اور بالآخر نئی پود کا غلبہ اس تمثیل کا ماحصل ہے۔

اس ڈرامے کا مصنف اے اے **ملن** ایک قابل صحیفہ نگار ہے جس کے کمال کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ چوبیس سال کی عمر میں لندن کے مشہور عالم جریدہ "پنچ" کا (جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مذاحیہ رنگ میں باریک سے باریک سیاسی تمدنی اور قومی مسائل پیش کر دیتا ہے) مدیر معاون ہو گیا۔ جنگ عالمگیر شروع ہونے پر وہ بھی میدان کارزار میں چلا گیا اور جہاں باقی سپاہی اپنے اوقاتِ فرصت تاش اور گاف میں گزارتے تھے وہ ایک زیادہ دلچسپ کھیل — مضمون نگاری میں گزارتا۔ ملن کے کردار وہی ہستیاں ہیں جو ہمیں انگلستان کے عام قصبات میں ملیں گی۔ مکالمہ میں وہ اپنے اوجِ کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پنچ کے مضمون نگار کی تحریر میں مذاحیہ رنگ ضرور ہو گا۔ ملن کا خوش مذاق طرزِ نگارش خصوصی ہے اور لفاظی کا محتاج نہیں۔

جنگ

(ایک کامیڈی ایک ایکٹ میں)

افراد:- ۱۔ چچا جیمس ۲۔ چچی ایملی ۳۔ فلپ ۴۔ میری ۵۔ مسز ہگنز

سین:- کرامول روڈ پر چچا جیمس کے مکان کا ایک کمرہ

وقت:- عارضی صلح سے اگلا روز

چچا جیمس کے مکان کا ہر ایک کمرہ وسط عہد وکٹوریہ کی ثقیل طرز پر سجا ہوا ہے۔ صبح کے بیٹھنے کا کمرہ درمیان کی بڑی میز سے لے کر دیوار کی تصویروں تک باقی کمروں سے نسبتاً مکلف اور زیادہ معزز ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں۔ پچھلی طرف والا دروازہ ہال میں کھلتا ہے اور اس جانب والا کھانے کے کمرے میں۔

[فلپ ہال میں سے نکلتا ہے اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے بظاہر اُسے وہاں کچھ نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ بیٹھنے والے کمرے میں واپس آ جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ اور گھنٹی بجاتا ہے دس بج چکے ہیں اور وہ ناشتہ کرنا چاہتا ہے اخبار اٹھا کر آتشدان کے قریب ایک بڑی آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ایک تئیس سالہ خوشرو اور مضبوط جوان ہے۔ اس کے چہرے سے مضبوط قوت ارادی ٹپکتی ہے]

(خانساماں میری داخل ہوتی ہے)

میری۔ آپ نے گھنٹی بجائی تھی ماسٹر فلپ!

فلپ۔ (بے پروائی سے) ہاں۔ مہربانی کر کے مجھے ناشتہ لا دو۔ میری!

میری۔ (سرد مہری سے) ناشتہ ختم ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔

فلپ۔ بیشک اسی واسطے تو میں نے گھنٹی بجائی تھی تم مجھے دو ایک انڈے ابال کر دے سکتی ہو اور کافی لانا۔ چائے نہیں۔

میری۔ میں نہیں جانتی مسز ہگنز کیا کہیں گی

فلپ۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) مسز ہگنز کون؟

میری۔ باورچن وہ اس طرح کے کاموں کی عادی نہیں۔

فلپ۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ کچھ کہے گی؟

میری۔ میں نہیں جانتی وہ کیا کہیں گی۔

فلپ۔ اگر تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو کوئی مضائقہ نہیں تاہم مجھے امید نہیں کہ اس کے سننے سے مجھے کوئی صدمہ ہوگا۔ فوج میں رہ کر سرد و گرم برداشت کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے (مسکراتا ہے)

میری۔ خیر جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا کروں گی۔ مگر پورے آٹھ بجے ناشتہ یہاں کا قاعدہ ہے۔ جیسے آپ کے جنگ پر جانے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

فلپ۔ جنگ پر جانے سے پہلے مجھ سے کئی حماقتیں سرزد ہوا کرتی تھیں۔ اب مجھے ان کی طرف نہ کھینچو (ذرا درشتی سے) دو انڈے اور اگر خشک گوشت ہو تو وہ بھی لے آؤ (دوسری طرف چلا جاتا ہے)

میری۔ (جانے کی تیاری کرتے ہوئے مشکوک لہجے میں) میں نہیں جانتی مسز ہگنز کیا کہیں گی! (جاتی ہے)

[جونہی وہ جاتی ہے چچی ایملی داخل ہوتی ہیں۔ چچی ایملی وسط عہد وکٹوریا کی ایک نرم دل عورت ہے جس کے دل میں کبھی ووٹ کا حق حاصل کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی]

ایملی۔ اخاہ۔ تم ہو فلپ! عزیزم۔ سوئے تو اچھی طرح ہو نا تم؟

فلپ۔ ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ شکریہ چچی ایملی۔ آپ کا کیا حال ہے؟

ایملی۔ اور کیا تم کو ناشتہ مل گیا؟ ہا شریر لڑکے تم لیٹ ہو۔ میں تو ہمیشہ سمجھتی تھی کہ فوجیوں کو علی الصبح اٹھنا پڑتا ہے۔

فلپ۔ ہاں ہاں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ فوج چھوڑ چکتے ہیں تو دیر سے اٹھتے ہیں۔

ایملی۔ عزیز من! میرا خیال تھا کہ چار سال کی عادت تم اس قدر جلد بھول نہیں جاؤ گے۔

فلپ۔ متواتر چار سال تک ہر روز جب میں علی الصبح بستر میں سے نکلتا تو یہی سوچا کرتا تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا جب میں پوری نیند لے سکوں گا۔

ایملی۔ گویا تم نیند پوری کرنا چاہتے ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اتنے سال خندقوں میں رہنے کے بعد شاید نرم گرم بستروں میں تمہیں نیند ہی نہ آئے۔

فلپ۔ نہیں سارا وقت خندقوں میں تھوڑا ہی گزرتا ہے اور افسروں کو تو چھٹی بھی مل جاتی ہے۔

ایملی۔ (طعنہ دینے کے انداز میں) ہمارے ساتھ تو تم نے کوئی چھٹی نہیں گزاری فلپ!

فلپ۔ (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) درست ہے لیکن آپ جانتی ہیں پیاری چچی . . . .

ایملی۔ ہاں یہاں پر خوش وقتی کے سامان نہیں ہیں اور تم تھوڑے سے وقت کو غنیمت جان کر اسے آزادی سے گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن تمہارے چچا نے اس بات کو محسوس کیا ہے۔ عزیز من آخر تم یہاں پر کچھ سال رہتے رہے ہو اور وہ ہیں بھی تمہارے سرپرست۔

فلپ۔ مجھے بھی معلوم ہے اور پیاری چچی ایملی آپ میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی ہیں لیکن (ناشائستگی سے) چچا جیمس اور میں . . . .

ایملی۔ ہاں! ہاں! وہ ذرا سخت طبیعت کے ہیں میں ان کی طبیعت سے واقف ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں فلپ۔

فلپ۔ ہوں! لیکن مجھے ہمیشہ اُن سے ڈر لگتا تھا اور میرا خیال ہے وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔ کل رات بھی ویسے ہی تھے اور ناشتہ وہ اب بھی آٹھ بجے کرتے ہیں۔ روپیہ تو خوب آتا رہا ہوگا۔

ایملی۔ وہ مجھے کبھی ٹھیک طرح نہیں بتاتے۔ ایک دن زائد منافع کے ٹیکس کی نامعقولیت کا ذکر کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو جام JAM فوج میں بہت لگتا ہے۔

فلپ۔ بالکل۔

ایملی۔ اور یہ کام ان کے بہت راس آیا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے حصے کی قومی خدمت خندقوں میں مصروف سپاہیوں کے کام و دہن کی تواضع سے کر رہے ہیں۔ (میری داخل ہوتی ہے)

میری۔ مسز گھنز آپ سے ملنا چاہتی ہیں بیگم (وہ فلپ کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھتی ہے جیسے کہ وہ کہہ رہی ہو "اب بتاؤ")

ایملی۔ اچھا میں آتی ہوں (اٹھتے ہوئے۔ فلپ سے) میرا خیال ہے بہتر ہوگا میں دیکھ آؤں وہ کیا چاہتی ہے۔

فلپ۔ (میری سے۔ درشتی آمیز لہجے میں) مسز گھنز کو ادھر بلاؤ (میری رک جاتی ہے اور اپنی مالکہ کی طرف دیکھتی ہے) جلدی کرو۔

ایملی۔ (متغیر ہو کر) فلپ عزیزم میں نہیں جانتی مسز گھنز کیا کہے گی۔

فلپ۔ ہاں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کہتی کیا ہے۔

ایملی۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میرے لئے باہر ہی جانا بہتر ہوگا۔

فلپ۔ (اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) نہیں نہیں کوئی ضرورت نہیں در اصل وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

ایملی۔ تم سے!

فلپ۔ ہاں۔ پانچ منٹ ہوئے میں نے ناشتہ منگایا تھا۔

ایملی۔ اوہ۔ فلپ تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں ناشتہ لا دیتی۔ گو میں نہیں جانتی مسز گھنز کیا کہتی۔

(ایک نہایت غصیلی آواز باہر سے سنائی دیتی ہے اور مسز گھنز اکڑتی اور تنتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

مسز گھنز۔ آپ نے بلایا ہے مجھے بیگم صاحبہ؟

ایملی۔ (ترساں) ہاں ۔۔۔ ار ۔۔۔ میرا خیال تھا تم ۔۔۔ شاید ۔۔۔

فلپ۔ (بات کاٹ کر) میں نے تمہیں بلایا ہے مسز گھنز۔ مجھے تھوڑا سا ناشتہ درکار ہے۔ کیا میری نے تمہیں نہیں بتایا؟

مسز گھنز۔ ناشتہ آٹھ بجے ہوتا ہے جیسا کہ جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں ہوتا رہا ہے اور جب تک کہ مجھے مزید احکام نہ ملیں ہوتا رہے گا۔

فلپ۔ ہاں تم کو ابھی مزید احکام دیئے گئے ہیں دو انڈے اور اگر خشک گوشت ہو ۔۔۔

مسز گھنز۔ احکام! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس گھر میں مجھے کس سے احکام لینا ہیں۔

فلپ۔ اندریں حال مجھ سے۔

مسز گھنز۔ (اپنا کارگر حربہ استعمال کرتے ہوئے) اس صورت میں بیگم صاحبہ میں ایک مہینہ کا نوٹس دیتی ہوں۔ آج سمیت۔

فلپ۔ (پیشتر اس کے کہ ایملی کچھ کہہ سکے) یقیناً اور میرا خیال ہے کہ تم پسند کرو گی کہ ہم بھی تمہیں نوٹس دیں۔ کیونکہ پھر تم ابھی جا سکتی ہو۔ یہ انتظام فوراً ہو سکتا ہے (قلم اور چیک بک نکالتے ہوئے۔ ایملی سے) اس کو کیا تنخواہ دیتے ہیں آپ؟

ایملی۔ (آہستہ سے) پینتالیس پاؤنڈ

فلپ۔ (دیکھتے ہوئے) بارہ ضرب پینتالیس (مسز گھنز سے خندہ پیشانی سے مگر بغیر اس کی طرف دیکھنے کے) مجھے امید ہے کہ تم "کاکس" کا چیک لے لو گی بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں لیکن کوئی حرج نہیں (کاپی سے پھاڑتے ہوئے) یہ لیجئے۔

مسز گھنز۔ (مبہوت ہو کر) یہ کیا؟

فلپ۔ نوٹس کی بجائے تمہاری تنخواہ۔ تم ابھی جا سکتی ہو۔

مسز گھنز۔ جانے کو کس نے کہا ہے؟

فلپ۔ (حیران ہو کر) معاف کرنا میرا خیال ہے کہ تم نے کہا تھا۔

مسز گھنز۔ نہیں ۔ اگر صرف ناشتے ہی کا جھگڑا ہے تو یہ معمولی بات ہے اور اگر مجھ سے اچھی طرح کہا جائے تو میں کیا نہیں کر سکتی۔

فلپ۔ تو پھر میں کہے دیتا ہوں۔ "دو انڈے۔ خشک گوشت اور کافی" اور میری گوشت ابھی دے جائے۔ اتنی دیر میں وہی کھاؤں گا (مڑتے ہوئے) شکریہ

مسز گھنز۔ اچھا میں ... ہوں ... اچھا ... (لاجواب ہو کر باہر چلی جاتی ہے)

فلپ۔ (متحیر) یہی کہا کرتی ہے۔ اس میں تو کوئی ڈرنے کی بات نہیں۔

ایملی۔ تم نے یہ کیسے کیا فلپ! میں تو ضرور ڈر جاتی۔

فلپ۔ دیکھو میں نے دو سال کے لئے تمہارا کام کر دیا ہے۔

ایملی۔ کیا کام؟

فلپ۔ ناظم مطبخ کا ... میرا خیال ہے میں گوشت کا پتہ لوں۔

(مسکراتا ہے اور کھانے کے کمرے میں جاتا ہے۔ ایملی کمرہ میں اِدھر اُدھر پھرتی ہے اور اپنی عادت کے موافق بے ترتیب چیزوں کو قرینے سے رکھتی جاتی ہے۔ اتنے میں چچا جیمس داخل ہوتے ہیں جیمس بڑے تن و توش کا آدمی نہیں ہے اور نہ سیاہ کوٹ میں کچھ رعب دار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی داڑھی گھنی نہیں ہے اور نہ اس کی ٹھوڑی سے عزم راسخ ظاہر ہوتا ہے لیکن اس میں کچھ ایسی درشتی پائی جاتی ہے جسے کمزور لوگ قوت اور حوصلہ کی پختگی سے تعبیر کرتے ہیں)

جیمس۔ ابھی نیچے نہیں آیا فلپ؟

ایملی۔ ابھی ناشتہ کرنے لگا ہے۔

جیمس (گھڑی دیکھتے ہوئے، دس بجے ہیں (گھڑی) سے بند کرتے ہوئے جیب میں رکھ کر) دس میں نے کہا دس بجے ہیں ایملی۔

ایملی۔ ہاں جی! میں نے سن لیا ہے۔

جیمس۔ پھر تم کچھ بولتیں کیوں نہیں۔

ایملی۔ میرا خیال ہے وہ جنگ کی وجہ سے تھکا ہوا ہے۔

جیمس۔ یہ وقت کی پابندی نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔ میں امید کرتا تھا کہ وہ جنگ سے پابندیٔ وقت سیکھ کر آئے گا۔

ایملی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے سیکھی ضرور ہے۔ لیکن اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بھول چکا ہے۔

جیمس۔ پھر وہ جتنی جلدی سیکھ لے بہتر ہوگا میں خاص طور پر اسی سے گفتگو کرنے کی خاطر ابھی تک دفتر نہیں گیا اور (گھڑی دیکھتے ہوئے) دس بج چکے ہیں۔ دس سے اوپر ہو چکے ہیں اور اس کا پتہ ہی نہیں۔ میرا سارا دن ضائع ہو رہا ہے۔

ایملی۔ کس بات کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ آپ کو اس سے؟

جیمس۔ اس کے مستقبل کے متعلق اور کیا؟ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فی الفور کاروبار میں شریک ہو جانا اس کے لئے بہتر ہوگا۔

ایملی۔ کیا آپ واقعی اس سے گفتگو کرنے لگے ہیں یا یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ ضرور بزنس میں آ جائے۔

جیمس۔ (متحیر) کیا مطلب ہے تمہارا! اس میں فرق کیا ہے! ظاہر ہے کہ ہم گفتگو کریں گے اور قدرتی طور پر وہ میرے کہنے پر عمل کرے گا۔

ایملی۔ میرا خیال ہے وہ بمشکل اپنا انتظام خود کر سکتا ہے بیچارا لڑکا!

جیمس۔ بہرکیف جب تک وہ پچیس سال کا نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنا روپیہ لے سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

ایملی۔ (بہر اساں) لیکن میرا خیال ہے آپ کو کچھ نہ کچھ اس کی رائے پر چلنا چاہئے۔ آخر وہ ہمارے لئے لڑائی میں شامل رہا ہے۔

جیمس۔ (آتشدان کی طرف پشت کرتے ہوئے) ایسے فضول خیالات بہت عام ہو رہے ہیں۔ میں ان پر سخت اعتراض کرتا ہوں میں ڈینگ نہیں مارتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بھی اپنے حصے کی خدمت کی ہے۔ میں نے اپنا بھتیجا قوم کے حوالے کر دیا . . . اور . . . آلوؤں کی کمی کو اس حد تک برداشت کیا کہ تم کو بھی معلوم نہیں اور وہ تو خوش قسمتی سے تمہیں خیال ہو گیا کہ تم آلو پسند نہیں کرتیں ورنہ او رہی مصیبت بنتی اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں گو میں "زائد منافع کے ٹیکس" کو بالکل واہیات سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی ادا کرتا رہا ہوں اور میں ڈینگ بھی نہیں مارتا کہ میں اتنا زائد منافع کا ٹیکس" ادا کرتا رہا ہوں۔

ایملی۔ (متاثر نہیں ہوتی) خیر فلپ چار سال باہر رہ کر آدمی بن آیا ہے بہرکیف وہ لڑکا نہیں رہا کہ اسے بتایا جائے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت کچھ سیکھ کر آیا ہے۔

جیمس۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بم چلانے۔ ریوالور چلانے اور لائنیں بنا کر چلنا سیکھ آیا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ باتیں ایک نوجوان کو اس زمانہ بعد از جنگ میں اپنے مستقبل کے متعلق بعد کرنے میں کس طرح مدد دے سکتی ہیں۔

ایملی۔ خیر میں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ تم اسے بدلا ہوا پاؤ گے۔

جیمس۔ کل رات تو اس میں کوئی خاص تغیر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

ایملی۔ میرا خیال ہے تم اسے بہت . . . مجھے سمجھ نہیں آتا کہ کیا لفظ استعمال کروں۔ مسز ہگنز آپ کو میرا مطلب سمجھا دے گی۔

جیمس۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے کرے جبکہ روپیہ میرے پاس ہے (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہتر ہوگا تم اس سے کہہ دو کہ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔

ایملی۔ (کھانے کے کمرہ کا دروازہ کھول کر) تمہارے چچا دفتر جانے سے پہلے تمہیں ملنا چاہتے ہیں۔ کتنی دیر ہے فلپ!

فلپ۔ کیا انہیں بہت جلدی ہے!

جیمس۔ (مختصراً) ہاں

ایملی۔ ہاں۔ دیکھو نا۔ انہیں ذرا جلدی ہے۔

فلپ۔ کیا وہ مجھ سے یہاں آ کر گفتگو کر سکتے ہیں میرے ناشتے میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

جیمس۔ نہیں۔

ایملی۔ عزیزم وہ کہتے ہیں کہ تم ہی ذرا ادھر آ جاؤ۔

فلپ۔ اوہ بہت اچھا۔

ایملی (جیمس سے) وہ ابھی آتا ہے۔ آپ آرام سے آگ کے قریب بیٹھ جائیے اور اخبار دیکھئے وہ دیر نہیں لگائے گا۔

جیمس (اخبار لیتے ہوئے) یہ وقت آرام کرنے کا نہیں۔ اس وقت آرام کرنا نہایت قبیح عادت ہے۔ ابھی ابھی میری آنکھ ہی لگ گئی تھی۔ میں اس طرح وقت کھونا پسند نہیں کرتا۔

ایملی۔ آنکھ لگ گئی تھی تو آپ کو اچھی طرح سو لینا چاہئے تھا رات کتنی دیر تک ہم فلپ کی باتیں سنتے رہے۔

جیمس۔ ہاں۔ ہاں (جمائی لیتا ہے۔ لیکن جلد ہی سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے) اپنی ڈیوٹی سے کبھی کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ ایملی! میرا خیال ہے نہیں بھی بہت کام کرنے ہیں۔

ایملی۔ بہت بہتر میں جاتی ہوں لیکن لڑکے کے ساتھ سختی سے پیش نہ آنا

جیمس۔ میں انصاف کروں گا۔ ایملی! تسلی رکھو۔

ایملی۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) لیکن میرا مطلب یہ تو نہیں۔

[جیمس اونگھنے لگتا ہے۔ پھر چونک اٹھتا ہے اور اخبار دیکھنے لگتا ہے پھر اونگھ جاتا ہے اور جلد ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے]

فلپ۔ (داخل ہوتے ہوئے) معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو انتظار کی زحمت دی۔ میں ناشتہ میں ذرا لیٹ ہو گیا تھا (چرٹ نکالتا ہے) کیا آپ بزنس کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

جیمس۔ (گھڑی نکالتے ہوئے) ذرا لیٹ! میں اسے دو گھنٹے کہوں گا۔

فلپ۔ (خندہ روئی سے) کوئی بات نہیں چچا دو گھنٹے لیٹ ہی کہہ لیجئے بالکل صبح کے ناشتہ سے بائیس گھنٹے پیشتر (میز کے دوسری طرف چچا کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور چرٹ سلگاتا ہے)

جیمس۔ تم تمباکو نوشی کرنے لگے ہو اب!

فلپ۔ میں کیا!

جیمس۔ (چرٹ کی طرف اشارہ کر کے) تمباکو پیتے ہو تم؟

فلپ۔ لاحول ولا قوۃ! تو آپ کے خیال میں ہم فرانس میں کیا کرتے رہے ہیں۔

جیمس۔ یہاں ہر کمرے میں چرٹ پیتے پھرنے سے پیشتر تمہیں اپنی چچی کی اجازت حاصل کر لینی چاہئے تھی۔

[فلپ حیران ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھتا ہے اور پھر دروازے کی طرف جاتا ہے]

فلپ۔ (پکار کر) چچی جان!... چچی جان! کیا آپ کو میرے یہاں پر چرٹ پینے پر کوئی اعتراض ہے؟

ایملی۔ (اوپر سے ہی) قطعاً نہیں عزیزم۔

فلپ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے جیمس سے) قطعاً نہیں عزیزم (چرٹ منہ میں رکھ لیتا ہے)

جیمس۔ خیر فلپ! واضح ہونا چاہئے کہ جب تک تم میرے یہاں رہو علاوہ پابندیٔ وقت کے شائستگی اور ادب بھی ملحوظ خاطر رہے۔ میں بے باکی پسند نہیں کرتا۔

فلپ۔ ہاں (غیر متاثر رہتے ہوئے) چچا میں آپ سے اسی معاملے کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں یعنی آپ کے ہاں رہنے کے متعلق

جیمس۔ میں نہیں سمجھا تمہارا مطلب کیا ہے۔

فلپ۔ میرا مطلب ہے کہ ہمارا آپس میں گذر ہونا مشکل ہے اس لئے میں کوئی کمرہ کرائے پر لے لوں۔ آپ میرا کچھ ماہانہ لگا دیجئے۔ یا میرا روپیہ ابھی دے دیجئے۔ معلوم نہیں ابا جان کس شرائط کے ماتحت روپیہ آپ کے سپرد کر گئے تھے۔

جیمس۔ (سرد مہری سے) پچیس سال کی عمر ہونے پر تمہیں روپیہ مل سکتا ہے تمہارے عقلمند باپ کو معلوم تھا کہ ایک بڑی رقم ایک کمسن سالہ لڑکے کے حوالے کرنا بری باتوں کی ترغیب دینا ہے۔ میں اس کی ہدایات سے انحراف کر سکتا ہوں یا نہیں اس کا کوئی سوال نہیں۔ فی الحال میں یقیناً ایسا کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

فلپ۔ اگر یہ بات ہے تو میں اب پچیس برس کا ہو گیا ہوں۔

جیمس۔ بیشک۔ میرا خیال ہے یہ دو سال کے عرصے میں ہوا ہے۔ کب ہوئے تھے پچیس سال کے تم؟

فلپ۔ (آہستگی سے) اس دن جب اگلے روز لڑائی ہونے والی تھی اور ہم جنگل کے کنارے ایک دوزخ سے بری خندق میں تھے۔ "کمپنی کمانڈر" نے پوچھ بھیجا کہ ہم آگے بڑھیں؟ جواب ملا "ہرگز نہیں۔ جمے رہو" بے چارا بلی (Billy) بہت اچھا آدمی تھا وہ مارا گیا۔ تو مجھے کمانڈ لینا پڑا۔ اس مقام سے پانسو گز کے فاصلہ پر ایک اور خندق تھی۔ تھی تو وہ بھی خندق ہی لیکن پہلی کے مقابلے میں ہائیڈ پارک! میں نے اس جگہ کا نقشہ بھیج کر وہاں جانے کو پوچھا لیکن میرا آدمی واپس نہ آیا۔ میں نے ایک گھنٹہ بعد ایک اور آدمی بھیجا۔ وہ بھی واپس نہ آیا۔ تیسرا آدمی بھیجا تو تنہا عدم تھا۔ ادھر دستہ کے

آدمی بھی آ دبے وہ گئے تھے میرے واسطے اب تین طریق عمل تھے۔
جا رہوں۔ بغیر حکم کے دوسری خندق میں چلا جاؤں۔ خود واپس
جا کر احوال بتاؤں میں بغیر حکم کے دوسری خندق میں چلا گیا اور بعد
میں کمانڈنگ آفیسر کو تبلا دیا کہ میں نے جگہ تبدیل کر لی ہے۔ اس
وقت میں پچیس سال کا ہو گیا تھا۔ یا چھبیس کا یا پچیس کا۔

جیمس۔ (بولنے کی ہمت کرتے ہوئے) اوہ۔ ہاں ہاں (کھانستا ہے) ایسے
واقعات لڑائی میں ہوتے ہی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم نے
وہاں پر اچھا کام کر کے دکھایا اور تمہارا افسر یقیناً تم سے خوش ہو گا۔
لیکن اب جبکہ تم فوج کو خیرباد کہہ چکے ہو اور اپنے مستقبل کے متعلق
سوچ رہے ہو۔ میری رائے زیادہ کار آمد ہے۔ ظاہر ہے تمہارے
باپ نے بھی سوچ کر تم کو میری سرپرستی میں چھوڑا ہو گا۔

فلپ۔ میرے باپ کو یہ علم تو تھا نہیں کہ جنگ ہو گی۔

جیمس۔ درست ہے لیکن تم جنگ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہو۔ تم
لڑکے سمجھتے ہو کہ "بڈھوں کو اب ہم سے سبق لینا چاہئے" لیکن
حق یہ ہے کہ تمہیں سبق لینا ہو گا۔

فلپ۔ میں لینے کو تیار ہوں (غالباً) رچاہتا بھی یہی ہوں۔

جیمس۔ بہت خوب۔ فیصلہ شد!

فلپ۔ لیکن ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ میں کونسی بزنس کروں گا۔

جیمس۔ اس میں کونسی مشکل ہے۔ میں تمہیں اپنی بزنس میں لے لوں گا
ظاہر ہے تم ادنیٰ ترین درجہ سے شروع کرو گے۔ لیکن یہی تمہارے
مستقبل کے لئے شاندار زینہ ہو گا۔

فلپ۔ (سوچتے ہوئے) اچھا آپ نے میرے لئے فیصلہ کر دیا ہے؟ جام بزنس!

جیمس۔ (تندی سے) تو کیا اس میں کوئی ہتک ہے؟

فلپ۔ نہیں بالکل نہیں۔ صرف یہ مجھے پسند نہیں۔

جیمس۔ تمہیں ہاتھ سے کما کر کھانا پڑے تو یہی تمہارے پسند خاطر ہو جائے

فلپ۔ میرا خیال ہے میں انجنیئری کا کام شروع کر دوں۔

جیمس۔ تئیس سال کی عمر اور علم تعمیر سیکھنا شروع کرو!

فلپ۔ (مسکراتے ہوئے) لیکن میں اس سے پیشتر شروع ہی کیسے
کر سکتا تھا؟

جیمس۔ درست ہے لیکن اب تم بہت لیٹ ہو۔

فلپ۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب کوئی اور انجنیئر
کوئی اور ڈاکٹر۔ کوئی اور وکیل نہ بنے گا۔ کیونکہ ہم سب نے چار چار
سال ضائع کر دیئے ہیں۔

جیمس۔ تمہارا کیا خیال ہے کب تک تم کمانے کے لائق ہو جاؤ گے؟

فلپ۔ جب کام سیکھ لوں گا۔ سب ہی چار سال پیچھے ہیں۔

جیمس۔ میرے خیال میں تمہارے لئے ضروری ہے کہ فوراً کمانا شروع کرو۔

فلپ۔ دیکھو چچا جان! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک
روا رکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ایک لڑکے کے ساتھ جس نے ابھی ابھی
سکول چھوڑا ہو کیا جاتا ہے؟ کیا میدانِ جنگ میں چار سال گزارنے
کے بعد مجھ میں کچھ فرق نہیں پڑا۔

جیمس۔ اگر کچھ فرق پڑنا چاہئے تو وہ یہ ہونا چاہئے کہ اپنے بڑوں کی اطاعت
میں زیادہ مستعدی سے کام لو۔

فلپ۔ (مایوسانہ) تو آپ لڑائی پر تلے ہوئے ہیں! میں جام بزنس میں
داخل ہونے سے قطعاً انکار کرتا ہوں۔

جیمس۔ (غصے سے میز پر ہاتھ مار کر) اور میں تم جیسے بچے کی
گستاخی برداشت کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

فلپ۔ (یاد کرتے ہوئے) ایک دفعہ میرا افسر مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔
لیکن وہ بڑا رعب دار شخص تھا۔ اس کا منہ سرخ اور آنکھیں نیلی
تھیں۔ اس کو بیس تمغے مل چکے تھے۔ چچا! آپ اتنے رعب دار
تو نہیں۔

جیمس۔ (ناراض ہو کر) اوہ۔ یہ؟ خوش قسمتی سے میرے پاس رعب
جمانے کے اور ذرائع موجود ہیں۔ اس دنیا میں روپیہ بہت طاقت
رکھتا ہے اور میں اس طاقت کے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

فلپ۔ ہوں! . . . لیکن یہ عجیب سی بات ہے۔

جیمس۔ شاید۔

فلپ۔ واقعی۔

(جیمس ایک تمسخر آمیز ہنسی کے ساتھ اخبار دوبارہ اٹھاتا ہے جیسے
معاملہ ختم ہو چکا ہو)

فلپ۔ (اپنے آپ سے) میرا خیال ہے مجھے اور طریقہ استعمال کرنا
ہو گا (جیب سے ریوالور نکالتا ہے اور اس کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)

جیمس۔ (یکلخت ریوالور کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے) یہ کیا کر رہے ہو تم؟

فلپ۔ یہ فرانس کی یادگار ہے۔ اس سے بیس جرمن مارے ہیں۔

جیمس۔ (مختصراً) خیر لیکن۔ ۔ ۔ ۔ اب اس کو نہیں نکالنا چاہئے ورنہ تم انگریزوں ہی کو مارنا شروع کر دوگے۔

فلپ۔ (اپنے چچا کا نشانہ لگاتا ہے) کیا چھوٹا سا ہتھیار ہے۔

جیمس۔ (غصے سے، مہربانی کرکے اسے رکھ دو۔ یہ چالاکیاں وہیں چھوڑ آتے تو بہتر تھا۔ اسی طرح خالی ریوالوروں کے نشانے لگاتے پھرنے سے ہی حادثے ہو جایا کرتے ہیں۔

فلپ۔ نہیں یہ تو بھرا ہوا ہے۔

جیمس۔ (بہت غصے میں۔ کیونکہ وہ بہت ڈر گیا ہے) اسے فوراً رکھ دو (فلپ بے پروائی سے ریوالور کو دیکھتا ہے) تمہیں ہوا کیا ہے؟ یکلخت پاگل ہو گئے ہو۔

فلپ۔ (نرمی سے) میرا خیال تھا آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے کئی جرمن ہلاک کئے ہیں۔

جیمس۔ خیر اب اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فلپ۔ آپ جانتے ہیں اس وقت انگلستان میں ایک لاکھ کے قریب ایسے آدمی ہیں جو ریوالوروں کے مالک ہیں اور انہیں استعمال کرنے کے عادی ہیں۔

جیمس۔ نہیں میں نہیں جانتا۔

فلپ۔ ایک ہی بات ہے۔

جیمس۔ (اٹھتے ہوئے) میں نہیں جانتا اس خرافات سے تمہارا کیا مطلب ہے لیکن یاد رہے کہ صبح تمہیں نو بجے دفتر میں حاضر ہونا ہے۔ (جانے کو مڑتا ہے)

فلپ۔ (نرمی سے) چچا جان!

جیمس۔ (پیچھے دیکھ کر) بس میں زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔

فلپ۔ (پریڈ کی آواز میں) خبردار۔ جب افسروں سے گفتگو کرو تو سیدھے کھڑے ہو جاؤ (جیمس غیر ارادی طور پر مڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے) خوب۔ اگر آپ چاہیں تو کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں (ریوالور سے کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

جیمس۔ کیا تم ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم اپنے بوڑھے چچا کو مار ڈالنا چاہتے ہو۔

فلپ۔ کیوں نہیں۔ میں نے کئی جرمن نیچے مارے ہیں۔

جیمس۔ لیکن وہ تو جرمن تھے۔ اب تو تم انگلستان میں ہو۔

فلپ۔ لیکن کیا چار سال میدانِ جنگ میں رہنے کے بعد انسان کی زندگی کے متعلق خیالات میں تغیر نہیں آ جاتا!

جیمس۔ لیکن یاد رہے جیوری کے خیالات میں کوئی تغیر نہیں آتا۔

فلپ۔ مگر جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے ریوالور بعض اوقات غلطی سے بھی چل جایا کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاقی حادثہ ہوگا۔ اخبار میں نکلے گا کہ "مرحوم کا بھتیجا جو کہ غالباً غصے میں تھا ۔ ۔ ۔ ۔

جیمس۔ (غصے میں) کیا یہی کچھ سیکھ کر آئے ہو تم! ایک نہتے آدمی کو ریوالور سے ڈرانا کوئی بہادری نہیں۔

فلپ۔ وہ تو آپ کی خوش قسمتی سے میرے پاس صرف ایک ہی بم ہے۔ ورنہ آپ پر چھ بم پھینکتا۔ (جیب میں سے بم نکالتا ہے)

جیمس۔ (بہت خوفزدہ ہو کر) اس کو فوراً جیب میں رکھ دو۔

فلپ۔ (ریوالور رکھ کر بم پکڑ لیتا ہے) اس کو اس طرح دائیں ہاتھ میں پکڑ کر یہ پن نکال دی ۔ ۔ ۔ ۔ خیر یہ اپنے مطلب کی بات نہیں ہے۔

جیمس۔ (کرسی پرے سرکاتے ہوئے) اسے رکھ دو۔

فلپ۔ (بم رکھ کر ریوالور اٹھا لیتا ہے) چچا جان کیا آپ جانتے ہیں کہ انگلستان میں کئی لاکھ آدمی ایسے ہیں جو بم کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اور بم چلا سکتے ہیں!

جیمس۔ قطعاً نہیں۔ مجھے ایسی باتوں کا خواب بھی نہیں آنا چاہئے۔

فلپ۔ (مایوسی سے بم کی طرف دیکھتے ہوئے) بحیثیت ایک سپاہی کے یہ میرا اصول تو نہیں لیکن پھر بھی آپ دیکھ سکتے ہیں (جیمس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

جیمس۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں نہیں۔ کہیں چل ہی نہ جائے۔

فلپ۔ نہیں یہ بالکل بے کار ہے۔ اس کے چلانے کا اوزار تو ہے ہی نہیں (درشتی سے) اچھا تو اب کام کی بات کریں۔

جیمس۔ تم کیا چاہتے ہو؟

فلپ۔ در اصل آپ کو ہمیشہ آپ Hands up کرکے بولنا چاہئے۔ خیر میں صرف یہ کہوں گا کہ آپ معقولیت کو مدنظر رکھیں۔

جیمس۔ اور ــــ اگر میں اس بات سے انکار کروں تو تم مجھے مار ڈالوگے؟

فلپ۔ معلوم نہیں آپ کو آج کا سبق بہت پسند آیا ہے تو روز یہی دہرایا جا سکتا ہے اور ــــ ڈر بہت بری چیز ہے۔ اکثر عمر رسیدہ آدمی اس سے نہیں بچتے۔

جیمس۔ اوہنہ ۔ ۔ ۔ میں اس طرح رعب میں آنے سے رہا۔
فلپ۔ (یکلخت) واقعی؟ درست ہے (نشانہ باندھتے ہوئے) آخر مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ دو ر
جیمس۔ (گھٹنوں پر گر کر اور ہاتھ اٹھا کر) فلپ! ۔ ۔ ۔ رحم ۔ ۔ ۔ تم کیا چاہتے ہو؟
فلپ۔ (جیمس کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر کرسی میں پھینک دیتا ہے) ہوں۔ یہاں ذرا آرام سے بیٹھو جب تک کہ میں واپس آؤں (اس کو اخبار دے کر ہال میں چلا جاتا ہے)

. . . .

(جیمس آنکھیں کھولتا ہے اور چونک کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ سر کھجاتا ہے اور گھڑی نکال کر وقت دیکھتا ہے۔ کھانے کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور فلپ ہاتھ میں ٹوسٹ لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

فلپ۔ (منہ میں ٹوسٹ رکھتے ہوئے) آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے چچا جان!
جیمس۔ (ابھی تک پریشان ہے) کوئی حرج نہیں عزیزم کیا کر رہے تھے تم؟
فلپ۔ (متحیر ہو کر) ناشتہ (آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتا ہے) ذرا لیٹ ہو گیا تھا۔
جیمس۔ کوئی مضائقہ نہیں (ہنستا ہے)
فلپ۔ کیا بات ہے؟ آج آپ کا چہرہ کچھ اترا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔
جیمس۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ یہ میری عادت کے بالکل خلاف ہے بالکل۔
فلپ۔ تو آپ کو صبح جلد نہیں اٹھنا چاہئے۔ اگر آدمی فوج میں ہو تو مجبوری ہے۔ شکر ہے میری خلاصی ہو گئی۔
جیمس۔ بیٹھ جاؤ فلپ (آتشدان کے قریب والی کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے)
فلپ۔ (میز کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر) آپ وہاں بیٹھیں۔ میرے لئے یہی ٹھیک ہے۔
جیمس۔ (جلدی سے) نہیں۔ نہیں۔ تم یہاں آجاؤ (فلپ کو آرام کرسی دے دیتا ہے اور آپ میز کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) وہاں مجھے پھر اونگھ آجائے گی (عجیب طرح سے ہنستا ہے)

فلپ۔ (ہنس کر ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے۔ جیمس کانپتا ہے اور ڈر کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ فلپ سگرٹ نکالتا ہے جیمس تسلی کا سانس لیتا ہے)
جیمس۔ فرانس میں تو تم بہت تمباکو پیتے رہے ہو گے؟
فلپ۔ ہاں۔ اور کام ہی کیا تھا۔ یہاں پر اجازت ہے؟
جیمس۔ ہاں، ہاں۔ ضرور (فلپ سگرٹ سلگاتا ہے) اچھا فلپ تم فوج سے فارغ ہو کر اب کیا کرنا چاہتے ہو۔
فلپ۔ وردی کو آگ لگا کر ریوالور بیچ دوں گا۔
جیمس۔ (ریوالور کا نام سن کر کانپ اٹھتا ہے) ریوالور بیچ دو گے۔ خوب!
فلپ۔ (متحیر) مجھے اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟
جیمس۔ نہیں بالکل نہیں۔ اب اسے کرنا ہی کیا ہے؟ (ہنستے ہوئے) اب تم انگلستان میں ہو۔ ریوالور کی کیا ضرورت ہے۔
فلپ۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) بالکل نہیں مجھے امید ہے کہ بالکل نہیں۔
جیمس۔ (جلدی سے) بہت اچھا اب تمہارے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہئے۔
فلپ۔ (جمائی لے کر) ہاں میں نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں۔
جیمس۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ انجنیئر ۔۔۔ بننا پسند ۔ ۔ ۔ ۔
فلپ۔ (متحیر) انجنیئر!
(جیمس سر کھجاتا ہے اور حیران ہے کہ یہ بات اسے کیسے سوجھی)
انجنیئری کے لئے اب میں لیٹ ہوں۔
جیمس۔ کوئی حرج نہیں۔ اگر تم چار سال لیٹ ہو تو اسی طرح اور سب نوجوان بھی چار سال لیٹ ہیں۔
(جیمس محسوس کرتا ہے کہ یہ دلیل اس نے پہلے بھی سنی ہے)
فلپ۔ (مسکراتے ہوئے) دراصل جو آپ کہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ سوائے فوجی عہدیدار بننے کے۔ اب میں وردی کبھی نہیں پہنوں گا۔
جیمس۔ میری بزنس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟
فلپ۔ جام بزنس؟ کیا حرج ہے؟ کیا مجھے ہر روز آپ کو سلوٹ کرنے کو تو نہیں کہا جائے گا۔
جیمس۔ نہیں۔ نہیں عزیز لڑکے۔
فلپ۔ بہت اچھا میں کوشش کروں گا۔ مجھے کیا کام کرنا ہوگا۔
جیمس۔ تمہارا حسن انتظام اور آدمیوں سے کام لینے کا طریقہ تمہیں بہت

مدد دے گا۔

فلپ۔ اوہ یہ تو بوجہ احسن سرانجام ہو جائے گا۔ میں فوجی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں چچا جان! کیا آپ کبھی سچ مچ ڈرے ہیں!

جیمس۔ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ (کھانستا ہے)

فلپ۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔

جیمس۔ اچھا تم دفتر آ جانا۔ میرا خیال ہے تم کچھ دن چھٹی کرو گے۔ (اٹھتے ہوئے)

فلپ۔ (اٹھتے ہوئے) چچا جان لندن میں رہنا ہی چھٹی ہے۔ شام کا اخبار خریدنا۔ واسکٹ پہننا۔ بس کے پیچھے دوڑنا یہ سب چھٹی منانا ہی ہے۔

جیمس۔ تو ابھی میرے ساتھ چلے چلو۔ میں تمہیں مسٹر بامفورڈ سے ملائے دیتا ہوں۔

فلپ۔ بہت خوب وہ کون ہے؟

جیمس۔ ہمارا مینجر۔ وہ ہے تو ذرا سخت طبیعت کا آدمی لیکن بہت اچھا آدمی ہے۔

فلپ (مسکراتا ہے) میرے خیال میں ریوالور ساتھ لے چلنا چاہئے ممکن ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔

جیمس۔ (ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ خوب مذاق ہے۔ خوب۔ لیکن ہے تو مذاق ہی نا۔

[فلپ باہر جاتا ہے جیمس اس کے پیچھے دروازے میں سے نکلتا ہے۔ وہ کمرے کے اندر پریشان نگاہوں سے دیکھتا ہے کیا یہ خواب تھا؟ وہ کبھی نہیں معلوم کر سکے گا]

(اے۔ اے۔ ملن)

منظور احمد

ایام حیات

(وہ احساس مشترک جو میرے مکرم دوست رشید عمرانی کی گزشتہ حالت پر نظم کیا گیا)

میں بھی ناکام حیات اور تو بھی بدنام حیات
ہمنشیں دونوں ہیں ہم مجبور آلام حیات

پوچھ مت اے دوست کیا ہونا ہے انجام حیات
ہے تری قسمت سے بھی تاریک تر شام حیات

مضطرب رہتا ہے انساں ماہیچاں کی طرح
زہر قاتل ہے مزاج بادۂ جام حیات

آرزو میخانہ غم ساقی ہے مایوسی شراب
ہے دل بدمست اس میں ذوق آشام حیات

مرگیا جب سے دل پروردۂ صد آرزو
عار آتی ہے مجھے لیتا ہوں جب نام حیات

زندگی ہے حسرت جاوید میں اُن کے لئے
پختگان عشق کو کہتے نہیں خام حیات

(ملک) مراتب علی تائب

غزل

مری نگاہ سے کیوں احتراز کرتے ہو؟
خموش کیوں مری ہستی کا ساز کرتے ہو؟

ملا کے اپنی جنوں آفریں نظر مجھ سے
خدا گواہ! عجب ساز باز کرتے ہو

زمانہ دیکھنے لگتا ہے مجھ کو حیرت سے
کچھ اس طرح سے مجھے سرفراز کرتے ہو

بہار و رنگ کا موسم ہے، رقص و کیف کی رُت
بلند و پست میں کیا امتیاز کرتے ہو

ہو معترض مری دیوانگی پہ، ہنس ہنس کر
کھلا، کہ تم مری وحشت پہ ناز کرتے ہو

حجاب ناز نہ پیہم اٹھاؤ چہرے سے
اثرؔ کو ہوش سے کیوں بے نیاز کرتے ہو

اثر چکوالی بی اے

آزاد اور حالی مرحوم کی نیچرل شاعری

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

اردو علم ادب میں عموماً دو قسم کی شاعری موجود پائی جاتی ہے۔

عشقیہ (۱) اور نیچرل (۲)

عشقیہ سے مراد وہ طرز سخن ہے جو زمانہ قدیم سے یہاں مروج ہے اور بہت متعارف ہے یعنی حسن و عشق کا بیان گل و بلبل کی داستان یا غزل و ہزل اور واسوخت وغیرہ جس میں متاخرین لکھنو نے ریختی کا بھی اضافہ کر دیا تھا لیکن نیچرل شاعری اس سے بہت مختلف ہے کیونکہ اس میں شاعر ہمیشہ حقایق و واقعات کو قلم بند کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر الذکر نیچرل شاعری کی بنیاد شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اور حالی مرحوم نے ڈالی تھی اور اس خاص کارنامے کا فخر سرزمین پنجاب کو حاصل ہے۔ ممکن ہے یہ بالکل صحیح ہو جیسا کہ پنجاب کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ مگر اس حقیقت کو شرف قبولیت دینے سے قبل ناظرین مندرجہ ذیل سطور پر کچھ غور فرمائیں۔

جدید اردو علم ادب جس سے نیچرل شاعری کا خاص تعلق ہے۔ کیونکہ اسی میں اس کا حدوث ہوا۔ زمانۂ غدر دہلی کے بعد کی پیداوار ہے اور غدر ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء کے درمیان وقوع پذیر ہوا تھا۔ مگر دلی اور لکھنو میں کامل سکون کی حالت ۱۸۶۰ء میں رونما ہوئی تھی۔ جس کے چار پانچ سال بعد سرکار عالیہ کی طرف سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کئی طرح کی ایسی سوسائیٹیاں یا انجمنیں قایم کی گئی تھیں جو راعی و رعایا کے تعلقات کو آیندہ زیادہ مضبوط کرنے اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وسائل بہم پہنچانے پر مامور تھیں انہی کثیر التعداد سوسائٹیوں میں سے ایک دلی کی سوسائٹی تھی جس کا آغاز اگست ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ اس کا نام دہلی سوسائٹی تھا اور اس کے پیٹرن یا چیف پریزیڈنٹ خود گورنر پنجاب مقرر ہوئے تھے۔ اس سوسائٹی میں ہندو مسلم روسائے شہر کے علاوہ دلی کے اکثر جدید مذاق کے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی شامل تھے جن میں سے کوئی نہ کوئی ہر ماہ ایک مفید عام مضمون پر لکچر دیا کرتا تھا۔ انہی مفید علمی جلسوں میں ایک مرتبہ سرکار برطانیہ کی طرف سے تمام عشقیہ غزلوں۔ اور ہزل نویسی یا فحش گوئی کا سدباب کرنے کے لئے۔ ایک تحریک پیش کی گئی تھی۔ پھر جب اسی سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ ادبی رسالہ جاری ہوا۔ تو اس کا یہ دستور قرار پایا کہ ہر مہینے کسی خاص علمی مضمون پر آپس میں بحثیں کی جائیں اور اس پر کوئی اچھی نظم یا نثر۔ اہل مجلس کو سنائی جائے اور پھر وہ رسالہ مذکور میں مفاد عامہ کے لئے شائع کر دی جائے۔

اس خاص مقررہ کارگزاری کے علاوہ دہلی سوسائٹی کا مقصد اردو میں ہر طرح کی جدید علمی اور سائنٹفک کتابیں طبع کرانا اور ان کو پبلک سے روشناس کرنا بھی تھا۔ تاکہ ملک میں مغربی علوم کی اشاعت ہو۔ یہ واقعات ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی دلی سوسائٹی کی دیکھا دیکھی ۱۸۶۶ء کے بعد جبکہ صوبہ پنجاب میں تعلیم انگریزی کا رواج ہونے لگا تو یہاں بھی ایک بک ڈپو قایم کیا گیا۔ جس میں علوم مغربی کی بعض کتابیں زبان اردو سے ترجمہ کرانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی طرح جب سرسید مرحوم نے علی گڈھ میں ایک مدرسہ انگریزی علم ادب کی تعلیم کے لئے جاری کیا تو وہاں بھی اسی دہلی سوسائٹی کی تقلید پر ایک سائینٹفک سوسائٹی قایم ہوئی تھی۔ غرض اول اول اردو زبان میں قدیم مقفیٰ عبارت کی نثروں اور عشقیہ غزلوں کو ترک کرنے کا خیال مذکورۃ الصدر دہلی سوسائٹی ہی کی تحریک پر عوام میں پیدا ہوا تھا اور وہ ایسا وقت تھا کہ نہ تو آزاد مرحوم اور نہ حالی مغفور اس وقت پنجاب میں موجود تھے۔ بلکہ حضرت حالی کا تو تخلص بھی اس زمانے میں خستہ تھا نہ کہ حالی اور آزاد مرحوم تو سب سے پہلے لاہور میں آ کر ڈاک خانے کے محکمے میں ملازم ہوئے تھے اور اس وقت

ان کا کوئی تعلق کسی بک ڈپو یا اخبار یا رسالہ یا کسی علمی انجمن سے مطلقاً نہیں تھا۔ البتہ ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب جو لالہ سری رام آنجہانی کے چچا تھے اور مرزا غالب کے بھی عزیز دوستوں میں سے تھے۔ وہ ایک طرف تو دہلی سوسائٹی اور دوسری طرف پنجاب کے محکمہ تعلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ پس اسی قسم کے اہل قلم دہلی سوسائٹی کی رونق تھے۔
چنانچہ انہی کے ایک معاصر اور ہم نام مولوی الفت حسین صاحب مرحوم تھے جنہوں نے مندرجہ ذیل مضمون سوسائٹی مذکور کے ایک اجلاس میں پڑھا اور وہ رسالہ دہلی سوسائٹی نمبر ۹ (جلد ۲) بابت اگست ۱۸۷۴ء میں شایع ہوا۔

مضمون مصنفہ مولوی الفت حسین صاحب

چونکہ فی الحال ہندوستان میں شاعری عاشقانہ رہ گئی تھی جس سے اخلاقِ عامہ روز بروز بالکل بگڑتے جاتے تھے۔ اس لئے سرکار سے بڑی فحش مضامین کی کتب چھپنے و بکنے کی ممانعت ہوگئی۔ اب اکثر خلقت اس عنایت سرکار کو بھی غضب سمجھتی اور کہتی ہیں کہ کیا کہئے ایک وقت شاعری ہندوستان میں باقی تھی۔ سو وہ یوں کھو دی۔ اگرچہ قدر دان تو پہلے ہی جا چکے تھے۔ مگر خیر کچھ شوق طبیعت باقی تھا۔ کچھ کہہ سن کر طبیعت بہلا لیتے تھے۔ دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی۔ افسوس کہ وہ لطف زبان بھی نہیں۔ لہٰذا حقیر نے چاہا کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اس لئے چند شاگردوں اور رشتہ داروں کو اس طرف متوجہ کیا کہ اخلاقی مضامین کے اشعار کہا کریں اور عمدہ مضامینِ مفیدہ میں زور طبیعت دکھائیں "تاکہ لفظاً و معناً ہر طرح حظ حاصل کریں۔ گورنمنٹ نے جو لغو و بیہودہ شاعری کی بنیاد اکھاڑ دی یہ ہمارے جوانوں اور تمیزداروں کے لڑکوں کے لئے تہذیب کا درخت بویا ہے طبع آزمائی کے لئے ہزاروں مفید مطالب ایسے ہیں کہ اب تک نظم و نثر کے میدان میں نہیں آئے۔ چنانچہ بعض شائقین نے رانڈ بیواؤں کی مصیبت نظم میں اچھی لکھی ہے اور اس باب میں معقول تحریص و ترغیب دی ہے۔ اور ایک شخص نے لڑائی و بغض و حسد و تکبر و ریا کی مذمت خوب اچھی طرح اشعار میں لکھی ہے کہ بندہ کے نام پر اس کا نام الفت نامہ رکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ میدان شاعری بہت وسیع ہے۔ اس نیک انداز سے اچھی طرف قدم بڑھائیں اور اپنے بھائیوں کی درستی اخلاق چاہیں۔ اپنی نازک طبعی اور ذہانت کو اچھی جگہہ کام میں لائیں یعنی عشق و رندی میں نہ کھو دیں۔ بیشک ہندوستانی جیسے شاعری میں کامل ہیں۔ اگر اس کمال کو عمدہ طور پر اخلاق کی باتوں میں خرچ کریں تو ایک دن اپنے آپ کو کمال اوج پر پائیں گے"۔

مندرجہ مضمون سے صاف واضح ہے کہ نیچرل شاعری کی تحریک دہلی سوسائٹی کی طرف سے ہوئی تھی اور وہ سوسائٹی وہاں ۱۸۶۵ء میں قیام پذیر ہوئی تھی جبکہ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم نواب مصطفٰے خاں شیفتہ والی جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کے اتالیق تھے۔ چنانچہ تذکرۂ حالی میں جو کہ حالی مرحوم کی صد سالہ برسی کی تقریب پر کسی واقفکار کے قلم سے مرتب ہوا ہے یہ عبارت موجود ہے۔

مولانا کا تعلق نواب صاحب سے اُن کی وفات تک رہا۔ جب ۱۸۶۹ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو پھر مولانا کو کسی دوسرے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی . . . چنانچہ ان کو فوراً گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ایک جگہہ مل گئی . . . پھر ۱۸۶۹ء کے اوائل میں اخبار انجمن پنجاب کے نام سے سررشتہ تعلیم پنجاب کی طرف سے ایک اخبار جاری ہوا۔ جو عرصہ تک کامیابی سے چلتا رہا لیکن بعد میں سرکار نے اسے ماہوار کرکے اس کا نام اتالیق پنجاب رکھ دیا۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال اس کے ایڈیٹر تھے اور مولانا بھی کچھ عرصے تک اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے ہیں . . . "ایک جدید قسم کے مشاعرے کا قیام"
اس عنوان سے پھر اسی کتاب میں یہ الفاظ اور عبارت صاف طور پر موجود ہے۔

"مولانا کے قیام لاہور کے زمانے میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے کرنیل ہالرائیڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے ایما سے ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی مضمون کا عنوان تمام شعرا کو دے دیا جاتا تھا اور مشاعرے میں شعرا اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس مضمون پر طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے انجمن پنجاب کے دفتر میں بڑی شان و شوکت سے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم بھی ان مشاعروں میں شامل ہوئے اور آپ کی سب سے پہلی چار دلچسپ مثنویاں یعنی برکھارت۔ نشاط امید۔ رحم و انصاف اور حب وطن انہی مشاعروں کی یادگار ہیں"۔

مضمون ہذا کو بخوف طوالت یہیں ختم کرتا ہوں۔ حاصل یہ کہ ہندوستان میں نیچرل شاعری کی ابتدا دہلی سوسائٹی کے دفتر واقع دہلی میں ہوئی تھی اور اس کے بانی مبانی نہ تو حضرتِ آزاد ہیں نہ حالی جیسا کہ عام طور پر یہاں مشہور ہے۔

سرخوش

فتنۂ معصوم

(۱)

عطر میں ڈوبی ہوئی ہے سبزہ زاروں کی ہوا
آ رہی ہے کوہساروں سے پپیہے کی صدا

ہیں افق پر سرخیاں اور سرخیوں میں اک سما
جھاڑیوں میں گا رہے ہیں طائرانِ خوش نوا

کھیتیوں کی سنسناہٹ میں صدائے چنگ ہے
پھول تو پھول کانٹوں پر بھی آج اک رنگ ہے

خامشی چھائی ہوئی ہے ہر طرف گلزار میں
دور تک پانی بھرا ہے دامنِ کہسار میں

(۲)

بے محابا ہے اور اک لڑکی لبِ جو ہر رواں
سرو قد، کافر، پری وش، رہزنِ دل، نوجواں

اوڑھنی کے آنچلوں کو سر سے ڈھلکاتی ہوئی
کھیتیوں کے موڑ پر رہ رہ کے بل کھاتی ہوئی

جا رہی ہے سر جھکائے اس طرح مستانہ وار
جس طرح گلشن میں چلتی ہے ہوائے خوشگوار

چاند سے ماتھے پہ ٹیکا، ہات میں ہیں چوڑیاں
دوش پر زلفیں، ہتھیلی پر حنا کی سرخیاں

اپنی رعنائی سے ہر منظر کو تڑپاتی ہوئی
عارضِ گل رنگ سے کلیوں کو شرماتی ہوئی

موڑ پر یوں نازکی سے جسم لچکاتی ہوئی
بید کی شاخوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

نرم شاخوں کی طرح گردن کو بل دیتی ہوئی!!
شاعروں کے دل کو پیغامِ اجل دیتی ہوئی

حُسن سے اپنے فضا میں رنگ دوڑاتی ہوئی
مسکراتی جھومتی پھولوں سے کتراتی ہوئی

منتشر لیکن جذبات کی سینے میں طے کرتی ہوئی
ہر نفس میں ایک ٹھنڈی آہ سی بھرتی ہوئی

(۳)

کشمکش سے نوجوانی کی ہوئی بے قرار
کمسنی کی یاد ہے اس کے لئے خواب بہار

دل میں ہے اک اجنبی سی ایک مبہم سی کھٹک
چال میں اک لوچ آیا ہے کمر میں اک لچک

دل میں فطرت نے جلایا ہے محبت کا چراغ
تپ رہا ہے ایک ہلکی آنچ سی اس کا دماغ

لیکن اس ہلچل میں بھی محسوس کرتی ہے فراغ
اس کے عارض پر ہے روشن بے کسی عصمت کا چراغ

(۴)

الغرض وہ جا رہی تھی دیکھتی رنگیں خواب
ڈال دی اتنے میں ہر منظر پہ ظلمت نے نقاب

رات جب آئی سیہ زلفوں کو بکھراتی ہوئی
جھاڑیوں میں ہو گئی وہ جھلملاتی ہوئی

جلال ملیح آبادی

پانچ چوڑیاں

وادیٔ کشمیر کا ایک دیہاتی رومان

"اگرد کا موہڑا" ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یہ موہڑا پیر پنجال کے اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک زرخیز و شاداب وادی کے آغوش میں آباد ہے پنجاب کے میدانوں سے جو راستہ پیر پنجال میں سے ہوتا ہوا گلگت کو گیا ہے یہ بستی اسی شاہ راہ پر واقع ہے۔ بستی کے ایک جانب ناجوتری ــــ ایک پہاڑی ندی۔ گاتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ عموماً اس ندی میں یہی گھٹنے گھٹنے پانی رہتا ہے۔ مگر برسات کے دنوں میں اس میں بعض دفعہ ایسی طغیانی آجاتی ہے کہ بیچارے زمینداروں کی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

کشمیر اور گلگت کی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اگرد کا موہڑا بارونق جگہ بن گئی ہے۔ ایک دو دکانیں بھی ہیں جن پر عام دیہاتی ضرورت کی چیزیں موجود رہتی ہیں۔ ریاست کی طرف سے ایک پرائمری مدرسہ بھی کھلا ہے۔ سرکاری ڈاک خانہ اور ڈاکخانے کا منشی فضلو۔ جسے چٹھی رساں کہنا زیادہ موزوں ہے ـــــ پنڈت مادھو رام پنساری جسے یہاں کے لوگ ویدجی کہہ کر پکارتے ہیں بستی کے سب سے زیادہ باعزت اور باثر شخص خیال کئے جاتے ہیں۔ سادہ لوح زمینداروں کے دلوں میں ویدجی کے لئے بڑی عقیدت ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ویدجی کے ہاتھ میں خدا نے بڑی شفا دے رکھی ہے۔ ویدجی کے علاج معالجے کے ہزاروں محیرالعقول کارنامے لوگوں کو ازبر یاد ہیں خصوصاً یہ قصہ کہ ایک دفعہ انہوں نے رام نگر کے راجہ کی کماری کے کان میں سے ایک زہریلا بچھو کس کمال سے نکالا ـــــ بچے بچے کی زبان پر جاری ہے۔ بستی کے لوگ فصل کے فصل ویدجی کا حصہ الگ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ ویدجی اس کے بدلے میں سارا سال انہیں دوائیں اور جڑی بوٹیاں مفت دیتے رہتے ہیں۔

گرمی کے دن تھے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب ڈھلتے ہوئے نیلے پہاڑوں کی آسمان بوس چوٹیوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی قرمزی شعاعیں جب بستی کے میدان، اور آس پاس کی کھیتیوں پر پڑتیں، تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دور دور سطح زمین پر آگ سی پھیل رہی ہے اور ناجوتری کا پانی پگھلے ہوئے سونے کی طرح دمکتا دکھائی دیتا۔ سرکاری ذخیرے میں سے زمینداروں کے نوعمر لڑکے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چرا کر گھروں کو واپس آرہے تھے۔ بھیڑوں کے ممیانے اور چرواہوں کے بے معنی مگر خوش آہنگ دیہاتی گیتوں سے فضا میں ایک خوش آیند تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

پنڈت مادھو رام وید کی دکان کے سامنے مٹی کے چبوترے پر وید جی کے نوکر کرپو نے چھڑکاؤ کیا اور وہاں دو تین بڑی بڑی چارپائیاں اور ایک میلے ٹاٹ کی کرسی بچھا دی۔ اتنے میں پنڈت مادھو رام آکر کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنی ناریل کی بنی ہوئی گڑگڑی میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی منشی نور عالم مدرس، فضلو ڈاکیہ، راجہ مولاداد خاں پٹواری، اور چاندی چوکیدار بھی آپہنچے۔ پٹواری کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ پنڈت مادھو رام نے کرسی راجہ مولاداد خاں کے لئے خالی کردی اور خود ایک چارپائی پر ہو لئے۔ منشی نور عالم اور فضلو ڈاکیہ دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ چاندی چوکیدار زمین پر بیٹھا چلم کی نَے بھرا جاتا تھا۔

منشی نور عالم کے ہاتھ میں کوئی مہینے بھر کا پرانا اخبار تھا اور وہ اس میں سے "لام" کی خبریں پڑھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اتنے میں پنڈت مادھو رام بولے ـــــ "کرپو۔ جاؤ راجہ جی کے لئے اچھی سی چلم بھر لاؤ ـــ اچھا سا بلمی تمباکو بھرنا۔ راجہ مولاداد جی آج کچھ غمگین سے دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں راجہ جی؟"

"نہیں تو ویدجی" پٹواری نے قلم کان کے اوپر اٹکاتے ہوئے کہا "آپ کے دشمنوں کا چہرہ آج کچھ اترا اترا سا ہے۔ قرآن کی قسم راجہ جی! کوئی بات ضرور ہے!" فضلو ڈاکئے نے جیب میں سے ڈاک خانے کے نسواری رنگ کے کاغذ کی ایک پڑیا نکالی اور اس میں سے نسوار کی ایک چٹکی بھر کر ناک اور

ناک سے زیادہ دانتوں میں ڈالتے ہوئے ویدجی کی تائید کی۔ پنڈت مادھورام بولے "اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا مولاداد خاں جی آپ واقعی غمگین نظر آتے ہیں"۔

"حقہ ذرا اوپر اٹھائے رکھنا۔ چاندی" پٹواری نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا "ٹھیک ہے ویدجی۔ آج میں غمگین ہوں۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے ویدجی آج میری روح غمگین ہے۔ آج بڑے تحصیلدار صاحب دورہ پر آئے تھے۔ میرا کام دیکھ کر تحصیلدار صاحب چودھری خادم حسین گرداور اور مجھے ہمراہ لے کر کنگھن پور کے موضع کی پڑتال کو گئے اور کنگھن پور ــــ ویدجی، میری پہلی محبت کی بستی ہے۔ یہ میرے پریم کی دھرتی ہے۔" پٹواری نے حقے کا ایک لمبا کش بھرا۔ کان پر سے قلم اٹھا کر کان کو کھجلایا اور پھر کہنے لگا۔

"ویدجی، آج میں کوئی تیس پورے تیس سال کے بعد اس سرزمین محبت کی طرف گیا ہوں۔ مگر وہاں پہنچ کر مجھے اپنی زندگی کے کچھ بھولے بسرے افسانے یاد آگئے۔ میری جوانی کی کچھ بیتی ہوئی گھڑیاں میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں اور میری پہلی محبت کے سنہرے خواب میری روح میں چمکنے لگے۔ ویدجی مجھے زندگی کی وہ "مٹھاس" یاد آگئی جس مٹھاس کے بعد میری ساری زندگی ناقابل بیان تلخیوں کا ایک مجموعہ بن گئی"۔

یہاں پٹواری کی آواز بھرا گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سے آنسوؤں کے دو چار گرم گرم قطرے ٹپ ٹپ گرے اور اس کی گردن جھک گئی۔ منشی نور عالم نے اپنے اخبار کو مروڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ چاندی چوکیدار نے ایک انگڑائی لی اور فضلو ڈاکئے نے نسوار کی ایک چٹکی چڑھائی تھوڑی دیر کے بعد پٹواری نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ویدجی یہ آنسو میرے پریم کے موتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے یہ ستارے اپنی سکینہ کی پیاری یاد پر نچھاور کئے ہیں ــــ آہ ــــ آج سے ٹھیک تیس سال پہلے میرے آغاز شباب کا زمانہ تھا۔ یہی کوئی انیس بیس کا سن تھا۔ رگوں میں خون اور خون میں حرارت تھی۔ میں نیا نیا مڈل پاس کر کے نکلا تھا اور اس کنگھن پور میں بطور پٹواری متعین ہوا تھا۔ اس سے پہلے مجھے ملازمت کا قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا۔

کنگھن پور ــــ آپ جانتے ہوں گے ویدجی، خالص راجپوت زمینداروں کی بستی ہے۔ میں نے جب اپنے حلقے کا کام سنبھالا تو اپنی رہائش کے لئے کنگھن پور کو ہی پسند کیا۔ ایک تو درمیانی موضع تھا۔ دوسرے ڈھنگروٹ کا پتن نزدیک پڑتا تھا۔ اتفاق کی بات، ویدجی، ان دنوں گاؤں بھر میں کوئی مکان خالی نہ تھا۔ لاکو نمبردار نے بڑی کوشش کی مگر کوئی علیحدہ مکان نہ مل سکا۔ آخر اس بیچارے نے اپنے کوٹھے میں ہی مجھے بھی ایک کوٹھڑی رہنے کے لئے دے دی۔ لاکو کے مکان میں کل تین کمرے، ایک پسار، اور ایک وسیع دالان تھا۔ اپنی کوٹھڑی میں میں نے اپنے کاغذوں کی الماری، بستر، چارپائی، اور لالٹین رکھ دی۔ میرا کھانا عموماً باہر ہی ہوتا تھا۔ لیکن اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو میں لاکو کا ہی مہمان ہوتا مگر ویدجی آپ یہ نہ سمجھیں کہ لاکو میری اس مہمانی سے تنگ آگیا ہوگا۔ وہ تنگ آتا کیوں؟ یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ میری وجہ سے لاکو کا سارے زمینداروں پر رعب تھا۔ سارا حلقہ اس کا غلام تھا۔ زمیندار اپنے کاموں کے لئے لاکو سے سفارش کراتے اور اس کے صلہ میں اسے انڈوں اور مرغوں کے ٹوکرے دے جاتے تھے۔ میرے سہارے پر لاکو بادشاہی کر رہا تھا۔

لاکو نمبردار کے گھر میں اس کی بیوی، اس کی لڑکی سکینہ، اور دو چھوٹے بچے رہتے تھے۔ لاکو کا کنبہ یہی کچھ تھا۔ البتہ اس کا بڑا لڑکا شاہیا فوج میں سپاہی تھا جو عموماً باہر ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار چھٹی پر گھر بھی آجاتا تھا باقی اولاد میں سے سکینہ سب سے بڑی تھی۔ سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت۔ کنگھن پور تو ایک طرف رہا۔ سکینہ میرے سارے حلقہ کی خوبصورت ترین دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن و جمال کے چرچے گھر کی چار دیواری سے نکل کر اپنے گاؤں اور قرب وجوار کے تمام دیہات میں پھیل چکے تھے۔ جب وہ پانی بھرنے کے لئے ندی پر جاتی تو گاؤں کے نوخیز جوان اسے دیکھنے کے لئے راہ پر جمع ہو جاتے۔ بعض شریر طرح طرح کی "بولیاں" بھی گاتے لیکن نمبردار کے خوف کی وجہ سے کوئی اس کے قریب نہ بھٹکتا۔

کرپو تمباکو کی تازہ چلم بھر کر لایا۔ منشی نور عالم نے وہ پرانا اخبار جیب میں سے نکالا اور اسے الٹ پلٹ کر پھر جیب میں رکھ لیا۔ فضلو ڈاکئے نے نسوار کی ایک چٹکی چڑھائی اور چاندی چوکیدار نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"راجہ جی" یہ بڑی عجیب کہانی ہے۔ میری دادی، خدا نخشے، انہیں دیوؤں اور پریوں کی ایسی ایسی کہانیاں یاد تھیں کہ آدمی سن کر حیران ہو جاتا تھا"۔

"یہ کہانی ہے؟ چاندی یہ کہانی نہیں" پٹواری نے تازہ چلم کا ایک کش لگایا اور کھانستے ہوئے کہا "چاندی یہ کہانی نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ یہ

پریوں کے قصے نہیں مولا داد کے سر پر گزری ہوئی باتیں ہیں۔ میری آپ بیتی ہے ـــ اچھا تو پنڈت جی! آپ کو یاد ہو گا وہ دن میری اٹھتی جوانی کے دن تھے۔ مال کے محکمے میں کام کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ بے چارے اہلکاروں کو عشق و شش کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان کی زندگی کاغذی زندگی ہوتی ہے۔ محبت اور محبت کے رس سے خالی۔ میرا بھی یہی حال تھا میرے قدموں میں حسن کی گنگا بہہ رہی تھی مگر مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ اس حُسنِ معصوم پر ایک بھرپور نظر ہی ڈال سکتا میں باہر سے آتا اور اپنی کوٹھڑی میں "خسرہ گرداوری" اور "جمعبندیوں" کے انبار میں غرق ہو جاتا اور پھر زمینداروں کا ہجوم ـــ ہر وقت دس پانچ آدمی بیٹھے ہی رہتے۔

مجھے روٹی پانی دینے کے لئے اکثر سکینہ ہی میری کوٹھڑی میں آیا جایا کرتی تھی۔ میری کوٹھڑی کی صفائی وغیرہ بھی اسی کے ذمے تھی۔ اکثر ہماری نگاہیں چار ہو جاتیں اور ہمارے نوجوان دلوں میں کچھ دھڑکن سی محسوس ہوتی۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں ـــ سے کھانا ... لیتے وقت میری روح ایک عجیب لذت محسوس کرتی۔ مگر بات ابھی یہیں تک تھی۔ ہاں کبھی کبھی ہم ایک دوسرے کو ٹوک دیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے سامنے روٹی رکھتے ہوئے سکینہ کہنے لگی۔

"راجہ جی! حرام کی روٹی کھا کھا کر آپ تو روز بروز سرخ ہوئے جا رہے ہیں"۔ میں نے بھی جھٹ کہہ دیا ـــ "تم سے زیادہ سرخ تو نہیں ہوں بھولی سکینہ!" ـــ یہ جواب سُن کر وہ شرما گئی اور اس نے اپنے انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے رخساروں کو اپنی رنگی ہوئی کھدر کی چادر میں چھپا لیا۔ اکثر اسی قسم کی نوکیں ہوتی رہتیں۔

سردیوں کے دن تھے۔ لالو کی بیوی تابو کو ساتواں مہینہ جا رہا تھا۔ اب گھر کا سارا جنجال سکینہ کے سر پر ہی تھا۔ بے چاری سحری کے وقت اٹھتی، جھاڑو، بہار دیتی۔ دو بھینسوں کا دودھ بلوتی، بھائیوں کیلئے روٹی پکاتی، انہیں نہلاتی بہناتی، اور مدرسے بھیجتی۔ پھر میرا بھی پورا خیال رکھتی۔ سچ پوچھو تو میں اسی میں خوش تھا میں اسی میں خوش تھا کہ اس کی ماں چارپائی سے لگی رہے۔ بلکہ اکثر دعائیں کرتا کہ وہ مر جائے تا کہ ہمیں آزادی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے زیادہ سے زیادہ موقعے مل سکیں۔

مجھے وہاں رہتے ہوئے کوئی ایک سال ہو گیا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو چکی تھی مگر اظہارِ محبت کی جرأت نہ تھی۔ سکینہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر میری کوٹھڑی میں آجاتی اور ہم یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ میں محسوس کرتا کہ سکینہ مجھ سے باتیں کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے میں اب زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہا کرتا تھا اور زمینداروں سے عام ملنا جلنا بھی ترک کر چکا تھا۔

ایک دن مجھے چودھری خادم حسین گرداور نے تاج پور بلا بھیجا۔ وہاں مجھے خیال آیا کہ آؤ اس قصبہ سے سکینہ کے لئے کوئی تحفہ لے چلوں۔ میں نے کانچ کی کچھ چوڑیاں خریدیں۔ سوچا کہ اُسے دوں گا۔ اگر قبول ہو گئیں تو میں سمجھوں گا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں چوڑیاں لے آیا۔ جب شام کو سکینہ روٹی لے کر میری کوٹھڑی میں آئی تو میں نے اُسے چوڑیاں دکھاتے ہوئے کہا ـــ سکینہ، یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔ یہ میری محبت کی چوڑیاں ہیں۔ کہو قبول کرتی ہو؟ ـــ وہ قدرے ٹھٹکی، اس نے کچھ سوچا اور پھر آہستہ سے اپنی گوری گوری گداز باہیں بڑھاتے ہوئے چوڑیاں تھام کر کہنے لگی ـــ

"راجہ جی! یہ آپ کی محبت کی زنجیریں ہیں" اس جواب پر میں نے اُسے اپنی بے قرار آغوش میں کھینچ لیا اور اپنے پیاسے ہونٹوں کو اُن شاداب اور نازک ہونٹوں پر رکھ دیا۔

ویدجی، اب میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا تھا مجھے سکینہ کی محبت حاصل تھی میں قصبہ تاج پور سے سکینہ کے لئے اکثر تحفے لاتا رہتا تھا یہی ریشمی آزار بند جھوٹے موتی اور کانچ کی چوڑیاں ـــ سکینہ بھی کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے کاڑھ کر کوئی رومال مجھے دے دیا کرتی تھی۔ ہماری محبت انگور کی بیل کی طرح بڑھ رہی تھی۔ راجوتری کی خاموش سوئی ہوئی راتیں، چیڑ کے درختوں کے آسیبی سائے اور پیر پنچال کے قریبی سلسلے کے رومانی غار اور کھوہیں یہ ہماری محبوب تفریح گاہیں تھیں۔ ہم اکثر یہاں بیٹھے رہتے اور محبت کے گیت گاتے سکینہ کی محبت مجھ پر کچھ اس طرح سے چھا رہی تھی کہ میں سرکاری کام سے بھی بے پروا سا رہنے لگا۔ ویدجی! میں ساری نوکری میں صرف ایک دفعہ معطل ہوا ہوں اور یہ انہیں دنوں کی بات ہے۔

رات کی بے زبان تاریکیوں اور دامن کوہ کے بہشتی سکوت کے آغوش میں جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتے تو سکینہ بات بات پر رو دیا کرتی تھی۔ جب وہ رخصت ہوتی تو اس کی گھنی گھنی پلکیں اشکوں سے بھیگ رہی ہوتیں

اور اُس کے رخساروں پر آنسوؤں کا کوئی کوئی چمکتا ہوا موتی ابھی تک اٹکا ہوتا تھا وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی ـــــ مولو مجھے دھوکا نہ دینا میری جوانی تباہ نہ کرنا۔ راجہ! میں نے تمہارے لئے اپنی عاقبت خراب کر لی کہیں تم میری دنیا کو بھی برباد نہ کر دینا ـــــ یہ کہہ کر وہ ایک معصوم بچے کی طرح میرے سینے سے چمٹ جاتی اور بلک بلک کر رونے لگتی ـــــ ویدجی! مجھے سکینہ کے اُس رونے میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا۔ آہ! وہ گھڑیاں میں کبھی نہ بھولوں گا۔ میں بھول سکتا ہی نہیں۔

پٹواری نے یہاں قدرے توقف کیا۔ منشی نور عالم نے جیب میں سے پرانا اخبار نکالا اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب میں رکھ دیا۔ چاندی چوکیدار نے ایک انگڑائی لی اور فضلو ڈاکئے نے نسوار کی ایک چٹکی چڑھائی۔

کچھ دیر کے بعد پٹواری پھر کہنے لگا ـــــ کھلتا کھلتا موسم تھا۔ شاہیا تین ماہ کی رضا پر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ میری آنکھوں کا خار تھا۔ فوج کی نوکری نے اسے بددماغ اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ میری کوٹھڑی میں وہ ایک ہی دفعہ آیا تھا۔ اصل میں آگے پیچھے سے لوگوں نے اُسے میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ ہم دونوں کو ـــــ مجھے اور سکینہ کو ـــــ بستی کے چند شریر نوجوانوں نے ایک آدھ بار ندی کے کنارے اکٹھا بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بات ذرا نمک مرچ لگا کر شاہیا کو سنائی وہ بے وقوف تو تھا ہی ان باتوں پر ایمان لے آیا اور پھر اس نے ایک روز خود اپنی آنکھوں سے سکینہ کو میری کوٹھڑی میں دیکھ لیا۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ یہی محبت کی باتیں ـــــ اور شاہیا باہر کھڑکی سے لگا سن رہا تھا۔

ویدجی اب میری کہانی کا وہ حصہ آتا ہے جس نے میری جوانی کو دوزخ اور میری ساری زندگی کو ایک نوحۂ ماتم بنا دیا ـــــ آہ وہ شام ـــــ وہ شام مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تند ہوا چل رہی تھی۔ قدرے بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ سکینہ دوڑی دوڑی میری کوٹھڑی میں آئی اور کہنے لگی ـــــ "راجہ! گھوڑی پر زین ڈالو اور ابھی تاج پور جاؤ میرے لئے کانچ کی پانچ چوڑیاں لے آؤ۔ ابھی جاؤ میرے موتی۔ کل بہادر کمہار کی لڑکی کا "تیل" ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ یہ چوڑیاں اُس کے شگن پر پہنوں گی۔ اگر تمہیں مجھ سے باجرے کے دانے اتنی محبت بھی ہے تو ابھی جاؤ اور دن چڑھے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤ ـــــ میرے! اچھے راجہ۔ میرے موتی ـــــ پھر وہ مجھ سے چمٹ گئی اور اپنے رخساروں کو میرے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ دیا ـــــ

جب میں گھوڑی پر سوار تاج پور کو جا رہا تھا تو گاؤں کی آخری حد تک مڑ مڑ کر دیکھتا گیا۔ سکینہ ڈیوڑھی میں کھڑی اپنا سرخ دوپٹہ ہلا رہی تھی۔

تھوڑا تھوڑا سورج نکل رہا تھا۔ میں سکینہ کی پانچ چوڑیاں لے کر جب گنگھن پور پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں ـــــ ہائے وہ منظر اب تک میری روح کو بے چین کئے دیتا ہے۔ آہ! سکینہ میری کوٹھڑی میں میری چارپائی پر پڑی تھی۔ وہ زندہ، گرم، ہنستی اور مسکراتی ہوئی سکینہ نہیں بلکہ ایک ٹھنڈی، بے حس، مردہ لاش۔ اس کے سینے سے خون بہہ بہہ کر منجمد ہو چکا تھا اور شاہیا کے ہاتھ ـــــ بھائی کے ہاتھ بہن کے خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ بہن مر چکی تھی۔ اور بھائی پولیس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

مولاداد خاں پٹواری جب اتنا کہہ چکا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی اور اس کی چھوٹی چھوٹی بے نور آنکھوں میں سے موٹے موٹے آنسوؤں کا ایک مسلسل تار نکل کر اس کی گھنی سفید و سیاہ داڑھی میں غائب ہو رہا تھا۔ اس حالت میں پٹواری نے کوٹ کے اندر کی جیب میں سے ایک پرانا لفافہ نکالا اور اس لفافے میں سے کانچ کی پانچ چوڑیاں نکال کر کہا ـــــ ویدجی! یہ سکینہ کی پانچ چوڑیاں ہیں۔ انہیں میں ہر وقت سینے سے لگائے رکھتا ہوں اور ویدجی! سکینہ کی یاد میں اُس کی پاک محبت اور معصوم جوانی کی یاد میں، میں نے آج تک شادی نہیں کی ـــــ

پٹواری پھر رونے لگا۔ سننے والوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ساعت در ساعت محفل پر آنسوؤں کی نمی چھائی رہی۔ پھر منشی نور عالم نے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب میں رکھ لیا۔ چاندی چوکیدار نے ایک انگڑائی لی اور فضلو ڈاکئے نے نسوار کی چٹکی چڑھائی اور کھانسنے لگا۔

سید ضمیر جعفری

نجمہ سے

مرے شباب کو تو سوگوار رہنے دے
مجھے رہینِ غمِ انتظار رہنے دے
قبائے صبر و سکوں تار تار رہنے دے
تمام عمر یونہی بے قرار رہنے دے
مگر خدا کے لئے آپ بے قرار نہ ہو

مرا خیال نہ کر تو مرا ملال نہ کر
ملول رہ کے مری زندگی محال نہ کر
اور اپنی اٹھتی جوانی کو یوں وبال نہ کر
میں خوش ہوں، آہ مجھے دلفگار رہنے دے
مگر خدا کے لئے آپ دل فگار نہ ہو

زمانے بھر کے مصائب میں آپ سہہ لوں گا
فلک نے جس طرح چاہا جہاں میں رہ لوں گا
بہائے جس طرح سیلِ زمانہ بہہ لوں گا
مجھے شہیدِ غمِ روزگار رہنے دے
تو خود رہینِ ستم ہائے روزگار نہ ہو

مری تباہی ستاتی رہے تجھے صد حیف
مری جدائی رلاتی رہے تجھے صد حیف
یہ آگ ہائے جلاتی رہے تجھے صد حیف
مرے جگر کو یونہی داغدار رہنے دے
مگر، حذر! کہ جگر تیرا داغدار نہ ہو

مرے لئے، تو جوانی کو یوں تباہ نہ کر
نہ کر خدا کے لئے، آہ یہ گناہ نہ کر
نہیں ہے چرخ کو منظور تو نباہ نہ کر
مرے شباب کو تو سوگوار رہنے دے
ترا شباب، مگر دیکھ! سوگوار نہ ہو

تمہارے پیار میں کب اشتباہ ہے پیاری
کہ یہ خیال بھی کرنا گناہ ہے پیاری
تری جھکی ہوئی پھر کیوں نگاہ ہے پیاری
مری نظر میں مرا اعتبار رہنے دے
تجھے ہے مجھ سے محبت تو شرمسار نہ ہو

سید ضمیر جعفری

دنیائے ادب

تھانیسر کی لڑائی اور اُس کے اثرات

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر ہوئی تھی۔ جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لئے گُل کر دیا اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لئے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے راستہ بھی کھول دیا تھا لیکن تھانیسر کی لڑائی سے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابلِ ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کی تاریخ پر پڑا ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے سنہ ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قایم کی لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا۔ اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔ دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے در پے حملوں کا ہے مگر یہ بھی بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے۔ اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا کیونکہ محمود کی وفات کے چند ہی سال کے بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دہلی میں ایک طاقتور سلطنت قایم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ ازسرِ نو کھول کر آیندہ مسلمان حملہ آوروں کے لئے اس ملک میں داخل ہونے کی یقینی راہ دکھا دی۔ دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا۔ اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اُسے ہندوستان خاص تک پہنچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہو کر سرہند تک پہنچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے جس کے بدولت اکثر سلطنتوں نے اُسے پایہ تخت بنایا۔

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے، جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد و جوان مرگ بہنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہو گئی اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑ کر قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہی اور آگے چل کر اس ... نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی سنہ ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ... میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قایم ہو گئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں

تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی۔ ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پُر کاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ فنِ تعمیر کے خاص اسلامی جزو تھے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس زمانے کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے۔ راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور نائکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ شکل و صورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کو ہندو مسلم آرٹ کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنتا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے۔ اور انواع واقسام کے رنگوں کی حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ اظہارِ خیال کے لئے ہندی مرہٹی، بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں۔ مسلمانوں نے بھی ترکی فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی۔ اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ گرامر تشبیہات اور طرزِ تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی۔ پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب لاکھ بخش ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہلِ عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فن طب کے مرہونِ منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا اس لئے وہ اِن صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لیں۔ اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دواسازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں جنہوں نے فن کاغذ سازی بھی چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس ملاپ کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگنیاں قبول کرلیں لیکن آلاتِ موسیقی میں بہت کچھ ردوبدل کیا۔ جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہہ ستار نے لے لی۔

لباس، رسمیات، آدابِ محفل، غذا، کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ حلوائی کی دُکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے۔ دانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا۔ مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آج کل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچہ قایم رکھا۔ اس کے سکوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سرِ نو جاری کیا۔ چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعے ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا۔ اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری زندگی پر حاوی ہے اور آیندہ بھی عرصہ تک رہے گی۔

"زمانہ" منشی دیانرائن نگم (ایڈیٹر)

اُردُو غزل کا مستقبل

اردو غزل کے تین دور

کسی چیز کے متعلق پیش گوئی کرنے سے قبل اس کے ماضی و حال پر نظر ڈال لینے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ مستقبل کی تعمیر میں ماضی و حال کی چٹانوں سے بڑی حد تک کام لیا جاتا ہے۔ انسان کی نگاہ، مستقبل کے تاریک کہرے میں کام نہیں کر سکتی۔ مگر ماضی و حال کی عینک کے ذریعہ، انسانی نگاہ اس کہرے کی بہت سی روشن پرچھائیوں کو دیکھ سکتی ہے۔ جو لوگ ماضی و حال سے بے نیاز ہو کر مستقبل کے متعلق فتوے لگا دیتے ہیں۔ ان کی پیش گوئیاں "کودکِ ناداں" کے تیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ میں اردو غزل کے ماضی و حال پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنا چاہتا ہوں تاکہ مستقبل کے سمجھنے میں مجھے اور ناظرین کو آسانی ہو۔

ماضی — ۱

اردو غزل کا ماضی صحیح طور پر میر تقی میر کے زمانہ سے شروع ہو کر فصیح الملک داغ پر ختم ہوتا ہے۔ میرزا مظہر جانِ جاناں، ولی دکنی اور اسی نوع کے دوسرے شعرا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان حضرات کا کلام اب "آثارِ قدیمہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو غزل کے تدریجی ارتقا کا اندازہ لگانے کے لئے جن کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ میر تقی ہی حقیقت میں اردو غزل کے سب سے پہلے شاعر تھے اور آج دو سو برس سے کچھ اوپر زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اُن کے کلام کی تاثیر اور اسلوب کی دل کشی کم نہیں ہوتی۔ میر کے تیر و نشتر آج بھی ہمارے دل کو برماتے ہیں۔ اور ہمارے ادب کے بہت سے صفحات پر میر کے اشعار دمکتے ہوئے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو کے ماضی کو بھی ہم دو زمانوں میں تقسیم کریں گے۔ پہلا زمانہ تو میر سے شروع ہو کر غالب پر ختم ہوتا ہے اور دوسرے دور کی عمر بہت ہی مختصر ہے یعنی غالب سے لے کر داغ تک۔ میر تقی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سوز و گداز، زبان کی چاشنی، بیان کی سادگی اور محاورات

کا برمحل استعمال ہے۔ میر کی غزل کو اس کے زمانے میں ہی قبولیت حاصل ہو گئی اور تمام ہندوستان پر اس کا رنگ چھا گیا۔ تاہم چاندپوری کو جو میر تقی ہی کے ہمعصر تھے، میر کا مقلد تو نہیں کہہ سکتے لیکن ان کا طرزِ بیان میر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میر کے اندازِ بیان سے وہ بھی متاثر ہوئے ہوں۔ میر تقی نے زیادہ تر توجہ زبان کی چاشنی، بیان کی سادگی، اور سوز و گداز پر کی۔ حقائق کی بلندی کی طرف میر نے زیادہ غور نہیں کیا۔ قدرت نے میر کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ وہ ہمارے درمیان سوز و گداز کا ایک آتش فشاں چھوڑ کر رخصت ہو جائیں۔ اور اردو ادب کے فدائی اُن کے اشعار پر ہمیشہ سر دھنتے رہیں۔ میر کا یہ شعر

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

پڑھنے والے کی نگاہ کے سامنے ایک ایسے حسین انسان کی صورت کو مجسم کر دیتا ہے، جس کے ہونٹ سچ مچ گلاب کی پنکھڑی جیسے نظر آتے ہیں اس طرح کے سینکڑوں سادہ اور دلکش اشعار آپ کو میر کے یہاں ملیں گے۔ یہ اردو غزل کی ابتدا تھی، اس لئے بلند مسائل کی ترجمانی کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میر کے اس شعر کا جواب پیش کرنے کے لئے روح القدس کسی شاعر کی دوبارہ امداد کے لئے مشکل ہی سے آمادہ ہوگا

کل کا وعدہ کیا ہے اس نے میر ایک دن اور بھی جئے ہی بنی

غالب کے دور تک قریب قریب تمام شعراءِ غزل میں میر کے رنگ کی تقلید کرتے رہے۔ خواجہ میر درد کے یہاں البتہ سادگی بیان کے علاوہ تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے، اور وہ اردو غزل کے پہلے صوفی شاعر ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اردو زبان، ابھی ان نازک اور پیچیدہ مسائل کی ترجمانی کے لئے پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی اس لئے خواجہ میر درد کے یہاں جا بجا ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے اور خواجہ کا مافی الضمیر سمجھنے کے لئے بہت سے خلاؤں کو از خود پُر کرنا پڑتا ہے۔ خواجہ میر درد نے جہاں صاف کہا ہے اس کا جواب بس میر تقی کے ہی یہاں مل سکتا ہے، حیران ہوں کہ اس شعر کی داد کس زبان سے دوں۔

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

میر تقی کی طرح خواجہ میر درد کے رنگ کو قبولیتِ عام حاصل نہ ہو سکی لیکن جو بنیاد خواجہ درد ڈال گئے تھے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لکھنؤ اور دہلی کے تمام شاعروں نے میر تقی کے رنگ کی تقلید کی لیکن بعد میں جا کر، اردو غزل میں صنائع بدائع کا استعمال ہونے لگا۔ جس کے موجد ناسخ لکھنوی سمجھے جاتے ہیں۔ آتش کے یہاں میر کا بڑی حد تک صحیح اتباع

پایا جاتا ہے اور نواب سید محمد خاں رند اپنے استاد کا نقش ثانی نظر آتا ہے مگر ناسخ جو کہتا تھا کہ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"

انداز بیان میں میر کا عکس نظر آتا ہے۔ ناسخ نے بیان کی سادگی کو تکلفات کی جھول اور صنائع، بدائع کی فرغل پہنا دی عجیب بات ہے کہ عام طبائع نے اسی رنگ کو قبول کیا اور اردو غزل ایک چوچلا بن کر رہ گئی، دہلی کے شعرا پر بھی اس رنگ کا اثر پڑا اور لکھنو کے شعرا تو ان ہی چکن اور آب رواں کی قناطوں میں گھر کر رہ گئے۔ یہ لفظ پرستی کا دور تھا، معنویت کا تصور دماغوں سے بڑی حد تک محو ہو چکا تھا۔ شعرا تکلفات اور چوچلوں سے کھیل رہے تھے۔ زخم جگر کے ثبوت کے لئے ناسور اور زخم کھرنڈ اور لہو کے تمام استعار صرف کئے جا رہے تھے اور عاشق کے چہرے کی زردی دکھانے کے لئے خون کی کمی، ہڈیوں کی خشکی اور ناتوانی کی مختلف کیفیتیں دکھائی جا رہی تھیں۔ اسی ماحول میں غالب پیدا ہوا جس نے اردو غزل میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

میر تقی کے یہاں جو حقایق کی بندی کی کوتاہی اور خواجہ میر درد کے یہاں تصوف کے مضامین میں اظہار بیان کی ژولیدگی باقی رہ گئی تھی، غالب نے اس کی حسین تلافی کر دی ـــــ غالب اردو کا پہلا شاعر تھا، جس نے اردو غزل میں بلند سے بلند مسائل کو بیان کیا۔ غالب نے اردو غزل کو فارسی غزل کے برابر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اگر شاعری کسی شریعت کا نام ہے تو غالب اس شریعت کا پیغمبر تھا۔ اس نے جدید ترکیبیں ایجاد کر کے اردو ادب کے دامن کو وسیع کر دیا۔ قدرت نے حافظ خسرو اور سعدی کو بخشی ہوئی شعریت اجتماعی طور پر غالب کے لئے مختص کر دی غالب اردو کا پہلا مفکر شاعر تھا اور نہ صرف مفکر بلکہ انقلابی شاعر، جس نے زمانہ کے مزاج شعری کے خلاف جہاد کیا نا سمجھوں نے اس کو برا بھلا کہا۔ اس کے کلام پر بے جا تنقیدیں کیں، لوگوں کے اسی طرز عمل سے متاثر ہو کر اسے کہنا پڑا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

زمانہ نے غالب کو ٹھکرایا، ملک الشعرائی کا تاج کسی دوسرے سر پر رکھ دیا گیا، لیکن مستقبل اس کی پذیرائی کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ غالب اپنے مستقبل سے کس قدر باخبر تھا اس نے خود ہی کہا ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی غزل نے لوگوں کو چونکا تو دیا، لیکن اس کے دور میں، اس کے رنگ کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی ـــ تکلفات شاعری نشہ کتنا تیز ہوتا ہے۔

مومن نے بھی اسی ماحول میں شعریت کی سانس لی   س نے تغزل کا صحیح نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ مومن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت بیان کی شوخی ہے اور یہ اثر ہے اس کی بے پناہ عاشقانہ فطرت کا ـــ اگرچہ جہاں کہیں وہ فلکیات اور نجوم و رمل کے مسائل استعاروں کی شکل میں بیان کرتا ہے تو دوسرا "ناسخ" نظر آتا ہے۔ مومن اور غالب کے رنگ سے نواب مصطفے خاں شیفتہ بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعرا نے اس رنگ کو قبول نہیں کیا۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق معلوم ہوتا ہے کہ اردو غزل کو ابن یمین کے ناصحانہ رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ ناصحانہ ہے۔ حیرت ہے کہ جس زمانہ میں غالب کے اس شعر پر

اک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے ذوق کے اس شعر پر

واہ اے ذوق جراحت خوب ہی چھڑکا نمک

ہڈیاں میری ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

لوگ سر دھنتے تھے ـــ ! دنیا والے کتنے جاہ پرست اور نا منصف ہوتے ہیں!

غالب کے بعد داغ اور امیر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے کلام کو علی قدر لذت قبولیت نصیب ہوئی۔ داغ شاگرد تو تھے ذوق کے مگر وہ میر، غالب اور مومن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب سے وہ "معنی آفرینی" کی حد تک متاثر ہیں۔ جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے۔ اس میں میر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں شیرینی اور شوخی خوشگوار اعتدال کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مومن کا تغزل تکمیلی شان کے ساتھ داغ کے یہاں نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم (آہ! کہ اقبال کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتا ہے) نے داغ کو حسن و عشق کا مصور کہا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ داغ نے حسن و عشق کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے، داغ کی کلیات میں ناول کی طرح لطف آتا ہے۔ بس پڑھتے ہی رہے طبیعت کسی طرح سیر نہیں ہوتی، داغ کے رنگ کو بے حد قبولیت حاصل ہوئی، میر تقی سے بھی زیادہ! داغ کا رنگ سارے ہندوستان پر چھا گیا اور آج بھی بہت سے شعرا داغ کے اتباع کو سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔ امیر مینائی کے یہاں لکھنو کے تکلفات بڑی حد تک پائے جاتے ہیں، لیکن جہاں امیر نے صاف کہا ہے، اس کا جواب نہیں، یہ عجیب بات ہے کہ داغ کی قبولیت سے متاثر ہو کر امیر نے

بہت سی غزلیں داغ ہی کے رنگ میں کہی ہیں۔ مولانا حالیؔ غزل میں اپنے استاد غالب سے متاثر نظر نہیں آتے۔ غزل میں حالیؔ کے رنگ کے اتباع کی دو چار شاعروں کے سوا اور کسی نے کوشش نہیں کی۔

حال ——!

موجودہ اردو غزل، غالبؔ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض چوٹی کے غزل گو شعراء اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں لیکن ان کے اشعار، ڈنکے کی چوٹ اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔ میں اردو غزل گو شعرا کے کلام کا تجزیہ کر کے بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں کہاں غالبؔ کے خیال سے متاثر ہوئے ہیں۔

داغؔ کے بعد اردو غزل گوئی کو تین دوروں سے گزرنا پڑا، پہلا دور تو داغ کے رنگ کا دور تھا، اس کے بعد جب غالب کو لوگوں نے سمجھا تو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کا غزل میں بے تحاشا استعمال شروع ہو گیا! اس کے بعد تیسرے دور میں غزل کی حالت پھر اعتدال پر آ گئی۔ موجودہ اردو غزل، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے میرؔ، خواجہ میر دردؔ، غالبؔ مومنؔ اور داغ کے افکار کا نچوڑ ہے۔ اس میں اجتماعی طور پر وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، زبان بہت زیادہ سلیس اور شیریں ہو گئی ہے۔ بلند سے بلند خیالات کی ترجمانی کی جا رہی ہے اور نئی نئی ترکیبوں کی ایجاد نے زبان میں بہت کچھ وسعت پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان میں جتنی شاعروں کی بہتات ہوئی ہے، اتنی بہتات شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہوئی ہو۔ والیان ملک، وزرا، سیکرٹری کونسل کے ارکان، انجنیر، ہواباز، موٹر ڈرائیور، تاجر، کاشتکار، درزی، نورباف، شیرینی ساز، حجام، قلی، تانگے والے، غرض ہر پیشہ کے لوگ شاعر بن گئے ہیں رسائل اور اخبارات کی کثرت نے شہرت کو ارزاں کر دیا ہے۔ اس لئے ہر شخص اس ارزانی سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شعرا کی اس بے پناہ کثرت کے باعث اردو غزلیں ایک ہی ٹکسال کا سکہ بن کر رہ گئی ہیں، ایک ہی خیال سینکڑوں غزلوں میں خفیف تبدیلی کے ساتھ نظر آتا ہے اردو کی بے شمار غزلوں میں آپ کو

"ذوقِ نظر، برق تجلی، ارے توبہ! فطرت، میکدہ بردوش"
عالمِ شباب، جنبش مینا، لغزش مستانہ، صبح ازل، شام ابد"
"انگڑائی، کیف انگیز، وجد و سماع ——"

کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہی ٹکڑے جا بجا ملیں گے، شعرا اپنی جگہ ایک مستقل حقیقت ہے، مگر شاعروں کی اس کثرت کو ہندوستان کی وسعت گوارا نہیں کر سکتی۔

مستقبل ——!

بعض ناسمجھ اور کم فہم اردو غزل کے خلاف قلمی جہاد کر رہے ہیں، اردو غزل کے اساتذہ کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں اور ان اشعار کا جو درحقیقت الہامی اشعار ہیں۔ مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک دل میں چوٹ کھا کر آہ کرنے کی قابلیت موجود ہے، غزل فنا نہیں ہو سکتی، غزل باقی رہے گی۔ انقلاب کے خونریز ہنگامہ اور سیاسیات کے لرزہ بر اندام طوفان میں ——! ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خونی انقلاب آئے گا اور ضرور آئے گا لیکن یہ انقلاب کیا دل کو برف کا ٹکڑا بنا دے گا اگر دل اس انقلاب میں بھی بدستور دل رہا تو غزل بھی بدستور باقی رہے گی۔ آپ غزل کو مٹانے سے پہلے لوگوں کے سینے چیر کر دلوں کو نکال کر پھینک دیجئے کہ یہی کم بخت غزل کی بنیاد ہے۔ یقین جانئے کہ بڑے سے بڑے انقلاب کے وقت بھی، انسان وصل و ہجر کے تاثرات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور غزل ان ہی تاثرات کی ترجمان ہے۔

ترکی میں آپ کے ہندوستان سے کہیں بڑا انقلاب آیا تھا۔ اس وقت جبکہ میدانِ جنگ میں گولے برس رہے تھے اور آگ اور خون کا دریا بہہ رہا تھا، غازی انور پاشا مرحوم اپنی چہیتی بیوی کو خط لکھتے ہیں:۔

"مجھے تمہاری وہ نازک انگلیاں جو میرے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں، یاد آ رہی ہیں"

بس یہی غزل ہے! —— ہمارے انقلابی شاعر اور ادیب ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ تخمیناً ایک صدی تک موجودہ غزل کا اثر باقی رہے گا۔ موجودہ شعرا نے اتنے متنوع اور مختلف بلند خیالات غزل میں پیش کر دیئے ہیں کہ مستقبل میں ان ہی خیالات کی غالباً الٹ پھیر ہوتی رہے گی زبان اب سے زیادہ سلیس ہو جائے گی لیکن چونکہ انسانی فطرت ایک حالت پر قانع نہیں رہتی۔ اس لئے کیا عجب ہے کہ ادق الفاظ کا دور پھر واپس آ جائے۔ آیندہ چل کر ردیف کا استعمال کم ہو جائے گا۔ عربی شاعری کی طرح قافیہ پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ مسلسل غزلیں کثرت کے ساتھ کہی جائیں گی۔

اشتراکیت کا طوفان سرمایہ داری سے نفرت اور مزدور کی حمایت کے ساتھ ساتھ الحاد و انکار کی موجیں اپنے ساتھ لا رہا ہے، دنیا کا مستقبل بڑی حد تک مادی ہو گا، اس لئے عام لوگ:۔

"برق و طور، ایمن و کلیم، غیب و شہود۔"

لذتِ سجدہ، چراغِ کعبہ اور فانوسِ کلیسا "

کے استعاروں کو نہ سمجھ سکیں گے، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے اردو غزل گو شعرا بھی مادہ پرستی سے متاثر ہوکر تصوف کے مضامین کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اردو غزل کو اس سے بہت صدمہ پہنچے گا۔

مستقبل میں اردو غزل سے یاس و نا امیدی کے مضامین بڑی حد تک خارج کر دیئے جائیں گے۔ شباب، ہستی، سوز و جذب اور رجائیت کے مضامین کو غزل کا جامہ پہنایا جائے گا۔ اسی زمانے میں دیکھ لیجئے کہ گو یہ عریاں کی طرف عام طور پر اردو غزل گو شعرا کا خیال بہت ہی کم جاتا ہے۔ میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اردو غزل غالب کے اثر سے کسی دور میں بھی بے نیاز نہ ہو سکے گی۔

ماہر القادری

"شاہکار" (گورکھپور)

غم و راحت

آلام باقی آرام فانی — راحت مسافر غم جاودانی

غم کا پتنگا تابندہ دائم — راحت کا جلوہ فانی ہی فانی

افراط عشرت آثار اجل کے — غم کی فزونی ہے زندگانی

ذوقِ الم تو بخشا ہے یارب

بھڑکا دے اب یہ سوزِ نہانی

"تاجور سامری"

نقد و نظر

تعمیرِ نو

مصنفہ مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم اے ایل ایل بی۔ حجم ۱۹۲ صفحات سائز ۲۹×۲۲/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ملنے کا پتہ۔ اردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور۔

کتاب کے نام سے متاثر ہو کر ہم نے خیال کیا تھا کہ شاید اس میں قومی تعمیر کا کوئی خاص واضح اور معین پروگرام پیش کیا ہوگا لیکن پڑھنے کے بعد ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ فاضل مصنف کا دل و دماغ عام ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح اضطراب اور کشمکش کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور انہوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ اس ذہنی اضطراب کا اظہار اس کتاب کے اوراق میں کیا ہے۔ تعمیرِ نو کے مصنف پنجاب کے ایک نہایت قابل نوجوان ہیں جنہوں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامیات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور چونکہ وہ حساس طبیعت اور دلِ دردمند کے مالک ہیں اس لئے وقتاً فوقتاً تصانیف کے ذریعہ سے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت اور موجودہ فلاکت پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ تعمیرِ نو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ قومی ادبار کو کس شدت سے محسوس کر رہا ہے اور کوئی راہِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے خود اپنی آگ میں کس بے دردی سے جل رہا ہے۔ اس نوع کی تصانیف سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان زندگی کے معرکے میں آگے بڑھنے اور فتح و نصرت سے ہمکنار ہونے کے لئے بے تاب ہیں لیکن مذہب کی قدیم روایات نے غیر شعوری طور پر انہیں جکڑ رکھا ہے اور وہ اپنی قوتِ عمل کے باوجود ہل نہیں سکتے۔

تعمیرِ نو کی زبان نہایت چست اور درست ہے لیکن اندازِ بیان میں بعض مقامات پر تعقید پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مصنف بہت تھوڑے لفظوں میں بہت کچھ بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے اس میں مختصر طور پر اُن اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن سے کام لے کر دنیا میں قومیں بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں کی ترقی کی داستان بہت اختصار لیکن خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں قرآنی تعلیمات، اتحادِ اسلامی، سائنس کی موجودہ ترقیات اور جنگِ عظیم کے اسباب و نتائج پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کتاب کے بیشتر مقامات میں مصنف کے خیالات سے اختلاف ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اضطراب و کشمکش اور غور و فکر کا یہ دور ختم ہونے کے بعد جب فاضل مصنف کی رائے سیاسی معاملات کے متعلق پختگی حاصل کرے گی تو وہ تعمیرِ ملت کا کوئی واضح نسخہ بتا سکیں گے۔ ہمارے نزدیک تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک راہِ نجات ہے ـــــ اشتراکیت۔

بنی اسرائیل کا چاند

مصنفہ سر رائڈر ہیگرڈ۔ مترجم عبدالمجید حیرت بی اے (علیگ) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ساڑھے چار سو صفحات۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ مکتبۂ پنجاب لاہور

سر رائڈر ہیگرڈ انگریزی زبان کے مشہور اور مقبول ترین فسانہ نگار ہیں اور اُنکے ناول عوام سے لے کر بادشاہوں تک ہر جگہ دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ "بنی اسرائیل کا چاند" میں مصنف نے سرزمینِ مصر کے ایک مشہور تاریخی واقعہ کو جسے مذہبی روایات نے تقدس کا رنگ بھی دے رکھا ہے ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بنی اسرائیل سیکڑوں برس تک مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مصر کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں داخل ہوتا ہے تو سخت طوفان برپا ہو جاتا ہے جس میں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر فرعون جس قسم کے مظالم روا رکھتا تھا اُن کی داستان پڑھ کر رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں اور بنی اسرائیل جس استقامت اور بے خوفی سے ان مظالم کا مقابلہ کرتے رہے اُس سے اس قوم کی بلند حوصلگی کا پتہ چلتا ہے کتاب میں زمانہ ماقبل تاریخ کی معاشرت، سیاست اور مذہب کا نقشہ خوب پیش کیا گیا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے قہر و عتاب، جادوگروں۔ کاہنوں کی شعبدہ بازیاں اور مذہبی توہمات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کی چاشنی نے کتاب میں اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

ترجمے کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ عبدالمجید حیرت ایساصاحب قلم اس کا مترجم ہے۔ حیرت صاحب نے نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے مطالب کو ترجمہ کی دقتوں خاطر کہیں حذف نہیں کیا گیا بلکہ زبان وادائے بیان کی روانی دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی خود بخود اردو کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ زبان نہایت صاف، آسان اور شگفتہ ہے۔ رائڈر ہیگرڈ ایسے مصنف کے ناول کو جو اپنی تصانیف میں ہمیشہ پُراسرار ماحول پیدا کرنے کا عادی ہے اردو میں اس خوش اسلوبی سے پیش کرنا کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہم حیرت صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اگر انہیں سرکاری ملازمت کے افکار سے کبھی فرصت ملے تو انگریزی کے بلند پایہ مصنفوں کی اور کتابوں کو بھی اسی خوبی سے اردو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

کتاب العلم

میسرز الیسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ ۔ چیمبر لین روڈ ۔ لاہور

اردو سے ایک عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا کتاب العلم کے نام سے تیار کر رہے ہیں اس کتاب کے سو جز باقساط شائع ہوں گے۔ ہر جز کی قیمت تین روپے دو آنے ہوگی۔ خریداری کی شرط یہ ہے کہ پہلے دس روپے بطور پیشگی کمپنی کے دفتر میں جمع کرا دئے جائیں۔ ہر جز شائع ہوتے ہی خریدار کے پاس بذریعہ قیمت طلب پیکٹ پہنچ جائے گا۔ کمپنی نے کتاب العلم کے نمونے کے صفحات ہمارے پاس بھیجے ہیں جن سے اس کتاب کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتابت اور کاغذ نہایت اعلیٰ ہے۔ چھپائی سرآمد ملک کی ہے۔ ہر علم اور فن کے متعلق بے شمار تصویریں ہیں جن سے کتاب کے مطالب کی وضاحت ہوتی ہے۔ کتاب العلم میں کن کن موضوعات پر مضامین ہوں گے۔ اس کی ایک خفیف سی جھلک مندرجہ ذیل فہرست سے ہو سکتی ہے۔

کائنات۔ معدنیات۔ حیاتیات، انسانیات۔ کیمیا و طبیعات ایجادات۔ فنون لطیفہ۔ تاریخیات۔ ادبیات۔ اقتصادیات۔ صحتیات تفریحیات۔ دینیات۔ نظمیات۔ زرعیات۔ ملکیات۔ شخصیات۔ میکانیکیات۔

کتاب العلم اگر اس ساز و سامان اور اہتمام کے ساتھ نباہ ہو گئی تو اردو زبان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوگا۔ یورپ میں متعدد ادارے اس قسم کی عظیم الشان کتابیں بہ اقساط شائع کرتے رہتے ہیں جس سے علم و ادب کے شائقین بیک وقت بہت سا روپیہ خرچ کرنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں اور ہر ماہ ایک جز کی قیمت ادا کر کے ایک خاص میعاد کے اندر مکمل کتاب حاصل کر لیتے ہیں۔ اردو میں اس نوع کی خدمت خدمت کا سہرا الیسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ کے سر ہے۔ امید

ہے ہندوستان میں اس کتاب کی شایانِ شان قدر و منزلت ہوگی۔

"ع"

ہندوستانی کشیدہ کاری

مرتبہ محترمہ آنسہ آمنۃ اللہ صاحبہ سابق ہیڈ مسٹریس سر سکندر گرلز انڈسٹریل سکول

یوں تو آج تک فن کشیدہ کاری کی بہت سی کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں۔ مگر وہ سب کی سب جدت تنوع اور دیگر معلومات و ہدایات کی محتاج ہیں محترمہ امتہ اللہ صاحبہ نے اپنی تمام محنت و کاوش سے ہندوستانی کشیدہ کاری میں تمام ضروری ہدایات و معلومات اور جدید ڈیزائن پیش کرتے ہوئے اس کو بہت ہی مفید اور جدید ترین کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کے ہوتے ہوئے کشیدہ سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والی بہنوں کو کسی سے سیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوسکتی۔ محترمہ بیگم صاحبہ نواب احمد یار خاں دولتانہ صاحب نے اس کا تعارف لکھا ہے جس میں انہوں نے کشیدہ کی اہمیت اور فنی لحاظ سے اس کتاب کی خوبیاں بتلائی ہیں۔ اس کے بعد دو صفحات پر ضروری ہدایات و دیگر مختلف کام مثلاً شیڈ کا کام سلمہ، دشنیچائل کا کام۔ زری کا کام اور ربن ورک کے بنانے کے مختلف طریقے اور مختلف ٹانکے بمعہ اشکال درج کئے گئے ہیں۔ پھر ۲۹ تا ۲۲۴ کے ۴۸ صفحات پر ہر قسم کے چھوٹے اور بڑے ڈیزائن دئے گئے ہیں۔ ڈیزائنوں کے ساتھ ساتھ درج شدہ ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک ڈیزائن کئی ایک مختلف جگہوں پر استعمال ہوسکتا ہے۔ ہمارے خیال میں آرائش و زیبائش کی کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس کے متعلق اس میں ڈیزائن موجود نہ ہو۔ کتاب کے اخیر میں ۲۲۱۲۹ کے پورے چھ صفحات پر بہت بڑے بڑے ڈیزائن دئے گئے ہیں جو کہ کتاب کی جدت میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کی اشاعت نے صحیح معنوں میں وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ دی انڈین فیڈرل آرٹ اینڈ انڈسٹری ہاؤس الہ یار سٹریٹ برانڈرتھ روڈ لاہور

ادارہ

اعتذار

(۱) ادبی دنیا کی گذشتہ اشاعت کے حصہ "دنیائے ادب" میں جناب ساغر نظامی کی نظم مکالمۂ ساقی و ساغر "معزز معاصر ساقی سے نقل کی گئی تھی اور چونکہ نظم ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ سے لی گئی تھی اس لئے اسے جوں کا توں کاتب کے سپرد کر دیا گیا اور یہ جس طرح "ساقی" میں چھپی تھی اسی طرح "ادبی دنیا" میں بھی چھپ گئی اب جناب ساغر کے ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ نظم کے بعض اشعار غلط چھپ گئے ہیں۔ اس بارہ میں اگرچہ ہماری ذمہ داری ادارہ ساقی کی ذمہ داری سے کمتر ہے لیکن یہ فروگذاشت بہرحال قابل افسوس ہے۔ ہم جناب ساغر سے اس بارے میں معذرت خواہ ہیں۔

وہ غلطیاں یہ ہیں۔ ص۶۲ دوسرا شعر۔ غلط وقتِ سحر کا کھڑا۔ صحیح۔ دولتِ سحر کا کھڑا

ص۶۳ پہلا شعر۔ غلط مہر تخلیق - صحیح مہدِ تخلیق

ص۶۳ دوسرا شعر۔ غلط ابدی نیستی کر۔ صحیح ابدی ہستی ہے

(۲) افسوس ہے کہ پچھلی اشاعت میں کاتب صاحب کے سہو نظر سے فہرست مضامین میں جناب بابر بٹالوی کے ڈرامہ "بے جوڑ شادی" کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ڈرامہ پرچے میں شائع ہوا۔ امید ہے بابر صاحب اس سہو کو نظر انداز فرمائیں گے۔

ادارہ

نیشنل لیبارٹریز لاہور کے تحفہ جات
مونا سنو
پرجلال بادشاہ سے لے کر بے خانمان گداگر تک
خوبصورتی کا خواہش مند ہے
اس کے چند روزہ استعمال سے کیل، چھائیاں، جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جائیں گے اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا ایک دفعہ ضرور استعمال کریں۔
ہر اچھے دکاندار سے طلب کر سکتے ہیں
کالی سنبل کے ساتھ قدرت کا بے بہا تحفہ
لمبے بال عورتوں کی خوبصورتی کو دوبالا کریں گے
مونا ہیئر آئل
کے بال ناگن کی طرح سیاہ ریشم کی طرح ملائم گھٹنوں تک لمبے اور چمکدار نکل آئیں گے زیادہ تعریف نہیں
ایک دفعہ استعمال کر کے ہماری محنت کی داد دیں۔
جملہ تحفہ جات
کو منگا کر ضرور استعمال کریں۔ تمام تحفہ جات کو ہر صفت موصوف پائیں گے۔
سول ایجنٹ
مونا کولڈ کریم
اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جاتے ہیں۔
بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انارکلی۔ لاہور
فایدہ نہ ہونے کی صورت میں واپسی قیمت کی ٹھوس گارنٹی
ایک 1000 ہزار روپیہ
کا چیک پرتاپ کے جنرل مینجر مسٹر ٹیک چند ڈھینگرہ ایم ایل اے کے پاس جمع کرا دیا گیا ہے اور ان کو تحریری اختیار دیا گیا ہے کہ اگر کسی صاحب کو ہماری دوائی سے فایدہ نہ ہو تو صرف ان کی شکایت آنے پر مزید تفتیش یا تسلی کے بغیر ہی قیمت واپس کر دیں
کھانے سے سفید بال کالا
Neverold
نیورولڈ کے استعمال کا حیرت انگیز نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفید بال جڑ سے سیاہ پیدا ہو جاتے ہیں اور زندگی بھر کسی خضاب وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ سسٹم میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوتی بلکہ اعضائے رئیسہ میں جن کا براہ راست تعلق بالوں سے ہوتا ہے غیر معمولی توانائی و تیزی پیدا ہو جاتی ہے مزید تسلی کے لئے لٹریچر و سرٹیفکیٹ مفت منگوائیں قیمت مکمل بکس ۱۰ روپیہ خورد ڈھائی روپیہ محصول ڈاک علاوہ
سول ڈسٹری بیوٹرز۔ سی اومر اینڈ کو پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹ راوی روڈ لاہور
C.OMAR&Co. P.B.149 LAHORE

سوزِ ناتمام
(دوسرا ایڈیشن)
جناب عاشق بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ
سوزِ ناتمام کے نام سے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے
اس کا پہلا ایڈیشن دس ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا۔ ملک کے
ادبی حلقوں میں سوزِ ناتمام نے جو مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم
کتابوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اہل ذوق کے اصرار پر اب اس کا دوسرا
ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے جو پہلے ایڈیشن کے تمام افسانوں کے علاوہ
فاضل محترم پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے کے ایک مبسوط تبصرہ
پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ کیا ہے اردو کے افسانوی ادب پر ایک
نہایت بیش قیمت تنقیدی مقالہ ہے جو لاہور کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں
بے حد پسند کیا جا چکا ہے۔
سوزِ ناتمام دورِ حاضر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی کے
نشیب و فراز، ان کی ذہنی و روحانی کشمکش کے مدوجزر، دوران کی
بے قرار طبیعتوں کے ہیجان و اضطراب کا حیرت انگیز مرقع ہے۔
سوزِ ناتمام کے متعلق چند آراء کا خلاصہ
"میں عاشق صاحب کو ان کی عبارت نقاشی فطرت پر مبارکباد دیتا ہوں"
مولانا سر محمد یعقوب ممبر آف گیزو کونسل وائسرائے ہند

"عاشق صاحب نے حیات بشری کے نشیب و فراز اور معاشرتی کشمکش
کے نقشوں کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اس کی داد نہ دینا ایک بڑا
جرم ہے"۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی
"مصنف نے اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی سے عہد حاضر کے
پر پیچ معاملات اور فطرت انسانی کے دقیق اسرار کی نقاب کشائی
کی ہے"۔
روزنامہ بمبئی کرانیکل بمبئی۔
کتاب کی ضخامت چار سو صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز
طباعت نفیس اور جلد خوبصورت ہے ان خوبیوں کے باوجود
قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے
مینیجر ادبی دنیا۔ لاہور
سے طلب فرمائیے

SHAHI
for
HEALTH &
VITALITY
SHAHI
BEST TONIC
for
BRAIN & NERVES
امتحان
میں کامیابی یا ناکامیابی کا دارومدار
دماغ
کمی خون
"شاہی"
طیبی دواخانہ یونانی
TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE
BOMBAY

بہارِ شادی (مع پوشیدہ ہدایات باتصویر) قیمت دو روپیہ
اسمیں بعد از شادی دولہا اور دلہن کے
باہمی ملاپ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔
بہارِ نوجوانی (باتصویر)
قیمت ڈیڑھ روپیہ
اسمیں چند ایسی ضروری اور
آسان باتیں مندرج ہیں
جو ہر انسان کو شادی سے
پہلے جاننی ضروری ہیں۔ کئی ایک ہیڈ ماسٹروں اور پروفیسروں کا
خیال ہے کہ اس کتاب کا علم طلبا کیلئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔
انسدادِ کثرتِ اولاد (باتصویر) قیمت ایک روپیہ۔
اسمیں اولاد بہ مرضی پیدا کرنے کے بے شمار آسان اور بے ضرر طریقے درج ہیں
رعایت: تینوں کی قیمت ساڑھے تین روپیہ۔
سٹینو ہاؤس ایجنسی امرتسر
STENO HOUSE AGENCY,
AMRITSAR

آپ کا دوست!
بیاہ کرنے کو ہے!
اسوقت اُسے رہنمائی کی سخت ضرورت ہے!
ہدایت نامہ خاوند
کی ایک جلد اُسے پیش کر کے اپنا فرض ادا کریں
سب کتب فروش بیچتے ہیں!
کویراج ہرنام داس بی اے
لاہور

BEAUTIFUL

SUMMER

HOLIDAY

RESORTS

SERVED

Via The NORTH WESTERN RAILWAY.

ABBOTTABAD

KASHMIR

MURREE

DALHOUSIE

KULU

MUSSOORIE.

Facilities available for through booking from all important stations on the N. W. Railway on Rail cum Road return tickets to the above places and from certain stations on the E. I., G. I. P., B. B. & C. I. and B. & N. W. Railways to Kashmir.

For pamphlet giving full particulars, apply to:—

Headquarters Office,

N.W. Railway,

LAHORE.

THE GENERAL MANAGER.

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Gilani Press, Hospital Road. Lahore.
The Title & pictures printed at the Victoria Press, Ry. Road, Lahore
Issued from office of the Adabi Dunya Commercial Building The Mall Lahore